جدید اُردو نظم میں انسان دوستی

تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

مقالہ برائے پی۔ ایچ ۔ ڈی (اُردو)

مقالہ نگار
نصرت جبین
انرولمنٹ نمبر 1S/38305M-Phil-PhdUR08

نگران مقالہ
ڈاکٹر سید منور ہاشمی
اسسٹنٹ پروفیسر

وفاقی اُردو یونیورسٹی برائے فنون وسائنس وٹیکنالوجی ، اسلام آباد

۲۰۱۷

ABSTRACT

In the first chapter differentconcepts and theories of humanism will be analyzed in detail in historicalprospective. In these theories religious, secular and socialist humanismtheories

are important. Besides this is the basic discussion of religious theoryof humanism and its effects will be analyzed with the reference to theparticular social situation of the subcontinent. The detail of secular andsocial theories of humanism developed by modern western knowledge and itseffects on the civilization of the subcontinent has been analyzed.

In the second chapter the background study of the Urdu poem has beenpresented particularly the classical effects of mysticism and Indian religiousmovements on Urdu poem, which are basically in favor of the religious theory ofhumanism, havebeen critically analyzed. Where as the changes in poem underwestern knowledge has been analytically researched from maulana Ataf HussainHali till Allama Iqbal.

In third chapter with the beginning ofprogressive movements socialist theories and concepts of humanism also affectedUrdu poem in 1936 in Urdu literature. Specifically the effects of socialiststheories of humanism are clearly seen in the poem of the poets related toprogressive movement. With this reference in the light of socialists theories ofhumanism progressive poem has been critically analyzed.

In the forthchapter the progressive, Psychological and metaphysical thoughts and theorieshave been analyzed. In the 20th century metaphysical philosophy has affectedUrdu poem on Iiterary level. In Meta physical philosophy humanism has animportant place. Its reflection is present in the poem of this period. Thesefacts have been studied that due to the effects of modernization at the end offorth decade of 20th centaury the movement of Halqae arbab-e-zauq avoidedmaterialism and developed the spiritualism, the poets of that movement fulfilledthe feelings of humanism in their poems. The period of language development isalso of great importance. This thing has also been highlighted that poem relatedto this movement an art and literary level side by side with other westernthoughts and theories has also affected the philosophy of humanism. Besides thiscontemporaries of Urdu poem the concepts of humanism have been analyzed from 1980 to date .

The development of modern industrial civilization , scientific revelations vastness of modern knowledge have played great role inthe enlightement of human rights. As a result the world Charter of human rightshas been composed. In which individual, social, economical, political andinternational human rights have been covered. According to it all humans areequals in freedom, rights and honour and there can be no difference in givingthem human rights on the base of colour, creed, language, sex, religion , political theories, friend, nationalism or family status. If we look from thispoint of view so in this period the political situation of Pakistan was such inwhich respect of rights was not taken care. The reaction against this is presentseverely in the poem of this

period with reference to this in this chapter thisthing has been analyzed that contemporaries of modern Urdu poem have performedtheir duty of fore bearers of human rights in this period which extend. Besidesthis side by side the specific political situation of Pakistan, the developmentof multinational culture has developed those feelings of coerce, helplessnessand unfulfilled wishes, the contemporaries with reference to the modern Urdupoem have also critically analyzed them. Moreover the affects of rival ,provincial and Preconceiption Urdu poem and their reaction has also beenanalyzed in this chapter according to the specific situation of the geographicalconditions of Pakistan.

اظہارِ تشکر

سب سے پہلے میں خدائے بزرگ وبرتر اور ذاتِ لم یزل کی شکرگزار ہوں جس نے مجھ بندہ خاکی کو تخلیق وتحقیق کے جوہر عطاء کیے اور میں اُردو زبان و ادب کے بحرِ بیکراں میں ایک ادنیٰ سی کاوش کے قابل ہوئی۔ ابتدا میں اس تحقیقی مقالے کا کام اتنا دشوار محسوس نہ ہوتا تھا لیکن کہا جاتا ہے کہ سمندر میں اترنے کے بعد ہی اس کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے اور ایسا ہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا بہر حال جن کے ارادے پختہ اور نظر خدا پر ہو وہ تلاطم خیز موجوں سے گھبرایا نہیں کرتے۔ اب جب کہ سفینہ کنارے آلگا ہے تو ضرورت اس امر کی ہے کہ ان احباب کا شکریہ ادا کیا جائے جن کی شفقت ومحبت اور مہربانیوں سے یہ تحقیقی سفر تکمیل کے آخری مراحل تک پہنچا ہے۔

اس تحقیقی سفر میں ڈاکٹر منور ہاشمی خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جن کی رہنمائی میں یہ مقالہ پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ انہوں نے تحقیق کے دوران ہر ہر قدم پر میری غلطیوں اور کوتاہیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ میری ہمت افزائی کی اور میرے حوصلے کو گرماتے رہے۔ ان کے احسانات کو لفظوں میں بیان کرنا مجھ نا چیز کے بس کی بات نہیں ۔

ڈاکٹر سعید احمد اور ڈاکٹر کامران کاظمی بھی خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ جنہوں نے تحقیق کے دوران آنے والی ہر مشکل میں میری رہنمائی کی اور میری ہمت بڑھاتے رہے۔ ڈاکٹر سعید احمد نے اپنے ذاتی کتب خانے سے کتب کی فراہمی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ مقتدرہ قومی زبان کے لائبریرین امتیاز صاحب اور بطور خاص ڈپٹی سیکرٹری جناب راشد حمید صاحب، اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے لائبریرین منور حسین کنٹونمنٹ، لائبریری راولپنڈی کے لائبریرین امجد صاحب، نیشنل لائبریری اسلام آباد کی لائبریرین رضوانہ صاحبہ اور سرفراز صاحب اور میونسپل لائبریری ، راولپنڈی کی لابریرین کی بے حد احسان مند اور شکر گزار ہوں جنہوں نے نادر اور قیمتی کتب فراہم کر کے میرے تحقیقی سفر کو سہل بنایا۔

دوستوں میں شعبہ اردو فوجی فاؤنڈیشن کالج فارگرلز راولپنڈی کی ممنونِ احسان ہوں جنہوں نے ہر مشکل گھڑی میں میری ڈھارس بندھائی اور مسزسلمیٰ قیصر (شعبہ انگریزی) اور قیصر بھائی جنہوں نے ہمیشہ

اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں دیگر سرگرمیوں کو موقوف کرکے تحقیق پر توجہ دوں ۔

اس کے علاوہ بطور خاص مسز شاہدہ جمیل (صدر شعبہ اُردو) فوجی فاؤنڈیشن کالج فار گرلز نیولالہ زار، راولپنڈی جو اس تحقیقی سفر میں میری ہم راہی تھیں ان کی معاونت اور رہنمائی نے مقالے کی تکمیل میں اہم کردار ادا کیا ۔ میں دل کی گہرائیوں سے ان کی شکر گزار ہوں ۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ، شعبہ عربی کے عریبک ٹائپسٹ محمداعظم کی بھی ممنون ہوں جنہوں نے پروفیشنل طریقے سے کمپوزنگ کا کام کیا۔

والدین کی دعائیں میرے لیے وہ سرمایہ گراں بہا ہیں جن کا جتنا شکر کروں کم ہے۔ والد صاحب خدا انہیں غریقِ رحمت فرمائے ہمیشہ میری کامیابی وکامرانی کے لیے دعا گو رہے اور والدہ صاحبہ ہر کڑی دھوپ میں میرے لیے چھپر چھاؤں بنی رہیں اور میری علمی سرگرمیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے میری ادبی کاوش کو سراہتی رہیں ۔

اس کے علاوہ اپنے شریک سفر(مرحوم) کی بھی احسان مند ہوں جن کے کہنے پر میں نے اس تحقیقی مقالے کا آغاز کیا۔ سسرصاحب اور ساس صاحبہ (مرحوم) کی محبت آمیز شخصیت بھی شکریے کی مستحق ہے۔ اپنے بھائیوں اور بہنوں کی بھی ممنون ہوں جنہوں نے اس تحقیقی کام کے دوران میری ہر طرح کی مدد کی اور میرے راستے کے کانٹوں کو چنتے رہے۔

امید ہے کہ میرے دوست احباب میری فروگزاشتوں سے صرف نظر فرمائیں گے۔

مقالہ نگار
نصرت جبین

cd

باب اوّل
انسان دوستی تصورات ونظریات

١۔ انسان دوستی کی تعریف اور پسِ منظر

٢۔ سیکولر ازم نظریہ اور انسان دوستی

٣ ۔ اشتراکیت اور انسان دوستی

٤ ۔ مذہبی نظریہ اور انسان دوستی

٥۔ حوالہ جات

Fe

انسان دوستی کی تعریف اور پس منظر

انسان دوستی

انسان دوستی کو انگریزی میں Humanismکہا جاتا ہے ۔ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جو انسانی تاریخ کے ہر دور میں کسی نہ کسی طور موجود رہا ہے ۔ لیکن باقاعدہ طور پر ادب و فن میں اس اصطلاح کو یورپی احیائے علوم کی تحریک کے آغاز کے ساتھ استعمال کیا گیا ۔ یہ نظریہ ایک تحریک کی صورت میں بھی اسی عہد میں ابھر کر سامنے آیا۔ تاہم بعد میں اس اصطلاح کو مذہبی اور سیاسی تعلیمات اور تحریکوں میں بھی استعمال کیا گیا ۔

شعرو ادب بنیادی طور پر انسان دوست افکار کے حامل ہوتے ہیں ۔ جن کا شعور شاعر و ادیب انسانی معاشرے کی اقدار ، روایات ، اخلاقیات ، نظریات اور اصول و مباحث سے حاصل کرتا ہے۔ گویا انسان دوستی تمدنی زندگی کا بنیادی جزو اور فطرت انسانی کا خاصہ ہے ۔ حساس فنکار انہی انسان دوست معاشرتی اقدار سے متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے فن میں انسان دوست رویوں کا اظہار شدت اور خلوص کے ساتھ ہوتا ہے۔ یوں وہ اپنی تخلیقات میں انسان دوست روایات پر مبنی ایک مثالی معاشرتی زندگی کا تقاضا کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔ اس نقطہء نظر سے دیکھیں تو "انسان دوستی " ایک وسیع المعانی اصطلاح ہے۔ جس سے فکری سطح پرادب کی تما م اصناف متاثر ہوتی ہیں ۔

یورپی احیائے علوم کی تحریک کے آغاز اور اس کے عہد میں " انسان دوستی " کے نظریے پر بحث سے قبل ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم "انسان دوستی " کی اصطلاح کو اس کے لغوی اور اصطلاحی معنوں میں سمجھ لیں ۔ تاکہ ہمیں اس تحریک اور نظریے سے متعلق بہتر آگاہی ہو سکے ۔

> ہیومینزم ، لاطینی زبان کے لفظ (Humanitas) سے ماخوذ ہے جس کا لفظی مطلب " انسان دوستی" انسانیت ہے ۔ یہ نظریہ عظمت انسانی اور اعلیٰ اقدار کا متقاضی ہے اور چونکہ یہ انسان اور انسانیت کی فلاح و بہبود اور اس کی بہتری کا دعویدار ہے اس لیے آج بھی زندہ و جاوید ہے ۔

انسان دوستی سے متعلق کوئی بھی بحث لفظ Humanism کو سمجھے بغیر نہ تو مکمل ہے اور نہ ہی اس کی کوئی اہمیت ہے :

Theworld BankEncyclopediaمیں Humanism کی وضاحت کچھ یوں کی گئی ہے :

> Humanisma way of looking at our world which emphasizes the importance of human beingstheir nature&their place in the universe. There have been many varietiesof humanism, both religious&nonreligous. But all humanists agree thatpeople are the center of their study. As the Latin writer terence said more than 2,000 years ago "I am a man& ,nothing human is foreign to me".

Humanismteaches that every person has dignity&worth&therefore should commandthe respect of every other person .

ترجمہ: انسان دوستی ہماری دنیا کو دیکھنے کا وہ انداز ہے جو انسانوں کی اہمیت پر ان کی ہیئت پر اور کائنات میں ان کے مقام پر زور دیتا ہے۔انسان دوستی کی بہت سی انواع ہیں مذہبی اور غیر مذہبی دونوں ۔ لیکن تمام انسان دوست اس بات سے متفق ہیں کہ لوگ ان کی تحقیق کا مرکزی ہیں ۔ جیسا کہ لاطینی مصنف ٹیرنس نے دو ہزار سال پہلے کہا" میں انسان ہوں اور کوئی انسان میرے لیے غیر/اجنبی نہیں "۔ انسان دوستی ہمیں سکھاتی ہے کہ ہر انسان کا ایک وقار اور عزت ہے اس لیے اس کو ہر دوسرے انسان کی عزت کرنی چاہیے۔

Dictionary of philosophy " لغات سماجی علوم و فلسفہ " میں ہیومنز م کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے ۔

ہیومن ازم کا اصل مقصد انسانی استحصال اور اس سے پیدا ہونے والے برے تمدنی اثرات کو ختم کرنا ہے۔ ہیومن ازم امن کا حامی اور جنگ کے خلاف ہے ۔ دنیا میں جنگ ، استحصال اور ملکیتی جبرو تشدد کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے ۔ انسانیت ایک مسلک ہے جو درج ذیل نکات پر مشتمل ہے ۔ امن ، محنت ، فرد کی آزادی ، مساوات ، اخوت اور خوشحالی سب کے لیے ۔

ہیو منز م دراصل امن کا حامی دکھائی دیتا ہے ایسا امن جس میں انسانیت پروان چڑھ رہی ہو اور اسے اندرونی اور بیرونی طور پر کسی فتنہ و فساد کا کوئی خطرہ نہ ہو ۔ لوگوں کے حقوق محفوظ ہوں ۔ معاشرے میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ کمزور اور زیر دست افراد توانا اور مضبوط ہوں ۔ ظالم اور مفسدوں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں ۔ قوم کے افراد میں ہم آہنگی بددرجہء اتم موجود ہو۔ اسی صورت میں انسانیت کی بقاء اور ترقی ممکن ہے ۔ جن معاشروں میں بدامنی کا راج ہوتا ہے وہ جلد انتشار کا شکار ہو کر صفحہء ہستی سے مٹ جاتے ہیں ۔

ہیومنز م انفرادی آزادی کا بھی قائل ہے اور اس کے تسلیم کیے جانے پر بھی زور دیتا ہے ۔ آزادی کی قدر افزائی در حقیقت انسان دوستوں کا اہم موضوع رہا ہے۔ ان کو ایسی آزادی سے دلچسپی ہے جس کو انسان فطرت اور معاشرے میں بروئے کار لا سکے۔ کیونکہ آزادی انسان کا بنیادی حق ہے جسے وہ اپنی دنیا تعمیر کرنے ، اسے بدلنے اور ترقی دینے کے لیے استعمال کر سکتا ہے ۔ ہیو منز م کا یہ فلسفہ پوری دنیا ئے انسانیت کو آزادی و مساوات کے حقوق عطا کرتے ہوئے انہیں اخوت و بھائی چارے کی ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں انسانوں کی اپنی طرف سے رنگ و نسل اور زبان و علاقائیت وغیرہ کی بنیاد پر تیار کی گئی دیواریں زمین بوس ہو جاتی ہیں اور انسان اور

انسان کے درمیان ان غیر فطری امتیازات کی بناء پر تفریق و انتشار اور فساد فی الارض کی تما م کوششوں پر پانی پھر جاتا ہے ۔

تشریحی لغت میں انسان دوستی کو " بشریت پسندی " یا "انسان پسندی" کا نام دیا گیا ہے اور اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے ۔

انسان اپنے اندر زبردست قوت اور قدر کا حامل ہے اور یہ انسان قوت اور قدر کی عزت ہے جو دیگر تمام انسانی اقدار اور حقوق کا منبع ہے۔ انسان کے اندر کی" قدر" کی بنیاد وہ امکانات ہیں جو ہر فرد کے اندر بے مثال حد تک موجود ہیں ۔ وہ تخلیق کر سکتا ہے یعنی تخلیقی قدروں کا حامل ہے ۔ پھر وہ زبان ، انسان ، تعلقات ، آرٹ ، فن ، سائنس (علم) اور اداروں کے ذریعے اپنا ماضی الضمیر بیان کر سکتاہے اور دوسرے انسانوں تک پہنچا سکتا ہے۔ اس کے اندر خفیہ قوتیں موجود ہیں جو تعلیم کے ذریعے بیدار کی جاسکتی ہیں ۔ یہ خفیہ قوتیں اگر روبہ کار آجائیں تو انسان اپنی زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے اور اس ضمن میں بڑی حد تک آزادی سے اپنی مرضی سے طرز زندگی کا انتخاب کر سکتا ہے ۔ وہ کسی بھی ایسے نظام فکر کو مسترد کر سکتا ہے جو انسان کو مایوسی میں مبتلا کر دے ۔ وہ ایسے نظام فکر کو بھی خاطر میں نہیں لاتا جو انسان کو انحطاط میں مبتلا کر دے یا بد اخلاقی پر اس کو مائل کر دے ۔

چودھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اٹلی میں " انسان دوستی " کو نئے سرے سے عروج حاصل ہوا اور اس تحریک کا نام "انسان پرستی " بھی اسی زمانے میں پڑا۔ انسان پرستی کے فلسفے کا اولین سراغ پانچویں صدی قبل مسیح میں یونانی مفکر پروتا غورس کے اس قول سے ملتا ہے ۔

انسان کائنات کی تمام اشیاء کا پیمانہ ہے اس بات کا پیمانہ کہ جو اشیاء ہیں وہ اس لیے ہیں کہ وہ ہیں اور جو اشیاء نہیں ہیں وہ اس لیے نہیں ہیں کہ وہ نہیں ہیں ۔

انسان پرستی کے فلسفے کے تحت انسان کو کائنات کا مرکز و محور سمجھا جاتا ہے یہ فلسفہ مکمل طور پر انسانی زندگی کا مطالعہ اور اس کی ترقی کی کوشش کرتا ہے اس تحریک نے ایک طرف تو مروجہ دقیانوسی توہمات سے اپنا دامن چھڑایا اور دوسری طرف علمی اور روحانی فیض حاصل کرنے کے لیے قدیم یونانی اور رومی ادبیات سے اپنا رشتہ قائم کیا ۔ انسان پرستی کا نصب العین یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت میں موجود چھپی صلاحیتوں کو سامنے لائے اور انسان کی موجودہ زندگی کو اعلیٰ بنانے کی کوشش کرے ۔ حیات ، بعد الموت ، مافوق الفطرت اور توحید کے مسائل سے انسان پرستی کا کوئی تعلق نہیں ۔

مولانا محمد بخش مسلم " آدمی کی انسانیت" میں "انسان پرستی " کو اس طرح بیان کرتے ہیں ۔

انسان پرستی ان تمناؤں ، سرگرمیوں اور کامرانیوں کا نام ہے جن کے ذریعے فطری انسان مافوق الفطرت بن جاتا ہے۔ انسان پرستی کا مثالی نمونہ فطری انسان ہے نہ مافوق الفطری بلکہ وہ فطری انسان ہے جو مافوق الفطری انسان بننے کے امکانات رکھتا ہے ۔

اقبال خان " انسان دوستی "کا مفہوم "انسا ن دوستی لبر م ازم جمہوریت"میں کچھ اس طرح واضح کرتے ہیں ۔

اس تحریک کا مقصد صرف یہ نہیں تھا کہ کلاسیکی علوم اور ادب کا مطالعہ کیا جائے بلکہ مقصد یہ تھا کہ ان میں زندگی اور انسان کے متعلق جو شعور اس کو ملتا ہے اس کو دوبارہ زندہ کیا جائے ۔ ان میں ایسی فکر اور سمجھ کارفرما تھی جو انسان کو مرکزی حیثیت دیتی ہے۔ اس کی قدر وقیمت کو اولیت دیتی ہے اور اسے تما م اشیاء کو جانچنے کا معیار ٹھہراتی ہے ۔ اسی طرح وہ انسانی فطرت ، اس کی حدود اور اس کے مفادات کا تجزیہ کرتی ہے ۔

انسان دوستی درحقیقت ایک عقیدہ ہے ۔ ایک ثقافتی تحریک ہے یا ایک تعلیمی پروگرام ہے جو صرف انسان سے مخصوص ہے۔ یہ انسان کو دائرہ انسانیت میں رکھتے ہوئے مثالی انسان بناتی ہے۔ انسان کی صلاحیتوں اور کامرانیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے عظیم بناتی ہے۔ انسان دوستی کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کو عظیم بنانے والی چیز خود اس کی ذات میں پوشیدہ ہے ۔وہ کسی اور ذات کی عطا کردہ نہیں ہے ۔

ڈاکڑ صلاح الدین درویش اپنی کتا ب "انسان دوستی نظریہ اور تحریک" میں " انسان دوستی " کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

انسان دوستی کے نظریے اور تحریک میں انسان کو کائنات کا مرکز سمجھا جاتا ہے ۔ انسان کا ماضی ، حال اور اس کے امکانات کی دنیا ، انسان ہی کی محنت اور جدوجہد کا ثمر ہے ۔ تاریخ انسانی میں صرف انسان ہی واحد مخلوق ہے کہ جس نے تہذیب ، ثقافت ، معاشرت ، معیشت اور سائنس و ٹیکنالوجی کے ارتقاء میں اپنی اہلیت اور قابلیت کے ان مٹ نقوش مرتب کیے ہیں ۔

انسان اشرف المخلوقات کی سند کے ساتھ دنیائے ہست و بود میں گرم سفر ہے ۔ آدم کی تخلیق سے لے کر آج تک پیدا ہونے والے انسان میں مذہب ، طرز معاشرت ، مزاج رویوں اور مذہب و تمدن کے اعتبار سے تو کافی فرق اور فاصلہ موجود ہے۔ لیکن مختلف ادوار میں ظہور پذیر ہونے والے ان تمام لوگوں کا انسان ہونا ایک ایسی قدرِ مشترک ہے جو انہیں تمام ذی روح مخلوقات میں بہتر اور برتر کے اعزاز سے نوازتی ہے ۔ انسان اپنے اندر کئی جہاں آباد رکھتا ہے ۔ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرنے ، سمندروں کو تسخیر کرنے اور آسمان تک بلند پرواز اڑنے کی اہلیت رکھتا ہے ۔ انسان کا شعور اسے نئے جہانوں کی تلاش میں سرگرداں رکھتا ہے ۔

منتخب ادبی اصطلاحات میں " انسان دوستی " کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے ۔

انسان دوستی کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے انسانوں کو زیادہ مہذب اور شائستہ ہونے کی ترغیب دی۔ انسانوں کو احساس دلایا کہ ان میں کتنی صلاحیتیں پنہاں ہیں اور وہ کس طرح اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتے ہیں ۔

ان تمام تعریفوں کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس کارخانہ ء قدرت میں انسان سب سے محترم ، موثر اور فعال عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کو عقل و ادراک اور ارادہ و اختیار کی دولت ملی ہے ۔ اس جہانِ رنگ و بو کے سارے ہنگامے اس کے وجود سے قائم و دائم ہیں ۔ تاثیر ، تخلیقی قوت اور صلاحیت اس کے اندر موجود ہے۔ وہ اپنی صلاحیت سے چاہے تو دریاؤں کو اپنے قابو میں کر لے ۔ سورج کی تمازت سے اپنے چولہے گرم کرے اور تپتے ہوئے صحرا کو چاہے تو گل و لالہ میں تبدیل کر دے ۔ چاہے تو سمندروں کو مسخر کرے اور چاہے تو عناصر کی ترتیب سے نئے نئے انکشافات کر دے اور چاہے تو ہواؤں ، فضاؤں اور سیاروں پر حکمرانی کرے ۔

انسان کائنات کی افضل ترین مخلوق ہے ۔ اسے کائنات کا مرکز و محور گردانا جاتا ہے ۔ تمام مذاہب عالم میں انسان کو بنیادی اور مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ دنیا میں جتنی بھی تہذیبیں پروان چڑھیں سب انسانی عظمت کی قائل دکھائی دیتی ہیں ۔ تمام مذاہب عالم ، مفکرین اور دانشوروں کے ہاں انسانی عظمت ، انسانی احترام ، مساوات ، اخوت اور انسانی محبت پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ گویا اس کائنات کی تمام رونق انسان ہی کے دم سے قائم ودائم ہے ۔ انسان کے بغیر یہ کائنات بے معنی و بے وقعت ہے۔ انسان اس کائنات کی ابتداء بھی ہے اور انتہا بھی ۔ انسان دوستی کی تحریک کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے نشاۃ ثانیہ یا تحریک احیائے العلوم پر ایک نگاہ ڈالی جائے۔ جس نے انسان دوستی کی تحریک کو بنیاد فراہم کی ۔

۱٤۵۳میں ترکوں نے جب قسطنطنیہ پر قبضہ کیا تو یونانی علماء جو قسطنطنیہ میں مقیم تھے اپنی کتابوں کے ذخیرے سمیت وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور اٹلی میں پناہ لی یہ لوگ اٹلی کے مختلف شہروں فلورنس (Florence) بولانا (Bologna) ، پا ڑ وا (Padua) وینس (venice) اور روم (Rome) وغیرہ میں مقیم ہوئے تو یہ مقامات علم و ادب کا مرکز بن گئے ۔ یہ علماء لوگوں کو یونانی اور لاطینی زبانوں کی تعلیم دے کر اپنا گزر بسر کرنے لگے ۔ یہی علماء یورپ میں جو جہالت کی نیند سویا پڑا تھا اس علمی بیداری کا باعث بنے جسے یورپی نشاۃ ثانیہ یا تحریک احیائے علوم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ مورخین کے نزدیک تاریخِ یورپ کا دورِ جدید بھی اسی تاریخ سے شروع ہوتا ہے ۔

یورپ پر نظر ڈالی جائے تو قرونِ وسطیٰ میں یہ عیسائی مذہب کا پیر و تھا ۔ پوپ تمام ممالک پر اپنی حاکمیت قائم کیے ہوئے تھا اور ہر جگہ اس کا حکم چلتا اور کوئی بھی اس کی مرضی و منشاء کے بغیر کچھ نہ کر سکتا تھا۔ چودھویں صدی تک اس مذہب کی حالت نا گفتہ بہ تھی ۔ راہبوں اور پادریوں میں بدکاری اور عیش پرستی عام تھی۔ دوسری طرف پوپ نے حاکمیت کے معافی نامے بیچنے شروع کر دیے تھے ۔ یونانی اور لاطینی زبان کے عالم اس گھٹن زدہ ماحول سے تنگ آچکے تھے۔ وہ مذہب کے تنگ دائرے سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لینا چاہتے تھے اور نئی آزادی کے لیے سرگرداں تھے ۔ یونانی اور لاطینی زبان کے شاہکاروں کے مطالعے نے ان میں وسعت نظری کو فروغ دیا اور ایک نیا نظریہ حیات عطا کیا ۔ مذہب کے حوالے سے لوگوں میں بدگمانی پیدا ہوئی اور وہ مذہب کو کلیسائی عہدیداروں کے ظلم وستم اور رعب و دبدبے کا نتیجہ سمجھنے لگے یا ان کے نزدیک مذہب فرسودہ مسائل کی پابندی کا نام تھا ۔ اس کے برعکس یونانی اور لاطینی نظریہ حیات تنگ نظری کا شکار نہ تھا ، بلکہ وہ باہمی ہمدردی اور رواداری کا درس دیتا تھا ۔

اٹلی نشاۃ ثانیہ کا مرکز بنا۔ اس ملک میں یہ اثرات پہلے ہی سے موجود تھے۔ اس ملک کے تین بڑے پیش رو دانتے (Dante)، ڈیوینا کمیڈیا (DivinaCommedia) اور پیٹرارک (Petrarch)ہیں ۔ پیٹرارک اٹلی کا سب سے پہلا انسان دوست شاعر اور ادیب تھا ۔ پیٹرارک کو سمجھنا نشاۃ الثانیہ کی روح کو سمجھنا ہے ۔ "پیٹرارک پہلا ماڈرن انسان ہے اسے احیاء العلوم کا ابوالآباء اور پہلا انسان دوست سمجھا جاتا ہے "۔

والدین نے پیٹرارک کو قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے علم کدہ بھیجا تو بجائے قانون کا مطالعہ کرنے کے اس نے مشاہیر قدما ورجل ، سیرو اور سنیکا وغیرہ کی کتب پڑھنے کو اہمیت دی ۔ قانونی رسائل میں اس نے جس چیز کو اہمیت دی وہ صرف بے شمار قدیم رومی حوالے تھے۔ ان تحریروں نے اس پر ایک نئی دنیا کے دروازے کھولے جو فلسفے اور ادبی فن کے دروازے تھے ۔ وہ انہی کی طرح سوچنے لگا اور انہی کی طرح لکھنے کی خواہش ہونے لگی ۔ پیٹرارک اپنے دوستوں اور آنے والی نسل کے نام طویل خط لکھنا پسند کرتا تھا ۔یہ چونکہ کلیسا کے جبرو استبداد ، رسوم پرستی، توہم پرستی اور روایت پرستی کے خلاف تھا۔ گرجوں اور خانقاہوں میں فسق و فجور کا دور دورہ تھا۔ اس لیے پیٹرارک نے کلیسا پر سخت تنقید کی اور اہلِ کلیسا کی گندم نما جو فروشی کا خوب تمسخر اڑایا۔

اس نے اپنے عہد کے لوگوں کی سوچ میں تبدیلی لانے کی بھر پور کوشش کی ۔

ڈاکٹر فا طمہ تنو یر"پٹیرارک"کے با رے میں ان خیا لا ت کا اظہا ر کر تی ہیں ۔

پیٹرارک (١٣٠٤-١٣٧٤) ایک ہنگامہ خیز دور میں پیدا ہوا جبکہ یورپ میں کافی جنگ وجدال اور تباہی و بربادی برپا تھی ۔ فرانس اور انگلینڈ میں سو سالہ جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اس ہنگامہ خیز دور میں اطالوی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ جوانی میں پیٹرارک نے اطالوی زبان میں عشقیہ نغمے لکھے تھے اور روم میں ١٣٤١ میں لنگ رابرٹ نے اس کو قومی شاعر کا اعزاز عطا کیا تھا۔ لیکن بعد میں وہ کلاسیکی ادب میں اس قدر محو ہو گیا کہ صرف لاطینی زبان میں لکھنے لکھانے لگا ۔ اس کے لاطینی زبان میں خطوط کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس طرح اس نے کلاسیکی ادب میں انہماک اور اس کی انسانی اور ادبی اور اس کی جذباتی خطیبانہ اور شخصی خوبیوں سے لوگوں میں دلچسپی پیدا کر دی یہی اندازِ فکر اور اندازِ نظر بعد میں ہیومنزم کے نام سے معروف ہوا" ۔

رفتہ رفتہ پیٹرارک کی تعلیمات کو فروغ حاصل ہوا۔ پیٹرارک سیسرو (Cicero) کا بہت بڑا مداح تھا۔ اس نے سیسرو کے بہت سے کام کو نہ صرف دریافت کیا بلکہ اس کا ترجمہ بھی کیا ۔ ١٣٤٥ میں ویرونا میں قیام کے دوران پیٹرارک کو وہاں کی ایک کلیسا ئی لائبریری میں سیسرو کے گمشدہ خطوط ملے۔ جو اس نے Brutus,AtticusاورQuintusکے نام لکھے تھے۔ سیسرو کے خطوط میں رومن زندگی کی بھرپور تصویر کشی کی گئی اور اس کے خطبے لاطینی نثر نگار کے شاہکار نمونے تھے۔ پیٹرارک اٹلی کی ریاست فلورنس کا رہائشی تھا۔ لیکن اس کی زندگی کا بیشتر حصہ فلورنس سے باہر گزرا ۔ فلورنس میں موجود علمی و ادبی حلقے نے اس کے کام کو آگے بڑھایا ۔ فلورنس میں انجیل مقدس کی تفسیر اس کے اصل متن کے مطابق کی اور یہیں سے انسان دوستوں نے اپنی تحریک کی بنیاد رکھی ۔

میڈیچی کی حکومت یا ان کے دور میں ہی انسان پرستوں نے اٹلی کے ذہن پر تسلط جما لیا۔ اسے مذہب سے فلسفہ کی جانب ، آسمان سے زمین کی طرف موڑا اور ایک حیرت زدہ نسل پر پاگان (Pagan) فکر و فن کے خزانے منکشف کیے۔آری اوستوAriostoکے وقت میں بھی علم کے دیوانے ان افرادنے umanisti یعنی"انسانیت دوستی"کا نام حاصل کیا۔کیونکہ وہ کلاسیک تہذیب کے مطالعہ کو Umanita یعنی انسانیات کہتے تھے۔اپنے جسم کی طاقت اور خوبصورتی ،اپنے احساسات وجذبات کی روشنی اور دکھ ،اپنی منطق کی لطیف شان و شوکت کے ساتھ اب انسان ہی نوع انسان کا موزوں مطالعہ تھا اور ان حوالوں سے ہی وہ قدیم یونان و روم کے ادب و فن میں بکثرت اور کامل طور پر ظاہر ہوتا ہے۔یہ انسان دوستی تھی ۔

آزازانہ تنقید، معروضی غور و فکر اور حصول علم کے آزادانہ ر ویے کا آغاز ہوا۔ تجرباتی علوم ،طبیعی علوم ایجادات وتحقیقات اور سائنسی ترقی کے لئے راہ ہموار ہوئی۔ نجوم جیسے روایتی علوم کی بجائے کیمیا اور فلکیات میں دلچسپی لی گئی۔ نقاشی، سنگتراشی اور فن تعمیر بھی نئے افکار و نظریات اور نئی علمی فضاوں سے متاثر ہوئے۔اس عہد کے مشہور فنکار کلیسا کی ترجمانی کرنے کے بجائے زندگی کی ترجمانی کرنے لگے۔آزادیء فکر کی فضا نے انفرادیت پسندی کے رجحان کو تقویت دی۔سائنسی طرز فکر نمودار ہوا۔فلسفہ کلیسا کے اثرات سے آزاد ہوا۔ اخلاق کے بجائے موت اہم ہوگئی۔مذہبی عقیدت مندی کی جگہ تہذیب نے اور مذہبی پابندی کی جگہ کلچر نے لے لی۔ کلچر ہی کا لفظ عام ہوا۔ ادبیات یعنی Humanities سے واقفیت کلچر کا معیار ہوئی اور نئے انسان کو Humanist کہا گیا۔

یہ انسان دوست ہی تھے جنہوں نے قرون وسطی middleageاور احیاء العلوم Renaissance کی اصطلاحات متعارف کرائیں ۔انہوں نے قدیم کےلئے کلاسیکل کا لفظ استعمال کیا۔اور اسی کلاسیکل کی تجدید کےلئے احیاالعلوم کا لفظ استعمال کیا۔قدیم اشیا چونکہ ماضی کا حصہ تھیں اس لئے قدیم سکوں کو تاریخ کی گراں قیمت دستاویزات کے طور پر جمع کیا گیا ۔عوامی کتب خانوں کے قیام پر زور دیا گیا۔ ان انسان دوستوں نے اپنے سفر کے دوران کتب ڈھونڈ ڈھونڈ کر خریدیں ۔ ناقابل خرید مسودوں کی نقول اپنے ہاتھ سے تیار کیں اور نقول تیار کرنے والوں کو تنخواہ پر اپنے ساتھ گھر میں رکھا۔قدیم ادب پاروں کے تراجم بھی کئے گئے ۔انسان دوستوں کی یہ کاوش انسان دوستی کے فروغ میں ممدو معاون ثابت ہوئی۔اس کے ساتھ ساتھ چھاپے خانے کی ایجاد کے باعث کلاسیکل اور جدید تحریروں کی اشاعت ہوئی۔

انسان دوستی کی تحریک اب اٹلی سے نکل کر سارے یورپ میں پھیل چکی تھی۔ فرانس میں اسکی سب سے زیادہ صحت مند صورت کی مثال ملتی ہے۔ مونتین ایسا ادیب تھا جس کی تربیت یونانی ادب اور فلسفے کے مطابق ہوئی تھی۔ اس نے یونانیوں سے انسانی فطرت کی طرف ایک نیا رجحان سیکھا ۔اس کے نزدیک نیکی بھی ایک تفریح ہے بلکہ سب سے اعلیٰ تفریح ہے۔اس کے بعد انسان دوستی کی انتہائی فکر اہل جرمنی کے مارٹن لوتھر کی صورت میں سامنے آئی۔یہ پروٹسٹنٹ فرقے کا بانی تھا۔اس نے پوپ کو خدا کا نمائندہ ماننے سے انکار کیا اور پوپ کے معافی ناموں کو شاہراہ عام پر جلوا دیا ۔اب انسان دوستی کی اگلی منزل انگلستان قرار پائی اور وہاں جا کر اپنے قدم جمانے کی بھر پور کوشش کی۔ معلمین اور فلسفیوں کا ایک گروہ وجود میں آیا۔ جنہوں نے انگلستان میں انسان دوستی کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس میں اہم نام ٹامس مور کا ہے۔ اس نے لاطینی زبان میں اپنی مشہور کتاب یوٹو پیا UTOPIAلکھی۔ اس کتاب میں خیالات میں نئی تبدیلی بہت عمدگی سے کی گئی ہے۔یہ کتاب افلاطون کے فلسفے پر مبنی ہے اور اس کی تبلیغ کرتی ہے۔

ٹامس مور کی کتاب یوٹوپیا "انسان دوستی "Humanismکے سلسلے میں دائمی اہمیت رکھتی ہے۔اور اسکی ہستی انگریزی ہیومنیٹیز میں مثالی ہے۔چونکہ اس عہد میں یونانی اور لاطینی زبانوں کو کلاسیک کا درجہ حاصل تھا۔ لہذا بہت سے ادیبوں اور شعرانے اسکے سیکھنے پر توجہ دی۔جو ن کو لتJohncolet نے لاطینی اور یونانی پڑھانے کےلئے سینٹ پالز سکول PAULS SCHOOL ST. بنایا ۔اس کے اثرسے ایراسمس ERASMUS جو ولندیزی تھا نے نئے علم کی تحریک چلائی اور اسی اثر کے باعث ٹامس مور نے یوٹوپیا utopia لکھی۔آخرکار کلاسیکی ادب کا مطالعہ لوگوں کی زندگی میں ایک واضح تبدیلی لے کر آیا ۔سوچ کے زاویوں نے ایک نیا رخ اختیار کیا ۔پاپائی نظام کی مذہبی اجارہ داری نے دم توڑ دیا۔صدیوں سے قائم جابرانہ نظام کا خاتمہ ہوا۔لوگوں میں تنقیدی شعور کا آغاز ہوا اور آزادیء فکر کو ایک درست سمت ملی جسکا ایک طویل مدت سے انتظار تھا۔

جب عیسائیت کو روم کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا تو رومی حکومت کو مقدس سمجھا جانے لگا۔مغرب میں رومی پوپ اور مشرق میں قسطنطنیہ کا پوپ بہت اہم تھے۔پوپ لاطینی زبا ن کا لفظ ہے جس کے معنی باپ کے ہیں ۔ پوپ کو۴۲۵ء تک پاپا کہا جاتا تھا۔اس عہدمیں مذہبی راہنماکو پوپ کہتے تھے۔مشرقی کلیسا کے مقابلہ میں مغربی کلیسا یعنی روم والوں نے دعویٰ کیا کہ" ہماری کلیسا تمام کلیساوں کی ماں اور ان کی ملکہ ہے"۔

> پاپائی نظام کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے والا پہلا شخص گریگوری اول تھا۔ "پاپائی نظام کو گریگوری اوّل (۵۴۰۔۶۰۹) نے تقویت پہنچائی"۔ اس عہد میں بہت سی وحشی اقوام عیسائیت میں داخل ہوئیں ۔ جس کے باعث پوپ کی طاقت و قوت میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ اسی کو دینی اور دنیاوی طاقت کا سرچشمہ قرار دیا گیا۔اس طرح پوپ کے اختیارات وسیع تر ہوتے چلے گئے اور وہ لامحدود اختیارات کا واحد مالک بن بیٹھا۔

پاپائی نظام کی بدولت پوپ قوت اختیار کر گیا جس کا مطلب تھا کہ تمام دینی اور دنیاوی اختیار کا مالک پوپ ہے۔ اس کا ہر لفظ قانون ہے۔اسکی حکم عدولی نہیں کی جا سکتی ۔حکم عدولی کے مرتکب افراد کو سزائیں بھگتنا ہوں گی۔عوام کو حقوق نام کی کوئی چیز حاصل نہ تھی ۔مختلف جنگوں میں انہیں زبردستی جھونک دیا جاتا۔ اسکی مثال ایسی بتائی گئی ہے کہ وہ بھیڑیں ہیں جہنیں کھانے کو کچھ نہیں ملتا لیکن ان کی اون کاٹی جائے گی۔

> پوپ کی لامحدود طاقت کا دور جسکی ابتدا ۸۰۰ء سے ہوئی اور سترہویں صدی تک یورپ کے تمام بادشاہوں کے تخت و تاج عملاً پوپ کے ہاتھ میں تھے۔پوپ اپنی مرضی و منشا کے مطابق جیسے چاہتا اقتدار کی کرسی پر بیٹھاتا اور جسے

چاہتا تخت و تاج سے محروم کر دیتا۔ گویا بادشاہت کا پورا اختیار پوپ کے ہاتھوں میں تھا۔تیرھویں اور چودھویں صدی میں پورے یورپ میں صرف پوپ ہی کا ڈنکا بج رہاتھا۔یورپ کے تمام حکمران پوپ کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔صرف پوپ کا قانون ہی سب کچھ تھا۔

پوپ کی مداخلت سے ایک طرف انگلستان کراہ رہا تھا تو دوسری طرف فرانس اپنے بادشاہوں پر کلیسا کا کنٹرول دیکھ کر کڑھ رہا تھا۔اس کے ساتھ ہی شمالی یورپ کا یہ خیال تھا کہ اسکی تہذیب دینی قدروں کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔اس لئے کلیسا سے مفر نہیں ۔ دوسری طرف معاشرہ رجال کلیسا سے ناراض ،اس کے سلوک سے ناراض اور اسکی تعلیمات سے گریزاں تھا۔

پوپ کے ایک ہاتھ میں یورپ کے بادشاہوں کے تاج تھے تو دوسرے ہاتھ میں عوام کے دل و دماغ کی باگ ڈور۔ تمام لوگوں پر علم کے دروازے بند تھے اور دینی معاملات میں عقل سے کام لینے والے کو گرفتا رکر لیا جاتا اور عبرت ناک سزائیں دی جاتیں ۔عوام میں سے کسی کے سر میں سر کشی کا سودا سماتا تو اسے الحادوبے دینی کی سزا کے لئے عدالت تفتیش (Inquisition) قائم کی گئی۔ جسکی شاخیں پورے یورپ میں تھیں ۔

ایک اندازے کے مطابق ۱٤۸۱ سے ۱۸۰۸ تک ان احتسابی عدالتوں نے تقریباً تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو مختلف سزائیں دیں ۔ان میں صرف۳۲ ہزار وہ تھے جن کو دہکتی ہوئی آگ کی نذر کیا گیا۔جن لوگوں کو سزائیں دی گئیں ۔ان میں کئی عالم ،فاضل ،موجد اور سائنس دان بھی شامل تھے ۔اس دور میں کسی قسم کی کتاب شائع کرنے کی ممانعت تھی۔مشہور سائنس دان گلیلیو جس نے دوربین ایجاد کی تھی اور اٹلی کے مشہور سائنس دان برونو کو بھی اشاعتِ علم کے جرم میں زندہ جلوا دیا گیا تھا۔

پندرھویں صدی کے پوپ کے بارے میں یہ رائے عام تھی کہ اسکا کوئی فیصلہ غلط نہیں ہوتا ۔اس لئے اس کے حکم کے آگے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔سولہویں صدی میں پوپ نے گناہ گاروں میں معافی نامے فروخت کرنا شروع کر دیئے ۔گویا گناہ گاروں کو معاف کرنے کا اختیار اسکے پاس تھا۔معافی ناموں کو فروخت کرنے کےلئے گلی گلی میں ایجنٹ مقرر تھے۔جو مختلف قسم کی صدائیں لگا کر ان کو فروخت کرتے۔

آؤ بڑھو،جنت کے دروازے کھل رہے ہیں اگر تم اب داخل نہ ہو گے تو کب داخل ہوگے۔ تم بارہ پنس کے عوض اپنے باپ کی روح کو جہنم سے نکلوا سکتے ہو۔کیا تم ایسے ناخلف ہو کہ اپنے باپ کےلئے اس قدر سستی نجات بھی نہیں خرید سکتے۔اگر تمہارے پاس اور کچھ نہیں ایک کوٹ ہے تو وہی اتار دو تاکہ اس متاع گراں بہا کو خرید سکو ۔

پوپ نے مظالم کی انتہا کر دی ۔ظلم کا یہ سلسلہ تقریباً اٹھارہویں صدی تک جاری رہا ۔

پوپ صاحبان نے اپنی تمام تر بدکرداری ،دنیا پرستی، بداخلاقی ،دینی و دنیوی اور روحانی پرا گندگی کے علم الرغم اپنے نقادوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ کر رکھ دئیے اور اس سلسلہ ء جبر وتعدی ،ستم اور جور کو ایک دو سال ،پانچ پچاس سال نہیں بلکہ صدیوں تک پھیلایا۔اپنی متزلزل پاپائیت کو سنبھالنے اپنی بد اعمالی کو جائز قرار دینے ،اپنی جہالت کو تقدس میں چھپانے اور اپنے اخلاقی انحطاط کو اپنی عظمت میں سنوارنے کی کوششوں میں انہوں نے بربریت کو مات کردیا۔

انسان دوستی کا مذہبی پس منظر جاننے کے بعد ضروری ہے کہ اس تحریک کے سیاسی پس منظر پر بھی ایک نگاہ ڈالی جائے۔

انگلستان میں پارلیمان تیرھویں صدی میں وجود میں آئی ۔پارلیمان کے وجود میں آتے ہی بادشاہت اور اس کے درمیان اختیارات کی کشمکش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔انگلستان میں سٹوارٹ خاندان ١٧١٤ تک حکمران رہا ۔اس خاندان کا آغاز جمیز اول (١٦٠٣۔١٦٢٥)سے ہوا۔ انگلستان کے بادشاہ عموماً مطلق العنانی کی طرف راغب تھے۔یہی وجہ تھی کہ جمیز اول میں بھی مطلق العنان بننے کی خواہش موجود تھی ۔لیکن پارلیمنٹ اسے ایسا نہیں کرنے دیتی تھی ۔جس کے باعث بادشاہ اور پارلیمنٹ میں تنازعہ شروع ہوا۔ایک شدید کشمکش کی صورت پیدا ہوگئی۔ جسکی بازگشت اگلی صدی تک سنائی دی۔جمیز اول کہا کرتا تھا " بادشاہت کا حق اسے خدا نے دیا ہے جسے کوئی واپس نہیں لے سکتا ۔یہی وجہ ہے کہ وہ عوامی حقوق آزادی رائے اور اختیارات کی شخصی مرکز یت جیسے معاملات پر پارلیمنٹ کے ساتھ ہمیشہ الجھتا رہا ۔

جمیز اول اپنی رعایا کو " بادشاہ کے آسمانی ہونے " کا درس نئے سرے سے دینا چاہتا تھا۔ لیکن پارلیمنٹ اس شاہی تصور کو دوبارہ زندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔اس سیاسی کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ جمیز اول نے پارلیمنٹ کو توڑ دیا ۔بادشاہ کے اس قسم کے خیالات کے باعث لوگوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات نے جنم لیا ۔جمیز اول کے بعد چارلس اول (١٦٢٥۔١٦٤٩) آیا ۔اپنے باپ جمیز اول کی وفات کے بعد ٢٧ مارچ ١٦٢٥ کو تخت نشین ہوا۔ اپنے باپ کی طرح چارلس اول بھی پارلیمنٹ کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتاتھا۔یہ بھی اپنی رعایا سے بادشاہ کو سایہ خداوندی تسلیم کرانے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے اپنی مرضی کے مطابق ٹیکس لگانے شروع کئے ۔یہ ایک اذیت ناک مطلق العنانی کا دور تھا۔ بادشاہ کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کو سزاوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ہر طرف خوف اور دہشت کے سائے منڈلاتے دکھائی دیتے تھے۔دوسری طرف پارلیمنٹ کے ممبران برسوں سے عوامی حقوق کےلئے بڑی استقامت سے جدوجہد کر رہے تھے ۔یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ١٦٢٨ میں چارلس اول کے

سامنے ایک درخواست پیش کی۔ جیسے حقوق انسانی کا پروانہ قرار دیا گیا۔جس کے الفاظ یہ تھے کہ

بادشاہ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر کوئی ٹیکس نہ لگائے ۔سپاہیوں کو نجی مکانوں پر پہرداری کےلئے مقرر نہ کیا جائے ۔زمانہ امن میں فوجی قانون نافذ کرنے کی غرض سے آرمی افسروں کی تعیناتی روکی جائے اور کسی شخص کو اس وقت تک گرفتار نہ کیا جائے جب تک اس کے خلاف واضح الزامات نہ ہوں ۔

حالات میں بہتری کے بجائے آہستہ آہستہ بگاڑ آتا چلا گیا ۔چارلس اول کو اختیارات کی تقسیم قبول نہ تھی اور دوسری طرف پارلیمنٹ مطلق العنان کو قبول نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چارلس اول اور رعایا میں دوری بڑھتی چلی گئی۔اور آخر کار رعایا نے ایک فوج منظم کرکے بادشاہ کے خلاف جنگ شروع کردی ۔پارلیمنٹری پارٹی کی فوج کے جنرل کر امویل نے شاہی فوجوں کو شکست دی۔۳۰ جنوری ۱٦٤۹ کو چارلس اول کو گرفتار کر لیا گیا اور مقدمہ چلا کر عدالتی حکم کے ذریعے ۳۰ جنوری ۱٦٤۹ کو وائٹ ہال کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔اس کی موت پر تبصرہ کرتے ہوئے خالد آرمان کہتے ہیں ۔ "اسکی موت نے ایک بار تو انگلستان کا پورا حکومتی نظام ہی بدل دیا۔یہ وہ لمحے تھے جب بادشاہ کا لقب اور دارالامراء کا وجود ختم کردیا گیا"۔

اب انگلستان کی تاریخ کے عہد آفریں اور ناقابل فراموش دن تھے ۔کیونکہ چارلس اول کے قتل ہو جانے پر پارلیمانی جمہوریت کا آغاز ہوا۔ اس جمہوریت کا آمر اولیور کرامویل تھا ۔بادشاہ اور کلیسا کے ستائے ہوئے لوگوں کو اولیورکرامویل کی شکل میں ایک انقلابی میسر آیا ۔یہ ایک ذہن اور متاثرکن فوجی رہنما تھا ۔جلد ہی اس نے ہمسایہ ممالک پر چڑھائی کر دی ۔آئر لینڈ اور سکاٹ لینڈ میں اقتدار حاصل کرلیا ۔اولیورکرامویل پروٹسٹنٹ فرقہ کا حامی سپہ سالار تھا۔جس نے مطلق العنان بادشاہت کے خلاف جنگ میں فوجوں کو فتح سے ہمکنار کیا۔ لیکن اسکی طاقت اور حیثیت دونوں اپنے حامیوں کے سماجی تناعازت کو حل کرنے کی سکت نہیں رکھتی تھی اور نہ انہیں ایک نئے آئین کے لئے باہم متفق کر سکی۔کیونکہ یہ اختلافات بری طرح سے مذہبی اختلافات کے ساتھ جڑے ہوئے تھے ۔اس مرحلے پر آ کر سیاست اور مذہب ایک ہی چورا ہے پر آن کھڑے ہوئے ۔پروٹسٹنوں نے کیتھولک فرقے کے لوگوں کا جینا دو بھر کر دیا۔

کرامویل نے کیتھولکوں کو شدید سزائیں دیں ۔۱٦۵۳ سے ۱٦۵۸ تک " لارڈپروٹیکٹر " کے خطاب کے ساتھ وہ انگلستان سکاٹ لینڈ اور آئرلینڈپر حکومت کرتا رہا ۔آخر کار ملیریا میں مبتلا ہو کر ۱۳ دسمبر ۱۹۵۸ کو لندن میں انتقال کر گیا۔

مائیکل ہارٹ کرامویل کے با رے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

اکثریت کا خیال یہ تھا کہ کراموپل واقعتاً جمہوری روایات سے مخلص تھا۔ تاہم حالات اس کے قابو سے باہر ہوگئے اور اسے آمرانہ اختیارات کو استعمال کرنا پڑا ۔سیاست میں کراموپل نے کبھی فریب نہیں کیا، نہ تخت نشینی قبول کی، نہ ہی مستقل آمریت کے قیام کی سعی ۔اسکا دور حکومت مجموعی طور پر معتدل اور بردباد حکمت عملی پر مبنی تھا ۔

یہ قدرتی چیز ہے کہ انسانی ذہن نا پسندیدہ افکار کو ہضم نہیں کر پاتا ۔جب ظلم ،تعدی ،فسادات اور بدکاریوں نے اپنی انتہا کو چھو لیا تو اس قسم کے مظالم اور عیش پسندی نے عوام کے دلوں میں نفرت کے بیج بونے شروع کردیے۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بارھویں صدی میں مصلحین کلیسا اور مسیحی مذہب کی اصلاح کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان مصلحین میں پیڑوالڈو، جان وائی کلف ، مارٹن لوتھر ، رچ رونگلی اور جان کالون وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔

ان مصلحین نے فکر کے دھاروں کو ایک نئی سمت عطا کی۔ سوچ کے زاویے میں واضح تبدیلی آئی اور لوگوں میں اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا ۔ جس سے کلیسا پر بے لاگ تنقید کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا ۔ پیٹر والڈ و فرانس کا ایک امیر آدمی جسے اصلاح مذہب کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل تھا ۔ ا س نے بارھویں صدی کے اواخر میں کلیسا کے خلاف اعلان برات میں پہل کی ۔ اس نے اپنی تعلیمات میں پوپ کے اقتدار سے انکار کیا ۔ اس نے اپنی تمام زندگی مسیحی تعلیمات پر عمل کرتے اور عیسائیت کی تبلیغ و تشہیر کے لیے وقف کر دی۔ اس سب کے باوجود پیٹروالڈ و کلیسا کے اقتدار کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے میں کامیاب نہ ہو سکا اور آخر کار جلا وطنی کی زندگی بسر کی ۔

اس اصلاحی تحریک کی ایک اور اہم شخصیت جان و کلف کی تھی ۔ جس نے پوپ کے اقتدار کے خلاف اعلان جنگ کیا ۔

اس نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں پوپ پر سخت تنقید کی گئی۔ اس نے پوپ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بارہا اس بات کو دہرایا کہ پوپ کا دعویٰ سراسر غلط ہے کہ خدا نے اپنے اختیارات اسے سونپ دیے ہیں ۔ وہ کہتا تھا کہ خدا نے پوپ کو اختیارات ہر گز تفویض نہیں کیے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان پوپ کی بجائے خدا سے اطاعت کا اظہار کرے ۔

جان و کلف کو پوپ کے خلاف آواز بغاوت بلند کرنے کے نتیجے میں پوپ کے غیض و غضب کا شکار ہونا پڑا۔ پوپ کی نفرت اس حد تک بڑھ گئی کہ جان و کلف کے مرنے کے تیرہ سال بعد اس کی لاش کو قبر سے نکال کر جلا دیا گیا ۔ وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے چلتا رہا اور کلیسا کا جبر و استبداد بدستور جاری رہا۔ اس نے اپنے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو دبانے کی کوشش کی۔ لیکن جب ظلم و ستم حد سے بڑھ جاتا ہے ،

سچ عیاری کی زد میں آجاتا ہے ، جب اخلاق وکردار پامال ہو کر رہ جاتا ہے تو حق بات کہنے والا اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر نکل آتا ہے ۔ پھر زمانے کا کوئی ظلم ، وقت کی کوئی زیادتی اور راستے کی کوئی رکاوٹ اسے اپنے مقصد سے ہٹا نہیں سکتی۔ وہ بڑھتا جاتا ہے۔ اس وقت تک جب تک تڑپتی ہوئی انسانیت کو سکون نہیں مل جاتا اور ظلم و ستم کی بنیاد بکھر نہیں جاتی ۔ مارٹن لوتھر ایسا ہی انسان تھا جس نے کلیسا کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور پا پا ئیت کے تارو پور بکھیر کر رکھ دیے۔ جب پچیس سال کی عمر میں وٹن برگ یونیورسٹی میں معلم کے عہدے پر فائز ہوا تو یہی وہ زمانہ تھا جب اس کے ذہن میں پا پا ئیت کے خیالات ابھرنے شروع ہو گئے تھے ۔

مارٹن لوتھر کی تحریک کا بنیادی پتھر رسولؐ کا یہ فرمان تھا کہ خدا اور بندے کے درمیان پاپائیت یا اور کوئی واسطہ نہیں ہے۔ لوتھر کا کہنا یہ تھا کہ پاپائیت کا نظام انسان کی اجتماعی اور انفرادی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس لیے اسے بالکل ختم ہوجانا چاہیے ۔

مارٹن لوتھر نے پوپ کے ہر ظلم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ۔ جب پوپ نے "دستاویز مغفرت " جاری کی تو یہ دستاویزات ہر شہر اور بستی میں پادریوں کے ذریعے فروخت ہونے لگیں ۔ (Jon tet zel) نامی پادری جو ان دستاویزات کی ایجنسی کا مالک تھا۔ لوتھر نے اس سے بحث کی اور کہا کہ دستاویزات مغفرت کا اجراء اور اس کی اشاعت انجیل کے خلاف ہے ۔ اس کے بعد لوتھر نے پچانوے نظریات کو مرتب کیا اور انہیں لکھ کر ۲۱ اکتوبر۱۵۱۷کو گرجا گھر کے دروازے پر آویزاں کر دیا۔ گویا یہ لوتھر کا پاپائیت کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ تھا ۔ " مارٹن لوتھر کا اصرار تھا کہ ہر فرد اپنا پادری خود ہے۔ پادری اور پاپائی حاکمیت کے بغیر صحیفوں پر مبنی ایمان ہی کافی ہے ۔ گناہوں سے بخشش کے لیے پادریوں کے پروانہ نجات کی ضرورت نہیں ۔"

مارٹن لوتھر کی آویزاں کی ہوئی دستاویزات نے جرمنی کے لوگوں میں ایک انقلابی روح پھونک دی۔ وہ پوپ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ۔ ابتداء میں پوپ نے اس تحریک کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ لیکن جب انقلابی سیلاب حد سے تجاوز کر گیا تو ۱۵۲۰ میں پوپ نے لوتھر کے نظریات پر سخت تنقید کی اور انہیں غلط قرار دیا۔ لوتھر نے اس پیغام کو نذر آتش کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے مذہب سے خارج کر دیا گیا۔ اگرچہ لوتھر کے خیالات جرمن کے لوگوں میں خاصے پھیل چکے تھے اور دیگر متعدد افراد کے ساتھ وہ چند موثر جرمن شہزادوں کی حمایت بھی حاصل کر چکا تھا ۔ اب وہ تنہا نہیں تھا بلکہ اس کے ہزاروں جانثار اس کے ساتھ تھے ۔ اسے ایک مستحکم قلعے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں وہ ایک سال تک پاپائیت کے ظلم سے محفوظ رہا ۔

مصلحین کی یہ اصلاحی تحریک در حقیقت پاپائیت کے خلاف ایک احتجاج تھی۔ جو لوگ اس تحر یک میں شامل ہوئے انہیں

پروٹسٹنٹ(protestant) کہا گیا ۔ مارٹن لوتھر جب تک زندہ رہا کلیسا کے خلاف اس کا احتجاج جاری رہا ۔ لوتھر کی وفات کے بعدبھی یہ انقلابی تحریک جاری وساری رہی اور پاپائی نظام کے خلاف غم و غصے کی لہر کم نہ ہوئی۔جان کیلون نے لوتھر کے نظریات اور تعلیمات کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا ۔کالون کی عمر اس وقت آٹھ برس تھی جب لوتھرنے وٹن برگ میں گرجا کے دروازے پر پچانوے دستاویزات لکھ کر چسپاں کیے تھے اورپروٹسٹنٹ اصلاح کا آغازکیا تھا۔کیلون کی تربیت اگرچہ کیتھولک کی حیثیت سے ہوئی مگر جوانی میں وہ پروٹسٹنٹ بن گیا۔١٥٣٦میں ٢٧ برس کی عمر میں اس کی معروف کتاب " عیسائی مذہب کے ادارے —" شائع ہوئی۔ جس میں لوتھر کے نظریات کی حمایت کی گئی۔" کیلون نے لوتھر کے اس عقیدے کی حمایت کی کہ نجات کےلئے صرف ایمان کافی ہے اور زمانہ ما بعد میں یہ عقیدہ پروٹسٹنٹ الٰہیات کا نمایاں جزو قرار پایا۔"

کالون کی زیر قیادت جینوا یورپ میں پروٹسٹنٹ فرقہ کا مرکز بن گیا۔وہ مسلسل دوسرے ملکوں میں بھی خاص طور پر فرانس میں اس کے فروغ کے لئے کوشاں رہا۔لوتھر کے بعد معروف ہونے والے پروٹسٹنٹ رہنماؤں میں کالون کانام ہے۔اس کے افکار نے اپنے مقلدین کی زندگیوں پر گہرے نقوش ثبت کیے۔زونلی گل کیلون کا ہمصر تھا۔اس نے بھی اصلاح مذہب کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا ۔یہ اپنے پیشر و لوتھر سے بھی زیادہ متشدد تھا۔ اس نے کلیساکے نظام کو جمہوری بنیادوں پر استوار کیا اور اصلاح یافتہ کلیسا ReformedChurch کے وجود کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔کچھ مدت گزرنے کے بعد اصلاحی تحریک کے ردعمل کے طور پر ایک تحریک منظر عام پر آئی ۔جس کا مقصد دونوں کلیساوں کے لیے ایسی راہ تلاش کرنا تھا۔ جو دونوں میں اعتدال پیدا کردے۔ لیکن کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی اور ہر کوئی دوسرے پرعرصہ حیات تنگ کرنے اور شدید جسمانی اور روحانی ایذائیں دینے میں مصروف رہا۔اس طرح یورپ آہستہ آہستہ پاپائیت کے شکنجے میں پھنس گیا اور مایوس لوگوں نے مذہب میں پناہ تلاش کی۔

فرانس میں ایسے عظیم انسان اور روشن خیال فلاسفر اور مفکر پیداہوئے جنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے عوام کے اندر احساس بیداری کو جنم دیا اور انہیں زندگی کی راہیں دکھائیں ۔اس جدوجہد میں مانٹسکو (١٦٨٥۔١٧٥٥) والٹیئر (١٦٩٤۔١٧٧٨) اور روسو (١٧١٢۔١٧٧٨) جیسے لوگ شامل تھے۔

والٹیئر فرانسیسی خرد افروزی کی تحریک کی ایک ممتاز شخصیت تھا۔ وہ آزادی فکر کا ایک بڑا مصلح تھا۔قیام انگلستان کے دوران وہ جس چیز سے متاثر ہوا وہ انگریزی جمہوریت اور شخصی آزادیاں ان سیاسی حالات کا یکسر تضاد تھیں جن سے والٹئیر فرانس میں شناسا تھا۔کوئی انگریز جاگیردارکسی کے خلاف سر کشی کا الزام لگا کر ایسے قید نہیں کر سکتا تھا۔والٹیئرنے اپنی ایک فلسفیانہ کتابPhilosophiquesLetters تحریرکی۔

جیسے عام طور پر "انگریزی زبان کے متعلق خطوط " کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس کتاب نے فرانسیسی وڈیروں کو برانگیختہ کیا۔وہ مذہبی رواداری کا زبردست حامی تھا۔ فرانس میں پروٹسٹنٹ پیرو کاروں کے قتل عام کے متعدد ہولناک واقعات دیکھ کر اس نے خود کو مذہبی تعصب پسندی کے خلاف جہاد کےلئے وقف کر دیا۔والٹیئر سے اایک جملہ منسوب کیا جاتا ہے۔"میں تمہاری رائے سے متفق نہیں ہوں لیکن میں تمہاری آزادی رائے حق کے لئے آخری سانس تک جنگ کروں گا "۔

والٹیئر جیسے عظیم مفکر اور محقق نے اپنی نظموں ،مضامین ،ناولوں اور ڈراموں کے ذریعے پاپائیت کے خلاف جنگ لڑی اور برائیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ۔وہ کلیسا کے استدلال کے خلاف اس انہماک سے مصروف پیکار تھا کہ اپنے عمر کے آخری حصہ میں اسکی توجہ سیاسی ابتری اور استدلال کی طرف سے بالکل ہٹ گئی۔

مائیکل ہارٹ لکھتے ہیں کہ

یہ والٹیئر کی تحریر یں ہی تھیں جنکی بدولت جمہوریت مذہبی رواداری اور ذہنی آزادی کے تصورات فرانس بھر میں عام ہوئے اور اس حوالے سے تمام یورپ میں بھی اگرچہ فرانسیسی خرد افروزی کی تحریک میں دیگر احباب کے نام بھی اہم ہیں جیسے ڈیڈروٹ، ڈی الم برٹ ،روسو ،مونٹسکیو وغیرہ۔یہ کہنا بجا ہے کہ والٹیئراس تحریک کا ایک ممتاز قائد تھا۔پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنے تیز دھار ادبی اسلوب، طویل العمری اور بسیار نویسی کے سبب اسے قارئین کا وسیع حلقہ میسر آیا۔ جو کم ہی ادبیوں کو ملا ہو گا۔دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے تصورات نے خرد افروزی کی تحریک کی تشکیل کی اور تیسری وجہ یہ ہے کہ اپنے دور کے تمام اہم افراد پر والٹیئر کا پلہ بھاری رہا ۔

پروفیسر ایم ۔اے شمس الدین والٹیئر کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں ۔

والٹئیرنے کلیسا اور پادریوں کے خلاف اعتراضات کی مہم شروع کر کے عوام کے دلوں سے کلےسا کا تقدس خارج کر دیا تھا ۔ عوام پہلے ہی پا دریوں کے ظلم واستبداد کے خلاف تھے اور ان کی دولت وثروت سے متنفر تھے۔ و الٹیئر کی تحریروں سے پادرےوں کے خلاف مزےد نفرت پےدا ہو گئی ۔ و الٹیئر شاعر ،مورخ ، ڈرامہ نوےس ، فلاسفر، ناقد اور ہجو گو تھا۔ لیکن اس نے حکومت وقت کے خلاف ایک لفظ بھی نہ لکھا تھا۔ اسکی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ تضحیک اور ہجو گوئی کی بدولت اس نے کلےسا کی فوقےت کے شاندار محل کومنہدم کر دیا اور انقلاب فرانس کے لیے زمین ہموار کی۔

والٹیئر صاحب ثروت ہونے کے باعث تغیر پسندی کی طرف مائل تھا ۔ نظریاتی طور پر وہ جمہوریت کو ترجیح دیتا تھا۔ اسے لڑائی سے سخت نفرت ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ دوسرے ملک برباد ہوجائیں اور اس کا وطن پھلے پھولے ۔

آخر کار ۳۰ مئی۱۷۷۸کو والیٹر پیرس میں انتقال کر گیا۔ اہلِ کلیسا کے خلاف اپنی تحریروں کے باعث اسے مسیحی طریقے سے نہ دفنایا جا سکا۔ تاہم فرانسیسی انقلاب کے فاتحین نے تیرہ برس بعد اس کی قبر کھود کر اس کی باقیا ت نکالیں اور انہیں پیرس میں پینتھین کے مقام پر دوبارہ دفن کیا ۔

روسو (۱۷۱۲۔۱۷۷۸) معروف فلسفی سوئنرر لینڈ جینوا میں پیدا ہوا۔ وہ ذہین ، جدت طراز اور گہری بصیرت کا مالک تھا۔ جس نے دو صدیوں سے جدید ذہن کو متاثر کیے رکھا ۔فرانسیسی خرد افروزی کے متعدد آزاد فکر ادیبوں سے اس کے دوستانہ مراسم تھے ۔ روسو کو اپنی سیاسی تحریروں کے باعث اربابِ بست وکشاد کے عتاب سے دوچار ہونا پڑا ۔

یہ کہا جاتا ہے کہ روسو کی تحریروں نے اشتراکیت پسندی ، قوم پرستی ، رومانویت ، مطلق انسانیت اور رد معقولیت پسندی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ۔ انہی نے انقلاب فرانس کے لیے راہ ہموار کی اور جمہوریت اور مساوات کے جدید تصورات کی بنیادیں وضع کیں ۔

روسو کی سیاسی تحریروں میں دلچسپ اور حقیقی تصورات موجود ہیں ۔ تاہم ان میں سب سے اہم اس کی مساوات پر اس کا پرجوش اسرار ہے اور ایسا ہی جوشیلہ احساس وہ موجودہ معاشرتی ڈھانچے میں موجود ناقابلِ برداشت غیر ہمواریوں کے متعلق ظاہر کرتا ہے۔ روسو کی شہرہ آفاق کتا ب(SocialContract) (معاہدئہ عمرانی) کا پہلا باب پر روز شعلہء بیانی سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا پہلا جملہ ہے ۔ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور ہر کہیں وہ زنجیروں میں ہے ہر شخص خود کو دوسروں کا آقا سمجھتا ہے۔ لیکن دوسروں سے زیادہ ہی غلام رہتا ہے"۔

روسو کا استدلال یہی تھا کہ فرانس میں اس نے تن تنہا روشن خیالی کی مادیت اور الحاد کا مقابلہ کیا۔ معاہدہء عمرانی میں روسو نے حکومت کے ظلم و استبداد کو بے نقاب کیا اور اس بات پر زور دیا کہ عوام بادشاہوں اور امراء کی غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہوجائیں ۔ وہ سوسائٹی کے مصنوعی بندھنوں کو توڑنے پر زور دیتا ہے ۔ رو سو نے اس کتا ب میں جمہو ریت کی بھر پو ر حما یت کی اور حق خدا داد با دشا ہی سے انکا ر کیا " روسو کو انقلابِ فرانس کا دماغ کہا جاتا ہے۔"

پس روسو نے سیاسی نظریات بدل ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا اور اپنے جذبات سے لبریز تحریروں کے ذریعے فرانس بھر میں آگ لگا دی ۔ اس کی تحریروں کے شعلے آج تک نہیں بجھ سکے اور اس لحاظ سے اسے جمہور کی آزادی کا علمبردار گنا جاتا ہے ۔ اس نے ۱۷۷۸میں وفات

پائی ۔لیکن آزادی ، حر یت اور انسان دوستی کا وہ سبق دیا جسے فرانس کے عوام کبھی فراموش نہیں کر سکتے ۔

سیکولر ازم نظریہ اور انسان دوستی

سیکولر ازم کے نظریے کا آغاز ڈھائی سو سال پہلے یورپ سے ہوا ۔پندرہویں صدی میں اسکی پیدائش ہوئی اور اٹھارویں صدی کے آغاز میں اس نے پورے یورپ میں مضبوطی سے قدم جما لیے۔ سیکولر ازم کا تاریخی پس منظر کچھ اس طرح سے ہے کہ قدیم روم میں سیکولر امور کا بنیادی تعلق لوگوں کی ان دنیوی مصروفیات سے تھا جو وہ اپنی روزمرہ زندگی میں سر انجام دیتے تھے اور ان کا کلیسائی امور یعنی عبادات اور مذہبی رسومات سے کوئی تعلق نہ تھا۔گویا زندگی دو مصروفیات پر مشتمل تھی۔ ایک مذہبی رسوم و عبادات کی ادائیگی کی مصروفیات جو پادری کے احکام کے تابع تھیں جبکہ دوسری غیر پادر یائی مصروفیات کہلاتی تھیں ۔ یہ ایک انسان کے روزگار ،تفریخ اور دیگر دنیوی مشاغل پر مشتمل دن بھر کی مصروفیات تھیں ۔دن بھر کی مصر وفیات میں انسان اپنی فہم و فراست اور عقل و سائنس سے کام لیکر اپنی روزی کماتا تھا۔جبکہ مذہبی عبادات و رسومات کی ادائیگی میں پادری کی اطاعت لازمی تھی۔

کلیسا کے اندر جسمانی حرکات، موسیقی،گیت ،وعظ وغیرہ تمام مصروفیات غیر سیکولر کہلاتی تھیں جبکہ ایسے تمام مشاغل جن کا تعلق پاپائی رسوم و عبادات سے نہ ہوتا تھا سیکولر مشاغل کہلاتے تھے ۔مطلب یہ کہ اقتصا دی سیکولر کا متضاد یعنی خانقاہی ،رہبانی یا پادریائی تھا۔ مگر اس کا مترادف کافر یا ملحد ہرگز نہ تھا۔گویا دنیوی معاملات اور اقتصادی و سماجی ضروریات پر مبنی تمام افعال جن کا تعلق فکر و استدلال یا سائنسی و فنی تحقیق و دریافت سے ہوتا تھا سیکولر کہلاتے تھے۔ جبکہ گرجا کے اندر مذہبی رسومات و عبادات پر مبنی افعال جن کا تعلق فکر و سائنس کے بجائے محض عقیدے و ایمان سے ہوتا تھا۔غیر سیکولر یا مقدس افعال تصور کیے جاتے تھے جو صرف پادری یا مذہبی پیشوا کے زیر نگرانی ہی انجام پاتے تھے ۔

گویا پا ئیت یا مذہبی عبادات کی ادائیگی کے علاوہ جو بھی انسانی کردار کا عمل تھا سیکولر عمل کہلا تا تھا۔ جب سیکولر یعنی دنیوی امور میں اضافے کے باعث سیاسی، سماجی اور اقتصادی دائرے میں وسعت پیدا ہوئی مختلف ادارے اور حکومتیں بننے لگیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کلیسا کا دائرہ کار کم ہونا شروع ہو گیا۔چنانچہ پانچویں صدی میں پوپ گیلا سئیس نے دوشمیشری نظریہ پیش کر کے پوپ کو خدا کا نائب اور ریاست کا حاکم اعلیٰ قرار دے دیا۔ جس کے باعث پوپ نے ریاستی امور میں مداخلت شروع کردی۔ ہر طرف پاپائیت کا راج دکھائی دےتا تھا۔ اس تاریک عہد میں سیاسی فلسفہ عےسائی صحیفو ں اور قدےم رومن قانو ن پر مبنی تھا۔ تمام معاشر تی زندگی کلےسائی مفادات کی ترجمان تھی۔تنقید وتحقےق کا حق چھین لیاگیاتھا۔آخرکارقوت کے غلط استعمال سے

جو نتائج نکلنے تھے وہی نکلے۔ظلم وزیادتی سے ان طبقات میں احساس محرومی بڑھا اوراحتجاج کا سلسلہ شروع ہوا ۔اس احتجاج کو روکنے کے لئے قوت کا مزید استعمال کیا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان طبقات میں یہ تصور را ئج ہو گیا کہ مذہب انسانیت کی ترقی کا دشمن ہے۔ چنانچہ اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا گیا۔

بقول سبط حسن:

کلیسا کازوال اب دور نہیں تھا ۔چنانچہ جلد ہی ایسی تحریکیں اٹھیں اور پے درپے ایسے اہم واقعات پیش آئے جو سیکولر خیالات کے حق میں سازگار ثابت ہوئے۔یور پ میں نشاۃ ثانیہ کا ظہور ،مارٹن لوتھر ،کالون اور زوینگلی وغیرہ کی پوپ کے خلاف بغاوتیں ،برطانیہ میں ہنری ہشتم کا رومن کلیسا سے تصادم ،سائنسی ایجادوں میں اضافہ،صنعت و حرفت کا بڑے پیمانے پر فروغ ،امریکہ اور ہندوستان کی دریافت اور اس کی وجہ سے بین الاقوامی تجارت وصنعت میں اضافہ ،برطانیہ میں خانہ جنگی اور جمہوریت پسندوں کے ہاتھوں بادشاہ چارلس اول کا قتل ،الوہی استحقاق ملوکیت کے نظریے سے عام بیزاری اور پارلیمانی نظام سے وابستگی غرضیکہ معاشرتی اور سیاسی شعبوں میں سیکولر میلان عام ہوگیا۔

سترہویں صدی جو عقلیت کی صدی کہلاتی تھی ۔اس صدی میں سیکولر رجحانات کو مزید تقویت ملی اور اس کو پھیلنے پھولنے کا خوب موقع ملا ۔اس سلسلے میں پروفیسر " آرنلڈ ٹوائن بی " اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "سترہویں صدی مغربی زندگی پر سیکولرازم کی بالادستی کی صدی ہے۔ سیکولرازم ہی کے طفیل مغربی معاشرے میں معاشی مفاد نے اور تحقیق و تفتیش کے دائرے میں سائنس نے مذہب کی جگہ لے لی"۔

اٹھارہویں صدی انگلستان میں صنعتی انقلاب،سیاسی انقلاب اور روشن خیالی کے عروج کی صدی تھی۔ والٹیئر، روسو، اولباخ اور کانٹ وغیرہ جیسے بے شمار مفکر پیدا ہوئے جنہوں نے معاشرتی اقدار و افکار کا رخ بدلنے میں اہم کردار ادا کیا اور جب عوام کی انقلابی جدوجہد کا آغاز فرانس اور امریکہ میں ہوا تو سیکولر خیالات نے عملی پیراہن پہن لیا۔

سیکولر ازم اور معاشرتی زندگی

انسانی معاشرت ایک نامیاتی مظہر ہے۔تاریخی طور پر معاشرے کو منظم و مستحکم بنانے کےلئے مختلف ریاستی نظام اپنائے جاتے رہے ہیں ۔کبھی کوئی خاندان حق حکمرانی کا حق دار ٹھہرتا ۔ کبھی کسی مخصوص نسل یا زبان سے تعلق رکھنے والوں کو حق حکمرا نی ودیعت کیا جاتا تھا اور کہیں کسی خاص عقیدے یا مسلک کے پیشوا یا امام منصب حکمرانی کے اہل قرار دیئے جاتے تھے ۔ان مختلف نظاموں میں ریاست کے قیام

کا مقصد بھی تبدیل ہوتا رہتا تھا۔کبھی ریاست کا مقصد شخصی اقتدار کا فروغ قرارپاتا ،کبھی کسی خاص نسل یا قبیلے کی منفعت کےلئے کشور کشائی اور کبھی اسے کسی خاص عقیدے کی ترویج واشاعت کے لئے بطور آلہء کار استعمال کیا جاتا ۔

مدتوں کے تجربات کے بعد انسان اس نتیجے پر پہنچا کہ ریاستی بندوبست کی یہ تمام صورتیں معاشرے میں امن و امان، عدل و انصاف اور ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہیں ۔ لہٰذا لوگوں کو تمام معاشرتی سہولیات بہم پہنچانے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ریاست میں حکمران اور رعایا کا فرق ختم کر کے تمام شہریوں کو ریاست کا مساوی رکن تسلیم کیا جائے اور ریاست کا کام صرف اور صرف انسانوں کی دنیاوی زندگی کو خوشحال اورپرُ مسرت بنایا ہو ۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو سیکولر ازم میں ریاست کا بنیادی مقصد ہماری دنیاوی یا زمینی زندگی کو بہتر اور خوشحال بنانے ہی میں مضمر ہے۔ سیکولرریاست اپنے شہریوں کو روٹی کپڑا اور مکان جیسی بنیادی ضروریات زندگی فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لوگوں کو مناسب روزگار اور مناسب تفریحات مہیا کرنا بھی ریاست کی ہی ذمہ داری ہے ۔اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگوں کے جا ن و مال ،عزت و آبرو اور شخصی آزادیوں کی بھی ذمہ داری ہے۔ لوگوں کو مختلف وبائی امراض اور بیماریوں سے بچانا اور ان کی صحت کا خیال رکھنا بھی اس کی ذمہ داری ہے ۔ سیکولر ریاست کا یہ بھی فرض بنتا ہے کہ ایسے اصول وقوانین اور پالیسیاں مرتب کرے جن پر عمل درآمد کر کے معاشرے سے جرم اور تشدد کا قلع قمع کیا جائے اور پر امن معاشرے کا قیام عمل میں لایا جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ریاست شہریوں کو حصول علم اور مختلف علوم وفنون میں ذوق پیدا کرنے کے جو مواقع فراہم کرتی ہے اس کے ذریعے جہالت کا خاتمہ کیا جائے۔ اس طرح سیکولر ازم کے اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے سیکولر ریاست انسان دوستی کے جذبے کو پروان چڑھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔

بقول وجاہت مسعود !

> سیکولر ازم انسانی معاشرے کی تنظیم و انضباط کا ایسا ریاستی نظام ہے جو واضح طور پر طے شدہ جغرافیائی حدود میں پیدا ہونے اوربسنے وا لے تما م انسانو ں کے بلا امتیا ز تحفظ،بہبود اور تر قی کی ذمہ داری قبو ل کرتا ہے۔سیکو لر ریا ست ان مقا صد کے حصو ل کے لیے فہم عا مہ، اجتما عی مشا ورت اور انصا ف کے اصول بروئے کا ر لا تی ہے۔

سیکو لر ریا ست کی ایک اور خصو صیت یہ ہے کہ اس میں اقتدار اعلیٰ شہر یو ں کی ملکیت ہو تا ہے۔اس ریاست میں رعا یا اور حکمرا ن کا تصو ر نہیں ہو تا ۔تمام شہر یوں کو مسا وی حقو ق اور مرا تب دیے جا تے ہیں ۔گو یا یہ ایسی ریا ست ہے جس میں رعا یاکی بجا ئے فعا ل شہریت کا تصور اپنا یا جا تا ہے۔حکو متی مناصب کا مطلب شہریو ں پر

حکم صادر کرنا نہیں ہو تا بلکہ اسکا کام عوام کی ضروریا ت اور امنگو ں کو اولیت دینا ہو تا ہے۔یعنی ایسی ریاست میں عوام کو مرکز ی یا بنیادی حیثیت حا صل ہو تی ہے ۔اس ریا ست میں تمام شہر یو ں کے لیے بہتر معیا ر زندگی کی سہو لیا ت ان کا حق ہے۔ اس ریا ست میں مو جو د تمام شہر ی اپنے سا تھ ہو نے والی نا انصا فی کے خلا ف آوا ز بلند کر نے کا حق رکھتے ہیں اور نا نانصا فی کا شکار ہو نے والوں کی داد رسی ریاست کے فرا ئض میں شا مل ہے۔اس طرح کو ئی سردار ،وڈیرہ، چوہدری اپنی سماجی حیثیت کے بل بوتے پر کسی قسم کا ظلم روا نہیں رکھ سکتا۔ اس طرح ایک انسان دوست معاشرے کا قیام عمل میں آتا ہے ۔

مشتاق احمد سیکولر ازم پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ سیکولر ازم کا سیدھا سادھا مفہوم یہ ہے کہ مذہب کی بنیاد پر کوئی انسان دوسرے انسان کے ساتھ متعصبانہ برتاؤ نہ کرے ۔ سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے اس کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک نہ کیا جائے۔ کسی ریاست کا شہری ہونے کی حیثیت سے تمام انسانوں کو خواہ ان کا کوئی مذہب ہو سب کو یکساں اور مساوی حقوق حاصل ہوں ۔ آئین اور قانون دونوں تمام انسانوں کو ایک جیسے حقوق اور تحفظات عطا کرے۔ حتیٰ کہ ہر انسان دوسرے انسان کے مذہبی عقائد و شعائر کا احترام کرے اور اپنا مذہب یا نظریہ حیات بہ جبر اس پر ٹھو نسنے کی کو شش نہ کر ے ۔ گو یا سیکو لر ازم کشا دہ نظر ی اور روا داری کا رویہ ہے۔ جس میں وسیع تر انسانی ہمدردی کا شعو ر کا رفرما ہوتا ہے۔اس کے علا وہ اسکی بنیاد خا لص عقل اور سا ئنٹیفک سو چ پر ہو تی ہے۔توہما ت اور بے بنیا د وبے سروپا خیالا ت کو سیکولر ازم سے کو ئی واسطہ نہیں ہوتا۔ سیکو لر سوچ یا سیکولر رویہ جس معا شر ے میں عام ہو جائے۔وہ معا شرہ ایک خو بصو رت اور پرُامن معا شرہ بن جا تا ہے۔

سیکو لر ازم میں سیکو لر ریاست عقل وخرد اور قا بلِ تصدیق شواہد پر انحصار کر تی ہے۔عقل چو نکہ انسا ن کی بنیادی صفت ہے جس کی بنا پر اسے اشرف المخلوقا ت کا شرف حا صل ہوا۔چنا نچہ انسا نی خرد اور شعو ر پر بھرو سا سیکولر فکر میں سنگِ بنیا د کی حیثیت رکھتا ہے۔لہٰذاسوچ وبچا ر کی صلا حیت کسی دوسرے کو منتقل نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی کو ئی شخص کسی دوسرے انسان کے لیے سو چ وبچا ر کر سکتا ہے۔ سیکولرازم ایک افادیت پسند نظر یہ ہے۔اسکا مقصدتمام موجودہ علوم اور دستیاب و وسائل کو بروئے کار لا کر ایسے ذرائع اختیار کرنا ہے جو انسانی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے موثر اور فائدہ مند ہوں ۔

سیکولر ریاست شہریوں کے تحفظ اور ترقی کےلئے مادی ذرائع بروئے کار لاتی ہے۔اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی مادی ترقی کا

ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شہری لالچ اور استحصال کے جذبات ماند پڑ جاتے ہیں اور اجتماعی بہتری کا جذبہ پروان چڑھتا ہے ۔سماجی ہم آہنگی کے نتیجے میں اخوت و بھائی چارے کے جذبات جنم لیتے ہیں اور یوں انسان دوستی کا مضبوط رشتہ قائم ہوتا ہے۔انسانی زندگی کے بہت سے رنگ ہیں ۔دنیا میں طرح طرح کے جغرافیائی اور سماجی حالات پائے جاتے ہیں ۔ اسی طرح افراد میں نصب العین ،مفادات اور اقدار کے حوالے سے بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ سیکولر ریاست اس طرح کے تمام اختلافات کو تسلیم کرتے ہوئے کوشش کرتی ہے کہ ان سب کا ایک اجتماعی نظام میں اس طرح رہنا ممکن بنایا جا سکے کہ کسی فرد یا گروہ کے تحفظ حقوق اور مفادات کو نقصان نہ پہنچے۔اس طرح سیکولر ریاست کا کام اپنے شہریوں کو اس بات کی تعلیم دینا ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے نقطہ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش کریں ۔ہم دوسروں کے طور طریقوں اور اقدار سے اختلاف رکھ سکتے ہیں ۔ان کی مخالفت کر سکتے ہیں لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کوئی انسان غلطی سے مبرا نہیں ہو سکتا ہے کہ ہمیں جن لوگوں سے اختلاف ہے انکی معلومات اور علم ناقص ہوں لیکن ہماری رائے اور ہمارا علم بھی ناقص ہو سکتا ہے۔اگر ہم یہ سمجھ لیتے ہیں تو ہم مختلف طور طریقوں اور اقدار رکھنے کے باوجود دوسروں کے حق رائے اور حق انتخاب کا احترام کرنا شروع کرتے ہیں ۔اسی سے معاشرے میں روا داری اور روشن خیالی کا آغاز ہوتا ہے۔ سیکولر ریاست انسانی آزادی کے اثبات کا اعلان ہے۔فردِ انسانی کی آزادی ،خوف سے آزادی ،اظہار کی آزادی ،بے کراں ترقی کی آزادی۔ دراصل آزادی سیکولر ریاست کے شہریوں کا بنیادی حق ہے۔ اس سلسلے میں سبط حسن اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

> سیکولر ازم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ضمیر وفکر اور اظہار رائے کی آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ لہٰذا ہر فرد کو پوری آزادی ہونی چاہیے کہ راستہ خود تلاش کرے اور زندگی کے تمام مسائل خواہ ان کا تعلق سیاست اور اقتصادیات سے ہو یا مذہب و اخلاق سے،فلسفہ و حکمت سے ہو یا ادب و فن سے ،اپنے خیالات کی بلا خوف و خطر ترویج کرے ۔طاقت کے زور پر کسی کا منہ بند کرنا یا دھمکی اور دھونس سے کسی کو زبردستی اپنا ہم خیال بنانا حقوق انسانی کے منافی ہے۔

جمہوری حکومت کے بغیر سیکولر ریاست اپنے مقاصد پورے نہیں کر سکتی یعنی سیکولر رازم اور جمہوریت باہم لازم ملزوم ہیں ۔ جمہوریت سیکولر ریاست ہی میں کامیاب ہو سکتی ہے۔دوسری طرف جمہوری نظام کے بغیرسیکولر ریاست اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکتی ۔ جمہوریت انتظام حکومت میں شہریوں کی باضابطہ اور موثر شرکت کے طریقہ کار کانام ہے۔جمہوریت کے بنیادی مفروضات میں شہریوں کی مساوات،جمہورکی حاکمیت ،قانون کی بالادستی،جواب دہ حکومت اور

آزادیِ اظہار شامل ہے۔جمہوریت کے یہ بنیادی فکری تصورات در حقیقت سیکولرازم ہی کا حصہ ہیں ۔
سیکولرازم میں سیکولر ریاست انصاف کے بنیادی اصول کو مدنظر رکھتی ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسان کے ساتھ ناروا سلوک نہ کرے اور کسی کی حق تلفی نہ کی جائے۔ دراصل انصاف انسانی معاشرت کی علامت ہے اور انسانی شعور کی عکاسی کرتا ہے۔انسانی معاشرے میں انصاف کے بنیادی تصورات کو مدنظر رکھ کر قوانین مرتب کیے جاتے ہیں تاکہ اس معاشرے میں رہنے والے ہر قسم کے گروہ کا تحفظ ممکن ہو سکے اور ایک پرُ امن فضا اور ماحول پیدا ہو۔یعنی ایسا معاشرہ جس میں انصاف کا بول بالا ہو وہی معاشرہ انسان دوست معاشرہ کہلائے جانے کا حق دار ہے۔
بقول چوہدری نیاز احمد

گویا سیکولر ازم کا مطلب یہ ہوا کہ قانون سازی کے وقت خصوصیت سے اس چیز کا خیال رکھا جائے کہ اس سے صرف ایک کلاس ایک طبقہ اور ایک مخصوص گروہ کے عقائد مفادات کی ترجمانی نہ ہو بلکہ یہ پورے معاشرے کے خیالات،عقائد اور مفادات کا حقیقی پر تو ہو۔

سیکولر ریاست اپنے شہریوں کی فلاح و بہبود کے لئے بنائے جا نے والے قوانین میں ردبدل کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ گویا انہیں عوام کی خاطر مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے ۔ایسی ریاست جرم وگناہ میں تفریق کرتی ہے۔گناہ بنیادی طور پر ایسے فعل کا نام ہے جسے عقائد کی روشنی میں غلط قرار دیا جائے۔سیکولر ریاست گناہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتی ۔اسکے برعکس جرم ریاست کے شہریوں میں طے شدہ حقوق و فرائض کی خلاف ورزی کا نام ہے۔ سیکولر ریاست جرائم کی روک تھام کی پابند ہے ۔اسکا فرض ہے کہ لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کرے۔ اس طرح جنگ وجدل سے پاک ریاست کا قیام عمل میں آتا ہے۔ بقول وجاہت مسعود ! " سیکولر ازم کی حقیقی روح مساوات آزادی، رواداری ،احترام علم اور تکثیریت پر مبنی فکری اسلوب کا نام ہے۔جسے معاشرے میں فروغ دیے بغیر سیکولر ازم کی انتظامی ہیئت کامیاب نہیں ہو سکتی"۔
اس تمام بحث سے یہ نیتجہ اخذ کیا جاسکتاہے کہ سکولر ریاست میں تمام پالےسوں اور قوانین کا مقصد شہرےوں کو سماجی ومعاشی طور پرترقی کے مواقعے فراہم کرنا اور اس کے ساتھ ان کی فلاح وبہود کا خیال رکھنا ہے۔ ےعنی سیکولرازم سماج مرتکز نظام ہے۔ جو ریاست کے بجائے معاشرے کو اولےت دےتا ہے۔ اس لیے کہا جاسکتاہے کہ یہایک انسان دوست نظریہ ہے۔

مشتاق احمد اپنی کتاب "احتساب یا ا نقلاب" میں سیکولرریاست کا ذکران الفاظ میں کرتے ہیں ۔اس سے ایک ایسی ریاست مراد ہوتی ہے جس میں مختلف مذاہب اور عقائد

رکھنے والے سب لوگ مل جل کرمحبت اورپیارسے رہیں ۔ایک دوسرے کے ساتھ رواداری برتیں ۔ ان کے مابین کسی قسم کا تعصب نہ ہو۔ایک ریاست کے شہری ہونے کی حیثیت سے سب کی حیثیت یکساں ہو۔سب کو مساوی حقوق حاصل ہوں سیاسی و معاشرتی لحاظ سے سب کا درجہ برابر اور ریاست کی نظر میں کوئی کمتر یا برتر اور کوئی ادنیٰ واعلیٰ نہ گردانا جائے۔ یہ ہے سیکولر ازم جو کشادہ دلی ، رواداری اور مساوات کا ضامن رویہ ہے آخر اس سے گریز ہوں؟

لہٰذا سیکولر ازم کی حقیقی ترقی اور کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں ہر جگہ اور ہر سطح پر سیکولر اقدار کو فروغ دیا جائے کیونکہ اس کے بغیر سیکولر ریاست کامیاب و کامران نہیں ہو سکتی اور انسان دوست معاشرے کا قیام عمل میں نہیں لایا جا سکتا ۔ ہمیں اپنے ذہنوں سے اس خیال کو نکال دینا چاہیے کہ سیکولر ازم کو معاشرتی نظام کے لیے درست سمجھنے سےحالات میں کوئی بگاڑ یا خراب پیدا ہو جائے گی دیکھا جائے تو سیکولراز ایک انسان دوست نظریہ ہے جو معاشرے میں امن وآشتی ، پیار ومحبت، مساوات، انصاف ، آزادیِ اظہار ، اخوت وبھائی چارہ درد مندی، ہمدردی ااور سب سے بڑھ کر انسانیت کا پیغام عام کرتا ہے اور معاشرے میں ظلم وجبر کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس کچھ لوگوں کے خیال میں سیکولرازم کامعنی ومفہوم کچھ یوں ہے:

سیکولر ازم طاعون کا چوہا یا اچھوت کی بیماری ہے۔ جس سے ہر شخص کو بچنا چاہیے ۔ ان کے خیال میں سیکولر ازم ایک عفریتی نظام ہے جس سے بے دینی ، دہریت اور بد اخلاقی پھیلتی ہے اور فتنہ و فساد کے دروازے کھلتے ہیں ۔ لہٰذا سیکولر خیالات کا سدِ باب نہایت ضروری ہے ورنہ اسلام اور پاکستان دونوں خطرے میں پڑ جائیں گے ۔

آئیے ان باتوں کا جائزہ تاریخی سچائیوں کی روشنی میں لیں ۔عصر حاضر میں جدید دنیا کے قوانین کا مجموعہ موجود ہے۔ ان میں بھی دینی قانون کا کافی حصہ شامل ہے۔مثلاً سماجی ، شخصی مذہبی ،تعلیمی اور انصاف سے متعلق جو آزادی اور مساوات کی دفعات ہیں ۔وہ سب دینی قانون سے لی گئی ہیں ۔ قرآن سماجی مساوات کی تعلیم دیتا ہے اور سورة حجرات میں اسکا ذکرا ن الفاظ میں کرتا ہے ۔

ترجمہ : اے لوگو ! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور مختلف برادریاں اور قبیلے اس لیے مقرر کیے ہیں کہ تم ایک دوسرے کو شناخت کر سکو ۔اللہ کے نزدیک تم میں معزز وہ ہے جو تم میں پرہیزگار ہو۔"

اسلام شہری ،شخصی اور مذہبی آزادی کی تعلیم دیتا ہےقرآن " سورۃ نور"کی آیت میں شخصی آزادی کا اعلان کرتے ہوئے فرماتاہے ۔
اے ایمان والو ! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو، جب تک اجازت نہ لے لو۔
اسی طرح مذہبی آزادی کا ذکر سورۃ البقرہ کی آیت میں ملتا ہے۔
ترجمہ : دین میں زبردستی نہیں ہے ۔
جبکہ سورۃ کہف میں ارشاد ہوتا ہے۔
جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔
جبکہ ملت آدم یعنی " انسانیت" کا پیغام ہمیں خطبہ حجتہ الوداع میں بھی بڑی وضاحت کے ساتھ ملتا ہے۔
ترجمہ : لوگو تم سب ایک آدم کی اولاد ہو ۔عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر سرخ کو سفید پر اور سفید کو سیاہ پر کوئی فضلیت نہیں سوائے تقویٰ کے۔
انسانیت اور برابری کا تصور ہمیں میثاق مدینہ کی دستاویز میں بھی ملتا ہے۔ جو دنیا کی سب سے پہلی جمہوری ریاست کا سیکولر آئین کہلاتا ہے۔جس میں کسی مذہبی اور سماجی فوقیت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔مگر یاد رکھنا چاہیے کہ انسانیت اور تحریم ذات کے اس تصور میں کسی ذات وقوم یا شعوب وقبائل کا استحصال و تحقیر ہرگز مطلوب نہیں ہے۔
میثاق مدینہ کی دستاویز پر روشنی ڈالتے ہوئے " شفقت تنویر مرزا " کہتے ہیں کہ
اس میثاق میں ان قبائلی رواجوں کو ملحوظ خاطر رکھا گیا تھا جو یہودی مذہب اسلام اور اسلام سے پہلے کی بت پرستی سے وابستہ تھا۔اس میثاق میں ہر قبیلے اور اس کے رسوم و رواج کو ایک خود مختار اکائی تصور کیا گیا تھا اور اسکی تفصیل رسول اللہ کے پہلے سیرت نگار ابن اسحاق نے دی ہے۔یونہی میثاق شہر مدینہ میں شہریوں کی قبائلی اور مذہبی خود مختاری کو تسلیم کیا گیا تھاکہا جا سکتا ہے کہ ایک زیر تشکیل ریاست کے آئین کا یہ ابتدائی ڈھانچہ ہے۔ اس میثاق میں بعض اصول رکھے گئے جو آج ایک سیکولر ریاست میں جائز اور کار آمد ہیں ۔ جب پیغمبر اسلام نے یہ میثاق بنایا تھا اس وقت تک شرع بطور ضابطہ قانون وجود میں نہیں آئی تھی ۔مدینہ والوں کی اس اہم دستاویز میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ رسول اکرامؐ نے یہودیوں اور بت پرستوں کے مختلف قبیلوں کو اسلامی قوانین پر عمل کرنے کےلئے مجبور نہیں کیا۔
جبکہ دوسری طرف " مولانا محمد حنیف ندوی " ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ" اسلامی نظام حکومت ہمہ گیر انسانیت پر مبنی

ہے۔یہ کسی بھی طرح تنگ نظری اور تعصب سے آلودہ نہیں یعنی ایسی حکومت جو انسانی بنیادی حقوق کی ضمانت دیتی ہے وہی عین اسلامی ہے"۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام ملت آدم ،انسانیت ،ہیومنزم اور مسا وات کا درس دیتا ہے تو پھر آخر اس سے گر یز کیوں ؟

غور کیا جائے تو سیکولر ازم سے گریز اور اجتناب ایک بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے ۔حقیقت میں یہ نظریہ انسان دوستی کا پیامبر ہے۔سیکولر ازم کائنات میں ہر جگہ موجود ہے ۔مثلاً زمین ،ہوا ، دریا ،بارش ، درخت ،پھول ، پانی، ہوا، سورج علم وغیرہ ان سب کا عکاس ہے ۔ایک کسان چاہے کسی بھی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہو مسلمان ہو یا ہندو، سکھ ہو یا عیسائی بت مت ہو یا دیر یہ جب زرعی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کاشتکاری کرتا ہے تو زمین اس کی محنت کا پھل ضرور دیتی ہے اور ہرگز یہ نہیں دیکھتی کہ اس کے سینے پر محنت کرنے والا کس مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہے۔

اسی طرح زمین کے اندر جو مخفی خزانے موجود ہیں ۔ ان پر بھی بغیر مذہب کی تخصیص کے ہر ایک کا حق ہے۔کوئی بھی شخص اپنی علمی صلاحیت ،قابلیت اور مہارت کے بل بوتے پر وہ خزانے حاصل کر سکتا ہے۔کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ زمین کسی خاص مذہب یا نظریہ سے تعلق رکھنے والے کے لئے خزانے لٹا دے اور دوسروں کے لئے اپنی آغوش وا نہ کرے۔اس زمین پر بہنے والے دریاؤں پر غور کیا جائے تو ان کا رویہ بھی سراسر سیکولر ہے ۔ دریا ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلی ہوئی زمینوں اور کھیتوں کو سیراب کرتے جاتے ہیں ۔یہ جانے اور پوچھے بغیر کہ یہ زمین اور کھیت کس مذہب کے ماننے والوں کے ہیں ۔وہ ایک علاقے اور ایک ملک سے دوسرے علاقے اور دوسرے ملک کا سفر طے کرتے ہیں اور جہاں سے بھی گزرتے ہیں پیاسی زمین اور انسانوں کو سیراب کرتے جاتے ہیں ۔

یہی حال برسنے والی بارش کاہے۔جب برستی ہے تو ہر جگہ سرسبزوشاواب ہوجاتی ہے۔ یہ فرق کیے بغیرکہ اس سے کوئی ہندو مستفید ہواہے یامسلمان۔ اسی طرح باغوں میں کھلنے والے پھولوں اور ہرے بھرے درختوں کا رویہ بھی سیکولر ہے۔ وہ ہرباغ میں کھلتے اور اپنی خوشبو بکھیرتے ہیں چاہے۔ وہ باغ کسی مسلمان کا ہو یاہندوکا۔کائنات میں موجود پانی اور ہوا پرغور کیا جائے تو ان کارویہ بھی سیکولر ہے۔ یہ دونوں مذہب ،عقیدے اور رنگ ونسل کے امتیاز سے بالاتر ہو کر اپنا فریضہ انجام دیتے ہیں ۔ پانی کا کام لوگوں کی پیاس بجھانا اور دلوں کو تسکین پہنچانا ہوتاہے ۔لہٰذا وہ اپنی فیض رسانی سے کسی خاص مذہب اور عقیدے رکھنے والے لوگوں کو محروم نہیں کرتا۔ یہ جس طرح مومن کی پیاس بجھاتا ہے۔ اس طرح کا فرکی بھی۔ یہی حال ہوا کا بھی ہے اس کا رویہ بھی سیکولر ہے۔ اس کائنات میں ہر مکتبہ فکر کے لوگ موجود ہیں اور ان کے زندہ رہنے کے لیے ہوا بنیادی

عنصر ہے۔جس میں وہ سانس لیتے ہیں ۔ لہٰذا بغیر کسی تخصیص کے وہ سب کو مستفید ہو نے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

اس کے علاوہ سورج جوکائنات میں روشنی وحرارت کامرکز ومنبع ہے جس کے بغیر زندگی کا وجود ناممکن ہے۔ یہ بھی اپنے مزاج کے اعتبار سے سیکولر ہے۔ وہ اپنی سنہری کر نیں پورے کرہ ارضی پر پھیلا دیتا ہے اور اپنی روشنی اور حرارت تمام انسانوں کویکساں طورپرمہیا کرتاہے۔ وہ مسجدومندر ، کلیساوکنشت میں کوئی فرق نہیں کرتا سب پر یکساں طور پرچمکتا ہے اور روئے زمین پربسنے واے تمام انسانوں حتی کہ حیوانوں کو بھی اپنی روشنی اور حرارت سے ایک ہی طرح سے نوازتا ہے۔ وہ سب کی فصلیں پکاتاہے ۔اور سب کو سردی وگرمی سے نجات دلاتا ہے۔

دیکھاجائے تو اس کائنات میں علوم کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں ۔ کوئی شحض چاہے ہندو ہو یا مسلمان یا کسی بھی مذ ہب کا پیروکار علم کا ہر شعبہ اسکے لیے کھلاہے۔ وہ اپنے شوق کے مطابق وہ علم حاصل کرسکتا ہے۔ یعنی مذہب وملت اور رنگ ونسل کااختلاف اسکی مہارت اور تکمیل علم میں ہر گز حائل نہیں ہوتا ۔ اسی طرح مختلف مذاہب کی مذہبی کتابوں سے ہر مذہب و ملت کے لوگ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں اور اس میں موجود حکمت و دانائی کے موتی چن سکتے ہیں ۔ اسی طرح جب ہم اہلِ تصوف پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ان کا رویہ بھی سراسر سیکولر ہی دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ ان کی تعلیمات کسی ایک مذہب و ملت سے تعلق رکھنے والوں کے لیے نہ تھیں ۔ان کا پیغام سب کے لیے محبت وپیار ، اخوت و بھائی چارہ کا تھا ۔ وہ سب کو گلے لگانے کا درس دیتے تھے۔ سب انسانوں سے محبت کرتے اور سب کے دکھوں کا مداوا کرتے رہے ۔

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سیکولر ازم کائنات میں ہر کہیں اور فطرت کے ہر مظہر میں کارفرما دکھائی دیتا ہے ۔ اس لیے اس سے انکار اور گریز ممکن نہیں ۔

بقول وجاہت مسعود

> آج کی دنیا میں کوئی ریاست عملی طور پر سیکولر ازم کے بنیادی مفروضات سے صرفِ نظر نہیں کر سکتی ۔ جو ریاستیں کسی خاص ، سیاسی ، نظریے یا سماجی تناظر کی آڑ میں سیکولر ازم سے انحراف کرتی ہیں وہ درحقیقت اپنے شہریوں کو بنیادی حقوق سے محروم کر کے مخصوص مفادات کو ناجائز تحفظ دینا چاہتی ہیں ۔ ایسے معاشروں میں ریاست اور شہریوں کا رشتہ نامیاتی اور صحت مند نہیں ہوتا ۔ جدید دنیا میں ایسی ریاست نہ تو عملی طور پر کامیاب ہو سکتی ہے اور نہ اپنے شہریوں کی ترقی کی ضمانت دے سکتی ہے ۔

اشتراکیت اور انسان دوستی

اشتراکیت کا انگریزی مترادف سوشلزم ہے ۔ جو لفظ سوشل social سے اخذ کیا گیا ہے ۔ جس کے معنی ، معاشرتی یا سماجی ہیں ۔ اس طرح اشتراکیت کا لفظ افراد کی شرکت کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ اس طرح ہم کہہ سکتے کہ اشتراکیت ایک ایسا نظام ہے جس کا تعلق پورے معاشرے کی فلاح بہبود سے ہے ۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ فرد کو زندگی کی بنیادی ضروریات روٹی ، کپڑا اور مکان وغیرہ کی فکر سے نجات دلائی جائے اور ہر شخص کو بلا تفریق بنیادی سہولیات بہم پہنچائی جائیں ۔ ہر شخص کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور ترقی کرنے کا موقع ملے اور معاشرے میں دولت کی منصفانہ اور مناسب تقسیم کا معقول انتظام ہو ۔

مختصر یہ کہ اشتراکیت سے مراد ایسا نظام ہے جس میں فرد کے ذاتی مفادات کو معاشرے کے اعلیٰ مجموعی مفادات کے تابع کر دیا جاتا ہے ۔اس کا مقصد انصاف ، رواداری ، آزادی ، مساوات اور انسان دوستی کا قیام ہے۔ جس سے معاشرے میں امن وامان اورمعاشرتی بہبودمیں اضافہ ہو۔ اشتراکیت بنیادی طورپرانفرادیت (Individualism)کی ضد ہے اور بحیثیت معاشی نظریے کے سرمایہ داری (Capitalism) کی بھی ضد ہے۔یعنی اس نظام میں زمین اور سرمائے پر نجی یا پرائیویٹ ملکیت نہیں بلکہ ریاست کی ملکیت قائم کی جاتی ہے ۔ چنانچہ سوشلزم بیک وقت سیاسی معاشی دونوں طرح کے نظریات کا مجموعہ ہے ۔

Collier's Encyclopedia کے مطابق

> Socialism an economic & Social order under which essentialindustries & Social Services are Publicly& Cooperatively owned & democratically Controlled with a view to equal opportunity forall .
>
> ترجمہ: اشتراکیت ایک اقتصادی اور معاشرتی حکم جس کے تحت ضروری صنعتیں اور معاشرتی خدمات عوامی سطح پر اور باہمی تعاون کے معنوں میں لی جاتی ہیں ۔ یہ سب کے لیے یکساں مواقع کی فراہمی کا باضابطہ جمہوری نظام ہے۔

دراصل سوشلزم عہد حاضر کا وہ معاشی اور سیاسی نظریہ ہے جس کا دعویٰ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنی افادیت ختم کر چکا ہے اور اس کی وجہ سے دولت کی پیداوار اور مناسب تقسیم میں رکاوٹ ہوتی ہے کیونکہ دولت پیدا کرنے کے بنیادی ذرائع زمین ، جنگلات ، بینک ، معدنیات ، بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں وغیرہ چند لوگوں کی ذاتی ملکیت ہیں اور وہ ان چیزوں کو زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی خاطر کام میں لاتے ہیں نہ کہ معاشرے کی فلاح وبہبود کی خاطر۔ حالانکہ دولت پیدا کرنے والے محنت کش عوام ہی ہوتے ہیں جن کو ان کی محنت کا صلہ نہیں ملتا۔ ان خرابیوں کو دور کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ دولت پیدا کرنے کے تمام بنیادی ذرائع کو قوم کی مشترکہ ملکیت بنایا جائے تاکہ دولت کی پیداوار اور تقسیم قومی مفاد کے تحت ہو ۔

چیمبر انسائیکلوپیڈیا کے مطابق

Socialism is abody of teaching&practice resting upon the belief that most social evilsare due to excessively unequal distribution of material resources & thatthese evils can be cured only by the transference, gradual or immediate total orpartial of the ownership of property and of the means of production exchange&distribution from private to public control .

ترجمہ: سوشلزم افکار و عمل کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کا انحصار اس تصور پر ہے کہ زیادہ تر معاشی خرابیوں کا سبب مادی وسائل زندگی کی غیر مساویانہ تقسیم ہے اور ان خرابیوں کا علاج صرف یہ ہے کہ جائیداد کی ملکیت اور ذرائع پیداوار زرِمبادلہ اور تقسیم کو بتدریج یا فوری کلاً جزواً انفرادی تصرف سے اجتماعی تحویل میں منتقل کر دیا جائے -

چنانچہ اشتراکی نظریہ ایک ایسا نظریہ ہے جو پیداوار اور تقسیم کے بنیادی ذرائع کو اجتماعی اور جمہوری نظام کے تحت لا کر مجموعی مفاد کے لیے استعمال کرنا حقیقی عوامی خدمت اور عوامی حق سمجھتا ہے -

ایک عظیم اور معروف اشتراکی مصنف کول اشتراکیت کی وضاحت یوں کرتے ہیں

اشتراکیت سے مراد چار مربوط اشیاء ہیں اول انسانی برادری جو طبقہ وارانہ امتیازات کو ختم کرنا چاہتی ہے اور جس میں نسلی و مذہبی و ملکی و ملی اختیارات کی خلیج کو ناپید کرنا ہی انسان دوستی کی دلیل ہے - دوم "معاشرتی نظام " جس میں نہ تو کوئی شخص زیادہ غریب ہو اور نہ زیادہ امیر بلکہ اعتدال پر مبنی ایک معاشرتی زندگی پر انسان کا حق ہے - سوم "پیداوار پر مساویانہ حقوق " جس سے ملک میں پیدا ہونے والی یا پائی جانے والی تمام اشیاء یا ان کے حصول کے ذرائع عوام کی مشترکہ ملکیت میں ہوں اور تمام شہریوں کو ان کے استعمال کا مساویانہ حق حاصل ہو - چہارم " استعداد کے مطابق ملک و ملت کی خدمت" اس طرح کہ ہر فنکار اپنے فن کو صرف اپنا ذریعہ معاش ہی تصور نہ کرے بلکہ اپنی خداداد قابلیت اور قوت کو ذاتی مفاد کے بجائے عوامی خدمت کے لیے بروئے کار لایا جائے۔

ان تمام تعریفوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اشتراکیت کے تحت ریاست میں ایک ایسا معاشی اور سماجی نظام قائم ہوتا ہے جس میں ملک کی دولت اور وسائل چند لوگوں کی ملکیت میں نہیں رہتے۔ بلکہ ہر شخص کو ان سے فیض یاب ہونے کا حق ملتا ہے - اشتراکیت سرمایہ داری کی لعنت کو ختم کر کے مزدوروں کو ان کی محنت کا صحیح اجر دیتی ہے اور لوگوں میں دولت کی منصفانہ تقسیم عمل میں لاتی ہے۔ اس

نظام کے تحت ملک کی معاشی ترقی کے لیے صحیح قسم کی منصوبہ بندی کی جا سکتی ہے۔ جس سے معاشرے کو فائدہ پہنچے اور ایسی پیداوار کو روکا جا سکتا ہے جو فطرت رساں ہو ۔ اشتراکیت کے تحت مزدوروں کو معاشرتی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ حکومت ان کی فلاح و بہبود کی طرف توجہ دیتی ہے۔ ان کو بے روزگاری اور پریشان حالی سے نجات ملتی ہے اور یوں اشتراکی نظریہ انسان دوستی کی بہترین فضا پیدا ہوتی ہے ۔ مزدور اور کارخانہ کی طبقاتی کشمکش کا خاتمہ ہوتا ہے۔ عوامی اتحاد کو فروغ ملتا ہے ۔ سماجی خدمت اور کام سے محبت کا جذبہ پروان چڑھتا ہے ۔

اشتراکیت کا تاریخی پسِ منظر

انسان ابتدا سے ایک ایسے معاشرے کا خواہش مند رہا ہے جہاں اس کی ضروریات زندگی احسن طریقے سے پوری ہوں ۔ ہر ایک کو اُس کے بنیادی حقوق حاصل ہوں ۔ امیرو غریب کا فرق نہ ہو ہر شخص کو ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کارلانے کے مواقع میسر ہوں ۔ قانون کی نظر میں حاکم و محکوم کا کوئی امتیاز روا نہ رکھا جائے۔ تاکہ وہ سکون اور مسرت کی زندگی گزار سکے ۔ قدیم قبائلی یا اشتمالی معاشرے میں خوراک ، لباس ، اور ٹھکانے میں افراد قبیلہ برابر کے شریک تھے۔ شخصی املاک کاکوئی وجود نہیں تھا۔ املاک مشترکہ تھی اور پورے قبیلے کی تحویل میں تھی۔لیکن زرعی انقلاب کے نفوذ کے ساتھ ہی شخصی املاک کا آغاز ہوا۔ جس نے وحدت نوع انسانی کو پارہ پارہ کر دیا۔ معاشرہ آقا اور غلام ، جاگیردار اور مزارع ، سرمایہ دار اور مزدور جیسے طبقات میں بٹ گیا۔ جس کی وجہ سے حصول املاک کی ہوس نے ظلم و ستم ، جبرواستبداد ، لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت جیسے تخریبی جذبات کو اکسایا اور یہ دنیا کمزوروں اور مفلوک الحال انسانوں کے لیے دوزخ کا نظیر بن گئی ۔

اٹھارھویں صدی کے آخر میں اور انیسویں صدی کے شروع میں انگلستان میں صنعتی انقلاب برپا ہوا اور ایک سو سال کے اندر زندگی کا نقشہ بدل گیا ۔ صنعتی انقلاب نے دنیا کو ایک بڑی مشین مہیا کی ۔ یہ مشینی دور یا میکانکی دور کی نقیب تھی۔ اگر اس سے تہذیب و تمدن کو فروغ ملا تو بربریت اور ہلاکت آفرینی کو بھی فروغ ملا ۔ اس نے امیروں کی تعیشات اور غریبوں کے افلاس میں ایسا فرق واضح کر دیا جو ماضی میں نہیں تھا۔ صنعتی انقلاب کا اہم ترین اثر یہ ہوا کہ پیدائش دولت کے طریقے بدل گئے۔ سرمایہ دارانہ نظام شروع ہوا۔ ملک میں جگہ جگہ کارخانے قائم ہو گئے دستکار مشینی دور کا مقابلہ نہ کرنے کے باعث مجبوراً کارخانوں میں مزدور بن گئے۔ بعض حالات میں مزدوروں کو کئی کئی روز کے فاقے کرنے پڑتے تھے دونوں وقت پر پیٹ بھر کر روٹی کھانا نصیب نہ ہوتی تھی اور سرمایہ دار مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے فائدہ اٹھا کر کم سے کم مزدوری دیتے تھے۔ محنت کشوں کی

کمائی کھینچی ہوئی سرمایہ داروں کے پاس چلی جاتی۔ امیر ، امیر تر ہوجاتے اورغریب، غریب ترسرمایہ داروں اور محنت کشوں میں طبقاتی کشمکش کی فضا پیدا ہو گئی تھی جس سے بغض وحسد اور عداوت کے جذبات نشوونما پاتے گئے ۔ ہمدردی ، اخوت اور شفقت نام کو رہ گئی تھی۔ " ایک طبقہ دن بدن امیر سے امیر تر ہوتا جا رہا تھا اور دوسرا طبقہ حسرت سے فلک بوس عمارتوں کو دیکھتا تھا۔" One was rolling in the other was siarving in thegutter&wealth. ملکی دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں آگئی اور یوں سوسائٹی کے دو طبقات مزدور اور کارخانہ دار ابھر کر سامنے آگئے معاشرے میں اخلاقی اقدار ناپید ہوگئیں اور مادہ پرستی عام ہو گئی ۔

صنعتی ترقی کے بعد سرمایہ داری نظام پوری دنیا میں پھیل گیا یہ نظام ابتداء ہی سے امیر اور غریب کے درمیان امتیاز پر زور دیتا آیا ہے۔ صنعتوں میں مشینوں کی آمد کے بعد پیداوار میں زبردست اضافہ ہوا۔چنانچہ دولت بھی زیادہ حاصل ہونے لگی لیکن یہ نئی دولت صرف محدود گروہ تک ہی پہنچی۔ یہ گروہ نئی صنعتوں کا مالک تھا ۔ کارکن بہرطور غریب ہی رہے ۔ پروفیسر مینڈے ول نے نظام سرمایہ داری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ " غریبوں سے کام لینے کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ ہے کہ انہیں بھوکا رکھا جائے۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی ضروریات کو تھوڑا تھوڑا پورا کیا جائے۔ انہیں ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بے نیاز اور بے پرواہ کرنا حماقت اور بے وقوفی ہے ۔"

مسٹر ٹاون سینڈ نے اپنی کتاب " ڈیزر ٹیشن آف دی پوئر لاز " میں وضاحت سے لکھا ہے کہ

> بھوک کا کوڑا ایسا سخت ہے۔ جو وحشی سے وحشی اور تُند سے تُند جانور کو بھی رام کر لیتا ہے۔ اس سے سرکش سے سرکش انسان اطاعت گزار اور مطیع و فرمانبردار بن جاتا ہے۔ اس لیے اگر غریبوں ، مزدوروں اور محنت کشوں سے کام لینا چاہتے ہو تو اس کا ذریعہ فقط ایک ہے یعنی بھوک ۔ بھوک ہی وہ جذبہ محرکہ ہے جس سے مزدور اور محتاج ہر قسم کا کام کرنے آمادہ ہوجاتے ہیں ۔

سرمایہ دارانہ نظام کے اس ظالمانہ رویے نے آخر مزدوروں اور غریبوں میں بھی احساس ، شعور اور بیداری کا جذبہ پیدا کردیا اور انہوں نے ردِ عمل کے طور پر حقوق کے نام سے شور و غوغا مچایا ۔مجالس قائم کیں بغاوتیں کیں اور اٹھارھویں صدی کے آخر ہی سے سوشلزم کے نظریے نے ان کی حمایت شروع کر دی جس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ مفادِ عامہ کا داعی اور مزدوروں ، کسانوں اور پست و مظلوم طبقوں کا حامی ہے ۔

انیسویں صدی کے ابتدائی ایام میں مغربی یورپ میں صنعتی سرمایہ دارانہ نظام مضبوطی سے اپنے قدم جما چکا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب سرمایہ دار کی کافی حد تک حوصلہ افزائی ہو رہی تھی۔ وہ صنعتی انقلاب

برپا کرنے کے دعویدار تھے۔ گویا یہی وہ وقت تھا جب معاشرے میں صنعتی سرمایہ دار ایک نئے طبقے کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے اور صنعتی مزدور کم اجرت پر زیادہ محنت سے ان کے لیے سرمایہ کا انتظام کر رہے تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز کا ایک اہم اور تاریخی واقعہ ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب ہے۔ اس انقلاب کے تاریخی پس مظر میں یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد تہذیبی قدروں میں تضاد اور کھوکھلے پن کا پیدا ہونا، سرمائے اور محنت کی کشمکش میں تیزی اور اقتصادی نظام کی بوسیدگی شامل ہیں ۔ خود روس زار شاہی نے محنت کش طبقوں کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ ان سب عوامل پر مستزاد پہلی عالمگیر جنگ کا آغاز تھا جس کے نتیجے میں یورپ کا سیاسی واقتصادی ڈھانچہ ٹوٹے پھوٹے کا شکار ہوگیا۔ اس جنگ کے دوران انقلاب روس ۱۹۱۷ء کا تاریخی واقعہ رونما ہوا اور روس میں جابر شہنشاہیت اور سرمایہ داری کے خلاف محنت کشوں کا اقتدار قائم ہوگیا اور اشتراکی تحریک اور اس کے ذریعے مارکسی نظریات زبردست قوت کے ساتھ دنیا بھر میں پھیلنے لگے۔

اگرچہ کئی انگریز مصنف اس غیر منصفانہ معاشی سوسائٹی سے نالاں تھے اور اس کے خلاف آواز بلندکر چکے تھے لیکن کوئی خاطر خواہ نتائج سامنے نہ آئے۔ آخر کار اس سرمایہ دار طبقہ اور مزدور کی کشمکش کے دوران جرمن میں ایک ایسا یہودی پیدا ہوا جس نے اپنی تمام زندگی اس غیر منصفانہ تقسیم کے خاتمے کے لیے صرف کردی اس کا نام کارل مارکس تھا۔

ما رکس دورا ن تعلیم ہی اشتراکی فلسفے کا عمیق مطا لعہ کرتا رہا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اشتراکی فلسفے سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ اشتراکی بن گیا۔ وہ جاگیر داری نظام کا مخالف تھا۔ جس کے باعث کسان صدیوں سے اپنے ابتدائی انسانی حقوق سے محروم ہو چکے تھے۔ اپنے انقلابی افکار کی اشاعت کے لیے اس نے ایک جریدے Rheinisch Zei tung (رینش زائی ٹنگ) میں پر مغز اور زور دار مقالات لکھے۔ جس کے باعث اسکی علمیت کی ہر کہیں دھاک بیٹھ گئی۔ ۱۸۴۳ میں حکومت نے یہ پرچہ بند کردیا ۔ آخر کار مارکس نے والد کی طرف سے ملنے والی رقم سے ایک نیا پرچہ " ینور ینشن زائی ٹنگ" کے نام سے جاری کیا۔ لیکن حکومت نے اسکی اشاعت پر بھی پابندی لگا دی اور مارکس کو نہایت پریشانی کے عالم میں ہجرت کرنی پڑی جس سے اسکا سارا اثاثہ دریا برد ہو گیا۔ اس پر آشوب دور میں اسے جرمنی، پیرس اور بلجیئم سے بار بار جلا وطن کیا گیا۔ مارکس اپنی جلا وطن زندگی کا کچھ حصہ بلجیئم میں گزار کر پیرس جا پہنچا اور ۱۸۴۹تک وہاں مقیم رہا۔ اس دوران اسکی ملاقات فیڈرک انیگلز سے ہوئی جو کہ ایک جرمن صنعتکار کا بیٹا ہوتے ہوئے بھی معاشرے میں صنعتی مزدوروں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔

انسان دوست انجلزکی پیدائش جرمنی کے ایک شہر بارمن میں ہوئی۔ فارغ التحصیل ہو کر انجلزکاروبار میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ لیکن جلد ہی انقلابی سرگرمیوں کا سرگرم رکن بن گیا۔ جس کے باعث اسکا باپ بے حد مایوسی کا شکار ہوا۔ مانچسٹر میں انجلز کے باپ کا ایک کارخانہ تھا۔ انجلز نے مانچسٹر پہنچتے ہی وہاں کے چارٹسٹ لیڈروں سے رابطہ قائم کیا اور مزدور تحریک کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ وہ مزدور بستیوں میں گھومتا، مزدوروں کے گھروں میں جا کر ان سے بات چیت کرتا۔ ان کے جلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کئی صنعتی شہروں کے دورے بھی کیے اور وہاں کے مزدوروں کی زندگی کے حالات سے براہ راست واقفیت بھی حاصل کی۔ آخر کار اس نے مارکس کے اخبار"رینش زائی ثنگ" میں مسلسل پانچ مضامین برطانیہ کی مزدور تحریک پر لکھے۔ اس نے انگریزی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی زبوں حالی کا جائزہ لیا اور اپنی کتاب "انگلستان کے مزدور طبقے کے احوال" میں اسکی تفصیل بیان کی۔ جس سے پہلی بار لوگ مزدور طبقے کے مسائل سے آگاہ ہوئے۔ انجلز ۱۹ نومبر ۱۸٤٤کو بارمین سے مارکس کو ایک خط میں لکھتا ہے۔

> میں ان دنوں انگریزی اخباروں اور کتابوں کے انبار کے نیچے دبا ہوا ہوں ۔ امید ہے کہ کتاب جنوری ۱۸٤٥کے وسط یا آخر تک مکمل ہو جائے گی۔ میں انگریزوں کو بڑے مزے کی فرد جرم پیش کرنے والا ہوں ۔ میں انگریز سرمایہ داروں کو ساری دنیا کے سامنے قتل، ڈکیتی اور دوسرے طرح طرح کے جرائم کا بڑے پیمانے پر ملزم قرار دوں گا---- انگریز مجھے بہت دن تک یاد رکھیں گے۔

دوسری طرف انجلز دیباچے میں کتاب کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ۔

> مزدور طبقے کے حالات دور حاضر کی تمام سماجی تحریکوں کی بنیاد اور ان کا نقطئہ آغاز ہیں ۔ کیونکہ آج کل کے سماجی آلام کی سب سے گھناونی اور سب سے عریاں شکل یہی حالات ہیں --- سوشلسٹ نظریات کو ٹھوس بنیاد فراہم کرنے کے لیے پرولتاریہ کے حالات سے آگہی بے حد ضرور ی ہے--- لیکن پرولتاری حالات اپنی کلاسیکی شکل میں مکمل طور پر فقط سلطنت برطانیہ بالخصوص انگلستان میں پائے جاتے ہیں ۔

انجلز مارکس کی طرح پکا مادیت پسند اور پر جوش انقلابی تھا۔ وہ نہایت فراخدلی سے تاریخی مادیت کے نظریے کی اولیت اور معاشرہ انسانی کی جدلیاتی ارتقا کے تصور کو کارل مارکس سے منسوب کرتا تھا۔ لیکن اسکی اپنی فکری و عملی دین بھی گرانقدر ہے۔ ریاست کی ابتدا کا ذکر کرتے ہوئے وہ ان خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

قدیم زمانے کی ریاست کسانوں اور مزارعوں کی ریاست تھی جس کا مقصد غلاموں کو محکوم رکھنا تھا۔ جاگیرداروں کی ریاست کسانوں اور مزارعوں کو دبائے رکھنے کے لیے آلہئ کار ثابت ہوئی۔ جدید نمائندہ یا پارلیمانی ریاست سرمایہ داروں کا ایک وسیلہ بن گئی جس سے وہ محنت کشوں کو لوٹ رہے ہیں ۔

دراصل انجلز کا عقیدہ یہ تھا کہ مزدوروں کو سرمایہ داروں کے جبر و استحصال سے نجات حاصل کرنے کے لیے محنت کش طبقے کو متحد ہو کر کوشش کرنی ہو گی۔ اسی صورت میں وہ ظلم کی چکی میں پسنے سے چھٹکارا حاصل کرسکتے ہیں ۔ انجلز مارکس کا نہ صرف ایک دوست، پیروکار اور کو ورکر بن گیا تھا بلکہ اس نے ہر مشکل وقت میں مارکس کا ساتھ دیا۔ آخری عمر میں مارکس کے مالی حالات کافی خراب ہو گئے تھے جن کو انجلز نے سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کی ۔ یہ وہ وقت تھا جب اس کے بچے بھوک اور افلاس کی وجہ سے بیماری سے لڑتے ہوئے چھوٹی عمر میں ہی چل بسے تھے۔ اسکی بیوی دائمی مریضہ بن چکی تھی۔ ایسی صورتحال میں انجلز نے مارکس کی بھر پور مالی امداد کی اور ساتھ ہی ساتھ قرض خواہوں سے اسکا پیچھا بھی چھڑایا۔

عبدالروف ملک اپنی کتاب "مغرب کے عظیم فلسفی" میں انجلز کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے۔

یہی وہ نوجوان ہے جو آگے چل کر مارکس اور مار کسز م کے ساتھ اس طرح وابستہ نظر آتا ہے جیسے پھول کے ساتھ اسکا رنگ یا خوشبو۔ مارکس کا ذکر اینگلز کے ذکر کے بغیر ادھورا ہے۔ یہی نہیں کہ انگلزنے مارکسز م کو آگے بڑھانے میں مارکس کی مدد کی اور اس کے کام کو پا یہئ تکمیل تک پہنچایا بلکہ اگر وہ نہ ہوتا تو موخر الذکر عمر بھر اسی طرح اپنی تصنیفی اور انقلابیوں سرگرمیوں میں مصروف نہ رہ سکتا تھا۔ اور اغلب تھا کہ وہ اس کی امداد کے بغیر اپنی خود ناری اور دنیاداری سے لاعلمیت کی بنا پر جلا وطنی کی تنگدستیوں اور مصیبتوں میں افلاس اور فاقہ کشی کا شکار ہو جاتا۔

۱۸٤۸ میں کارل مارکس اور انجلز نے اپنا مشہور انقلابی Communist Manifisto (اشتمالی منشور) شائع کیا۔ جسکی اشاعت کے ساتھ ہی سیاسیات کی دنیا میں ایک غلغلہ برپا ہو گیا اور اس مقالے کی بدولت ہی وہ مارکس سے کارل مارکس بن گیا۔ مارکس نے اس مقالے میں سرمایہ دارانہ نظام کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا اور اس بات پر روشنی ڈالی کہ کس طرح سرمایہ دار مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں ۔ اس نے تاریخ کے تناظر میں یہ حقیقت واضح کرنے کی بھی کوشش کی کہ کس طور ماضی میں سرمایہ داروں نے جاگیرداروں پر غلبہ حاصل کیا اور

اقتدار پر قبضہ حاصل کر لیا اور سرمایہ داروں نے کس طرح حکمت عملی کو بروئے کار لاتے ہوئے سرمائے کو اپنے آپ تک محدود کر لیا اور مزدوروں پر اس کے کیا اثرات پڑے اور سرمایہ داروں نے کس طور اپنے سرمائے میں اضافہ کیا اور وہ کس طرح امیر سے امیر تر بنتے چلے گئے۔ آخر کار اس نے دنیا بھر کے محنت کشوں کو متحد ہو کر سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کے خلاف جدوجہد کرنے کی دعوت دی اوراپنی انسان دوستی کا بہترین ثبوت پیش کیا۔ اس نے ایک انسان دوست مفکر ہونے کے ناطے کمیونسٹ لیگ کا پرانا نعرہ " سب انسان بھائی بھائی ہیں " بدل کر ایک نیا نعرہ دیا جو بین الاقوامی پرولتاریہ کا نعرہ بن گیا۔

پرولتاران زنجیروں کے سوا کچھ نہ کھوئیں گے، جنہوں نے ان کے ہاتھ پاوں جکڑ رکھے ہیں ۔ ان کے سامنے فتح و تسخیر کے لیے د نیا کھلی پڑی ہے۔دنیا بھر کے مزدورو ، متحد ہو جاؤ۔

مارکس کے پیش کردہ اس اشتما لی منشور پر پروفیسر ہیرالڈلاسکی تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو بات کے ابتداَ ظلم و ستم کے خلاف محض ایک احتجاج کی حیثیت رکھتی تھی اب ایک فلسفہ بن گئی اور صحیح عمل کی جانب رہنمائی کرنے لگی۔ کمیونسٹ مینی فسٹو کے شائع ہونے کے بعد یہاں وہاں بکھری ہوئی غیر منظم جماعتیں ایک رشتہ میں منسلک ہو کر ایک با اثر جماعت میں تبدیل ہونے لگیں ۔ پہلے جو جماعتیں حکومت کے خلاف خفیہ سازش کا گڑھ سمجھی جاتی تھیں ان تمام جماعتوں کو اس منشور نے یکبارگی ایک مقصدیت اور تاریکی پس منظر عطا کیا۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ اس نے مزدوروں میں صحیح پرولتاری شعور کی تخلیق کی اور ان کے اپنے تاریخی کردار کی اہمیت کو آشکارا کیا اور ان کو اپنے کام میں مضمر عظمت و وقار کا احساس دلایا۔ اس نے بیک جنبش قلم اس اعتقاد کے گروندے کو ڈھا دیا کہ سو شلزم بغیر ایک طویل جدوجہد کے قائم ہو سکتا ہے۔ اس بات کی امید دلائی کہ کوئی ایسا اقتصادی نظام جو زمانہ سے مطابقت نہ رکھتا ہو قائم نہیں رہ سکتا۔ اس نے انسان کے فطری حقوق پر زور دیا اور اپنے اصولوں کی بنیاد ما بعد اطبیعات کو نہیں بنایا۔

جبکہ دوسری طرف لینن مارکس کے Communist Manifisto پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔"یہ تحریر ایک نئے تصور دنیا، پائیدار مادیت ، جدلیات، نظریہ طبقاتی جدوجہد اور پرولتاریہ کے عالمی، تاریخی، انقلابی کردار کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔"

دیکھا جائے تو یوں تو کارل مارکس نے اپنے اشتراکی نظریات و خیالات کے پر چار کے لیے اخبارات میں بے شمار مضامین و مقالات تحریر کیے۔ لیکن اس نے اپنے اشتمالی نظریات پر بڑی وضاحت سے

روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں مارکس کی کتاب " سرمایہ" (Das Capital) کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جس میں اس نے معاشی مسائل پر بڑے فلسفیانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں اور بد عنوانیوں کے علاوہ اس نظام میں پائے جانے والے تضادات کو بھی اس نظام کے زوال پذیر ہونے کا سبب قرار دیا ہے۔ مارکس کی اس کاوش کو سراہتے ہوئے علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں ۔"دس سال کے مطالعے کے بعد اس نے اپنی مشہور کتاب "سرمایہ" لکھی جسے محنت کشوں کی انجیل " کہا جاتا ہے۔ جبکہ دوسر ی طرف پرو فیسر خواجہ غلا م صا دق کے نزدیک "کمیونسٹ پارٹی کے لیے CommunistManifesto یعنی کمیو نسٹ منشور شر یعت کا حکم رکھتا ہے اور کیپٹل (Capital) صحیفہ آسمانی کا "

مارکس مزید کہتا ہے کہ دنیا میں برپا ہونے والے عظیم انقلابات بھی مزدوروں کو کچھ نہ دے سکے بلکہ ان سے سرمایہ داروں کے ہاتھ ہی مضبوط ہوئے اور مزدور بددستور تنگ دستی و مفلسی کا شکار ہوتے چلے گئے۔ اگرچہ وہ صنعتی ترقی کو مستحسن نگاہوں سے دیکھتا ہے لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس صنعتی ترقی کا کیا فائدہ جو کہ چند سرمایہ دار ہی اٹھائیں اور مزدور طبقے کو اس میں سے کوئی حصہ نہ ملے۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ دنیا میں رونما ہونے والے تمام انقلابات کے محرک آزادی اور مساوات ہی کے اصول تھے لیکن ان اصولوں کو عملا بے معنی کر کے رکھ دیا گیا۔ غرضیکہ مارکس اپنی اس کتاب میں سرمایہ دارانہ نظام پر تنقید کرتے ہوئے اس بات پر زور دیتا ہے کہ سچی آزادی اور بھائی چارگی کا حصول اس وقت تک نہیں ہو سکتا کہ جب تک معاشی مساوات کا قیام عمل میں نہ لایا جائے اور دولت کی تقسیم مساویاتی بنیادوں پر نہ کی جائے لیکن اس کے لیے سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ انتہائی ضروری ہے اور اقتدار پرولتاریہ کے قبضے میں ہو۔

اب مارکس کے فلسفے کے ماخذ پر غور کرتے ہیں جو اس کے پیش کردہ فلسفے کی بنیاد بنے۔

مارکس چونکہ معاشرے میں امن، مساوات اور انصاف کا متمنی تھا اس لیے معاشرے میں پائی جانے والی معاشی، معاشرتی اور سیاسی ناہمواریوں کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زندگی کے تمام شعبہ جات میں تبدیلی اور انقلاب کا حامی تھا۔ معاشرتی ناانصافیوں اور معاشی استحصال نے مارکس کے ذہن پر گھرے نقوش مرتب کیے جس کے باعث وہ انقلابیوں سے وابستہ ہو کر جدوجہد میں مصروف ہوگیا۔

مارکس نے فرانسیسی انقلابی اور اشتراکیت کے حامی مفکرین سے بھی تعلقات قائم کیے اور ان کے خیالات کو سمجھا۔ لیکن سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ کیونکہ فرانس کے اشتراکی کوئی ٹھوس بنیادوں پر اشتراکی نظام مرتب نہ کرسکے تھے اور نہ ہی وہ فلسفہ اشتراکیت کو ایک با ضابطہ تحریک کی شکل دینے میں کامیاب ہو سکے ۔ مارکس کے

نزدیک ان کا کردار صرف اتنا ہی تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف یہ لوگ تھوڑی بہت رائے عامہ کی ہمدردیاں ضرور حاصل کرسکتے تھے لیکن ان کا تمام تر لائحہ عمل لوگوں میں بیزاری و افراتفری پھیلانے کا باعث تھا۔ مارکس کا کہنا یہ ہے کہ معاشرے میں سرمایہ داروں کے خلاف نفرت پیدا کرنا ہی کافی نہیں بلکہ اشتراکی پسندی کے لیے ضروری ہے کہ عملی طور پر میدان میں اتریں اور انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں۔

انسان دوست مارکس بنیادی طور پر مزدوروں کا ہمدرد اور خیر خواہ تھا اور اسکی وجہ اس کے اپنے ذاتی حالات تھے جو اس نے نہایت تنگدستی اور کسمپرسی کی حالت میں گزارے۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف علم بغاوت لیکر میدان عمل میں نکل پڑا اور اپنی تمام تر طاقت و توانائی اشتراکیت کے لائحہ عمل کے لیے صرف کر دی۔ اس سلسلے میں مارکس کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تمام دنیا کے اشتراکیوں سے رابطے کر کے انہیں ایک جامع اور ٹھوس لائحہ عمل دیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ مارکس تھوڑے ہی دنوں میں اشتراکیت کا سب سے بڑا پر چارک بن گیا۔ مارکس نے نہ صرف اشتراکیت کے بکھرے ہوئے اصولوں کو سا یئنفک بنیادوں پر استوار کیا بلکہ سیاسیات کی تاریخ میں اسلام کے بعد اس نے پہلی مرتبہ ایک نیا ضابطہ حیات اپنے فلسفہ اشتمالیت کے نام سے پیش کیا۔

اس سلسلے میں "شیخ محمد رشید" اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

> اس سے قبل اٹھارویں ، سترہویں اور سولہویں صدی میں بھی مختلف مصلحین نے سوشلسٹ بنیادوں پر سوسائٹی کو استوارکرنے کی کوشش کی۔ لیکن کسی فلسفی نے اس مقصد کے حصول کا راستہ نہیں دکھایا۔ اس لیے یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی تھی کہ آیا سوشلزم کا حصول ممکن بھی ہے کہ نہیں ۔ مارکس نے ان عوامل کا ذکر کیا ہے جس سے سوشلزم کا نفاذ ممکن یا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس عظیم فلسفی کے مطابق سوشلزم کسی انفرادی خواہش سے نہیں آسکتا جب تک معاشرہ مخصوص ارتقائی منازل طے نہ کرے اور اس سفر کو طے کرنے کے بعد کسی فرد یا جماعت کے روکنے سے رک نہیں سکتا۔ اس سیاسی ارتقا کے عمل کے نتیجہ پر سوشلزم کے نافذ العمل ہونے کو سائنٹیفک سوشلزم سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہی قدرت کا تقاضا ہے۔"

مارکس اپنے اشتراکیت کے فلسفے میں جو اصول بیان کرتا ہے وہی اصول اس سے پیشتر اشتراکی مفکرین بیان کرچکے ہیں ۔ مثلاً تاریخی مادیت یا جدلیات مادیت" کا نظریہ اشتراکی مفکر پیرنگٹن نے " طبقاتی کشکمش" کا نظریہ سائمن نے جبکہ"قدر زائد" کا نظریہ بابائے معاشیات آدم سمتھ نے پیش کیا۔ اس کے علاوہ اشتمالی انقلاب کے اصول

مارکس نے ۱۷۸۹کے فرانسیسی اشتمالی انقلاب سے حاصل کیے۔ لیکن اس کے باوجود انسان دوست مارکس کا کمال یہ ہے کہ اس نے تمام نظریات کو یکجا کر کے ایک گلدستہ کی شکل دی اور یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ سرمایہ دارانہ نظام معاشرے کے بنیادی مقاصد کے قطعاً خلاف تھے۔

مارکس کا یہ اہم کارنامہ ہے کہ اس نے اپنے فلسفے میں دنیا میں ہونے والی تمام مساوی تبدیلیوں کے اصول وضع کر دئیے اور سرمایہ دارانہ نظام کے تمام اداروں کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے قدیم یونانی مفکر ارسطو کے بر عکس انسان کو سیاسی کی بجائے معاشی حیوان قرار دے دیا اور نظام زندگی کا مرکز صرف مادے کو قرار دیا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کارل مارکس نے اپنے تمام تر سیاسی فلسفے کی بنیادیں جدلیات مادیت پر ہی رکھی ہیں ۔بقول خواجہ غلام صادق "جدلیات مار کسز م کی روح ہے۔ اگر اسے نکال دیا جائے تو مار کسز م زندہ نہ رہ سکے گا"۔ مارکس نے کائنات اور تمام سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کا محرک مادہ کو ہی قرار دیا۔ اس کا خیال ہے کہ تمام تر انسانی اداروں کی نشو ونما اور ان کا عروج و زوال مادی اشیا کی ہی بدولت واقع ہوتا ہے۔

اگرچہ مارکس کا جدلیات مادیت کا نظر یہ ہیگل سے مستعار ہے جسکی بنیاد اس نے تصورپر رکھی تھی۔ اس کے برعکس مارکس نے اس میں مادیت کی آمیزش کر کے ایک جدت ادا کے ساتھ اپنا نظریہ جدلیاتی مادیت پیش کر دیا۔ وہ ہیگل کے فلسفہ جدلیات پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بنیاد مادہ پر ہے تصورات پر نہیں اور کائنات کی تمام تبدیلیوں کا محرک مادہ ہے تصور ہرگز نہیں ہے۔ تصور یا خیال صرف اس قدر اہم ہے کہ وہ صرف ایک خیال ہے۔ در حقیقت تصور کا وجود مادی اشیا کا ہی مرہون منت ہے۔ لہٰذا اسے اصل قرار دینا انتہائی ناموزوں اور نامناسب ہے ۔

بقول علی عباس جلالپوری!

> مارکس اور انجلس نے ہیگل کے تصورات کی پیکار کو طبقات معاشرہ کی کشمکش میں منتقل کر دیا۔ انہوں نے کہا ہیگل سچ کہتا ہے کہ کائنات اور فکر انسانی ہر لمحہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں ۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط ہے کہ ذہن مین جو تغیرات ہوتے ہیں وہی عالم مادی میں بھی تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں ۔ حقیقت اس کے بر عکس ہے ۔ تصورات اشیا کی پیداوار ہیں اور اشیا کے تغیر کے ساتھ تصورات میں بھی تغیر واقع ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح انہوں نے "ہیگل کی جدلیات کو جو سرکے بل کھڑی تھی دوبارہ اپنے پاوں پر کھڑا کر دیا۔

مارکس نے جدلیات کی بنا مادہ کو قرار دے کر یہ کہا ہے کہ معاشی مسئلہ ہی ہر چیز کی بنیاد ہے۔ دنیا میں تمام تر کشمکش اور تصادم مادی مسائل ہی کا پیش خیمہ ہیں ۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مادی مسائل

ہی کی بنا پر انقلابات اور تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں اور مادہ ہی اصل ہے۔ کیونکہ تصوارات مادی چیزوں ہی کی مرہون منت ہیں اور حقیقی دنیا سے ان کا تعلق محض پرچھائیوں کا ہوتا ہے۔ غرضکہ مارکس نے ہیگل کے فلسفہ حیات میں مادیت کی آمیزش کرکے اپنا جدلیات کا نظریہ پیش کیا اور اس صورت حال کا مکمل منطقی نتیجہ اشتمالی سماج کو قرار دیا۔ اس کے خیال میں وہ اشتمالی معاشرہ ہی ہے جو ہر طرح کے عیوب سے پاک ہو گا۔ یہ معاشرہ غیرطبقاتی حیثیت کا حامل ہو گا۔ اس میں موجود پیداواری نظام ہر طرح کی برائیوں سے پاک ہو گا۔ محنت کرنے والے کو اسکا حق ملے گا اور کوئی دوسرا اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔چونکہ یہ نظام تضادات کا حامل ہے اس لیے وہ بوژوا اور پرولتاریہ میں کشمکش کو ناگزیر قرار دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کشمکش کا منطقی نتیجہ پرولتاریہ کی فتح کی صورت میں سامنے آئے گا اور یہ تضادات کا حامل نظام مکمل طور پر نیست و نابود ہو جائے گا اور اس نظام کے خاتمے کے ساتھ ہی جدلیات کے تصور کا بھی خاتمہ ہو گا۔ اس طرح عوام مکمل امن اور سکون کی زندگی بسر کر سکیں گے۔ بقول کارل مارکس**!**"جرمن فلسفہ آسمان سے زمین کی طرف آتا ہے۔ ہمارا فلسفہ زمین سے آسمان کی طرف جاتا ہے۔"

کارل مارکس نے تاریخ کا مادی نظریہ اپنی مشہور کتاب "سرمایہ"(DasCapital) میں بڑے مفصل انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ نظریہ بھی ہیگل سے مستعار لیا ہوا ہے مارکس کا خیال یہ ہے کہ انسان کے خیالات، اعمال اور افعال ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے بلکہ اس میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں ۔ گویا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے معاشی، معاشرتی،اقتصادی، اخلاقی اور سیاسی خیالات میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں ۔ مارکس انسانی تاریخ کی تمام تر تبدیلیوں کا موجب مادی اسباب کو قرار دیتا ہے۔ جبکہ ہیگل کے نزدیک تاریخ میں تمام تر تبدیلیاں تصورات کے باہمی کشمکش اور تصادم کا نتیجہ ہیں ۔ مارکس انسان کی آزادی کو بھی معاشی ترقی سے مشروط قرار دیتا ہے۔ اس کے خیال میں اگر معاشرہ معاشی اعتبار سے خود کفیل ہو گا اور معاشرے میں معاشی مساوات برقرار رہی تو پھر آزادی بھی فعال ہے بصورت دیگر آزادی کا تصور محال ہے۔

مارکس کے تاریخی مادیت کے نظریہ پر "روڈ ولف مونڈ و لفو" روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ

> حقیقت میں اگر ہم تاریخی مادیت کا کسی تعصب کے بغیر اس طرح جائزہ لیں جیسا کہ مارکس اور اینگلز کی تحریروں میں اسے بیان کیا گیا ہے تو ہمیں یہ احساس ہو گا کہ یہ مادیت پرستی کے بجائے حقیقی انسان دوستی ہے اور یہ کہ یہ ہر خیال اور بحث کا مرکز انسان کو بناتی ہے۔ یہ ایک حقیقی انسان دوستی (RealorHumanismus) ہے جیسا کہ اسے تخلیق کرنے والوں نے اسے نام دیا ہے۔ یہ انسان کو

اسکی موثر اور ٹھوس حقیقت میں دیکھنا چاہتی ہے۔ یہ تاریخ میں انسان کی موجودگی کو سمجھنا چاہتی ہے اور تاریخ کو صدیوں میں انسان کی سرگرمی محنت اور معاشرتی عمل کے نتیجے میں بننے والی حقیقت کے طور پر سمجھنا چاہتی ہے۔ ان صدیوں کے بعد وہ ماحول بتدریج عمل میں آتا ہے اور اس میں تبدیلی آتی ہے جس میں انسان رہتا ہے اور جس میں انسان آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہے اور ایسا تاریخی ارتقاء کے علت اور معلول (Effect&Cause) سے ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے تاریخی مادیت کو مادیت پرست فلسفے کے ساتھ گڈ مڈ نہیں کیا جاسکتا ۔

کارل مارکس کے نزدیک قبائلی معاشرے کے اختتام پذیر ہوتے ہی طبقاتی کشیدگی کی شروعا ت ہوئی۔ معاشی نظام نے جب طبقات کو دو دھڑوں میں منقسم کر دیا تو ان طبقات کے درمیان مقابلے کا رجحان بھی پیدا ہوا۔ ہر پرولتاریہ کی یہ خواہش تھی کہ وہ اعٰلی طبقے کے بورژوا کلاس میں شامل ہو کر پرُ تعیش زندگی بسر کرے۔

یہی خواہش مزدور طبقہ کو سخت محنت پر اکسانے لگی اور وہ دن رات محنت کر کے بورژوا جماعت میں شامل ہونے کا خواب دیکھنے لگا۔ لیکن اس اقتصادی نظام کی غلط پالیسی کے باعث معاشرہ جاگیردار اور سرمایہ دار کو حاکم کے روپ میں جبکہ مزدور طبقہ کو محکوم طبقہ کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ اس طرح ان دونوں طبقات میں کشیدگی بددستور قائم رہتی ہے۔

مارکس کا کہنا یہ ہے کہ طبقات کے درمیان تھوڑے بہت تفاوت کو تو برداشت کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جب فرق اس حد تک بڑھ جائے کہ ایک طرف سرمایہ دار طبقہ زندگی کی ہر سہولت سے لطف اندوز ہو اور غریب بیچارہ زندگی کی بنیادی ضروریات کو بھی ترسے تو پھر یہ افلاس زدہ چہرے آہستہ آہستہ بغاوت پر اتر آتے ہیں ۔ لیکن جاگیر دار اس بات سے قطع نظر ظلم و ستم کے نئے نئے طریقے ایجاد کرتے رہتے ہیں ۔ مارکس کا خیال ہے کہ ابتدا میں سیاسی اقتدار جاگیر داروں کے پاس تھا۔ لیکن بعد میں یہ درمیانہ طبقہ کے ہاتھوں میں آگیا۔ لیکن بورژوا اور پرولتاری طبقہ کی کشمکش اقتدارکو بعد میں پرو لتا ری طبقہ کی جھولی میں بھی ڈال سکتی ہے۔ جس کے باعث ایک نیا معاشرہ تشکیل پائے گا جس میں طبقات کا کوئی وجود نہ ہو گا اور سب کو مساویا نہ حقوق دیے جائیں گے۔

بقول صدر حیات صفدر

کارل مارکس خود کو طبقاتی جنگ کا مصنف نہیں سمجھتا ۔ اس نے پہلے سے موجود طبقاتی مخاصمت کے نظریہ کو لیکر پھیلا دیا۔ اس نے خود ہی آگسٹن تھیری(Augustin Theory) کو فرانسیسی تاریخی تحریروں میں طبقاتی جنگ کا بانی قرار دیا۔ تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ عالمی سیاست میں

طبقاتی جنگ کے تصور کو ایک اہم حامل بنانے کا سہرا کارل مارکس ہی کے سر ہے۔

دراصل کارل مارکس نے جب آدم سمتھ بابائے معاشیات اور مسٹر ریکارڈو کی معاشی اصولوں کا اور مزدور طبقے کی حالت کا جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ انسان کی صرف مشقت حقیقی طور پر بنیادی حیثیت کی حامل ہے ۔ کارل مارکس کے "نظریہ زائد" کو اس کے فلسفے کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے مطابق یہ قدر زائد در حقیقت ایک مزدور کی محنت اور اسکا پسینہ ہے۔ لیکن سرمایہ دار اس پسینے کا سودا کرتا ہے اور نا انصافی سے کام لیتے ہوئے اسے معمولی داموں خریدتا ہے۔ مزدور حاصل ہونے والی اجرت سے بنیادی ضروریا ت زندگی بھی پوری کرنے سے قاصر رہتا ہے اور مصائب کا شکار رہتا ہے اور منافع قدر زائد سارے کا سارا سرمایہ داروں کی تجوری میں چلا جاتا ہے۔ یہ سرا سر ناانصافی پر مبنی رویہ ہے جسکا خاتمہ از حد ضروری ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ سرمایہ داری نظام کا قلع قمع کر دیا جائے۔ کیونکہ جب تک اسکی بیخ کنی نہ کی جائے صحت مند معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا اور استحصالی معاشرہ کی موجودگی میں مساوات کا دعویٰ ایک فریب ہے۔

کارل مارکس کا کہنا یہ ہے کہ یہ بات درست ہے کہ مشین اور خام مال سرمایہ دار کا ہوتا ہے مگر محنت مزدور کی ہوتی ہے۔ اس طرح دونوں ہی قدر زائد کے مساوی حقدار ہوتے ہیں ۔ مگر سرمایہ دار قدر زائد سے مزدور کو مکھن سے بال کی طرح نکال دیتا ہے۔ جبکہ مزدور کی محنت اور مالک کی مشین سے جو چیز تیار ہوتی ہے۔ وہ جب فروخت ہوتی ہے تو محنت کش کی اجرت اور کارخانے پر لگائی جانے والی رقم کے مقابلہ میں کہیں زیادہ قیمت حاصل کرتی ہے۔ لہٰذا اس چیز کی قیمت فروخت اور محنت کشوں کو اداکی جانے والی اجرت میں جو نمایاں فرق ہے وہی"قدر زائد" ہے اور اس پر مزدور کا حق ہے۔ مگر اسے اس حق سے محروم کر دیا جاتا ہے اور مالک اسے غصب کر لیتا ہے۔

مارکس انہی بنیادوں پر سرمایہ دار کے خلاف صف آرا ہو کر مزدوروں کو محاذ آرائی کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ محنت کش اور مزدور طبقہ خود اپنے حق کے لیے آواز بلند کرے۔ سرمایہ دار کو اپنی محنت اور طاقت کا احساس دلائے اور اسے یہ باور کروائے کہ مالک اور مزدور میں کوئی فرق نہیں ۔

کارل مارکس نے "سرمایہ کے ارتکاز" کا نظریہ اپنی مشہور کتاب "سرمایہ" میں پیش کیا ۔ مارکس کا خیال ہے کہ سرمایہ دار طبقہ اپنے اقتدار کو طول دینے اور مزدور طبقہ کو زیر تسلط رکھنے کے لیے نت نئے حربے اختیار کرتا رہتا ہے۔ جس میں اسے خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوتی ہے۔ وہ اپنے سرمائے میں بے پناہ اضافہ کر لیتا ہے جبکہ مزدور طبقہ معاشی بد حالی کا شکار ہو کر مزید مفلسی اور تنگ دستی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک سرمایہ دار کے پیش نظر اسکا سرمایہ اور

اقتدار زیادہ اہمیت کے حامل ہیں ۔ اسے مزدور کی خستہ حالت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی دولت کے اضافے کے لیے محنت کش طبقہ کی محنت کو کم سے کم معاوضہ پر خرید تا ہے۔ جس کے باعث ان کی پیداوار میں اضافہ ہو تا رہتا ہے اور وہ معاشی طور پر مستحکم ہو جاتے ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار طبقہ مزدور کی مزدوری میں مزید کمی کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے پرولتاریہ طبقہ بعض اوقات سخت کوشی کے باوجود فاقوں پر گزارہ کرتا ہے اور مزدور طبقہ چونکہ معاشرے کے اکثریتی طبقہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ بے روزگاری اور افلاس کے خوف سے یا تو سرمایہ دار کی تا حیات خدمت میں گزار دیتا ہے یا پھر اپنی تباہ حالی سے تنگ آکر متحد ہو کر انقلاب برپا کر دیتا ہے۔

پرولتاریہ اپنی مضبوط قوت کا مظاہرہ عموما ہڑتال کی صورت میں کرتے ہیں ۔ کارخانے بند ہو جاتے ہیں۔ جس سے بورژوا طبقہ شد ید نقصان سے دوچار ہوتا ہے۔ اس عظیم نقصان کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ وقتی طور پر پرولتاریہ سے مصلحت کر لیتے ہیں ۔ لیکن یہ مصلحت تا دیر قائم نہیں رہ سکتی اور وہ میدان عمل میں اتر آتے ہیں ۔ مارکس کے نزدیک اس صورتحال کے پیدا ہونے کی وجہ پیداواری طریقے اور معاشرتی تعلقات ہیں جن میں ربط اور ہم آہنگی برقرار نہیں رہتی اور پرولتاریہ طبقاتی کشمکش کے آلات سے لیس ہو کر اسی جنگ میں حصہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اس طبقاتی جنگ کا نتیجہ بالآخر انقلاب کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ اور اس جنگ میں سرمایہ دارانہ نظام اور اسکی تمام تر خامیاں اور تضادات ہمیشہ کے لیے مٹ جاتے ہیں ۔

اس سلسلے میں شیخ محمد رشید اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

> اب اگر ارتکاز زر کو روکنے اور قدرت کے وسائل سے تمام مخلوق کو بہرہ ور کرنے کے لیے ذرائع پیداوار کو ریاست کی تحویل میں لیکر اس طرح اسکا انتظام کیا جائے کہ زمین کی ساری پیداوار کاشت کار کو ملے اور کارخانوں ، کانوں اور دوسرے ذرائع پیداوار کے منافع کو چند سرمایہ داروں کی جیبوں میں جانے کی بجائے عوام الناس پر خرچ کیا جائے تو اسکی قرآن و سنت میں کہاں نفی ہے۔ بلکہ یہ اقدام قرآن حکیم اور حضور اکرمؐ کی تعلیمات کے موجودہ حالات کے عین مطابق ہو گا۔ اسی عمل کو معاشیات میں سوشلزم کا نام دیا گیا ہے جس کے خلاف صبح و شام کفر کے فتوے صا در کیے جاتے ہیں ۔

المختصر یہ کہ کارل مارکس دنیا میں عادلانہ نظام معاشرہ قائم کرنے کے لیے جدوجہد کررہا تھا۔ وہ معاشی مساوات کی بنیاد پر عالمی حکومت قائم کرنے کے لیے تگ و دو کررہا تھا۔ اس پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ مسلح جدوجہد اور انقلابی کشمکش ، زور اور طاقت کے

بغیر ہمہ گیر جبرو استحصال کو ختم نہیں کیا جاسکتا ۔ اس طرح وہ ایک انسان دوست معاشرے کا خواہش مند تھا جہاں انسان دوستی کے جذبے کو فروغ مل سکے۔یہ ایسا انسان تھا جو دوسروں کوخوش کرکے سب سے زیادہ خوش ہوتا تھا۔ تمام عمر سوشلزم کی خدمت کرتا رہا یہ وہ عظیم انسان تھا جس نے کاشت کاروں کی سر فرازی کی جدوجہد میں بڑی سے بڑی قربانی سے کبھی دریغ نہ کیا۔

کارل مارکس کے فکری اور عملی کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے میکس ملین روبل اور مارگرٹ منالے نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مارکس نے اپنی ساری زندگی ایک ہی مقصد کے لیے وقف کر دی تھی۔پرولتاریہ کی جدوجہد کے حوالے سے بنی نوع انسان کی آزادی کا حصول۔ اس کے خیال میں پرولتاریہ جسمانی اور ذہنی پہلووں سے معاشر ے کے بہترین افراد ہیں ۔ اس مقصد کے لیے مارکس نے اپنی صحت، کنبہ، دوست اور احباب سب کچھ ہی قربان کر دیا۔ اس نے پرولتاریہ کو ایک انقلابی نظریہ فراہم کیا اور بذات خود ان کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس نے سرمایہ داری نظام کی زوال پذیری اور محنت کش عوام کے روشن مستقبل کی جانب توجہ دلائی۔ اس نے اپنی زندگی کے بہترین سال جلا وطنی میں بسر کیے اور علالت، افلاس، احتیاج اور گھریلو مشکلات اسکی زندگی کی مسرتوں کو مسموم کرتی رہیں ۔ اس کے باوجود اس نے مختلف ملکوں کی مالی پیشکش کو حقارت سے ٹھکرایا اور ان حکومتوں کے گماشتوں کی اس نوع کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ اس نے شہرت اور دولت دونوں پر لات مار دی اور روح فرسا مصائب میں بھی اپنا کام جاری رکھا۔

کارل مارکس کے نظریات وافکار کو عملی جامہ پہنانے میں لینن اور ماوزئے تنگ نے اہم کردار ادا کیا۔چین اور روس میں اشتمالی معاشرہ کی طرح ڈالی۔ اور اس طرح کارل مارکس کے نظریات پر عمل پیرا ہو کر ان ممالک کا نقشہ بدل دیا اور ایک انسان دوست معاشرے کی بہترین فضا قائم کی۔

بقول امجد علی بھٹی

دوسری جنگ عظیم کے بعد کے سالوں میں مارکسزم کا جو ماڈل لینن نے سویت یونین میں قائم کیا تھا اس پر عمل کرتے ہوئے سٹالن نے غیر انسانی آمریت کے ذریعے اسے ڈرامائی اور گہرے بحران میں مبتلا کردیا تھا۔ یہی وہ پس منظر تھا جس میں مارکس کے نظریات کی ایک نئی توضیح سامنے آئی۔ یہ سوویت یونین حکومت کے "سرکاری" مارکسزم کی مخالفت اور اس کے متبادل کے طور پر سامنے آئی تھی اس نئے نظریے کو Marxist humanism"مارکسزم میں انسان دوستی" کہا گیا۔ اس کے ماننے والوں کا کہنا تھا کہ مارکسزم کا ایک "انسانی پہلو" تھا اور یہ کہ اس کا بنیادی مقصد اصل میں نسل انسانی کو ہر طرح کے ظلم اور

اجنبیت سے آزاد کرانا تھا اور اسی وجہ سے یہ "انسان دوستی " ہی کی ایک قسم تھی۔

مذہبی نظریہ انسان دوستی

اسلام کسی ایسے مذہب کا نام نہیں جو صرف انسان کی نجی اور انفرادی زندگی کی اصلاح کا داعی ہو اور جس کا کل سرمایہ حیات کچھ عبادات، چند اذکار اور مٹھی بھر رسوم پر مشتمل ہو بلکہ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو خدا اور اس کے آخری نبیؐ کی ہدایت کی روشنی میں زندگی کے تمام شعبوں کی تعمیر اور سیرت گری کرتا ہے ۔

اگر مذہب دنیا میں نہ اتارے جاتے تو پوری کائنات میں ہر طرف وحشت و درندگی کا راج ہوتا۔ کیونکہ مذہب ہی ہمارے ہر درد کی دوا ہے، ہر مرض کی شفا ہے، ہر مسئلے کا حل ہے، ہر سوال کا جواب ہے، ہر پیچید گی کے لیے ایک زبردست تحلیلی قوت ہے۔ اس کی اپنی ایک غیر معمولی طاقت ہے۔ جس کے آسرے کے بغیر ہمارے جسم و جان کا زوال تو کیا ذہنی عناصر تک کی ترتیب بگڑ سکتی ہے۔ اس کے بغیر ہم خود سے خود بچھڑ جاتے ہیں ۔

اسلام دین فطرت ہے اسکی تعلیمات سادہ اور قابل عمل ہیں ۔ دین فطرت کي اصل دلچسپی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ہے۔ نبی اکرم ؐ نے اس دین فطرت کو صرف دنیا کے سامنے پیش ہی نہیں کیا بلکہ اس نظام کو قائم کرنے کے لیے جس کے آپ داعی تھے مسلمانوں کو ایک اجتماعی زندگی میں منظم کیا۔ خود ان کی زندگیوں میں اس دین کو قائم کیا اور ان پر یہ فر یضہ عائد کیا کہ پوری دنیا میں اس دین کو قائم کریں ۔

آنحضرت ؐ کی آمد سے پہلے ساری دنیا کا عموماًاو ر ملک عرب کا خصوصا حال بدترین تھا۔ بات بات پر جھگڑا ہوتا۔ نفرت و جنگ و جدال نے تبا ہی مچا رکھی تھی۔ قبیلے آپس میں بر سر پیکار رہا کرتے تھے، جاہلیت کا دور دورہ تھا۔ عصبیت عروج پر تھی۔ بیجا تفاخرنے دلوں کو تنگ اور نگاہوں کو پست کر رکھا تھا۔ یہ اس لیے ہوا تھا کہ احترام آدمیت کا جذبہ بالکل سرد پڑ چکا تھا۔ "ہم چون من دیگر ے نیست" کا نعرہ بلند تھا۔ دوسروں کے حق کی پامالی دیکھ کر دل خوش ہوتا تھا اور اپنے فرض کی بجا آوری کا دل میں دھیان بھی نہ آتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی رہنمائی کے لیے انبیا بھیجے۔ ہر نبی مخصوص حالات اور محدود علاقے کے لیے وقف رہا۔ ہر آنے والا دور ایک آخری آنے والے کی بشارت دیتا رہا کہ اس آخری آنے والے کے بعد کسی نے نہیں آنا۔ دین کی تکمیل اسی آنے والے کی محتاج رہی۔ پہلے آنے والے تمام انبیائے کرام رنگ اور خوشبو کے قافلے تھے۔ جوآئے اور اپنے گردوپیش کو مہکا کراوجھل ہو گئے۔ ان سب کے بعد حضو ر ؐ تشر یف لا ئے۔ جن کے وجود، جن کی سیرت اور جن کی تعلیم کے فیض سے یہ دنیا ہمیشہ کے لیے مہکتی رہے گی، حسن جہاں بھی ہو جس رنگ اور جس آہنگ سے ہووہ حضور ؐ کا فیض ہے۔ آپؐ تمام انبیا کا خلاصہ وعطر

ہیں ۔ آپؐ کی آمد سے دنیا کا نقشہ ہی بدل گیا، کفر و شرک کا اندھیرہ ختم ہو گیا۔ گناہوں کی تاریکی نور میں بدل گئی، انسانیت مسکرانے لگی۔ جہالت کا فور ہوگئی، نسل و خون کے امتیازات کا خاتمہ ہوااور انسا ن ایک مر تبہ پھر انسا نی شرا فت کا متحمل اورعظمت آدمیت کا ر فیق ہو گیا ۔

آج ہمیں اس انسان کے حوالے سے ہی بات کرنی ہے جسے نظر یہ انسا ن دوستی میں مر کزی حیثیت حا صل ہے۔گویا یہ نظریہ انسا نی عظمت کا قائل ہے اور اس کے تسلیم کیے جانے پر زور دیتا ہے۔ عظمت انسان کے لیے اسلام کا انداز بڑا عقلی اور منطقی ہے۔ مقام انسان کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے تین اہم سوالات اٹھا کر ان کا جواب دیا ہے۔ ان جوابات میں انسان کا مقام بھی متعین ہو گیا اور اسکی عظمت بھی ثابت ہو گئی۔ انسان کا مقام بھی فلسفہ اور مذہب کے ان تین مشترک مسائل کے حل پر منحصر ہے۔

۱۔ کائنات کیا ہے؟
۲۔ کائنات کا بنانے والا کون ہے؟
۳۔ انسان کیا ہے اور اسکا اصل مقام و مرتبہ کیا ہے؟

انسان دوستی کے حوالے سے اگرچہ آخری سوال بنیادی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ یہ انسان کے مقام ومرتبے پربحث کرتا ہے۔ لیکن پہلے دو سوالات پر بھی نگاہ ڈالنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔

اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ کائنات کی مختلف اشیاء انسان کے لیے بنائی گئی ہیں ۔ وہ اسکی خدمت پر مامور ہیں ۔ یہ ان سے کام لے سکتا ہے۔ اسے ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی ضرورت نہیں ۔ قرآن مجید میں اسے بڑے دلنشین انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

۱۔ جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے اس نے سب کا سب تمہارے فائدے کے لیے پیدا کیا۔
۲۔ اور (اے مخاطب) کیا تجھ کو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے کام میں لگا رکھا ہے زمین کی چیزوں کو اور کشتی کو (بھی) کہ وہ دریا میں اس (خدا) کے حکم سے چلتی ہے۔
۳۔ اور اس نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند کو (اپنا) مسخر(قدرت) بنایا اور ستارے (بھی) اس کے حکم سے مسخر ہیں ۔
٤۔ اور اسی نے چوپایوں کو بنایا ان میں تمہارے جاڑے کا بھی سامان ہے اور بھی بہت سے فائدے ہیں ۔
٥۔ سو انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے کہ ہم نے عجیب طور پر پانی برسایا پھر عجیب طور پر زمین کو پھاڑا ، پھر ہم نے اس میں غلہ، انگور، ترکاری، زیتون اور کھجور اور گنجان باغ میوے اور چارہ پیدا کیا (بعض چیزیں تمہارے) اور (بعض چیزیں) تمہارے مویشی کے فائدے کے لیے۔

٦۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے اور تم پر اپنی تمام نعمتیں پوری کردی ہیں ، کھلی ہوئی نعمتیں بھی اور پوشیدہ نعمتیں بھی۔
۷۔ وہ ایسا (قادر) ہے کہ (بعض) ہرے درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کر دیتا ہے پھر تم اس سے اور آگ سلگاتے ہو۔

ان آیات میں جہاں اللہ تعالیٰ نے کائنات کی یہ تمام چیزیں انسان کے لیے پیدا کی ہیں تو یہ انسان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی ان نعمتوں کو پہچاننے، دریافت کرنے میں اپنی بساط کے مطابق کوشش کرے اور اللہ کی دی ہوئی عقل وفکر اور جہدو عمل کی قوت کو کام میں لا کر ان نفع بخش چیزوں تک رسائی حاصل کرے جو اللہ نے سینہء کائنات میں ودیعت فرمائی ہیں ۔ کیونکہ اس کائنات میں جہاں بہت سی نعمتیں واضح اور عمومی نوعیت کی ہیں جن سے ہر انسان ہر وقت فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ وہاں بعض نعمتیں پوشیدہ بھی ہیں ۔ جن سے فائدہ اٹھانے کے لیے عقل و فکر، محنت اور تجربے کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ساری کائنات کو مسخر تو ضرور کر دیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کائنات کی ساری نعمتیں بغیر محنت و مشقت کے ہاتھ آجائیں گی بلکہ قرآن کے مطابق اسکی خاطر انسان کو تحقیق و جستجو کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جوں جوں انسان تحقیق و جستجو کے میدان میں آگے بڑھتا جائے گا۔ اس کائنات کی نت نئی نعمتیں اس کے سامنے آتی جائیں گی۔

اسلام نے تسخیر کائنات کا جو تصور عطا کیا ہے وہ مغرب کے مادہ پرستانہ تصور سے بہت مختلف ہے۔ مغرب کی تنگ نظری مادے کے اس پار کچھ دیکھنے اور سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ لہٰذا اسکو اپنی تحقیق و جستجو کے نتیجے میں جو نئی چیز دریافت ہوتی ہے وہ اسے محض عقل و فکر اور اپنی محنت و کاوش کا ثمرہ سمجھتی ہے۔ لیکن اسلام کی نظر اس محنت و جستجو اور ان تجربات و انکشافات پر جا کر نہیں رکتی بلکہ وہ ان سب کے پیچھے اس خالق و مالک کی قدرت کا ملہ کا نظارہ کراتا ہے۔ جس نے ایک طرف پوری کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے اور دوسری طرف انسان کو وہ عقل و فکر اور وہ طاقت و توانائی عطا کی ہے جس کے ذریعے اس نے کائنات کی عظیم طاقتوں کو رام کر لیا ہے۔

انسان اس کائنات میں مالکانہ حقوق نہیں رکھتا وہ شتر بے مہار بھی نہیں بلکہ اللہ کا وہ بندہ ہے جس نے اس عارضی اور فانی دنیا میں اس رب کے احکامات کی پیروی کرنی ہے۔ وہ اس دنیا میں اللہ کے نائب اور بندہ کی حیثیت سے زندگی گزار رہا ہے۔ قرآن پاک کی ان آیات میں انسان کی عظمت بھی واضح ہوتی ہے اور اسکی صحیح حیثیت کا تعین بھی ہوتا ہے۔ملاحظہ کیجیے۔
۱۔ اے انسان تجھ کو کس چیز نے تیرے ایسے رب کریم کے ساتھ بھول میں ڈال رکھا ہے جس نے تجھ کو انسان بنایا پھر تیرے اعضا

کو درست کیا پھر تجھ کو (مناسب) اعتدال پر بنایا (اور) جس صورت میں چاہا تجھ کو ترتیب دے دیا۔

۲۔ تو ہم نے (اول) تم کو مٹی سے بنایا پھر نطفہ سے (جو کہ غذا سے پیدا ہوتا ہے) پھر خون کے لوتھڑے سے پھر بوٹی سے کہ (بعضی) پوری ہوتی ہے اور ب(بعضی)ادھوری بھی تاکہ ہم تمہارے سامنے اپنی قدرت ظاہر کریں اور ہم (ماں کے) رحم میں جس (نطفہ) کو چاہتے ہیں ایک مدت متعین (یعنی وقت وضع) تک ٹھیرائے رکھتے ہیں - پھر ہم تم کو بچہ بنا کر باہر لاتے ہیں تاکہ تم اپنی بھر ی جوانی (کی عمر) تک پہنچ جاؤ اور بعضے تم میں وہ بھی ہیں جو (جوانی) سے پہلے ہی مرجاتے ہیں اور بعض تم میں وہ ہے جو نکمی عمر (یعنی بڑھاپے) تک پہنچا دیا جاتا ہے جس کا اثر یہ ہے کہ ایک چیز سے با خبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتا ہے۔

۳۔ اور جب تم کو سمندر میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بجز اللہ کے اور جتنوں کی تم عبادت کرتے تھے سب غائب ہو جاتے ہیں - پھر جب تم کو وہ خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو پھر تم پھر جاتے ہو اور (واقعی) انسان ہے بڑا نا شکرا تو کیا تم اس بات سے بے فکر ہو بیٹھے ہو کہ وہ تم کو خشکی کی جانب میں لا کر زمین میں دھنسا دے یا تم پر کوئی ایسی تند ہوا بھیج دے جو کنکر پتھر برسانے لگے پھر تم کسی کو اپنا کار ساز نہ پاؤ یا تم اس سے بے فکر ہو گئے کہ خدائے تعالیٰ پھر تم کو سمندر میں دوبارہ لے جائے پھر تم پر ہوا کا سخت طوفان بھیج دے پھر تم کو تمہارے کفر کے سبب غرق کر دے پھر اس بات پر کوئی ہمارا پیچھا کرنے والا تم کو نہ ملے۔

٤۔ اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا کہ میری عبادت کیا کریں -

ان آیات میں اگرچہ اللہ نے انسان کی بے بسی اور اسکی حیثیت بیان کر کے بتایا ہے کہ اسے مغرور ، متکبر، غیر ذمہ دار اور ظالم نہیں بننا چاہیے بلکہ اعتدال کی راہ اختیار کرنے چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم عظمت انسانی کا وہ مثبت تصور بھی دیتا ہے جس سے اسکی صحیح حیثیت اور مقام کا تعین ہو تا ہے۔ اسلام کے نزدیک انسان اول و آخر انسان ہے اور انسان رہنے ہی میں اسکی عظمت ہے اگر وہ انسانی مرتبے کو پہچانے اور اس پر قائم رہے تو اللہ کے بعد کائنات کی اعلیٰ ترین مخلوق ہے۔ اللہ نے اسے اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا ہے۔

دنیا کی تمام مخلوق میں انسان ایک خاص مقام رکھتا ہے اس کائنات میں جتنے دوسرے جاندار ہیں ان کی زبان اور نفس کسی نہ کسی دائرہ کے اندر موجود ہیں اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ وہ کسی نہ کسی پروگرام کے مطابق مقررہ کردہ حدود میں کام کرتے ہیں - مگر انسان کے اندر عقل، زبان اور نفس فطری طور پر آزاد ہیں - انسان کو سوچنے کا کلی

اختیار ہے۔ علم کائنات کا حاصل کرنا اس کا مقدر ہے اور مشاہدات کرنا، تجربات پر غور کرنا اور سمجھنا اور اس پر عمل کرنے کے طریقوں کو اختیار کرنا اسکی فضیلت ہے اور اپنے علم اور سوچ کو لفظی جامہ پہنانا اسکی فطرت کا حصہ ہے۔ عقل، سوچ اور زبان مل کر علم کا خزانہ اپنے لیے اور آنے والی نسلوں کے لیے جمع کرتے ہیں جو اسے اشرف المخلوقات بناتے ہیں ۔

انسان اس زمین پر سردار اور اللہ کا خلیفہ ہے۔ ہر شے اللہ کی قدرت سے اس کے تابع بنا دی گئی ہے اللہ تعالیٰ نے تمام ارضی وسائل کا علم انسان کو عطا فرمایا اور بطور نعمت زمین کی طیبات سے فائدہ اٹھانے اور جمال سے لطف اندوز ہونے کی اجازت دی ہے۔ صرف زمین ہی نہیں بلکہ آسمان بھی انسان کے فرائض خلافت میں اس کے مددگار ہیں ۔

قرآن مجید انسانی عظمت کو بہت خوبصورت انداز میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ۔

۱۔ پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے ولا ہوں ۔ انہوں نے عرض کیا کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جواس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کریگا۔ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں فرمایا میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔ اس کے بعد اللہ نے آدمؑ کو ساری چیزوں کے نام سکھائے پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اگر تمہارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے نظام بگڑ جائے گا) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ ۔ انہوں نے عرض کیا نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے۔ ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں ۔ پھر اللہ نے آدم سے کہا تم انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ ۔جب اس نے ان کو ان سب چیزوں کے نام بتا دئیے تو اللہ نے فرمایا امیں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں ۔ جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چپاتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے۔ پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ تو سب جھک گئے مگر ابلیس نے انکار کیا وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا۔

۲۔ قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور طور سنین کی اور اس امن والے شہر کی۔ ہم نے بنایا انسان کو خوب سے خوب اندازے پر۔

۳۔ اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا اور نفیس نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی۔

٤۔ مو سیٰ نے فرمایا: بہت جلد اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دیں گے اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا مالک بنادیں گے پھر تمہارا طرز عمل دیکھیں گے۔
٥۔ اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں صاحب اختیار بنایا اور ایک کا دوسرے پر رتبہ بڑھایا تاکہ (ظاہرا) تم کو آزمائے ان چیزوں میں جو کہ تم کو دی ہیں ۔

جہاں قرآن نے انسانی عظمت کا تصور دیا ہے اس کے ساتھ ساتھ حدیث میں بھی عظمت انسان کا ذکر ملتا ہے۔

١۔ اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔
٢۔ جب تم سے کوئی اپنے خادم کو سزا دے تو چہرے پر نہ مارے۔
٣۔ جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی سے لڑے تو اس کے چہرے پر وار نہیں کرتا۔
٤۔ یہ نہیں کہنا چاہیے کہ اللہ تیرے چہرے کو بگاڑے کہ اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔

عظمت انسانی اسلامی تہذیب کی جان ہے۔ انسان معزز و محترم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلیفہ الارض اور نیابت الہی کا منصب عطا کیا۔ اسے کائنات میں افضل ترین مخلوق قرار دیا۔ انسان کو سجدہ دراصل عظمت بشر کی دلیل ہے۔ اور ابلیس کا انسان کو سجدہ نہ کرنے پر آسمان سے نکل جانے کا حکم دے کر اللہ نے اپنے اس عمل سے عظمت بشر اور احترام انسان کا واضح درس دیا ہے۔ اس کارخانہ قدرت میں سب سے موثر محترم اور فعال عنصر انسان ہے۔ اس کو عقل ، ادراک، ارادہ اور اختیار کی دولت ملی ہے۔ اس کائنات کے سارے ہنگامے، حسن آفرینیاں اور جہاں رنگ و بو کے سارے نقش و نگار اسی کے وجود کے کرشمے ہیں ۔

انسان خلیفہ ہونے کی حیثیت سے صرف خدا ہی کا ما تحت ہے۔ اس کا درجہ تمام چیزوں سے افضل اوراعلیٰ ہے ۔ دنیا کی تما م چیزیں اسکی خا دم ہیں ۔اور جتنی چیز یں اسکے زیر حکم ہیں ان پر اپنے آقا کا آمین ہے ۔اللہ تعا لی ٰنے اپنی مخلوقات میں سے بہت سی چیز یں انسا ن کی اما نت میں دی ہیں اور اسے ان پر تصر ف کے اختیارات عطا کیے ہیں ۔ اسی مقام اوررتبے کونیا بت وخلافت کا نام دیا گیا ہے یہی خلافت اور نیابت انسا ن کی عظمت کی دلیل ہے۔ اسلا م نے انسا ن کو کائنات میں مو جو د تما م مخلو قا ت سے افضل اور اشرف قرار دیا ہے ۔کا ئنا ت میں مو جو د آسما ن ،زمین ،درخت ،دریا ،پہا ڑ، رات،دن،تا ریکی، روشنی عر ض کہ سب چیز یں جنہیں ہم دیکھتے ہیں ۔ جو آسما نو ں اور زمین میں انسا ن کی خد مت کے لیے مخصوص کردی ہیں ۔ سب انسا ن کی خا دم ہیں اور انسا ن کو ان سب پر فضلیت حا صل ہے ۔اس کے سا تھ سا تھ فر شتو ں پر انسان کو ترجیح دینے کی اصل و جہ وہ علم ہے ۔جو اللہ تعا لیٰ نے انسان کو دیا اور فر شتو ں کو نہ دیا ۔ وہ علم ہے علم شر یعت اورعلم خداوندی جس سے انسا ن کو اللہ کی صحیح

معرفت اور پہچان ہوتی ہے اور یہ علم انسان کو بذ ر یعہ پیغمبر و ں حا صل ہو سکتا ہے یہ علم کسی بھی غیر انسان یعنی ملا ئکہ ،جنا ت اور حیوا نا ت و غیر ہ کو عطا نہیں ہوا۔یہی خو بی انسا ن کے لیے با عث تعظیم قرا رپا ئی۔
انسانی عظمت کی ایک اور دلیل اسکا احسن تقو یم ہو نا ہے۔ انسان کو بہتر ین سا خت پر پیداکیا گیا ۔اسے خو بصو رت جسم ،فکر و فہم اور علم و عقل کی بلند پا یہئ قا بلتیں عطا کر کے وہ عظمت اور شر ف عطا کیا جو کسی دو سر ی مخلو ق کو نہیں بخشا گیا ۔انسان کے اَحسن تقو یم ہو نے کی شہا دت میں ان مقا ما ت کی قسم کھا ئی گئی جو خدا کے پیغمبر و ں سے نسبت ر کھتے ہیں ۔ انجیر اور زیتون کی سر زمین یعنی شام و فلسطین کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نسبت ہے۔ کوہ طور پر حضرت موسیٰؑ کو نبوت ملی۔بلد امین مکہ معظمہ ہے جس کی بنا حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیلؑ کے ہاتھوں پڑی۔ گویا نوع انسانی کو ایسی بہترین ساخت پر بنایا کہ اس میں نبوت جیسے عظیم مرتبے کے حامل انسان پیدا ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآ ن کر یم میں اللہ تعالیٰ نے انسا نی مقا م و منصب کو بہت احترا م دیا اور اس کے ابنا ئے جنس میں سے کسی کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ کو ئی ایسا اقدام کرے جس سے کسی دو سر ے شخص کی عزتِ نفس مجر و ح ہو ۔ انسان کے لیے یہ امر بھی باعثِ فضیلت ہے کہ اللہ تعا لیٰ نے اس میں اپنی روح پھونکی۔ جس کے باعث وہ فکر و شعور اور عقل و تمیز اور فیصلہ و اختیار کا حامل قرار پایا جس کی بدولت اسے تمام دوسری مخلوقات ارضی سے ممتاز ایک صاحب شخصیت اور حامل خلافت ہستی قرار دیا گیا۔
مذکورہ بالا حقائق سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان ایک گراں قدر ہستی ہے۔ انسان کا احترام اور وقار بہت مقدم ہے اور انسا ن دوستی کا پیغام بھی یہی ہے۔

> احترام آدمیت ، اعتراف فضیلت کا دوسرا نام ہے جذبہ احترام اپنے اثر اور پھیلاو کے اعتبار سے بہت ہی عظیم ہے ۔ اس سے محبت کے چشمے پھوٹتے ہیں ۔ یہ انسان کو بزرگی عطا کرتا ہے۔ اس کے بدولت معاشرہ ، امن و امان کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ یہ برے خیالات اور غلط اقدام سے روکتا رہتا ہے۔ جب تک یہ جذبہ سرگرم عمل رہتا ہے اس وقت تک فضا پاک صاف رہتی ہے۔ ہر شخص دوسرے کے حق کی حفاظت اور اپنے فرض کی تکمیل میں لگا رہتا ہے۔ کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہیں ہوتی دلوں کو اطمینان کی دولت نصیب رہتی ہے۔

بس ثابت ہوا کہ اسلامی معاشرے میں نہ تو امارت کسی کے لیے وجہ تکریم ہیں اور نہ غربت وجہ ذلت نہ کوئی نسل کے لحاظ سے مسند صدارت پر بیٹھنے کا زیادہ مستحق ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور وجہ

سے محرومِ عظمت، دنیا کا ہر انسان محض انسان ہونے کے ناطے احترام کا مستحق ہے۔

انسان کو عظیم اور عالی مرتبہ عطا کیا گیا ہے۔ انسان دوسری مخلوقات کی طرح نہیں ہے۔ یہ تمام مخلوقات کا حاکم اور اللہ تعالیٰ کا محکوم ہے اور یہ دنیا اس کے لیے امتحان گاہ اور آزمائش گاہ ہے۔ دنیا اس کے لیے محض کھیل تماشا نہیں بن جانا چاہیے۔ بلکہ انسان کی زندگی کا ایک واضح اور نمایاں مقصد عبادت الٰہی ہونا چاہیے۔ انسان مجبور محض نہیں اور نہ ہی مختار گل ہے بلکہ بین بین ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ اپنی محنت اور کوشش کے اجر و ثواب یا مکافات عمل سے محروم نہیں رہتا۔انسان کو اپنا مقام و مرتبہ جو اللہ تعالیٰ نے ازل سے اسے عطا کیا ہے قائم رکھنے کے لیے بھرپور کوشش کرنی چاہیے اور اصلاح معاشرہ کے لیے کوشاں رہنا چاہیے اور انسان دوستی کے جذبے کو پروان چڑھانا چاہیے۔ کیونکہ یہی انسان دوستی صحت مند معاشرے کی پہچان ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ جب ایک انسان دوسرے انسانوں سے پیش آئے تو اس حیثیت سے کہ وہ کائنات کے مالک و آقا کا نمائندہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی نیا بت کا رنگ ہو۔ جہاں تک ممکن ہو سکے وہ اپنے آپ کو اسی رنگ میں پیش کرے جو خود مالک حقیقی کا رنگ ہے۔ اس لیے انسان کو وہ تمام صفات اپنے اندر پیدا کرنی چاہییں جو اللہ رب العزت کی صفات ہیں مثلاََ وہ خالق ہے اس نے انسان کو بھی تخلیق کرنے کی صفت و دیعت فرمائی، وہ اپنی تخلیق کے کسی ذرے سے نفرت نہیں کرتا لہٰذا انسان کو بھی کسی سے نفرت نہ کرنے کا حکم صادر فرمایا ۔وہ اپنی مخلوق سے بے انتہا پیار و محبت کرتا ہے اور اپنی خلقت کو بھی پیار و محبت سے پیش آنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ مکمل حق ہے اس لیے انسان کو حق گوئی کی تلقین فرمائی ہے۔ وہ در گزر کرنے والا ہے اس لیے در گزر کرنے والوں کو عزیز رکھتا ہے۔ رحیم ہے اس لیے انسانوں کو بھی انسانوں اور جانوروں پر رحم کا حکم دیتا ہے اور قہر و ظلم کو نا پسند فرماتا ہے۔وہ نرمی اور حلم کی انتہا ہے اس لیے نرم خو لوگوں کو جنت کی بشارت دیتا ہے اور انصاف کے ترازو میں خلق اعلیٰ کو بھاری ترین وزن قرار دیتا ہے۔ ستار اعظم ہے اس لیے لوگوں کی بھی ایک دوسرے کے لیے عیوب پوشی کو پسند فرماتا ہے۔ وہ انسان کے اعمال کو نہیں نیت کو دیکھتا ہے اس لیے انسان کی ساری قیمت نیک نیتی کے حوالے سے لگاتا ہے۔ وہ ہر بندے کا دوست ہے لہٰذا مخلوق کو بھی انسان دوستی اور ایک دوسرے سے محبت کرنے کا حکم دیتا ہے اور دشمنی کو ناپسند فرماتا ہے۔

ہمارا ہر عمل، ہما ری ہر تخلیق اس کے کرم کے بغیر بے معنی اور ادھوری ہے۔ مثال کے طور پر خاک رسیدہ انسان، انسان کو تخلیق کرتا ہے۔ مگر وہ تخلیق اس خالق اول و آخر کے حکم سے مٹی کا رزق ہو جاتی ہے جبکہ رب العالمین

اپنی کائنات اور مخلوق کو نیست کر کے صدیوں اور قرنوں کے بعد بھی دوبارہ اسی شکل وصورت میں ہست میں لا سکتا ہے۔ ایک ماہر کا ریگر مٹی کا خوبصورت ترین کھلونا تخلیق کر سکتا ہے مگر وہ اس سے اگر ایک بار ٹوٹ جائے تو پھر اس کے لیے اسے جوڑ کر بعینہ دوبارہ ویسا بنانا ممکن نہیں رہتا۔ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی کمی بیشی رہ جاتی ہے لیکن اکمل ذات حق کا معجزہ ہے کہ وہ جب چاہے جیسا چاہے کر ڈالے۔ اے کاش ہم خود کو اسکی عطا کردہ صفات کا اہل ثابت کرسکیں ۔

انسان دوستی یا انسانی محبت کو اسلامی تعلیم میں اول سے آخر تک نہایت اہمیت دی گئی ہے۔ اسلام کی روسے کوئی انسان بلند مقام تک اس وقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا جب تک اس کے اندر انسانی محبت و انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا نہ ہو۔ دنیا پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنی ضروریات زندگی کے لیے سماجی زندگی گزارتا ہے۔ لیکن اگر سماج میں رہنے والوں سے اس کا رویہ خالص کاروباری ہو تو وہ اپنی زندگی کو پر سکون انداز میں نہیں گزار سکتا ۔اس لیے ضروری ہے کہ اس میں بسنے والے لوگوں کے ساتھ اس کا رویہ ہمدردانہ اور مشفقانہ ہو۔ ان کے دکھ درد کواپنا دکھ درد محسو س کر ے اور جب ایک انسان بعض کام ذاتی مفاد سے بلند ہو کر انجام دیتا ہے تو عین تقاضائے انسانیت واخوت ہے اور اسی کا نام خدمتِ خلق اور انسان دوستی ہے۔

قرآن کریم میں اہل ایمان کی خصوصی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا

ترجمہ: وہ اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں وہ خود ضرورت مند کیوں نہ ہوں ۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

ترجمہ: وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے مسکین ، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں ۔

اگر مذاہب عالم کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے مذاہب ایسے ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کا مقصد خدمتِ خلق قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک نیکی کا مفہوم صرف یہی ہے کہ خدا کی مخلوق کی خدمت میں انسان کمر بستہ رہے۔ لیکن اسلام میں خدمتِ خلق نیکی کے متعدد اجزا میں سے ایک جزو ہے اور اسی سے اسلام میں اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمان کی نیکی خدمت خلق کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔اسلامی نقطہ نظر سے خدمتِ خلق سے بڑھ کر کوئی کرامت اور خدمت گار سے بڑھ کر کوئی اور ولی نہیں ہے۔

اگر دنیا میں کسی معاملے میں دوسروں پر سبقت لے جانی ہے تو دوسروں کے سامنے کرامات دکھا کر نہیں بلکہ کسی دکھی دل کو سکون پہنچانے میں لے جانی چاہیے۔ نیکی اور

محبت کے کاموں میں سبقت لے جانی ہی سب سے بڑی کرامت ہے۔

اس ضمن میں یہ بھی واضح رہے کہ قرآن مجید میں امتِ مسلمہ کو "خیر الامت " کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ اسکی تخلیق کا مقصدانسان دوستی کا فروغ اور بنی نو ع انسان کا فائدہ اور نفع ہے۔

سورۃ آل عمران میں اسلام اپنے ماننے والوں کے سامنے خدمت خلق کو ایک مقصد کی حیثیت سے اس طرح پیش کرتا ہے۔

ترجمہ: تم ایک بہترین امت ہو جسے لوگوں کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

اس وقت دنیا میں جہاں کہیں نیکی کا اجالا ہے اور اچھائی کا نور ہے جہاں کہیں بھی نیت کا خلوص اور دل کی صفائی کا اجالا ہے کیا وہ صرف ان ہی بزرگوں کی تعلیم و ہدایت کا نتیجہ نہیں جن کو تم انبیا کرام کے نام سے جانتے ہو۔ پہاڑوں کے غار، جنگلوں کی ویرانیاں ، شہروں کی آبادیاں غرض جہاں بھی رحم، انصاف پروری، یتیموں کی سرپرستی اور نیکیوں کا سراغ ملتا ہے وہ اسی بر گزیدہ جماعت کے کسی نہ کسی فرد کی دعوت اور پکار کا دائمی اثر ہے۔

خدمت خلق دراصل نیکی کی معراج ہے۔ اس سے خود غرضی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ معاشرتی برائیوں کا قلع قمع ہوتا ہے اور پورا معاشرہ پر سکون ہو جاتا ہے۔ یہ حسن معاشرت کا ذریعہ ہے اور حسن معاشرت پر ہی معاشرے کے استحکام اور ترقی کا دارو مدار ہے۔ اور اسی سے ایک انسان دوست معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ خدمت خلق کے پہلو بہ پہلو اخوت کے جذبے کو بھی اسلامی تعلیم میں بنیادی مقام حاصل ہے۔ اس سے مراد روئے زمین کے تمام مسلمانوں کا وہ باہمی تعلق ہے جسکی بنیاد محبت اور خیر خواہی پر ہے۔

وہ شے کیا ہے جسے اس کائنات کے خالق نے کائنات کی رگ رگ میں مستور کر رکھا ہے؟ اس کا نام لیا جائے تو وہ بھی ایک لفظ ہے ہوا، پانی ، مٹی کی طرح، ان لفظوں میں سے ایک لفظ جنہیں ہم بار بار سنتے ہیں لیکن شاید ان پر غور نہیں کرتے لیکن اگر یہ نہ ہوں تو زندگی بھی نہ ہو۔ ہوں نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو وہ لفظ چار حروف کا مجموعہ محبت ہے جی ہاں یہ سارا کارخانہ محبت ہی کی اساس پر قائم ہے۔ محبت ایک زریں مسلک ہے جو انسانوں سے لیکر انسانوں کے خالق تک پھیلتی چلی جاتی ہے۔

ایک مسلمان کا وجود انسانیت کے لیے سراسر پیار و محبت اخوت و بھائی چارہ اور آسودگی کا باعث ہونا چاہیے۔ اس کا جینابھی دوسروں کی خاطر ہو اور مرنا بھی دوسروں کی فلاح و بہبود کے لیے۔ اس کا ایک ایک لمحہ دوسروں کی بھلائی کے لیے بسر ہوتا ہو۔جو اپنے دل میں

پوری انسانیت کا درد و غم رکھتا ہو۔ مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں ۔ اس لیے اخوت کا بنیادی تقاضا یہی ہے کہ مسلمان مشکل میں ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں ۔ کیونکہ دین خیر خواہی ہی کا نام ہے۔ اخوت کا نظام اسی صورت میں برگ و بارلا سکتا ہے جب مسلمان آپس میں محبت کے ایک اٹوٹ رشتے میں منسلک ہوں ان کے درمیان تمام اختلافات یکسر ختم ہو جائیں اور وہ سلوک اور محبت سے رہیں ۔

ارشاد ربانی ہے۔

ترجمہ: اور سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ نہ کرو۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

ترجمہ: مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں ۔

پھر ارشاد فرمایا۔

ترجمہ: دو مومنوں کے دل آپس میں جوڑ دیئے ۔

پس اخوت ہی وہ جذبہ ہے جسکی بدولت ہم دوسروں کے دکھ درد کو اپنے اندر محسوس کرتے ہیں ۔مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نزدیک" جس دل میں محبت اور معرفت نہیں وہ انسان کا دل نہیں ، پتھر کی سل ہے، جس آنکھ میں کبھی آنسو نہ آئے وہ انسان کی آنکھ نہیں نرگس کی آنکھ ہے"۔ اخوت کا لازمی نتیجہ مساوات ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ"دوستی یا اخو ت میں ایک مخصوص قسم کی مسا وات کا مفہو م شا مل ہے"۔ اسلام نوع بشر کو مساوات و برابری کا درس دیتا ہے۔ یہ رنگ و نسل، زبان و علاقائیت اور قومیت و وطنیت کے تمام جھوٹے امتیازات کو مٹا کر پوری انسانی برادری کو ایک خاندان اور ایک کنبہ قرار دیتا ہے۔ قرآن کریم نے انسانی مساوات کا بھر پور درس دیا ہے۔

ارشاد باری ہے۔

ترجمہ: اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے شریف اور معزز وہ ہے جو سب سے پرہیز گار ہے اور جاننے والا خبر دار ہے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تمام انسانوں کی اصل ایک ہے اور تمام انسان ایک ہی آدمؑ و حوا کی اولاد ہیں ۔ اس بنا پر انسان اور انسان کے درمیان کسی فرق و امتیاز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ارشاد ربانی ہے۔

ترجمہ: اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو! جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اسکا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں پھیلائیں ۔

اسلام نے ان تمام مصنوعی معیارات کو ٹھکرا کر لوگوں کو یہ بتایا کہ تخلیق کے اعتبار سے سب لوگ برابر ہیں ۔ بنیادی انسانی ضروریات اور حقوق مساوی ہیں ۔ کوئی شخص محروم نہیں ، معاش، معاشرت اور سیاست میں تمام انسان مساوی بنیادی حقوق رکھتے ہیں ۔ ہاں اگر کوئی

فرق تسلیم کیا جا سکتا ہے تو وہ فقط فکر و عمل اور صلاحیت کا ہے ۔جو انسان بھی اس میدان میں آگے بڑھا وہ اونچا ہوگا۔ اسلام ایسی مساوات کا درس نہیں دیتا جو غیر فطری اور ناممکن الحصول ہو، ایسی نہیں جس کے لیے انسانوں کی آزادی سلب کرلی جائے اور انہیں انسانیت سے نکال کر مشین یا حیوان بنا دیا جائے۔

اسلام اپنے مزاج کے لحاظ سے ساری انسانیت کا نظام ہے۔ وہ سارے انسانوں کو ایک برادری ایک ماں باپ کی اولاد، یکساں ضروریات و حاجات رکھنے والے اور یکساں جذبات و احساسات کے حامل شمار کرتا ہے۔ وہ پیشہ وارانہ طبقات علاقائی اور نسلی تفاوت، رنگ اور خون امتیاز ، معاشی درجہ بندیوں اور انسانوں کی مال و دولت ، نسل ، علاقہ، زبان اور کلچر کی بنا پر امتیاز کرنے سے انکار کرتا ہے ۔ وہ سب انسانوں کو بنیادی حقوق میں مساوی قرار دیتا ہے۔

اسلام کا فلسفہ دیکھئے کہ اس نے ذات پات کی تفریق اور اونچ نیچ کے اندھیروں کو ختم کر کے مساوات کا چراغ جلایا۔ غیروں کے دل آپس میں ملا دیئے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسوں کو دوست بنا دیا۔ نماز دین کا ستون ہے۔ مسجد میں مساوات کا مظاہرہ روزانہ دیکھا جاسکتا ہے۔ اسلام ہی نے آقا اور غلام کو ایک صف میں لاکھڑا کیا اور محمود و ایاز کا فرق مٹا ڈالا ۔ رمضان شریف میں اللہ تعالیٰ نے روزے سب پر فرض کردئیے۔ وقت سحر اور وقت افطار میں مساوات کا ایک خوبصورت رنگ جھلکتا ہے۔صبح کے ایام میں سب سے زیادہ مساوات کا درس ملتا ہے۔ حاجی ایک جیسا لباس زیب تن کرتے ہیں ۔ خدا کے حضور ایک ہی طریقے سے پیشانی جھکاتے ہیں۔ الگ الگ علاقوں اور خطوں سے آنے والے مساوات کا مظاہرہ کرتے ہیں اور رنگ و نسل کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ در حقیقت اسلام نے انسانیت کو عدل ، مساوات اور تقویٰ کے جس اصول سے آشنا کیا ہے۔ وہ اسکی امتیازی شان ہے۔ اس سے ذات پات، رنگ و نسل اور جغرافیا ئی فرق و امتیاز کے تمام بت پاش پاش ہو جاتے ہیں ۔ اسلام ہی وہ دین ہے جو نسل انسانی کی وحدت و یکسانیت اور یک رنگی کا داعی ہے۔ ورنہ اسلام جب تک نہیں آیا تھا، انسانیت رنگ و نسل اور طبقاتی امتیازات میں بری طرح جکڑی ہوئی تھی۔ اسلام آیا تو اس نے پوری قوت سے مساوات کی منادی کی اور حضرت محمد ؐ نے اپنے پیروؤں کو یہی تعلیم دی۔

ترجمہ: تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کا خمیر مٹی سے اٹھا ہے۔ خبر دار تم میں سے کسی عربی کو عجمی پر کوئی بزرگی حاصل نہیں ہے۔ تم میں سے کوئی سرخ رنگ کا سیاہ رنگ کے لوگوں پر فضیلت نہیں رکھتا ہے اور نہ کسی سیاہ رنگ کے آدمی کو سرخ رنگ کے شخص پر کوئی بزرگی حاصل ہے۔

اسلام نے سیاہ رنگت پر سے حقارت کی گندگی کو تیز آلوں سے کھرچ دیا اور سارے انسانوں کو خواہ وہ گورے تھے یا کالے خواہ وہ آقا

تھے یا غلا م جو کل تک بازاروں میں بکنے کا مال سمجھے جاتے تھے ایک جیسی حیثیت دے دی۔

تاریخ اسلام مساوات کی مثالوں سے پر ہے۔ حضور خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کی زندگیاں مساوات کا عملی نمونہ پیش کرتی ہیں ۔ حضور نے مواخات مدینہ کی مثال پیش کر کے اسلامی مساوات و اخوت کا بہترین مظاہرہ کیا۔ تاریخ انسانی اخوت کی ایسی نظیر پیش کرنے سے قاصرہے۔

سوزدروں فکر و عمل کا سب سے زبردست محرک ہے۔ اس سوز کے تحت افراد انسانیت اور اس کے مسائل پر بڑی ہمدردی کے ساتھ غور و فکر کرتے ہیں اور پھر اپنے نتائج فکر سے انسانیت کو عملی اعتبار سے مالا مال بھی کرتے ہیں ۔ یہ سوز ان کے اندر ایثار، ہمدردی، بے نفسی اور بصیرت پیدا کرتا ہے۔ یہ ان کے اندر ایک ایسے لافانی اور مقدس احساس کی پرورش کرتا ہے جو انہیں ہر لمحہ ان کے فرائض سے آگاہ رکھتا ہے اور انہیں بتاتا ہے کہ وہ جب تک دوسروں کی تکلیفات کو اپنی تکلیفات پر مقدم نہیں رکھتے اس وقت وہ اس فرض سے صحیح معنوں میں سبکدوش نہیں ہو سکتے جو ایک انسان کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتا ہے اس بنا پر یہ سوز انسان دوستی اور فرض شناسی کی سب سے مضبوط اور مستحکم بنیاد ہے۔

غرض مذہبی نظریہ انسانی عظمت کا معترف دکھائی دیتا ہے۔ اور معاشرے میں خدمت خلق، درد دل ، اخوت و بھائی چارہ، مساوات و برابری کے پیغام کوعام کرتا ہے۔ کیونکہ ان تمام اقدار پر عمل پیرا ہو کر ہی ایک انسان دوست معاشرے کا قیام عمل میں لایا جا سکتا ہے اور انسان دوستی کے پیغام کو عام کیا جاسکتا ہے۔

cd

با ب دوم

انسان دوستی کا مذہبی نظریہ اور اردو نظم

۱۔ اردو میں ابتدائی صوفیانہ اور فارسی شعری روایت
۲۔ بہمنی دور کی شعری روایت اور انسان دوستی
۳۔ عادل شاہی اور قطب شاہی دور کی شعری روایت اور انسان دوستی
٤۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کے مختلف ادوار اور انسان دوستی
۵۔ ایہام گوئی کی تحریک اور انسان دوستی
٦۔ میرو سودا کا عہد اور انسان دوستی
۷ ۔ گلزار نسیم اور انسان دوستی
۸۔ انیس و دبیر کا عہد اور انسان دوستی
۹۔ نظیر اکبر آبادی اور انسان دوستی
۱۰۔ انجمن پنجاب کی نظم نگاری کی تحریک اور انسان دوستی
۱۱۔ اقبال اورمعاصرین اقبال کی انسان دوستی
۱۲۔ حوالہ جات

Fe

اردو میں ابتدائی صوفیانہ اور فارسی شعری روایت

اردو شاعری میں انسان دوستی کی تاریخ و روایت کا جائزہ لیں تو سب سے پہلے بر صغیر پاک و ہند میں صوفیائے کرام اور فارسی شعراء کی مذہبی ، اخلاقی اور اور صوفیانہ شاعری پر نظر جاتی ہے۔ اس شاعری میں گو ابتدائی اردو زبان کے خدو خال بنتے دکھائی دیتے ہیں ۔ لیکن مو ضوعاتی اعتبار سے اس میں انسان دوستی کے مختلف نمونے ملتے ہیں ۔

آیئے پہلے ایک نگاہ صوفیانہ شعری روایت پر ڈالتے ہیں ۔

آنحضرتؐ شافع محشر ، وجہ وجود کائنات اور خاتم النبیین کے بعد صحابہ کرام نے اسلام کے عالمگیر پیغام کو عرب سے باہر تک پہنچایا ۔ پھر ملوکیت کا دور آیا تو مسلمان مبلغین نے علم اسلام کو اپنے مبارک ہاتھوں میں مضبوطی کے ساتھ تھاما اور رحمت اللعالمین کے پیغام کو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچایا ۔ یہی وجہ ہے کہ آج اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ برصغیر میں اسلام صوفیائے کرام کی بدولت پہنچا تو اس حقیقت سے کسی کو انکار ممکن نہیں ۔ یہی وہ مردانِ حق تھے جنہوں نے پورے برصغیر کو اسلام کا گہوارہ بنا دیا ۔ یہاں رشدو ہدایت کا سلسلہ شروع کیا تو ہزاروں لوگ کفر کی ظلمت سے نکل کر اسلام کی روشنی میں آنے لگے ۔ انہوں نے نہ صرف اسلام کی شرعی تعلیمات کو رواج دیا بلکہ اسلام کی روحانی ضیاؤں کو پھیلانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

> اسلام کے یہ سفیر کالے کوسوں کا سفر طے کر کے لاہور میں اسی غرض سے آئے تھے کہ یہاں بسنے والے انسانوں کو راہ ہدایت دکھائیں ۔ان کے تاریک سینوں کو نورِ اسلام سے جگمگائیں ۔ انہوں نے مصطفیٰ کریمؐ کی سیرت طیبہ میں رنگی ہوئی اپنی زندگیوں کو ان کے سامنے پیش کیا۔ لوگ ان کے اخلاق و کردار سے متاثر ہوئے اور جوق در جوق ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ اسلام کے ان سفیروں نے گناہوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ان انسانوں کو اٹھایا اور محبت سے اپنے سینوں سے لگایا اور پھر اسلام کا وہ لافانی و ابدی پیغام انہیں سنایا جو دلوں کو مسرت و کامرانیوں سے ہمکنار اور محبت و اخوت کے جذبوں سے سرشار کرنے والا ہے۔

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلام سلامتی کا علمبردار ہے۔ وہ امن ، اخوت ، محبت اور مساوات کی تعلیم دیتا ہے ۔ بھائی کو بھائی سے ملا تا ہے اور دلوں کو نفرت سے دور کرتا ہے ۔ صوفیاء کرام بھی یہی پیغام لیکر ہندوستان آئے ۔ ان کے اخلاق کی کشش اور انسان دوستی کے جذبے نے انسانوں کا دل موہ لیا ۔ ان کے گفتار و کردار میں خلوص تھا ، پیار تھا ، شیرینی تھی ، نہ کسی کو تکلیف

پہنچائی نہ کسی کا دل دکھایا ، سب کے مونس و غمخوار تھے ۔ ان کی تگ و دو ملکوں کو اجاڑنے کے لیے نہیں بلکہ انسانوں کو سنوارنے کے لیے ہوتی تھی ۔یہ تخریب کے نہیں بلکہ تعمیر کے علمبردار تھے ۔یہ پتھر صفت انسانوں میں پارس کی خوبیاں پیدا کرنے کا جوہر رکھتے تھے ۔ انہوں نے نفس کو عبادت کی مشق کرانا اور اسے احکام الٰہی کی طرف پھیرنے کا کام کیا ۔حقوق اللہ اور حقوق العبادپر عمل کرنا ، اکل حلال ، اللہ کی عبادت اس طرح کرنا گویا اسے دیکھ رہے ہوں ۔ تمام اچھے اخلاق کو اختیار کیا اور برے اخلاق کو ترک کیا۔ اپنی ذاتی پسند کو ترک کیا اور سب سے بڑی چیز تزکیہ نفس کے فریضے کو اپنے ذمہ لیا۔ اصل میں نفس کے تزکیہ واصلاح پر ہی انسان کی اصلاح وفلاح کا دارومدار ہے۔

تزکیہ نفس کے متعلق حضورؐ کا ارشاد ہے ۔

> خبردار انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے۔ اگر اس کی اصلاح ہوگئی تو تمام جسم کی اصلاح ہوگئی ۔اگر وہ خراب ہوگیا تو سارا جسم خراب ہوجاتا ہے اور خبردار وہ لوتھڑا قلب "دل" ہے ۔

ثابت ہوا کہ انسان کی اصلاح دل کی پاکیزگی سے ہوتی ہے اور دل کی پاکی اللہ تعالیٰ کی ہدایتوں پر اسوئہ حسنہ کی روشنی میں عمل سے ہوتی ہے اور دل کی پاکی یہ ہے کہ مومن کی حرکت اور عمل اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع ہو اور رسول اللہؐ کی سنت کے مطابق ہو۔ ان صوفیوں نے عشق کا جو پیغام دیا وہ انسان دوستی کی زبردست اساس بن گیا اور تمام انسانوں سے محبت کا پیغام بن گیا ۔

> صوفیاء کا گروہ ہی وہ گروہ ہے جو خالصتاً اللہ تبارک و تعالیٰ کے راستے پر گامزن ہے ۔ سیرت تمام لوگوں کی سیرتوں سے بہتر ہے۔ ان کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔ ان کا راستہ ہی صحیح راستہ ہے بلکہ اگر تمام عاقلوں کی عقل، تمام حکما کی حکمتوں اور سوز شریعت سے واقف علما کے علم کو جمع کیا جائے تاکہ صوفیہ کی سیرت واخلاق میں کوئی تبدیلی کی جاسکے اور ان کے اخلاق وسیرت کے مقابلے میں سیرت واخلاق کا نمونہ پیش کیا جائے تو یہ بات ناممکن ہوگی کیونکہ صوفیہ کے ظاہر وباطن کی تمام حرکات وسکنات مشکوٰۃ نبوت کے نور سے ماخوذ ہیں اور دنیا میں نورِ نبوت سے بہتر کوئی اور نور تو ہے ہی نہیں جس سے اکتسابِ نور کیا جاسکے۔

صوفیا کرام دنیاوی حرص وطمع سے دور اور شہرت وجاہ سے نفور تھے۔ ان نفوس قدسیہ کا بس ایک ہی کام تھا کہ سنت مصطفی پر صدق دل سے پہلے خود عمل پیرا ہوں اور پھر دوسروں کو اس کی تلقین کریں ۔ ان کے نزدیک مخلوقِ خدا کی خدمت اور دوسروں کو دینا بہترین عمل تھا۔ انہوں نے وطنیت، قومیت، رنگت اور لسانیت کے تنگ دائروں

سے نکل کر آفاقیت آشنا ہونے کا درس دیا۔ سفاکی، ظلم وتشدد اور حیوانیت کی جگہ جوہر انسانیت کو اجاگر کرنے کی تعلیم دی۔ پورے برصغیر پاک وہند میں انسان دوستی، مروت اور اجتماعیت کی مستقل روایت کو پیدا کیا اور نہ صرف اس علاقے میں بسنے والے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان تہذیبی وثقافتی اشتراکات کو پیدا کیا بلکہ مذہبی سطح پر بھی رواداری، عمل اور برداشت جیسے رویوں کو فروع دیا۔

ان صوفیوں کی خانقاہیں ایسی تربیت گاہیں تھیں جہاں انسان ڈھلتے تھے۔ہزاروں انسان کیا مسلم کیا غیرمسلم دور دراز کے علاقے طے کرتے ہوئے کبھی فرد فرد کبھی جوق در جوق آپ سے آپ ان کی بارگاہوں میں کھینچے چلے آتے ہیں اور فیض روحانی حاصل کر کے نہاں ہوجاتے ہیں ۔

حکیم محمود احمد برکاتی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ

> شاہ ولی اللہ کا مدرسہ رحیمہ صرف ایک درسگاہ نہیں تھا بلکہ بر صغیر کی انقلابی تحریک کا مرکزی ادارہ تھا۔ اسے ایک خانقاہ کی حیثیت بھی حاصل تھی ۔ یہاں کردار بنائے جاتے تھے ۔ یہاں انسان ڈھالے جاتے تھے اور مجاہدین کی تربیت کی جاتی تھی ۔

شیرازہ اسلام کو نئے طرز پر مجتمع کرنے والے درد مندوں ہی کو آج صوفیاء کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان کے پہلے دور کورسنہ ٦٦١ء سے سنہ ٨٥٠ ء تک وسعتیں حاصل ہیں ۔ اس دور کے صوفیاء میں حضرت اویس قرنیؒ ، حضرت رابعہ بصریٰ ، حضرت خواجہ حسن بصری، حضرت مالک بن دینا رؒ ، حضرت محمد واسع اور حضرت ابراہیم ادم کے نام خصوصیت سے لیے جاتے ہیں ۔ ان کی انفرادی جدوجہد نے جو اجتماعی نتیجہ نکالا اسکے ثمرہ میں آج دنیا میں اسلام اپنی حقیقی روح کے ساتھ باقی ہے۔ان صوفیا میں خشیت الہیٰ کی صفت موجود تھی۔اس لئے وہ توبہ پر بہت زور دیتے تھے کیونکہ توبہ انسان میں انفعال پیدا کرتی ہے اور انفعال کسی لغزش کو دوبارہ ہونے سے روکتا ہے۔ان میں اللہ کا خوف اس کی محبت سے بھی زیادہ تھاہر چند کہ یہ صوفیا الگ تھلگ رہتے تھے مگر جب کبھی اظہار حق کی ضرورت پیش آتی تھی۔ ان کی زبان صادق پر بے جھجک حق آجاتا تھا۔انہوں نے عجز وانکساری، تو کل وایثار ، عبادت وریاضت اور انسان دوستی پر زور دیا۔

اسلام صرف ملک گیری اور ملک رانی کا نام نہیں بلکہ یہ اصلاح و تربیت کا ایک مکمل نظام ہے ۔جو انسان کو ارتقائے روحانی کا راستہ دکھا تا ہے۔ اگر دور اول سے ان صوفیاء کے حالات کوحذف کردیا جائے تو مسلمانوں کی تاریخ ملک گیری اور جہاں بانی کی داستان بن کر رہ جائے گی۔ انہوں نے تصوف اور اسلام میں جو مطابقت اور یگانگت پیدا کی اور جس طرح اسلام کے اعلیٰ نظریات کو اپنی اصلی صورت میں برقرار رکھنے کی کوشش کی وہ ناقابل فراموش ہے۔ یہ انسان دوستی کی خشت اولین تھی جو بعد میں صوفیاء کے ذریعے مختلف ملکوں میں

اسلام کی تبلیغ کا ایک بڑا ذریعہ بنی ۔گویا بعد کے صوفیاء نے اس آغاز کو بڑی خوبی سے انجام تک پہنچایا ۔

نویں صدی عیسوی میں عقلیت کے ساتھ ساتھ وضعیت کا طوفان بھی اٹھا۔ اس وضعیت کا برا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہب کی آواز دل تک نہیں پہنچتی اور جب دل ہی متاثر نہ ہو تو مذہب کی حقیقی روح سے آشناہونا ناممکن ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں صوفیاء کا طبقہ میدان عمل میں آیا جو عقلیت اور ذہنیت سے بیزار تھا ۔ ان میں حضرت بایزید بسطامی ، حضرت ذوالنون مصری ؒ ،منصور حلاج، حضرت جنید بغدادی ؒ جو دور ثانی کے مشہور مشائخ میں سے تھے نمایاں مقام رکھتے ہیں ۔ انہوں نے عقلیت کے خلاف آواز بلند کی اور عشق پر زور دیا ۔کیونکہ عقلیت اور وضعیت کے مسموم اثرات کو عشق ہی زائل کر سکتا تھا۔ ان صوفیا کا کہنا تھا کہ اگر ستاروں کی گزرگاہوں کو ڈھونڈنے کی بجائے انسان اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرے توو وہ اپنی شخصی اور قومی زندگی شاید بہتر بنا سکے اور سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنے کے بجائے اگر زندگی کی شب تاریک کو سحر کرنے کی کوشش کرے تو اس سے بنی نوع انسان کو زیادہ فائدہ ہو۔وہ مادی ترقی جو انسان کو معبود حقیقی سے دور لے جائے ترقی نہیں بلکہ زوال ہے۔چنانچہ ان صوفیا نے عشق سے عقلیت کا مقابلہ کیا اور بتایا کہ عشق ہی سے منزل مقصود کا پتہ چل سکتا ہے ورنہ عقل تو دو قدم بھی راہ حقیقت پر ساتھ نہیں دیتی ۔

اس دور میں عشق اور علم باطن پرزیادہ زور دیاگیا ۔توحید کے سلسلے میں غور وفکر لوگوں کو وحدت الوجود کیطرف لے گیا۔اس مسلک کے ماننے والوں کے مطابق کائنات میں بجز خدا کے اور کچھ نہیں ہے۔خالق اور مخلوق کا جوہر ایک ہے۔یہی وجہ ہے کہ طالب حق کمال کے درجہ کو پہنچتا ہے تو وہ منصور حلاج کی طرح اناالحق (میں حق ہوں چلا اٹھتا ہے میرا لباس حق کے سوا کچھ نہیں ہے) کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ اسی دعوے الوہیت کی بنا پراسے تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔وحدت الوجود کے قائل لوگوں کے بارے میں علامہ فتح پوری کی رائے یہ ہے کہ

> "یہ ہوالکل کا نعرہ بلند کرتے ہیں ۔یعنی کائنات کی ہر شے میں خدا کا ظہور ہے اور ماسوائے اللہ کے اور کچھ نہیں ہے۔ انسان اور خدا میں وہی نسبت ہے جو قطرہ اور دریا میں ہے"۔

دسویں صدی عیسوی میں تزکیہ و نفس اور اصلاح باطن جو دین کا مقصد تھا بالکل بھلا دیا گیا تھا اور مذہب کی صورت مسخ ہو کر رہ گئی تھی۔کیونکہ ایک زبردست گمراہی اس دور میں یہ پیدا ہوئی کہ فقہی مسائل میں حیلہ سازی کا باب کھل گیا اور ہر شرعی حکم سے بچنے کے لئے حیلے اور ہر قید شریعت سے نکل بھاگنے کے لئے بہانے تراشے جانے لگے۔صوفیا کا گروہ جو اس نامبارک دور میں موجود تھا ۔ان میں شیخ ابو سعید ابن العربی المتوفی ۹۵۲ء سنہ، شیخ ابو محمد الخلدی المتوفی

۹۵۹ء سنہ، شیخ ابو الغراج المتوفی ۹۸۸ ،شیخ ابو بکر المتوفی 1000ء اور ابوعبدالرحمن السلمیٰ المتوفی۱۰۲۱ وغیرہ شامل تھے۔یہ صوفیا ء کرام زبان و قلم کے ذریعے مصروف جہاد تھے اور اصلاح باطن پر روز دے رہے تھے۔انہوں نے اپنے حلقہ اثر میں اسلامی نظریات کو اصلی اور حقیقی صورت میں رائج کرنے کی انتھک کوشش کی۔ حیلہ سازیوں سے پیدا ہونے والے ہر فتنہ سے لوگوں کو روشناس کراکے اس سے دامن بچانے کی تلقین کی۔کیونکہ حیلہ بازی سے جو گندگی اور آلودگی معاشرہ میں پھیل گئی تھی اسکاعلاج سوائے تزکیہ نفس کے اور کچھ نہ تھا۔

گیارہویں صدی عیسوی میں تصوف پر جو رہبانیت اور بدعت کا لیبل لگا دیا تھا اتار کر پھینک دیا گیا اور ثابت کر دیا گیا کہ تصوف قرآن و سنت سے ماخوذ ہے۔ اس کا ہرمشغلہ شریعت سے مطابقت رکھتا ہے۔شریعت اور طریقت کی ہم آہنگی کا فائدہ یہ ہوا کہ تصوف کی طرف اب عام طور سے علمائے کرام کھینچنے لگے اور منافرت اور مغائرت کی فضا قطعاً بدل گئی۔ گویا تصوف کی عوامی مقبولیت کا زمانہ آگیا ۔شیخ ابوالقاسم قشیری ۱۰۷٦ سنہ شیخ علی ہجویری ۱۰۷۲اور ۱۰۷۹ کے درمیان شیخ عبداللہ انصاری ۱۰۸۸ء سنہ اور شیخ ابوسعید ابی الخیر ۱۰٤۹ ء سنہ اس عہد میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ۔

بارہویں صدی عیسوی میں اسلامی تصوف کی تاریخ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں تصوف کو ایک فن کی حیثیت حاصل ہوئی ۔ اس عہد کی نمایاں شخصیات میں حضرت امام غزالی ،غوث اعظم محی الدین عبدالقادر جیلانی،شیخ اکبر حضرت محی الدین العربی اور حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔ امام غزالی نے تصوف کو ایک باقاعدہ فن کی حیثیت دی اور اپنی اخلاقی تعلیم کی بنیاد تین چیزوں پرر کھی۔ وجدان، حکمت اور نفسیات۔ وہ جو کچھ کہتے اس میں ایک نفسیاتی گہرائی ہوتی جو ایسے حکمانہ انداز سے پیش کی جاتی کہ صحیح اور دینی وجدان رکھنے والا پیغام کو مانے بغیر نہیں رہتا ۔امام غزالی نے اگر علمی طور پر تصوف کو ایک مستقل فن بنانے کی عظیم خدمت انجام دی تو شیخ عبدالقادر جیلانی نے علمی اعتبار سے اس تحریک میں جان ڈالی ۔حضرت شیخ دینی اور اخلاقی زوال کو جسکا سب سے بڑا مرکز خود بغداد تھا دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے اور تمام دنیا اسلام جو دینی زوال کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کے حالات دیکھ کر ان کے سینے میں محبت اسلامی اور غیرت دینی کا جوش اٹھتا تھا ۔وہ اپنے اس قلبی احساس اور درد کو بعض اوقات چھپا نہیں سکے اور یہ دریا ان کے خطبات اور مواعظ میں امڈ آیا ہے۔ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں ۔

جناب رسول اللہ کے دین کی دیواریں پے درپے گر رہی ہیں اور اس کی بنیاد بکھری جاتی ہے۔ اے باشندگان زمین آو! اور جو گر گیا ہے اس کو مضبوط کردیں اور جو ڈھے گیا ہے اس کو درست کر دیں ۔ یہ

چیز ایک سے پوری نہیں ہوتی سب ہی کو مل کر کام کرنا چاہیے ۔اے سورج ،اے چاند اور اے دن تم سب آؤ۔

بارھویں صدی کی تیسری عظیم الشان شخصیت شیخ اکبر محی الدین ابن العربی کی ہے ۔ آپ نے تصوف کو اس بلندی تک پہنچایا جس کے بعد کسی بلندی کا تصور محال ہو جاتا ہے۔ آپ کے فلسفہ کا مرکزی نقطہ وحدت الوجود ہے یعنی یہ کہ خدا کے سوا کائنات میں کوئی چیز موجود نہیں ۔ کائنات کی اشیاء اپنا وجود نہیں رکھتیں ۔ ساری کائنات حقیقت عظمیٰ کا خارجی اظہار ہے حقیقت میں وجود صرف باری تعالیٰ ہے ۔

آیئے اب ایک نظر فارسی شاعری اور انسان دوستی پر ڈالتے ہیں ۔

فارسی شاعری میں انسان دوستی ، محبت ، رواداری ، وسیع المشربی ، آزادی خیال اور اتحادِ مذاہب کا درس ملتا ہے ۔ فارسی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کا مزاج روحانی ہے ۔ یہ دلوں میں خدا کی ہستی کا یقین پیدا کرتا ہے ۔دنیا خدا کی طرف یوں کشش پر مجبورہے جس طرح عاشق محبوب کی طرف کھینچا ہوا چلا جاتا ہے۔ ان شعراء کے ہاں وحدت الوجود کا تصور دکھائی دیتا ہے۔ جس کے تحت خدا کی ذات ہی اول ہے وہی آخر وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ۔ اس کی وحدت کا تصور دوئی اور غیرت کے سائے سے پاک ہے۔ گویا کائنات کو خدا کا پر تو سمجھنا بلکہ یوں کہیے کہ اس کے سوا ہر دوسری شے کی نفی ہو جاتی ہے جب عقیدہ یہ ہو تو انسان انسان میں فرق بے معنی ہوجاتا ہے ۔اس وحدت سے انسانی وحدت اور اس مساوات سے انسانی مساوات اور محبت کل کی نہریں نکلتی ہیں ۔ ساری فارسی اور اردو شاعری میں محبت کل کا نمایاں عکس نظر آتا ہے ۔ خدا ایک محبوب ہے جس کے عشق میں تمام ذراتِ عالم سرگرداں ہیں ۔ عشق کے معاملے میں یہ مجاز سے حقیقت کی طرف پیش رفت کے قائل ہیں ۔ چنانچہ اس روئے ارض پر موجود تمام مخلوقات ان کے لیے عشق کی اولین منزل بن جاتی ہیں اور یہیں سے انسان دوستی کے چشمے پھوٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ۔

فارسی کے کلاسیکی شعراء متعصبانہ ، وطن پرستی ، جارحانہ نسل پرستی اور قوم پرستی اور مذہبی تنگ نظری کے تصور کے خلاف ہیں ۔ ان شعراء نے رنگ ونسل کے امتیازات کو مٹاتے ہوئے تمام بنی نوع انسان کو محبت ، رواداری اور انسان دوستی کا درس دیا اور اس کی خاطر ہر قسم کی تکالیف اور پریشانیوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور تمام دنیا میں امن و آشتی اور پیار و محبت کا راگ الاپا۔فارسی شعراء میں غم کا عنصر غالب دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء کی نظموں میں بلکہ غزل کے مفرد اشعار میں بھی زندگی کی بے ثباتی اور غم انجامی کا مضمون بتکرار ملتا ہے ۔دنیا جو ناپائیدار ہے اس لیے اس کی بے ثباتی کا غم مئے ومینا میں ڈبو دیا جائے تو بہتر ہے ۔

حافظ اور خیام کے کلام میں امید اور رجا کی کچھ جھلک ہے۔ ان دونوں شاعروں کے نزدیک بھی دنیا بے ثبات ہے اور غم و الم اس کا آئینہ مسلّم ہے ۔اس لیے اس کا ماتم کرنے کے بجائے مئے ومطرب سے دل لگا لینا چاہیے۔ زندگی ایک معمہ ہے جس کی تعبیر نہایت مشکل ہے ۔ علم باوجود اپنی تمام اسرار کشائیوں اور زہد و پاکبازیوں کے راز حیات تک نہیں پہنچا سکتا۔ پس اس دنیائے فانی میں انسان کے لیے کوئی نسخہ اس سے بہتر نہیں ہوسکتا کہ جہاں تک بھی ممکن ہو عمر عزیز کو بے غمی اور آزادی میں گزار دیا جائے ۔

خیاؔم کے نزدیک غموں کو پاس نہ آنے دیا جائے اور شراب و شاہد کی دلفریبیوں سے تلخئ روزگار کو مٹا دیا جائے ایک ایسا تصور تھا جو اردو شاعری میں آزادی اور انسان دوستی کی شکل میں ظاہر ہوا ۔دودؔ کی جیسا شاعر جسے فارسی شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے ۔وہ بھی اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کو ہر حال میں خوش رہنا چاہیے اور اس خوشی کے حصول کے لیے تندرستی ، خرد مندی ، نیک خوئی اور نیک نامی پر بڑا زور دیتا ہے۔ رود کیؔ دنیا میں موجود ہر قسم کی نعمتوں سے مستفید ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ چنانچہ وہ جوانی کے سرور کو نہیں بھولتا اور بڑھاپے میں بھی ایسے اشعار قلمبند کرتا ہے۔

مرا بسود فروریخت هرچه دندان بود
بنود دندان لابل چراغ تابان بود
دلم خزانہ پر گنج بود گنج سخن !
نشان نامہ ما مہر وشعر عنو ان بود
بسا دلا کہ بسان حریر کردہ بشعر
از آن سپلس کہ بکردار سنگ و سندان بو د

(تاریخ ادبیاتِ عالم، ص: ۱٤٧)

اسی طرح دقیقیؔ جیسے نامور شاعر نے بھی آزاد خیالی، رواداری اور انسان دوستی اور رندی کے مضامین بہت عمدگی سے باندھے ہیں ۔ عمر خیام جس کے علم و فضل کا زمانے میں بڑا شہرہ تھا ۔ مذہبی معلومات میں بھی یکتا و یگانہ تھا ۔ بوعلی سینا کے ہم پایہ سمجھا جاتا تھا ۔ اس کے نزدیک بھی سب سے بڑی نیکی یہی ہے کہ انسان دوسروں کو تکلیف نہ پہنچائے اور اس کے ظاہر و باطن میں تضاد نہ ہو ۔ کیونکہ یہ منافقانہ رویہ معاشرے میں شر پھیلانے کا باعث بنتا ہے ۔

سید سلیما ن ندوی کے نزدیک : " خیام ایک صوفی تھا اور اس کا پیغام روحانی "۔ "مولانا شبلی نعمانی اسے سعدی سے بھی بڑا معلم اخلاق قرار دیتے ہیں ۔" فارسی کے صوفی شاعروں کے علاوہ ان شاعروں نے بھی جور سماَؔ صوفی نہیں اخلاق کا ایک نظام تجویز کیا ۔ چنانچہ سنائی ، عطار اور رومی وغیرہ کے علاوہ نظامی ، ابن یمین ، سعدی اور

حافظ انوری، خاقانی اور خسرو اور بہت بعد میں صائب وغیرہ نے اخلاق اور انسان دوستی کی ایک خاص نہج سے ہمیں آشنا کیا ۔ فارسی شاعری کی اخلاقیات میں خدا سے محبت کے بعد انسانی محبت کو اولین درجہ حاصل ہے ۔اس کے بعد انسان کی خدمت کو پھر مال و دولت سے بے نیازی کو کیونکہ دولت کی محبت تمام انفرادی اور اجتماعی بیماریوں کی جڑ ہے۔قدیم تہذیب میں تواضع اور انکساری دو اہم قدریں تھیں اور انہیں اخلاق اورشرافت کے اہم لوازم میں شمار کیا جاتا تھا۔ جدید لوگ اس کے معنی سے بے خبر ہیں ۔یہ رویے انسان دوستی پر مبنی تھے۔ ان میں مساوات انسانی کا رنگ تھا۔یہی وجہ ہے کہ پرانے لوگ عاجزی و انکساری کو کمال کی اولین سیڑھی قرار دیتے تھے۔بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ فارسی شاعری آزادی ،طلب ،جدوجہد اور عزت نفس کی تعلیم نہیں دیتی ۔لیکن یہ خیال درست نہیں کیونکہ عزلت وخاکساری کی تعلیم کے ضمن میں فی الحقیقت آزادی اور خود داری ہی کی تلقین ہے۔فارسی کا کوئی بڑا شاعر ایسا نہ ہو گا جس نے خاکساری کا پیغام نہ دیا ہو۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فارسی شاعری کسب معاش سے روکتی ہے۔اس میں شک نہیں کہ فارسی شاعری میں استغنا پر بڑازور دیا گیا ہے اور اس زراندوزی سے جو آبرو اور خود داری کو فروخت کرنے سے ممکن ہو بہت ڈرایا گیا ہے۔چونکہ طلب معاش کے لئے دربار شاہی اور محل امرا کا طواف کرنا پڑتا ہے اور اس میں ایک خود دار آدمی کو اپنی عزت نفس کی بہت سی قربانی کرنی پڑتی ہے۔اس لئے اہل دل اور ارباب کمال ایسے معاش سے پرہیز کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔اس کے علاوہ فروتنی ،انکسار ،عام ہمدردی اور خلوص وغیرہ فارسی شاعری کے عام مضامین ہیں جو انسان دوستی کا پیغام دیتے ہیں ۔

بریڈلے شاعری کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔

شاعری قوموں میں کلچر پیدا کرتی ہے اور زندگی کے اہم مسائل کے متعلق ذہن و فکر کےلئے ایک نہج متعین کرتی ہے۔جب انسانوں کی تھکی ہوئی روح دنیا کے مصائب اور معاش کی کلفتوں سے نجات پاکرخلوت کدوں میں اطمینان وتسکین کی تلاش کرتی ہے تو ایسے اوقات میں اسے شعر کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے۔شعر اسے رسوم و قواعد کی اس بستی سے دور تخیل کی ایک اور جنت میں لے جاتا ہے۔جہاں وہ کچھ دیر کے لئے مدہوشی کے گھنے سائے میں شیریں غفلت کا لطف اٹھا کر اور عناصر کی آلودگیوں سے پاک ہو کر پھر تازہ دم ہو جاتی ہے۔شاعری کی تاثیر اس سے بھی زیادہ ہے۔وہ قوموں کے کردار اور اخلاق کو سنوراتی ہے کائنات اور اس کے مسائل سے متعلق عرفان سے بہرہ ور کرتی ہے۔موت اور زندگی جمال اور عمل صالح، عشق اور عقل ،یاس اور امید، خوشی اور غم ،عفت اور پاک دامنی ،فضائل اور مکارم ،غرض اس جہاں آب و گل کے تمام

مقاصد و مطالب کے متعلق ایک واضح فکری اور جذباتی رویہ اختیار کرتی ہے۔

حافظ کو لسان الغیب یعنی (غیب کے راز کھولنے والی)زبان اس لئے کہا ہے کیونکہ انہوں نے قارئین کو غیب کی باتیں بتائیں اوران پر دل کے وہ راز کھوے جو اکثر کومعلوم نہ تھے ۔ان کی حکمت کی بنیاد ی باتیں نمایاں ہیں ۔ایک تو یہ کہ زندگی ناپائیدار اور فنا پذیر ہے اور دوسری یہ کہ چونکہ یہ معلوم نہیں کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ اس لئے جو وقت بھی ملے غنیمت خیال کرکے اسے خوشی سے گزارنا چاہیے۔بے فکری اور بے حسی کے عالم میں بے محابا دادعیش دینا اور گہرے شعورِ الم کے ساتھ پُر وقار اور مہذب خوشی دلی جو حوصلہ زیست کی ضامن ہو اور شے ہے۔ دنیا میں کون ہے جوکشتہئ غم نہیں کون ہے جو تغیرات و انقلابات کے صدمے نہیں اٹھاتا۔ لیکن ان کا بہادری سے مقابلہ کرنا ہی حافظؒ کا بنیادی نکتہ ہے۔ان کے ہاں زندگی کا خلاصہ سوزِعشق ہے۔وہ دل جس میں نورِ اخلاص ومحبت نہیں وہ تیرہ و تاریک ہے۔ان کے نزدیک زندگی نیکی،نکوئی اور خیر کا نام ہے ۔اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ کسی سے بُرائی نہ کی جائے کسی کا بُرا نہ سوچا جائے ۔اس رویے کے لئے صفائے قلب کی ضرورت ہے یعنی دل کا نفاق ،انتقام ،حسد اور مکر سے پاک ہونا لازمی ہے۔ اور یہی انسان دوستی کی خصوصیات ہیں ۔ حافظؒ نے ایسی ہی انسانیت نوازی پر زور دیا ہے۔ "حافظؒ کی خوش دلی کسی کھلنڈرے، احساس باختہ ،اوباش آدمی کی خوش دلی نہیں ۔یہ ایک تعمیر پسند رجائی، تجزیہ پسند، مثبت فکر والے حکیم کاسلسلہ تربیت ہے جو غم کی مایوسی کو پہلے خوش دلی میں پھر امید میں اور بالا آخر ایک بامعنی زندگی میں بدل سکتا ہے"۔

حافظؒ یاس ،اضمحلال اور منفی رویہ زندگی کے مخالف تھے اور ہر حال میں خوش اور پُر امید رہنے پر زور دیتے تھے۔

دیوان حافظ بڑے بڑے رہنماؤں اور مفکروں کےلئے تسکین اور رہنمائی کا وسیلہ ثابت ہوا۔ کہتے ہیں ربندر ناتھ ٹیگور اور سر تیج بہادر سپرو،دیوان حافظ کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے اور اشعار سے رہنمائی حاصل کرتے تھے ۔تاریخ شاہد ہے کہ بعض اوقات ایک ایک شعر اور نظم نے سلطنتوں میں انقلاب برپاکردیے۔بے سہارا انسانوں کے دلوں میں اولوالعزمی کی چنگاریاں روشن ہو گئیں اور ایسے نازک معاملات کا پُرامن تصفیعہ ہوگیا جن میں تلواریں اور تیر بھی بے اثر ہوچکے تھے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کا عہد مسلم تاریخ کا تاریک،پُرآشوب اور ہولناک دور ہے۔عام و خواص کی تفریق کے بغیر پُورا مسلم معاشرہ بے چارگی، مایوسی بے یقینی اور خوف و ہراس کا شکار تھا۔آبادیاں و یرانوں میں بدل رہی تھیں ۔مسلسل خون خرابوں اور آئے دن کی یورش نے لوگوں کو سنگدل بنا دیا تھا۔تاتاری یلغار نے قریب قریب پوری مسلم دنیا

کو سیلاب کی طرح آ لیا۔ شاہی درگاہیں پُرخطر تھیں ۔ لیکن فقیروں کی درگاہیں امن وآشتی کا گہوارہ تھیں ۔چنانچہ وہی عام اور خاص کا مرجع بن گئیں ۔مولانا رومی کی نشوونما ایسے گھرانے میں ہوئی جہاں علوم ظاہری اور معارف باطنی دونوں کے سوتے ایک جا ملتے ہیں ۔ انہوں نے دونوں سے فیض اٹھایا۔ شمس تبریز کی صحبت نے احوال و مواجید سے آشنا کیا۔عالمانہ عزوتفاخر نے فقیرانہ تواضع اور استغنا کے لئے جگہ خالی کی۔ عالمانہ فضل و کمال اور صوفیانہ احوال ومواجید نے مثنوی کا پیکر اختیار کیا۔ مولانا نے اپنی مثنوی میں انسان دوستی ،انسانی عظمت و رفعت کا علم بلند کیا ۔بہار الدین بحری کی حسب روایت مولانا کا قول تھا۔ "جو عطارؒ کے کلام کو پڑھے گا سنائیؒ کے کلام کو سمجھنے کی طاقت پیدا ہو گی اور جو سنائیؒ کا کلام پڑھے گا۔ میرے کلام سے فائدہ اٹھائے گا"۔

چنانچہ مثنوی میں ان بزرگوں کے انداز کلام ان کے الفاظ اور فقیرے ہی نہیں بلکہ اکثر معارف اور خیالات بھی آگئے ہیں ۔مولانا کے کلام میں افسردگی و اداسی اور قنوطیت کا رنگ دکھائی نہیں دیتا بلکہ وہ رجائیت کے پیامبربن کر سامنے آئے ہیں ۔ان کی ذات میں محبت اور ہمدردی اور انسان دوستی کا جذبہ بدرجہء اتم موجود تھا اور دوسروں کو بھی اسکی تلقین کرتے تھے ۔

بقول مولانا محمد عبدالسلام خان !

> بزرگوں اور تعلق رکھنے والوں کے خلاف بدگوئی کا متحمل نہیں ہوتا تھا ۔ فوراً مشتعل ہوجاتے تھے لیکن عام حالات میں نرم خو تھے ۔ اہل و عیال سے محبت ، متحلصین پر عنایت و شفقت اور حسن سلوک مولانا کی فطرت تھی ۔ غیور کے ساتھ ساتھ آشتی پسند ،ظریف اطبع اور بذلہ سنج تھے ۔ حلیم تواضع ، قناعت اور مال ودولت سے بے تعلقی افتاد طبع تھی ۔ کسبِ حلال اور جدوجہد کو اہمیت دیتے تھے ۔لوگوں کی حاجت براری کے لیے حکام کو سفارشی خطوط لکھنے سے دریغ نہ تھا ۔

رومی کے کلام میں عظمت انسانی کے مطالب بھی ہیں اور انسان کامل کی تلاش اور اس کے نقوش اور اس کی تعریف و توصیف بھی موجود ہے۔ وہ انسان کو عالم اکبر اور مظہر آیات حق کہتے ہیں ۔

رومی کا مثالی انسان ملکوتی علم سے بہرہ ور ہو کر مادی اور روحانی دنیا کی فرمانروائی حاصل کرلیتا ہے اور وہ دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتا ہے اس کے کفر میں دین کی خوشبو ہوتی ہے۔ اس کا شک بھی یقین کا رنگ رکھتا ہے۔ وہ عقل کل بھی ہے اور نفس کل بھی اس کی ذات مظہر حق ہے وہی امام برحق ہے خواہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خاندان سے ہو یاحضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خاندان سے وہی مہدی اور حادی ہے۔

رومیؒ کے اشعار دیکھیئے جو انسانی عظمت کی دلیل ہیں

بلکہ والی گشت موجودات را
بی گمان وبی نفاق وبی ریا
سیل وجوہابرمرادِ او روند
اختران زان سان کہ خواہد آن شوند
بل مکان ولا مکان درحکم او
ہمچودر حکم ہشتی چار جو

ایران کی قومی داستان اور تاریخ کو زندہ کرنے اور فارسی زبان میں ایک نئی جان ڈالنے کے لحاظ سے ابوقاسم فردوسی ایران کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ فردوسیؔ کی شاہنامہ ایک رزمیہ داستان ہے۔ اس لیے ممکن ہے یہ خیال ہو کہ یہ کتاب شروع سے آخر تک جنگ ، بہادری اور قتل و خون کے واقعات سے بھری پڑی ہے ۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں بہت سے باریک معانی اور فلسفیانہ اجتماعی اور اخلاقی مطالب بھی بیان کیے گئے ہیں ۔ اس میں موجود نصیحتیں اور حکیمانہ اقوال انفرادی اور اجتماعی طور پر لوگوں کو نیکی ، شجاعت ، بزرگی ، بلند ہمتی ، خدا پرستی ، حکمرانی ،عدل گستری اور مردم پروری کی تعلیم دیتے ہیں اور انسان دوستی کے پیغام کو عام کرتے ہیں ۔

چنانچہ لکھتے ہیں :
بیاتا جہاں را بہ بد نسپریم
بکوشش ہمہ دست نیکی پریم
نباشد ہمی نیک و بد پائدار
ہماں بہ کہ نیکی بو دیا دگار
ہماں گنج دنیا رو کاخِ بلند
بخواہد بدن مرتر سود مند

(تاریخ ادبیات ایران :۱۱۷)

گویا فردوسیؔ شاہنامہ میں عظمت انسان کا معترف دکھائی دیتا ہے ۔اس کے نزدیک انسان تمام مخلوفات میں افضل واعلیٰ ہے اور تمام مخلوقات اس کی مطیع اور فرما نبردار ہیں ۔

موجودہ فارسی کا رواج ہندوستان میں بعد اسلام اور خاص کر غزنویوں کی سلطنت کے بعد ہوا ۔ مغلوں کے عہد میں یہ زبان ہندوستان میں خوب پھلی پھولی اور فارسی زبان میں شعر کہنے والے شاعر اور علماء و فضلاء پیدا ہونے لگے۔ ان میں سے ایک مشہور ترین شاعر امیر خسرو ہیں ۔جو اس عہد کے بعض مشہور ایرانی شاعروں کے ہمعصر ہیں ۔یہ مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کے حلقہ ارادت میں شامل تھے ۔ خسرؔو نے ان ہی سے سلوک ، طریقت ، ریاضت اور درویشی کی تعلیم حاصل کی ۔ خسرؔو کے ہاں تقویٰ اور اخلا قی مضامین بکثرت دکھائی دیتے ہیں ۔امیر خسرو نے اپنی تصنیف " آئینہ سکندری " میں اپنی انسان دوستی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۔

اپنے قلب سے خود غرضی کا رنگ صاف کرو۔ خوشگوار چہرہ کے ساتھ جو کچھ ہے اسے دوسروں کو بخش دو اور

اپنے تحائف سے سب کو نوازو اور اس بلی کی طرح نہ ہو
جو کھانے کا سامان پا کر ایک گوشہ میں جاکر اسے کھانے
کے لیے بیٹھ جاتی ہے۔ ایک گدھا بھی اپنی بیوی بچوں کے
لیے فراخ دل ہوتا ہے۔ وہ آدمی جس کی سخاوت صرف اس
کے خاندان تک محدود ہو خود غرض ہے ۔

امیر خسرؔو اپنی مثنوی " مطلع الانوار " میں انسانی عظمت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

اے انسان تو سارے جہان کی روح ہے ۔جو سارے جہاں میں
سمائے ہوئے ہے ۔وہ تو ہے ، تو بادشاہ ہے اور دونوں عالم
تیری ملکیت میں شامل ہیں تو بادشاہ ہے اور تیرا تخت چار
عناصر ہیں۔ تو خدا کے خزانے کی کنجی ہے۔ تجھے خدا نے
بے فائدہ پیدا نہیں کیا ۔

شیخ سعدؔی کا شمار فارسی زبان کے نابغہء روزگار شاعروں میں ہوتا ہے ۔ سعدؔی کا نام آتے ہی ان کی دو مشہور کتابیں "گلستان و بوستان " ذہن میں آجاتی ہیں ۔ اس نے صرف درس و کتاب ہی سے استفادہ نہیں کیا تھا بلکہ زمانے نے بھی اس کی تادیب خاطر خواہ کی تھی ۔اس کی عمر کا ایک بڑا اور مفیدحصہ نہایت کٹھن اور دور دراز سفر کرنے اور دنیا کے عجائبات اور قدرت کی رنگینیاں دیکھنے میں بسر ہوا تھا۔ سلطنتوں کے پے در پے انقلابات اور ملکوں کے متواتر تغیرات ، ظالم بادشاہوں اور بے رحم عاملوں کے ظلم و ستم دیکھتے ہی دیکھتے بنی نوع کی دل سوزی اور ہمدردی اس کی طبیعت میں راسخ ہو گئی تھی ۔ یوں سعدؔی ایک بہت بڑے انسان دوست شاعر کے طور پر سامنے آتا ہے ۔

سعدیؒ کی حکایتوں میں اتحاد و یگانگت ، پیار و محبت اور انسان دوستی کی تعلیم ملتی ہے ۔ خلقت کی خیر خواہی اور ہمدردی اللہ تعالیٰ نے اس کی سرشت میں ودیعت کی تھی۔ سعدؔی کے نزدیک اللہ کے نیک بندے وہ ہوتے ہیں جو لوگوں کے غم کو اپنا غم سمجھتے ہیں اور جب کسی کو غم میں مبتلا دیکھتے ہیں تو خود بھی غمگین ہو جاتے ہیں ۔ اس کے نصائح اور مواعظ ہر گز اس قدر مقبول نہ ہوتے اگر انسانی ہمدردی کا جوش ان کے دل میں نہ ہوتا۔ اس نے اپنی زبان اور قلم کو بندوں کی نصیحت کے لیے وقف کر دیا تھا اور حق بات کہنے سے خطرناک موقعوں پر بھی نہ چوکتا تھا ۔اشعار ملاحظہ کیجیے۔

رَحِمَ اللہ مَعْشَرَ الماضِیْن

کہ بہ مردی قدم سپرد ندے
راحت نفس بندگان خداے
راحتِ جانِ خود شمرد ندے
آں عزیزاں چو زندہ می نشوند
کاش ایں ناکساں بحردندے

(تذکرہ صوفیائے بنگال،ص: ۲۵۵)

اعجاز الحق قدوسی سعدیؔ کی انسان دوستی کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

> سعدیؔ ہر فرقے اور ہر گروہ کے آدمیوں سے ملتا اور ان کی صحبت سے فائدہ حاصل کرتا تھا۔ جس طرح وہ فقراء اور مشائخ کے حلقوں میں بیٹھتا تھا۔ اسی طرح امراء کی مجلسوں اور بادشاہوں کے دربار میں بھی شریک ہوتا تھا۔ کبھی وہ ابرار اور احرار کی صحبت سے مستفید ہوتا تھا اور کبھی اوباش ،الواط کے جلسوں کا تماشائی تھا۔ نہ اس کو شراب خانے میں جانے سے عار تھا ۔ نہ بت خانے میں رہنے سے تنگ تھا۔ اسی نے جامع بعلیک میں مدتوں وعظ کیا تھا اور وہی بت خانہ سومنات میں ایک مدت تک پجاری رہا ۔ کبھی وہ بصرے کے نخلستان میں یاروں کے ساتھ کھجوریں توڑتا نظر آتا تھا اور کبھی فلسطین کی بستیوں میں پیاسوں کو پانی پلاتا پھرتا تھا ۔ غرضیکہ اس کی تمام عمر خصائل انسانی اور نیرنگی روزگار کے مطالعے میں بسر ہوئی۔ اسی سبب سے یورپ کے بعض مصنفوں نے اس کو "گریٹ مورلسٹ" کہا ہے اور اسی وجہ سے اخلاق بشری کی تصویر جس عمدگی کے ساتھ اس نے اپنے کلام میں کھینچی ہے ۔ ویسی آج تک ایران کے کسی شاعر سے نہیں کھنچ سکی ۔

بہمنی دور کی شعری روایت اور انسان دوستی (۱۳۵۰۔۱۵۲۵)

آٹھویں صدی ہجری میں دکن میں علم و ادب کی ابتداء ہوئی ۔ اس زمانے کی تصانیف میں زیادہ تر مذہبی کتابیں شامل ہیں ۔ اس دور میں ہمیں تین قسم کے موضوعات دکھائی دیتے ہیں ۔اول کسی دلچسپ ، عجیب اور معروف حصے کو نظم کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے اور قاری کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ اسے نصیحت حاصل ہو۔ دوم کسی مشہور مذہبی یا تاریخی واقعے کو داستانی دلچسپی کے ساتھ نظم کر دیا جاتا ہے۔ سوم : تصوف اور اخلاق پر مشتمل موضوعات ہیں ۔پہلے موضوع کی نمائندگی فخردین نظامی کی مثنوی "کدم را و پدم راو "کرتی ہے۔ جبکہ دوسرے موضوع کے نمائندہ اشرف بیابانی ہیں ۔ جنہوں نے اپنی مثنوی " نوسرہار"میں شہادت امام حسین اور واقعہ کربلاکو نظم کیا ہے اور تیسرے موضوع کی نمائندگی میراں جی شمس العشاق کرتے ہیں ۔جنہوں نے تصوف کے رموز کو شاعری کے پیرائے میں طالبعلموں کی ہدایت کےلئے بیان کیا ہے۔دکن میں شعر وادب کی روایت کے حوالے سے بات کرتے ہوئے حامد حسن قادری کہتے ہیں ۔

> اس میں شک نہیں کہ اردو زبان کی ایجاد اور شاعری و تصنیف کا طرہ شمالی ہند کے سر ہے۔ لیکن یہ کارنامے

امتیاز و اعزاز سے بڑھ کر کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ بر خلاف دکن کے کہ اردو زبان کے رواج میں دکن شمالی ہند سے بہت پیچھے ہے اس پر بھی دکن نے اردو کی اتنی قدر کی کہ چودھویں صدی عیسوی سے اٹھارہویں صدی تک نظم و نثر کی صدہاکتابیں تیار کر دیں جن میں شعرو سخن اور علم و فن کی مختلف اصناف شامل ہیں ۔

حضرت گیسودراز نے دکن میں چشتی سلسلہ کے اس مسلک کو فروغ دیا جو انسان اور انسان کی محبت پر یقین کامل رکھتا تھا۔ یوں انسان دوستی، محبت اور روشن خیالی کے ذریعے دکن میں گیسودراز اور ان کے مسلک کو مقبولیت خاص حاصل ہوئی۔انہوں نے تعزیر کی جگہ محبت و عنایت کو فروغ دیا اور ظلم کی جگہ لطف وکرم کو عام کیا۔ گیسودراز کا "چکی نامہ" انسان کی باطنی تربیت کےلئے تحریر کیا گیا ہے۔"چکی نامہ" میں انسانی وجود کو چکی کا استعارہ بنایا گیا ہے کہ جب تن کی چکی اللہ ہو کا ورد اختیار کر لیتی ہے تو اسکا باطنی تجربہ شروع ہو جاتا ہے اور یوں انسان کا ہر عمل اپنی رب کی رضا کی خاطر ہوتا ہے۔اس لئے وہ مخلوق خدا کو ہرمصیبت، پریشانی اور دکھ سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتاہے اور انسان دوستی کے جذبے کو پروان چڑھاتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری گیسودراز اور ان کی چکی نامہ کے بارے میں ان خیا لات کا اظہار کر تے ہیں ۔

حضرت گیسودراز دکن کی سرزمین پہ مرجع خلائق بن گئے تھے۔ صوفیا کا مشرب انسان دوستی اور رہنمائی تھا۔ یہ ایک ایسا مشرب تھا کہ جس نے صدیوں تک برصغیر کی اخلاقیات پر گہرا اثر ڈالے رکھا۔وہ انسان کو اسکی گمراہیوں سے ہٹا کر اس کے باطنی مرکز کی سمت سفر کا رستہ دکھاتے تھے اور جب باطنی مرکز بیدار ہو کر آنکھ کھولتا تھا تو اس وقت تک اسکی قلب ماہیت ہوچکی ہوتی تھی اور اب یہ انسان معاشرہ کی فلاح کا موجب بنتا تھا ۔وہ خود دوسرے انسانوں کو ان کے باطنی مرکز کا راستہ دکھاتا اور یوں معاشرہ کشودِقلوب کے باعث انسان اور انسانیت سے محبت کرنا سیکھتا تھا۔ صوفیا کی تعلیمات صرف باطنی دنیا تک محدود نہ تھیں بلکہ انسانی زندگی کی ترتیب و تنظیم کا درس بھی ان میں موجودتھا۔ان کا یہ سوال کہ انسان کیا ہے اور ہر زمیں پر اس کے فرائض کیا ہیں ؟ ایک بڑی صداقت کو دریافت کرنے کی دعوت دیتا ہے اور جب انسان اس صداقت کو پالیتا ہے تو اسکی باطنی اور دینوی ترتیب کا مرحلہ شروع ہوجاتا ہے۔حضرت گیسودراز کا " چکی نامہ" انسان کی اس باطنی تربیت کے لئے لکھا گیا۔

حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کی صوفیانہ تحریروں میں "شہادت الحقیقت" "خوشنامہ" ،خوش نغز" اور "مغزمرغوب" شامل ہیں ۔ان چاروں کتابوں میں تصوف کے مسائل کا بھر پور بیان ملتا ہے ۔اس کے علاوہ انہوں نے دوہے بھی لکھے۔ ان دوہوں نے عام آدمی کی اخلاقی تربیت اور اصلاح کا بھرپور فریضہ سر انجام دیا۔معاشرتی دکھ درد، پیارو محبت، اخلاقِ انسانیت، نیکی و شرافت اور انسان دوستی ان دوہوں کے مقبول موضوعات تھے۔

عادل شاہی اور قطب شاہی دور کی شعری روایت اور انسان دوستی
دکن میں بہمنی سلطنت کے زوال پر یہاں پانچ آزاد اور خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں ان میں سے د و مشہور ریاستیں جن میں بیجا پور کی عادل شاہی ریاست اور گولکنڈہ کی قطب شاہی ریاست شامل ہے۔ ان دونوں ریاستوں نے اردو زبان و ادب کی ترقی و فروغ اور انسان دوستی میں اہم کردار ادا کیا ۔

عادل بادشاہوں کا دور حکومت (۱۴۹۰۔۱۶۸۵) تقریباً دو سو برس کے عرصے پر محیط ہے۔ اس طویل عرصے میں عادل شاہیوں کی علم و ادب سے دلچسپی اور سرپرستی کی بدولت بے شمار شعراء اور مصنفین پیدا ہوئے۔ جن میں شاہ برہان الدین جانم ، صنعتی، ملک خشنود ، کمال خان رستمی ، حسن شوقی ، شاہ امین الدین اعلیٰ ، نصرتی اور سید میراں خان کا نام قابل ذکر ہے ۔

اس دور میں نثری تصانیف کے علاوہ شاعری نے بہت ترقی کی ۔ اس دور کے شعراء نے ہر صنف سخن مثلاً قصیدہ مرثیہ،غزل، رباعی، مثنوی، گیت اور دوہے سب میں طبع آزمائی کی۔سب سے زیادہ فروغ مثنوی کو حاصل ہوا۔ مثنوی کے علاوہ قصیدہ نگاری کاآغاز ہوا۔ شاہ برہان الدین جانمؒ نے اپنے والد شاہ میراں جی شمس العشاق کی طرح نظم و نثر دونوں میں عارفانہ خیالات اور تصوف کے مسائل پیش کئے۔انکی طویل مثنوی " ارشاد نامہ"تصوف کے مضامین کی بہترین عکاس ہے۔نظموں کے علاوہ جانمؒ نے خیال اور دوہے بھی لکھے۔ان دوہوں کا موضوع انسانی سچائیاں اور دکھ سکھ ہیں ۔یہ عام زبان میں پیش کئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی انسان دوستی کے غماز ہیں ۔

ڈاکٹر تبسم کا شمیری جانمؒ کے کلام پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ

> جانمؒ کے زمانہ میں بھگتوں کی روایت پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی اور ہر طرف ان کی انسان دوستی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔قدیم اردو میں گجری کے دور سے یہ آوازیں پہلی بار سنائی دیں ۔شیخ باجن ،جیوگام دھنی اور شیخ خوب محمد چشتی کے کلام میں ان آوازوں کی بازگشت بار بار سنائی دیتی ہے اور بعد ازاں وہی روایت دکن کا سفر طے کرتی ہے اور بیچاپوری صوفی شعرا کے کلام میں سنائی دینے لگتی ہے۔شاہ برہان الدین جانمؒ کا کلام اس روایت

سے وابستہ ہے۔ انہوں نے مختلف راگ راگینوں میں جو
نظمیں کہی ہیں وہ اپنے اسلوب اور ساخت کے اعتبار سے
شیخ بہاالدین باجن کی شعریت کے قریب ہیں ۔ ہندوی اسلوب
میں لکھا گیا یہ کلام ان کے صوفیانہ خیالات میں پائے
جانے والے مخصوص روحانی سوزوگدازکا اظہار کرتا ہے۔
عبدؔل نے اپنی طویل اردو مثنوی "ابراہیم نامہ " لکھی اس مثنوی میں
انہوں نے اپنے محسن ابراہیم عاد ل شاہ کے حالات قلمبندکیے ہیں ۔مثنوی
کی ابتدا حمدو نعت سے کرتے ہوئے مدح یاران رسول ؐ اور اپنے مرشد
خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی تعریف بیان کی ہے۔اس مثنوی کے متعلق
ڈاکٹر جمیل جابسی لکھتے ہیں ۔

معاشرتی و تہذیبی نقطہ نظر سے بھی اس مثنوی کی خاص
اہمیت ہے۔اس کے مطالعہ سے اس دور کی زندگی،
طورطریقے، رسوم ورواج ،ادب و آداب، انداز نشست
وبرخاست،لباس وزیورات، عمارات و آرائش،مجلس زندگی
،تقربیات ،تفریحات رقص و موسیقی کا عام ذوق بادشاہ وشرفا
کے معمولات کی ایک واضح تصویر سامنے آجاتی ہے ۔

صنعتیؔ کی دو مثنویاں "واقعہ بے نظیر" اور "گلدستہ" بھی قابل ذکر
ہیں ۔اس کے علاوہ ملک خشنودنے امیرخسرو کی فارسی مثنویوں کا اردو
میں ترجمہ کیا۔جن میں " ہشت بہشت "بازار حسن اور "یوسف زلیخا"
شامل ہیں ۔ مثنوی "ہشت بہشت" میں انہوں نے دنیا کی بے وفائی سے
متعلق اشعار بہت دکھ کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

عجب بے مہر دنیا بے وفا ہے
محبت عین اس کا سب جفا ہے
جتے ہیں دوستاں ، فرزند ساقی
شکل ہیں گو الگ اور سب سنگائی
کہاں دارا، کہاں سکندر، شیر
کیانی
کہاں جمشید جم حاتم و درانی
کہاں خسرو کہاں اور ستم و زال
سنیا نوشیرواں کا کیا ہوا حال
چلے جوں نیک مرداں چل تو
خشنود
خدا حاصل کریں گا دل کا مقصود

(خوشنود ہشت بہشت بحوالہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان،
جلد ششم،ص:٤٦٤)

رستمیؔ نے اُردو کی طویل ترین رزمیہ مثنوی " خاور نامہ" لکھی۔یہ
شاہنامہ فردوسی کی طرز پر ایک طویل مثنوی ہے۔اس میں رستمی نے
حضرت علیؑاور آپ کے ساتھیوں کی مختلف بادشاہوں ،دیووں ،پریوں
،جادوگروں اور آدم خور سے لڑائیوں کا حال اس طرح بیان کیا ہے کہ

جنگ کا اصل منظر نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے ۔حسن شوقیؒ صرف بزم کا شاعر نہ تھا بلکہ اسے بزم کے علاوہ رزم پر بھی پورا عبور حاصل تھا۔ان کی مثنوی فتح نامہ نظام شاہ " دکن کی مشہور جنگ تالی کوٹ کی بہترین عکاس ہے۔ان کی دوسری مثنوی "میزبانی نامہ" بھی قابل ذکر ہے۔اپنی مثنوی " فتح نامہ شاہ " میں وہ رزم گاہ کا منظر پیش کرتے ہیں جس میں گھوڑوں ، تلواروں ،لاشوں ، آگوں اور دھوئیں نے ایک خوف ناک منظرپیش کیا ہے۔ہرطرف آہ و بکا سنائی دیتی ہے اور ایک ایسا شور برپا ہوا ہے۔جس سے دھرتی کا سینہ کانپ اٹھا ہے۔

سو یکبار کا بھار سارا اتھا
دھرت ہور گگن میں دھولارا اتھا
نہ آسمان دستا نہ دستی زمیں
زمین بھار سیتی کماں ہو خمی
دھواں گرد میں مل کر گردوں ہوا
اسد خان جو جگ میں دہانہوں ہوا
نہ دیکھیں ایکس آنکھ کوں کھول کر
نہ کوئی کس پچھانے بچن بول کر
نکل گئے سو اوسان بے سد ہوئے
کتے پھٹ کلیجے سو دھاکوں ہوئے
(دیوان حسن شوقی،ص ۱۰۸)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری حسن شوقی کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔" شوقیؒ ایک زبردست شعری نابعہ تھا۔وہ اپنے عہد میں ماضی سے زیادہ حال اور حال سے زیادہ مستقبل کا شاعر تھا۔" نصرؔتی رزمیہ اور بزمیہ دونوں قسم کی شاعری کا استاد تھا۔ قصیدہ گوئی اور مثنوی نگاری میں دکن کا کوئی دوسرا شاعر اس کا ہم پلہ نہیں ۔ان کی مثنویوں میں "گلشن عشق"، "علی نامہ"اور مثنوی " تاریخ اسکندری " شامل ہیں ۔ان کی مثنوی "گلشن عشق "میں اس دور کی معاشرت وتہذیب کی عکاسی بڑی خو بصورتی سے کی ہے۔ اس کے علاوہ اخلاق اور انسان دوستی کے مضامین کثرت سے دکھائی دیتے ہیں ۔" علی نامہ" ان کی رزمیہ مثنوی ہے ۔جس میں انہوں نے عادل شاہ کی ان تمام جنگوں ، فتوحات ، معرکوں اور واقعات کو تفصیل سے پیش کیا ہے ۔ میدان جنگ کا منظر پیش کرتے ہوئے وہاں جو شورو ہنگامہ برپا ہے اور خوف و ہراس سے لوگوں کی جو کیفیت ہو رہی ہے اس دکھ کا بیا ن انسان ودست نصرتیؒ یوں کر تے ہیں ۔

کھناکھن تے کھڑکاں کے یوں شور اٹھیا
جو تن میں پہاڑاں کے لرزا چھوٹیا

بلا نید میں تھے سو ہوشیار ہوئی
اجل خواب غفلت تے بیدار ہوئی
سلاحاں میں کھڑکاں جو دھنے
لگے
اگن ہور رگت مل برسنے لگے
ہویاں لھوکیاں چھٹکاں ہوا پر
بخار
سٹیں تیغ جیباں تے شعلے ہزار
(دیوان نصرتیؔ ۔ ص:
۱۳۸۔۱۳۹)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نصرتیؔ کے بارے میں رقمطراز ہیں :

نصرتیؔ کی صورت میں دبستان بیجا پور کے بہترین شعری اسالیب کا تعین کیا جاتا ہے ۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نصرتیؔ کی شکل میں دبستان بیجا پور کے مجموعی شعری تجربات کی تکمیل ہوجاتی ہے ۔ بڑا شاعر وہی ہے جو اپنے عہد کی آواز بن جاتا ہے اور اس آواز میں اس کے عہد کا ادبی شعور بولتا ہے ۔ علی عادل شاہ ثانی کے دور تک پہنچتے پہنچتے بیجاپوری دبستان نے جو روایات قائم کی تھیں وہ نصرتیؔ کی شکل میں یک جا ہوجاتی ہیں ۔

ہاشمیؔ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ انہوں نے مرثیہ ، مثنوی ، قصیدہ اور غزل میں طبع آزمائی کی ۔ ان کی مثنویوں میں "یوسف زلیخا " اور معراج نامہ " قابلِ ذکر " ہیں ۔

گولکنڈہ کے قطب شاہی حکمرانوں (۱۵۱۸۔۱۶۸۶) نے بیجا پور کے عادل شاہی حکمرانوں کی طرح اپنی ذاتی کاوشوں سے اردو زبان وادب کو بہت فروغ دیا ۔ قطب شاہی حکمرانوں کی شعروسخن سے دلچسپی اور اہل علم و فضل کی قدردانی اور شعراء وعلماء کی سرپرستی کی بناء پر ان کے دور حکمرانی میں بڑے بڑے علماء نے اردو زبان کو خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور شاعری کو فروغ حاصل ہوا ۔ اس دور کے اہم شعراء میں محمدقلی قطب شاہ ، وجہی ، ملا غواصی،ابن نشاطی اور بلاقی وغیرہ نمایاں ہیں ۔ محمد قلی قطب شاہی سلطنت کا پانچواں فرمانروا اور پرگو شاعر تھا ۔اس نے اپنی شاعری کو صرف ادب کے مخصوص موضوعات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس نے زندگی کی ہر چھوٹی بڑی اہم اورغیر اہم بات کو شاعری کا موضوع بنایا ۔ ان کی شاعری میں مذہب ، درباری زندگی ، محلات کی رنگ رلیاں ، مناظر فطرت ، ہندو مسلم رسومات ، تقریبات ، کھیل کود ، تجارت پیشہ لوگوں کی زندگی غرض ہر موضوع شامل ہے جو ان کی انسان دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہے ۔ وجہیؔ شاعر اور نثر نگار تھا نثری تصنیف میں " سب رس " ان کی شہرت کا سبب بنی۔ ان کی دوسری اہم تصنیف " قطب مشتری " ہے جو ایک مثنوی ہے ۔

غواصیؔ کی تصانیف میں کلیات کے علاوہ تین مثنویاں " مینا سونتی " "سیف الملوک " "بدیع الجمال " اور "طوطی نامہ " قابل ذکر ہیں ۔ " مینا سونتی" اس نظم کا مرکزی خیال عصمت ، حیا اور عفت کی اقدار ہیں ۔ جنہیں غواصی نے کہانی کے روپ میں انسانی کرداروں کی زندگی میں دکھایا ہے ۔ اس مثنوی کے کردار ہندو ہونے کے باوجود روح ، مزاج ، معاشرت اور انداز فکر میں مسلمان ہیں ۔ " طوطی نامہ " ایسی مثنوی ہے جس میں قناعت پسندی ، دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے اور خواب غفلت سے بیدار ہونے کا درس ملتا ہے ۔ غواصی ؔ دنیاکو ایک ایسی برقعہ پوش عورت سے تشبیہ دیتا ہے جس کا ایک ہاتھ انسان کے لہو میں ڈوبا ہوا ہے اور دوسرا ہاتھ مہندی سے رچا ہوا ہے ۔ اس مثنوی میں سارا زور اخلاقی اقدار پر دیا گیا ہے اور انسان دوستی کی تعلیم کو عام کیا گیا ہے ۔ ابن نشاطی کی مثنوی " پھولبن " شہرت کی حامل ہے ۔ وہ ایک عوامی شاعر تھا اور اس کو شہرت بھی عوام میں ہی نصیب ہوئی تھی ۔ اسی طرح سید بلاقی ایک صوفی منش بزرگ تھے ۔ جن کی مثنوی " معراج نامہ " مذہبی حوالے سے اہمیت کی حامل ہے ۔

دکنی عہد کے مذہبی سرمائے میں تصوف کا قابل قدر حصہ ہے ۔ شاہ میراں جی کی نظم " خوش نامہ " خوب محمد چشتی کی " خوب ترنگ " وغیرہ میں مذہبی مسائل کا بیان عمدگی سے کیا گیا ہے ۔ اسی طرح شہادت ناموں اور مرثیوں کی شکل میں رثائی ادب کی تخلیق کی گئی ہے۔ جس میں عقائدو رسوم اور مذہبی جوش و جذبے کا اظہار ملتا ہے۔ اس کے علاوہ انسانی ہمدردی اور انسان دوستی کا رنگ نمایاں ہے ۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کے مختلف ادوار اور انسان دوستی

آغاز ہی میں دکن اور شمالی ہند میں مذہبی شاعری اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی اخلاقی اور مذہبی نظمیں لکھی گئیں ۔ اس کے علاوہ مثنوی یا مرثیہ ، رزم نامہ اور غزل میں بھی اخلاقی اور انسانی دوستی کے موضوعات بکھیرے پڑے ہیں ۔ شما لی ہند میں طنز و ہجو کی رواےت کا پہلا بھر پور شاعر جعفر زٹلی ؔہے۔ وہ انپے دور کا بھرپورتر جمان ہے۔ پروفیسرگیان چندجین جعفرزٹلی کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ"جعفرزٹلی اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا بہت بڑا نقاد ہے۔ اسکی شاعری حقےقت نگاری سے بھرپورہے"۔

جعفرزٹلی ؔ اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے اپنے دور کی معنویت اور زوال وانحطاط کا نقشہ عمدہ پیرائے میں بیان کیاہے۔ زٹلی ؔانسا ن دوست زٹلی ؔدکھ درد کی حالت میں اپنے عہدکے زوال پر نوحہ کناں ہے۔ نظم کے اشعار دیکھئےؔ۔

کہاں اب پائیے ایسا شہنشاہ
مکمل اکمل و کامل دل آگاہ

رکت کے آنسوؤں جگ رودتا ہے
نہ میٹھی نیند کوئی سودتا ہے
صدائے توپ و بندوق است ہر سو
بہ سراسباب و صندوق است ہر سو
دوا دو ہر طرف بھاگڑ پڑی ہے
بچہ درگود و سر کھٹیا دھری ہے
کٹاکٹ و لٹالٹ ہست ہر سو
جھٹاجھٹ و پھٹاپھٹ ہست ہر سو
یہ ہر سو مار مارو دھاڑ است
او چل چال و بتر خنجر کٹارا است
(دیوان
جعفرزٹلی)

جعفرزٹلی ؔمعاشرتی انحطاط،اخلاقی زوال ،اقتصادی بدحالی اور اقدار کی شکست وریخت پر بھی شکوہ کناں نظر آتے ہیں ۔نظم کے اشعاردیکھئے جس میں ان کی ا نسان دوستی واضح طور پر جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور
آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ
دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ
بھائیوں میں وفاداری
محبت اُٹھ گئی ساری عجب یہ دور
آیا ہے
ہنرمندان ہرجائی پھریں در در بہ
رسوائی
رزل قوموں کی بن آئی عجب یہ
دور آیا ہے
سپاہی حق نہیں پاویں نت اٹھ اٹھ
چوکیاں جاویں
قرض بنیوں سے لے کھاویں
عجب یہ دور آیا ہے
(دیوان جعفر
زٹلیؔ)

عہد مذکورہ کے دیگر ریختہ گو شعرا میں بیدل،شاہ گلشن اور اشرف علی علی فغان وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ انہوں نے فارسی کے تتبع میں اردو شاعری کو رواج دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے ۔ اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں ایسے ہی ریختہ گو شعراء نے ایہام گوئی کی بنیاد رکھی اور اسے باقاعدہ تحریک کے طور پر مستحکم کیا ۔

ایہام گوئی کی تحریک اور انسان دوستی

شمال میں اردو شاعری کا آغاز ایہام گوئی کی تحریک سے ہوا ۔ ولی کی شاعری کو ملک بھر میں جو قبول عام حاصل ہوا یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس کا تتبع بڑے پیمانے پر ہوا ۔ چنانچہ ولی کے تلامذہ میں شیخ نثار ، عمر ، رضی اور اشرف اور ان کے معنوی تلامذہ سراج ؒ، داؤد ؒاور عزلت وغیرہ نے ایہام کو اپنا شعار بنایا اور دلی میں خان آبرو کے شاگردوں میں سے شاہ مبارک آبرو ؔ ، مضمون اور یک رنگ اور اس کے علاوہ ناجیؔ اور حاتمؔ نے فارسی شعرائے متاثرین کی روایت اور دیوان دلی کی آمد سے ایہام گوئی کی بنیاد رکھی۔ شمالی ہند کی ابتدائی دور کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے اس کے اخلاقی پہلوؤں کو ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں ۔

اخلاقی مضامین بھی شاعری میں مل جاتے ہیں ۔ لیکن یہ وہ مضامین ہیں جن کے لیے کسی صوفیانہ یا فلسفیانہ باریک بینی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ عام معاشرتی اخلاق و آداب اور شریفانہ برتاؤ کے نتیجے میں جو انسانی اقدار بنتی ہیں وہی اس شاعری کا موضوع ہیں ۔ چنانچہ شاعروں کے ہاں اخلاقی موضوعات کے بیان کے لیے بالعموم صائب کا تمثیلی انداز اختیار کیا گیا ہے ۔

ایہام گوشعراء کے ہاں جہاں ترتیب لفظی اور صنعت گری کے نمونے کثیر تعداد میں ملتے ہیں ۔ وہاں ان شعراء کے کلام میں پندو نصائح ، تجربات دنیا ، اخلاقی درس اور انسان دوستی کے موضوعات بھی دکھائی دیتے ہیں ۔ آبروؔ کے ہاں اخلاقی درس کی جو صورت دکھائی دیتی ہے ۔ وہ ان کی انسان دوستی کی غماز ہے۔ اشعار دیکھیے :

انسان ہے تو کبر سیں کہتا ہے کیوں انا
آدم تو ہم سنا ہے کہ وہ خاک سے بنا

زبانی ہے شجاعت ان سبھوں کی
امیر اس جگ کے ہیں سب شیر قالی

(دیوان آبرو)

شاکر ناجیؔ کے ہاں پندونصائح ،انسان دوستی اور تجربات دنیا کی جھلک یوں دکھائی دیتی ہے ۔

کر لو کرم اے مہرباں پھر ہم کہاں اور تم کہاں
نہیں دیکھ سکتا آسماں پھر ہم کہاں اور تم کہاں

(دیوان شاکر ناجی
،ص: ۲۸۰)

ایہام گو شعراء کے ہاں اپنے عہد کے مسائل ، اخلاقیات اور انسان دوستی کے سچے جذبات کا رنگ دکھائی دیتا ہے ۔ ان کے ہاں " مجلسیت کا گہرا رنگ ملتا ہے ۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی !

یہ مجلسیت اور اس سے پیدا ہونے والا مزہ جہاں عام دلچسپ اور من پسند باتوں کے اظہار سے پیدا کیا جارہا ہے ۔وہاں اخلاق اورپندو نصیحت کی باتوں سے بھی یہی کام لیا جاتا رہا ہے تاکہ ذرا دیر کے لیے احساس کو جھنجھوڑ کر زندہ کردیا جائے اور سننے والا ٹھنڈی سانس بھر کر خوش وقتی کی طرف زیادہ توجہ و انہماک سے واپس آسکے ۔

ایہام گوئی کے خلاف جلد ہی رد عمل شروع ہوگیا اور حاتمؔ نے اپنے دیوان سے ایہام کے اشعار نکال کر اپنا شعری مجموعہ " دیوان زادہ " کے نام سے ترتیب دیا ۔آئیے اس دیوان میں انسان دوستی کے نمونے دیکھتے ہیں ۔

حاتمؔ ۱۱۱۱ھ میں دہلی میں پیدا ہوا ۔ والد کا نام شیخ فتح الدین تھا ۔ حاتمؔ سپاہی پیشہ تھا ۔ کیونکہ اس عہد میں اس پیشے کو ذریعہ عزت سمجھا جاتا تھا ۔ سپہ گری کے اس پیشے کو حاتمؔ نے بھی کمال زندگی کا سبب قرار دیتے ہوئے اس کا ذکر اس انداز میں کیا ہے ۔

اے قدر داں کمال حاتم دیکھ
عاشق و شاعر و سپاہی ہے
(دیوان حاتم ،
ص:۵)

حاتمؔ کے بیان کے مطابق حاتمؔ نے ۱۱۶۸ھ میں شاعری کا آغاز کیا جب ان کی عمر سترہ سال کے لگ بھگ تھی ۔شاعری میں حاتم ؔولیؔ کے ساتھ ساتھ اپنے شاگرد سوداؔ سے بھی مستفید ہوئے ۔ وہ علائق دنیا اور متعلقین کی کفالت سے بے فکر تھے ۔ مزاج میں ایک جولانی تھی ۔ شاعری اور نغمہ سخی کے باعث امرائے وقت کے حلقے میں قدرو منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ۔ فکر معاش سے آزادی اور آسودگی حاصل تھی ۔ فقرو فاقہ ، صبرو رضا ، انسان دوستی اور قناعت جیسی خوبیاں ان کی شخصیت میں بددرجہ اتم موجود تھیں ۔ وہ ابتداء ہی سے اعلیٰ روحانی قدروں کی تلاش میں سرگرداں رہے ۔ حاتمؔ کی تربیت میں میر بادل علی شاہ کا فیضان نظر شامل ہے ۔ جن سے وہ رشدو ہدایت کی خوبی سے مالا مال ہوئے ۔ میر حسن حاتم کو صاحب کمال و پسندیدہ افعال ، عالی فطرت و بلند ہمت کے معزز القاب سے یاد کرتے ہیں ۔

پروفیسر عبدالحق حاتم کی شخص خوبیاں کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں ۔

حاتم بارھویں صدی ہجری کی ادبی و تہذیبی بساطِ زندگی پر ایک باوقار شخصیت رکھتے ہیں ۔ اس شخصیت میں تہہ داری وتنوع کے ساتھ بڑی دلکشی ہے ۔ یہ دلکشی اسلوبِ

زندگی کے خوشگوار پہلوؤں کی وجہ سے زیادہ پرکشش دکھائی دیتی ہے ۔ تذکرہ نگاروں نے ان کی شخصیت کے ان دلکش پہلوؤں پر رشک کیا ہے ۔ انہیں نہایت مہذب و شریف ، متین ، جہاں دیدہ ، مرد بزرگ ، عالی فطرت ، عالی طبیعت ، بلند ہمت ، صاحب ہمت ، سنجیدہ ، ذی فہم ، صاحب کمال و فن ، مرد خلیق ، متوکل پاکیزہ خیال و افعال ، فرسودہ روزگار ،صیرفی طبع ، مرد درویش ، خوش پوش و خوش مزاج بتایا گیا ہے ۔ یہ خوبیاں ان کے خمیر میں شامل ہو کر انہیں اچھے انسان کے پرشکوہ مقام پر ممتاز کرتی ہیں ۔

صوفیاء کا نظریہ ہے کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف و افضل ہے ۔ اس کے وجود میں رب کی ذات جس تکمیلی شان سے سما سکتی ہے وہ کسی دوسری شے میں نہیں ۔ انسان دوست حاتم کے نزدیک بندہ اگرچہ جہاں میں بجائے خدا نہیں لیکن خدا سے بھی جدا نہیں ۔ وہ خدائی صفات کا مجموعہ ضرور ہے ۔لیکن وہ دنیاوی علائق میں پھنس کر اپنے مقام و مرتبے کو فراموش کر چکا ہے ۔ لیکن اگر انسان جو مرکزِ کائنات ہے اپنے دل کو دنیاوی آلائشوں سے پاک کرے تو جلوہ حق عیاں ہونے لگتا ہے یعنی معرفت کا حصول دل کی زندگی پر موقوف ہے اور دل کی زندگی یاد الٰہی سے حاتمؔ کی رباعی کے چند اشعار دیکھئے ۔

حاتم دل کر مثال آئینہ صفا
چاہے کہ جو ہو صورت حق جلوہ نما
کرتا کیا ہے نصیحتیں اور کے تئیں
چاہے ہے خدا تو راہ خدا کی میں خود آ

(دیوان زادہ ،ص: ۱۸۲)

عبادت اور ذکر الٰہی کے ساتھ " تسلیم ورضا " کا ہونا بھی لازمی ہے ۔ یہ انسان کی بندگی کا ایک جزو ہے اور رب کی ذات تک پہنچنے کا ایک وسیلہ بھی کہ سالک اپنی خواہشات اور نفس کے ارادوں کو خدا کی رضا میں فنا کردے اور ہر اس حکم پر جو خدا کی طرف سے صادر ہوا ہے سرتسلیم خم کردے ۔ حاتمؔ اپنی رباعی میں کس خوبصورت انداز سے اس کا ذکر کرتے ہیں ۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں :

ہر دم توکل ہے نشان فقراء
اور کنج قناعت ہے مکان فقراء
رکھتی ہے شرف ہزار نعمت اوپر
بے منت خلق خشک نان فقراء
ہے ذکر خدا ہمیشہ کام فقراء
اور خون جگر سے پُر ہے جام فقراء

اس کام میں آوے تو تجھے ہو
معلوم
کیونکر گزرے ہے صبح و شام
فقراء
(دیوان زادہ،ص:
۱۸۳)

انسان دوست حاتمؔ کے ہاں انسان دوستی کی اقدار واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں ۔ وہ صبرو شکر اور قناعت کی تعلیم دیتے ہیں ۔ استغناء ، قلندری اور درویشی کا پرچار کرتے ہیں ۔ کیونکہ صبرو شکر اور قناعت جس استغناء سے عبارت ہے اس کے ذریعے اعلیٰ انسانی سیرت کی تعمیر ہوتی ہے اور انسان دوست معاشرہ وجود میں آتاہے ۔

حاتمؔ کی " مسدس در توکل و قناعت " کے چند اشعار دیکھئے ۔

ناصح کہے ہے مجھ کو کہ دنیا سے
ساز کر
اس خام گفتگو سے میرا پھر گیا ہے
سر
کچھ آب و خورد کا نہیں دل میں
مرے خطر
ہر صبح اٹھ کے ہے میری رزاق پر
نظر
قسمت اوپر خوشی ہوں نہیں کام
غم کے ساتھ
روزی مری ہے روز میرے دم قدم
کے ساتھ
(دیوان ،زادہ ،
ص ۱۹۶)

ان اشعار میں توکل و قناعت ملاحظہ کیجئے ۔جو انسان دوست شاعرکی پچان ہے۔

حسرت نہیں ہے نعمت دنیا کو دیکھ
کر
پروا نہیں ہے اطلس و دیبا کو دیکھ
کر
رزاق کی صفت کے تماشا کو دیکھ
کر
گرتا نہیں کسی کے مدار کو دیکھ
کر
قسمت اوپر خوشی ہوں نہیں کام
غم کے ساتھ
روزی مری ہے روز میرے دم قدم

کے ساتھ
(دیوان زادہ
،ص:۱۹٦)

انسان دوست حاتمؔ کا زمانہ نفسا نفسی کا شکار تھا۔ دلوں میں بغض و عناد کی گرد جمی ہوئی تھی ۔ ہر طرف قتل وغارت گری ، نفرت و حقارت ، طمع و لالچ کے پست جذبات کارفرما تھے ۔ انسانوں کی حالت درندوں کی مانند تھی ۔ کوئی پرسان حال نہ تھا ۔ ان حالات میں حاتمؔ نے معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے جن خیالات و تصورات کی تشہیر کی ۔ ان میں " انسان دوستی " کا مسلک نمایاں ہے ۔ انہوں نے محسوس کیا کہ انسان ہی تخلیق کائنات کا مرکز و محور ہے اور مسجودِ ملائک ہے ۔ دنیا کی رنگینیاں اسی کے دم قدم سے وابستہ ہیں ۔ لہٰذا انسان دوست حاتمؔ نے قلب انسانی کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے محبت اور ہمدردی کا پرچار کیا اور انسان دوستی کے پیغام کو عام کیا ۔

سنگ و گِل کا طواف ہو تم کو
مبارک حاجیو
حضرت دل کے حرم کا کارواں ہی
اور ہے
معتکف ہو شیخ اپنے دل میں مسجد
سے نکل
صاحب دل کے بغل میں دل عبادت
خانہ ہے
(دیوان
زادہ)

انسان دوست حاتمؔ نے جہاں محبت و مروت کا درس دیا ہے وہاں مختلف العقائد لوگوں کو رواداری اور وسیع المشربی کا سبق بھی دیا ہے ۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں مختلف مذہبی طبقوں کے درمیان اتحادو یگانگت کی فضا پیدا کر دی تھی ۔ اس فضا کو موثر اور ہمہ گیر بنانے میں فقیروں اور درویشوں کی انسان دوستی کا بھی بڑا حصہ ہے ۔ مغلیہ عہد میں مذہبی رواداری کا یہ حال تھا کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کے باوجود ہندوستانی ایک قوم نظر آتے تھے ۔ لیکن زوال سلطنت کے ساتھ ساتھ یہ خواب بھی پریشان ہوگیا ۔ رواداری اور اتحاد کی جگہ نفرت نے لے لی ۔ مذہب کے دعویداروں نے نفرت کی اس آگ کو اور ہوا دی اور پورا معاشرہ اختلافات کا شکار ہوگیا ۔ انسان دوست حاتمؔ فقیروں کے تکیے سے وابستہ رہنے کے باعث وسیع المشربی اور رواداری کی صفت سے مالامال تھے ۔ چنانچہ انہوں نے معاشرے کے افراد کو تعصب اور تنگ نظری کی بجائے رواداری کا پیغام دیا اور اس بات کا درس دیا کہ باری تعالیٰ لاشریک ہے ۔اس کے ہزاروں مظاہر ہیں اور اس تک پہنچنے کے سینکڑوں راستے ہیں ۔

حاتمؔ نے اپنے عہد کی سیاسی افراتفری ، معاشی بدحالی ، معاشرتی بے راہ روی ، اخلاقی پستی اور انسانی قدروں کی بیخ کنی کا جس مہارت سے بیان کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماحول کے نشیب و فراز سے کتنے باخبر تھے ۔ وہ اپنے عہد کے خاموش تماشائی یا محض ترجمان نہیں تھے بلکہ نقاد بھی تھے ۔ وہ اختلاط پذیر نظام کی خامیاں اور نقائص کو منظرعام پر لاکر ایک انسان دوست شاعر کی حیثیت سے اس کی بہتری کے خواہاں تھے ۔ ان کے کلام میں ہمیں ہندوستان کے شہروں اور نگروں کے لٹنے اور ویران ہونے خصوصاً دار السلطنت دلی کی تباہی کا نقشہ صاف دکھائی دیتا ہے ۔ جہاں وہ گلستان باغ ، چمن اور آشیاں کا ذکر کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کنایتہ اپنے ملک و وطن اور گھر بار کا ذکر کر رہے ہیں ۔ اسی طرح ظالموں ، قاتلوں ، لٹیروں اور غارت گروں کو کبھی باغبان ، کبھی گل چین اور صیاد کے ناموں سے پکارتے ہیں اور چمن کے باسیوں کو غنچہ ، گل ، پھول اور بلبل سے تشبیہ دیتے ہیں اور اسی طرح دور امن و خوشحالی کو بہار سے اور دورِ انتشار و اضطراب کو خزاں سے ۔

اب کے چمن میں گل کا نے نام و نشان ہے
فریاد بلبلان ہے یا شہرئہ خزاں ہے
تو رنگ گل کے اوپر مت پھول کہ اے بلبل
پلک کے مارتے فصل بہار گزرے ہے
در و دیوار چمن آج ہے خوں سے لبریز
دست گل چیں سے مبادا کوئی دل ٹوٹا ہے

(دیوان زادہ)

میرا و سوداؔ کا عہدا اور انسان دوستی

میر وسوداؔ کے دور کو ایہام گوئی کے رد عمل کی تحریک کی توسیع قرار دیا جا سکتا ہے ۔اس عہد کو اردو شاعری کے دورِ زریں سے بھی موسوم کیا جاتا ہے ۔اس دور کی شاعری کا جائزہ لیں تو اس میں متصوفانہ،اخلاقی اور انسان دوستی کے مضامین بکثرت دکھائی دیتے ہیں ۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی!

طوفان کی زد میں آیا ہوا یہ معاشرہ ایک ایسی منزل کی تلاش میں تھا ۔جہاں اِسے سکون میسر آسکے۔تصوف نے اس دور کو یہ سائبان فراہم کر دیا ہے ۔جس کے نیچے زخمی انسانیت نے ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ تصوف اس دور کی بھٹکتی اور تڑ پتی ہوئی انسانیت کی ذہنی ضرورت تھی۔

اس عہد کی آواز میں میر وسودا کی آوازیں نمایاں مقام کی حامل ہیں ۔میرؔ کی شاعری دروں بینی کی عکاس ہے سوداؔ بیروں بیں کے طور پر سامنے آتے ہیں جبکہ میرؔ درد کے ہاں شاعری معرفت وحقیقت کے اظہار کا نام ہے۔ یہ تینوں شعراء اپنے دور کے سچے ترجمان ہیں ۔ جنہوں نے اپنے دور کی داستانِ زوال کو اپنی شاعری کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ آئیے اب فرداً فرداً میرؔ اور سودا کی نظموں میں انسان دوستی کا جائزہ لیں ۔

سوداؔاور انسانی دوستی (۱۷۰۶۔۱۷۸۱)

سودؔا ایک بہت بڑے انسان دوست شاعر ہیں ۔ ان کی انسان دوستی ، مروت ، محبت ، ہمدردی اور دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کی صفت کے نمونے ان کے کلام میں جابجا دکھائی دیتے ہیں ۔ انہوں نے سماج میں موجود لوگوں کی مشکلات اور پریشانیوں کو اپنی مشکل اور پریشانی محسوس کرتے ہوئے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ یوں ان کی شاعری میں اس دور کے انسانوں کی مشکلات کی بہترین تصویر کشی دکھائی دیتی ہے ۔

بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری !

> اٹھارھویں صدی کے ہندوستان میں سودؔا جیسی سیاسی بصیرت رکھنے والا کوئی دوسرا شاعر نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے عہد کا بہترین ناقد بھی ہے اور عکاس بھی اور اس عہد کے آشوب پر کرب محسوس کرنے والا حساس شاعر بھی ۔ اس کے شعری تناظر میں بہت پھیلاؤ ہے ۔ وہ اپنے دور کے انسانوں کی عمومی بے بسی ، لاچارگی ، ابتری اور ان کے زوال کی کیفیات کو دکھ کے ساتھ رقم کرتا جاتا ہے ۔

شہر آشوب اگرچہ کسی قوم کا مرثیہ ہوتا ہے۔ جس میں اس شہر میں برپا ہونے والے ہنگاموں اور فتنوں کا بیان ملتا ہے۔ بہترین اور کامیاب انسان دوست وہی ہے جو مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا ذکر ہمدردی کے پیرائے میں کرے اور اس کے ساتھ ساتھ کسی شہر کی تباہی اور اہلِ شہر کی بدحالی کا بیان اس انداز میں کرے کہ تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے ۔سودؔا جیسا انسان دوست ان تقاضوں کو بخوبی نبھاتا دکھائی دیتا ہے ۔

بقول ڈاکٹر روشن اختر کاظمی !

> سوداؔ کا کلام ان کے زمانے کی سیاسی ، سماجی اور معاشرتی تاریخ ہے۔ جس کا ہر شعر اس زمانے کی بگڑی ہوئی حالت ، بدانتظامی اور ابتری کی ایک دردناک تصویر ہے ۔جس میں صرف طنز کے نشتر ہی نہیں بلکہ اس زمانے کا مرثیہ ہے ۔جسے پڑھ کر واقعی آنسو نکل آتے ہیں ۔

سودا کا " قصیدہ شہر آشوب " اپنے دور کے حالات و واقعات کا بہترین عکاس معلوم ہوتا ہے ۔انسان دوست سودؔا نے ملک کی معاشی حالت

کا نقشہ حزن و یاس کے سمندر میں ڈوب کر لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں اب اس دور میں نوکری ملنا بالکل مفقود ہے۔ اگر کسی کی نوکری کرنے جاتے ہیں تو پھر تنخواہ کی امید کیسی ۔ افلاس کی حالت ناگفتہ بہ ہے ۔ ملازمت کرنے کے باوجود تنخواہ کی امید میں سال سال گزر جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانے میں کئی شکل
ہے وجہ معاش اپنی سو جس کا یہ بیاں ہے
گھوڑا لے کر اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ مکاں ہے
گزرے ہے سدا یوں علف و دانے کی خاطر
شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یاں ہے

(کلیات سودا جلد دوم ص ۳٤۵)

انسان دوست سوداؔ مغلیہ سلطنت کے زوال کی پوری تصویر پیش کرتے ہیں ۔ ہر جانب سازشوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ شرفا اور نیک آدمیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ۔ مسجدیں ویران اور مرثیہ خواں ہیں کہ کوئی نمازی نہیں ۔ یہاں نمازیوں کے بجائے گدھے بندھے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ اک عالم بدتمیزی ہے کہ توبہ ہی بھلی ۔ سوداؔ اس اخلاقی پستی کا ذکر " قصیدہ شہر آشوب" کے اشعار میں عمدگی کے ساتھ کرتے ہیں ۔

قاضی کی جو مسجد ہے گدھا باندھ کے اس میں
بیٹھا ہوا اس مشکل سے ہر پیر و جواں ہے
ملا جو اذان دیوے تو منہ موند کے اس کا
کہتے ہیں کہ خاموش ، مسلمانی کہاں ہے
رینگے ہے گدھا آٹھ پہر گھر میں خدا کے
نے ذکر ، نہ صلوٰت ، نہ مسجد ، نہ اذاں ہے

(کلیات سودا جلد دوم، ص: ۳٤٦)

انسان دوست سودؔا ملک کے مختلف طبقوں اور پیشہ وروں مثلاً تاجروں ، کاشتکاروں ، وکیلوں ، شاعروں ، علمائے دین ،مشائخ ، طبیبوں ، سپاہ ، اور درباری امراء کی حالت زار کا نقشہ بھی خوبصورتی سے " قصیدہ شہر آشوب " کے اشعار میں بیان کرتے ہیں ۔امراء کے مصاحب کی زحمتوں کا حال ملاحظہ کیجیے :

گر ہو جیے جا کر کسی عمدے کے مصاحب
اس کی تو اذیت نری ہی آفتِ جاں ہے
وہ جاگے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں دو زانو
کیسا ہی اگر اپنے تئیں خواب گراں ہے
بے وقت خورش اس کی جو ہو اپنے تئیں بھوک
سو کیا کہوں تجھ سے کہ مصیبت کا بیاں ہے
(کلیات سودا جلد دوم، ص: ۳٤۸)

انسان دوست سودؔا تجارتی حالات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں ۔ بد امنی اور شورش پسندی نے تجارت کی راہیں بھی مسدود کر دی ہیں ۔ہر طرف لٹیروں کا خطرہ منڈلاتا دکھائی دیتا ہے ۔تجارت کی حالت اس حد تک خراب ہو چکی ہے کہ جو مال اصفہان سے خریدا جاتا ہے وہ کہیں دکن جاکر بکتا ہے اور وہ بھی اس صورت میں جب لٹیروں کے ہاتھوں سے محفوظ رہ سکے ۔ سوداؔ اس بد امنی اور شورش پسندی کا ذکر اپنے اشعار میں کرتے ہیں ۔

ملاحظہ کیجئے :

سوداگری کیجئے تو ہے اس میں یہ مشقت
دکن میں بکے وہ جو خرید صفہاں ہے
ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجئے منزل
ہر شام یہ دل وسوسۂ سود و زیاں ہے
لے جا کسی عمدے کی جو سرکار میں دے جنس
یہ درد جو سنیے تو عجب طُرفہ بیاں ہے

(کلیات سودا جلد دوم،ص:۳۵۰۔۳۴۹)

ڈاکٹر جمیل جالبی سودا کے زمانے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ

سودا کا زمانہ تخریبی تھا ۔ جس میں تعمیری رجحان بالکل بھی نہیں تھا۔ تخریبی عمل نے فرد اور معاشرے دونوں کو پسپا کر دیا تھا ۔ شاعر اس بگڑی ہوئی صورتحال کو عام اخلاقی اصولوں کی نظر سے دیکھ رہا تھاجو تھا وہ نہیں ہو رہا تھا لیکن جو ہونا چاہیے کسی کو معلوم نہیں تھا ۔سوداؔ اس پر ہنستے اور ہجوکے تیر برساتے ہیں ۔ لیکن بگڑے ہوئے حالات کو سنوارنے کا رجحان نہ اس دور میں تھا اور نہ سوداؔ کی ذات میں ۔ اس لیے سوداؔ ہنس کر رلاتے ہیں ۔ کیونکہ ہنسانے والی چیزوں یا صورتحال کو ٹھیک کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

انسان دوست سودا آپنے دوسرے شہر آشوب " مخمس در ویرانی شاہ جہاں آباد " میں بھی انسان دوستی کے تقاضے نبھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ وہ بیروزگاری اور شرفاء کے فقدان معاش کاماتم کرتے ہیں ۔ ملک میں بدنظمی اور سر کشی کا دور دورہ ہے۔ جس کے باعث روزگار کے ذرائع محدود اور تنگ ہوگئے ہیں ۔ جو کل تک بائیس صوبوں کے مالک تھے۔ اب ان کے تصرف میں کول کی فوجداری بھی نہیں ۔ ظاہری رسوم و رواج اندر سے کھوکھلے ہو چکے ہیں ۔کاشتکاری کا نظام بھی کمزور ہوچکا ہے۔ جس کے باعث خزانے خالی پڑے ہیں ۔سوداؔ ان تمام پریشانیوں کا حال اپنے اشعار میں یوں بیان کرتا ہے :۔

سپاہی رکھتے تھے ، نوکر امیر ، دولت مند
سو آمد ان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند
جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول

(کلیات سودا جلد دوم ،ص :۷۷)

انسان دوست سوداؔ کی نظر صرف ایک شعبے تک محدود نہیں ۔ بلکہ وہ ہر ایک کے دکھ درد میں برابر کے شریک نظر آتے ہیں اور ان کے کرب کو محسوس کرتے ہیں ۔ فوج کی حالت کا نقشہ ان اشعار میں بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے ۔

پڑے جو کام انہیں تب نکل کے کھائی سے
رکھیں وہ فوج جو موتے بھری لڑائی سے
پیادہ ہے سو ڈرے سر منڈائے نائی سے
سوار گر پڑے سوتے میں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے الول

(کلیات سودا، جلد دوم، ص: ۱۸۲،۸۱)

سودا نے نہ صرف عام انسانوں کے دکھ درد کو بیان کیا ہے بلکہ سلاطین اور بادشاہِ وقت کی بد حالی اور بھوک کاتذکرہ بھی دل کی گہرائیوں سے بیان کیا ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ خادمان محل کی بھوک اور افلاس کا نقشہ بھی پیش کیا ہے ۔ اس بھوک سے درباریوں کے منہ کی یہ گت بنی ہے جیسے بوڑھی ہتھنی کے کپول بیٹھ جائیں ۔ انسانیت نواز سودؔا کے ان اشعار میں سلاطین کی حالت کا اندازہ کیجئے ۔

مچا رکھی ہے سلاطینوں نے یہ توبہ دھاڑ
کوئی تو گھر سے نکل آئے ہے گریباں پھاڑ
کوئی در اپنے پہ آ دے د ے مارتا ہے کواڑ
کوئی کہے ہے جو ہم ایسے چھاتی کے ہیں پہاڑ
تو چاہیے کہ ہمیں سب کو زہر دیجیے گھول

(کلیات سوداجلد دوم ،ص: ۸٦)

سودا کی ہمدردی ، پیارو محبت صرف انسانوں کی ذات تک محدود نہ تھی بلکہ جانوروں سے بھی ہمدردی کا جذبہ ان کے دل میں موجود تھا ۔یہی وجہ ہے کہ سودا نے جہاں اس زمانے کے شکار مختلف لوگوں کا ذکر بڑی ہمدردی سے کیا ہے ۔وہاں اصطبل اور فیل خانوں کے باربردار جانوروں کا بھی حال بیان کیا ہے ۔جو بھوک اور افلاس کی وجہ سے نڈھال اور کمزور ہوچکے ہیں ۔ گویا معاشرتی بدامنی نے انسان اور حیوان ہر ایک کو بری طرح متاثر کیا ہے ۔ انسان دوست سودؔا نے ان اشعار میں بڑی عمدگی کے ساتھ فیل خانے کا نقشہ کھینچا ہے ۔

اور اب جو زعم میں آقا کے فیل خانہ ہے
جو ہتھنی اندھی ہے ان میں تو ہاتھی کانا ہے
نہ ٹھور چارے کا ، راتب کانے ٹھکانا ہے
ہر ایک بھوک سے سوئے عدم روانا ہے
اب اس کو خوردہ تو پا بل سمجھ لے خواہ نجھول
(کلیات سودا جلد دوم ،ص: ٨٤)

سوداؔ دلی شہر کی بربادی اور ویرانی کا تذکرہ بھی بڑی دردمندی کے ساتھ کرتے ہیں ۔ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے وہ صرف شہر اور اہلِ شہر کی بربادی کا رونا نہیں روتے بلکہ شہر کے گردو نواح پر بھی ماتم کناں ہیں ۔ دیہاتوں میں موت کی ہولی کھیلی گئی ہے۔ کنویں لاشوں سے پٹے ہوئے ہیں اور امراء شرفاء فقروفاقہ کی زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ شریف زادیاں گداگری پر مجبور ہوگئی ہیں ۔ ہر طرف قیامت کا سماں ہے۔ ایسی کرب ناک حالت میں انسان دوست سوداؔ کا دل تڑپ اٹھتا ہے ۔

غرض میں کیا کہوں یارو کہ دیکھ کر یہ قہر
کروڑ مرتبہ خاطر میں یوں لہر گزرے ہے
جو ٹک بھی امن دل اپنے کو دیوے گردشِ دہر
تو بیٹھ کر کہیں یہ روئیے کہ مردم شہر
گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول
(کلیات سودا جلد دوم ص ٩٣)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری سوداؔ کے شہر آشوب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

سوداؔ کا شہر آشوب" ہندوستان کے سیاسی ، سماجی اور معاشی زوال پر لکھا جانے والا پر درد نوحہ ہے ۔ یہ "شہر آشوب " سوداؔ کی سماجی بصیرت کی ایک یادگار ہے ۔ انہوں نے اپنے عہدِ زوال کی پستیوں کے جو مشاہدے کیے تھے وہ اس نظم میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئے ہیں ۔ سماج

کے مختلف طبقات جس تباہی اور زبوں حالی کا شکار تھے اس کی تصویریں سودا کے" شہر آشوب " میں دیکھی جاسکتی ہیں ۔ پوری نظم میں زوال کی ایک گونج سنائی دیتی ہے ، ویرانی ، عسرت ، تہذیبی بربادی اور قدروں کی شکست سے پیدا ہونے والا المیہ نظم کے پورے منظر نامے پر چھایا ہوا ہے ۔

سوداؔ کے ان شہر آشوب کے بارے میں ایک انگریز کی رائے بھی بڑی قیمتی معلوم ہوتی ہے ۔ لکھتے ہیں

جس طرح رومۃ الکبریٰ کے زوال کی تصویروں کے واسطے ہم جو دانیال جیسے مرقع نگاروں کی صفحہ گردانی کرتے ہیں ۔ اس طرح ہم کو اگر زوال دولت مغلیہ کی سچی تصویریں دیکھنا ہیں تو ہم کو چاہیے کہ سوداؔ کی ان پر آشوب نظموں کا مطالعہ کریں ۔ جس میں انہوں نے مرہٹہ سواروں کی عین قلعہ دہلی کی دیواروں کے نیچے قتل و غارت گری کا سچا فوٹو اتارا ہے۔یا جس میں زمانے کی پر آشوب حالت اور امرائے دہلی کی تباہی و بربادی اور کسمپرسی کا بیان نہایت پرزور اور دردناک طریقے سے کیا ہے ۔

انسان دوست سودؔا کا کہنا یہ ہے کہ اکبر اور اورنگزیب کی دہلی میں دولت و ثروت اور جاہ و حشمت کی علامت ان کے گھوڑے تھے ۔ان کے طاقتور و دانا سپاہیوں کا وجود تھا ۔ ان کی تیز دھار تلواریں تھیں ۔ مگر افسوس کہ اب دہلی میں ہاتھی اور گھوڑے بھی سلطنت کی طرح کمزور و ناتواں ہو چکے تھے ۔درحقیقت سودا کے عہد کا یہ مذکورہ بالا گھوڑا سلطنت کے ہمہ گیر زوال کی علامت ہے ۔سوداؔ اس علامت کے ذریعے مغلیہ سلطنت کی بدحالی ، بد نظمی اور خلفشاری کی عمدہ تصویر کشی کرتے ہیں ان کی نظم "در ہجواسپ" کے اشعار دیکھئے ۔

مانند نقشِ نعل کی زمین سے بجز فنا
ہر گز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

اس مرتبے کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گزار

قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کرو گے یاد ؟
"امیدوار ہم بھی ہیں " کہتے ہیں یوں چمار

(کلیات سوداؔ جلد دوم،ص :۳۳٤)

گھوڑے کی طرح محمد شاہی دور کا ہاتھی بھی ضعف و ناتوں اور فاقہ کشی کا شکار ہے ۔ انسان دوست سوداؔ نے اپنے دور کے سماجی حالات کی خرابی اور ناہمواری کا ذکر بڑے کرب کے ساتھ کیا ہے ۔ دراصل انہوں نے ضعیف گھوڑے اور ہاتھی کو مٹتے ہوئے دور اور اس کی تہذیب کی زوال آمادگی کی علامت قرار دیا ہے ۔ سوداؔ کی نظم " درہجوفیل راجہ پربت سنگھ " کے اشعار ا س کی بہترین عکاسی کرتے ہیں ۔

بدن پر اب نظر آتی ہے یوں کھال
طنابِ سستِ سے خیمے کا جوں حال
نمودار اس طرح اب استخواں ہے
گویا ہر پسلی اس کی نردباں ہے
نہ بیڑی ، نہ کٹ بندھن ، نہ لکڑا
رکھے ہے ناتوانی اس کو جکڑا

(کلیات سودا جلد سوم ،ص: ۸۹)

انسان دوست سوداؔ کا خیال ہے کہ جب معاشرہ خراب ہوتا ہے تو اس میں طرح طرح کی معاشرتی برائیاں پیدا ہوجاتی ہیں ۔ انسان ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہوئے کسی بھی دھوکے اور فریب سے گریز نہیں کرتا ۔ اس کے نزدیک انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ۔ سوداؔ نے اپنی مثنوی درہجو حکیم غوث " میں اسی قسم کے ایک حکیم کی کہانی بیان کی ہے جس کے دل میں انسانی ہمدردی کا شائبہ تک موجود نہ تھا ۔ لوگوں کی زندگیوں سے کھیلنا اس کے لیے معمولی بات تھی ۔

بُو نہیں ظالم میں کہیں درد کی
جان کا دشمن ہے زن و مرد کی
کشتنِ خلق اس کا غرض کام ہے
مرگ و قضا مفت میں بدنام ہے
مرتے ہیں اس سے زبس اب سب مرد و زن
کھاتے ہیں قرض اس کے اوپر گورکن

(کلیات سودا جلد سوم،ص:١٤٥)

سودؔا کے کلام میں ہمیں مختلف طبقوں کے معاشرتی اور مالی حالات کے ساتھ ساتھ امراء کی نا اہلی اور انتظامی خرابی کی تفصیلات بھی دکھائی دیتی ہیں ۔ ایک مثنوی " در ہجوسیدی کافور کوتوال شاہ جہان آباد"میں شہر کی بدانتظامی، بے ایمانی اور عمال کی رشوت خوری کا

تذکرہ عمدہ انداز میں کیا ہے اور ان تمام باتوں کا ذمہ دار کوتوال کو ٹھہرایا ہے۔جس نے شہر کا سکون برباد کر رکھا ہے۔

چور کب اُس کا زور مانیں ہیں
کالا بال اپنا اُس کو جانیں ہیں
ہو یہ کتوال تو وہ مانیں زور
یہ تو مچھر کی جھول کا ہے چور
بازو کا مفسدوں کے زور ہے یہ
چور کا بھائی گھٹی چور ہے یہ
(کلیات سودا جلد سوم، ص: ۹۵)

انسان دوست سوداؔ کے نزدیک انسان وہی ہے جو دوسروں کے کام آئے۔اس کے دکھ درد میں شریک ہو۔یہی وجہ ہے کہ کنجوسی ،حرص ، بے جا تفاخر،تکبر ،ظلم و تعدی اور ایذا رسانی جیسی حرکتیں ان کے دل میں کھٹکتی تھیں ۔ وہ کنجوس اور حریص انسان کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔وہ سمجھتے تھے کہ کنجوسی اور حریص اخلاقی برُائیاں ہیں ۔جس سے معاشرتی سکون خراب ہوتا ہے۔اس لئے اسکی نفی کرتے تھے۔مثنوی کے چند اشعار دیکھئے جس میں دولتمند کی کنجوسی عروج پر دکھائی دیتی ہے۔

اُن کے باورچی خانے کا احوال
چولہے ہر گھر کے جب کریں ہیں خیال
ڈالیں ہیں سر پہ خاک ماتم سے
لکڑی جلتی ہے آتش غم سے
سینے دیگوں کے مارتے جوش
روتے ہیں ڈھانپ ڈھانپ منہ سرپوش
(کلیات سودا جلد سوم، ص:۱۱۳)

سوداؔ سمجھتے ہیں کہ جب تک انسان کی زندگی ہے اسے اپنی یہ زندگی مخلوق خدا کی خدمت میں صرف کردینی چاہیے۔کیونکہ انسان کے اعمال ہی اسکی اخروی زندگی میں کام آتے ہیں ۔اس لئے جہاں تک ہو سکے نیکی کے کام کرنے چاہیں اور انسانی فلاح و بہبود ہی کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔انسانیت نواز سوداؔ کے مطابق تمام انسان آدمؑ کی اولاد ہیں ۔کسی میں کوئی تفریق اور فرق روا نہیں رکھنا چاہیے ۔

افسوس کرےموں میں نہیں یہ دستور
مفلس پہ کرم کر کے نہ ہوویں مغرور
جھکتا ہے اگر شاخ ثمر دارِ کا ہاتھ
پھل دے کے وہیں آب کو کھینچے

ہے دور

(کلیات سودا جلد چہارم ،ص:۲٤۱)

سودا ؔجہاں عام انسان میں مساوات کی خوبی دیکھنے کے خواہش مند ہیں وہاں وہ سمجھتے ہیں کہ ایک بادشاہ میں جہاں دےگر خوبیاں موجود ہوتی ہیں وہاں مساوات کی خوبی بدرجہ اتم موجود ہونی چاہیے۔

اُمور ملکی میں اول ہے شہہ کو یہ لازم
گدا نوازی و درویش پروری جانے
مقام عدل پہ جس دم سریر آراء ہو
ہر ایک خورد و کلاں میں برابری جانے
ہمیشہ جود و کرم میں سمجھ ہر ایک کی قدر
مساوی از امراء تا بہ شکری جانے

(کلیات سودا)

سوداؔکے خیال میں اس جہاں رنگ وبو کا سب سے لازاوال رشتہ پیارو محبت کا رشتہ ہے ۔ یہ رشتہ رنگ و نسل اور تہذیب وعقیدے کی تفریق سے با لا تر ہے ۔ محبت کے اس رشتے میں بندھے ہوئے لوگ خدمت خلق کو اولیت دیتے ہیں ۔ رواداری اور وسےع المشربی جیسی صفات ان کی ذات کا حصہ ہوتی ہیں ۔ ایک رباعی کے اشعار دیکھیے ۔

زیر فلک جتنی کہ یہ موجودات
ہر ایک کی اک طرح کٹے ہے اوقات
اے شیخ کیا خوب یہ ہم نے تحقیق
شیخی و کرامات ہے بن آئے کی بات

(کلیاتِ سودا جلد چہارم ،ص :۲۳۸)

ایک اور رباعی ملاحظہ کےجئے ۔

مومن نہیں زنار سے میرے آگاہ
اس رشتے کو سبحہئ اسلام میں راہ
اس بت کا برہمن ہوں کہ ہم صوفی و شیخ
کہتے ہیں جےسے دیکھ کے ـ"اللہ اللہ"

(کلیات سودا جلد چہارم، ص:۲۵۰)

مذہبی رواداری کے ساتھ ساتھ سوداؔ کے ہاں دنیا کی بے ثباتی ؛ قناعت اور صبر واستقلال کے مضامین بھی کثرت سے ملتے ہیں ۔ یہ وہ اقدار ہیں جو ایک شخص کو انسان دوست بناتی ہیں ۔ ایک رباعی میں دنیا فانی سے دل لگانے اور اس فانی عالم کی محبت میں غلوکرنے کو نامردی اور کمزوری سے تعبیر کیا ہے ۔

لولی سے میں دنیا کی کہا یوں جا کر سن اے بے پرد
اب ایک کی ہو رہ نہ پھر ا کر گھر گھر تیں صورت نرد
بولی جو کوئی مرد ہے سو تو مجھ کو رکھتا ہی نہیں
باندھی ہے جنہوں نے میرے رکھے پہ کمر سو ہیں نامرد

(کلیات سودا جلد چہارم، ص :۲۵٦)

انسان دوست سوداؔ کے ہاں ان کے مرثیوں میں بھی انسان دوستی کے نمونے ملتے ہیں ۔ انہوں نے واقعہ کربلا میں موجود حضرات امام حسینؑ ،ان کے اہل بیت ،ان کے اصحاب ورفقا کے احساسات وجذبات کی بہترین عکاسی کی ہے اور دوسری طرف فوج مخالف جس میں حرملہ ، ابن سعد ،شمر وغیرہ کے کردار بھی دکھائے ہیں ۔ ایک مرثیے کے اشعار دیکھئے ۔ جس میں امام زین العابدین اور یزید کے کردار پر روشنی پڑتی ہے ۔ یہ بند اس موقع کا ہے ۔ جبکہ واقعہ کربلا کے بعد ابن سعد اہل بیت امام حسینؑ کو اسیر کر کے دربار یزید میں لے گیا ہے ۔ یزید امام حسینؑ سے مخاطب ہے ۔

اس لعیں نے یہ کیا دیکھ کے عابد کو مخاطب
کیوں ترا باپ لڑا گر نہ تھی لڑنے کی تاب
رد بیعت سے مری گھر کو کیا اپنے خراب
آپ تو جی سے گیا تجھ پہ ڈالا ہے عذاب
ہے گلے طوق تیرے پاوں میں تیرے زنجیر
دیکھتے ہیں تجھے اس حال میں برنا و پیر

(کلیاتِ سوداؔ)

غرض سوداؔ اس دکھ اور کرب کو بھی شدت سے محسوس کرتے ہیں جب کربلا کی جنگ ختم ہونے کے بعد فوج ےزےد شہداء کے سراور اہل۔ بےعت کو اسیر کر کے دربار ےزےد میں لاتی ہے ۔ اور اس سے انعام کی طالب ہوتی ہے ۔

اہلِ بےت اس کے یہ زنجیر میں حاضر ہیں تمام
دے شتابی ہمیں جو کچھ کہ ہے دینا انعام
(کلیاتِ سوداؔ)

سوداؔ غم کی ہر لہر کو شدت سے محسوس کرتے ہیں ان کے سینے میں دھڑکتا دل ہر ایک کے دکھ درد میں تڑپ اٹھا ہے ۔ وہ اپنی انسان دوستی سے ہر ایک کے دکھ درد کو دور کرنے کی بھر پور کو شش کر تے ہیں ۔

میر تقی میر اور انسان دوستی (۱۷۲۲۔۱۸۱۰)

میرؔ کی طبیعت میں درد مندی ، کسک ، سوزوگذار اور انسان دوستی کے جو جذبات دکھائی دیتے ہیں وہ ان کے والد علی متقی کی سیرت کا پر تو ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ میرؔ کو انسان دوست شاعر بنانے میں ان کے عہد کے سیاسی وسماجی حالات نے بھی اہم کردار ادا کیا ۔ انہوں نے نادر شاہ کا قتل عام اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔ ابدالی کی تلواریں ان کے سامنے چمکیں ۔ جاٹوں ،سکھوں اور روہیلوں کے مظالم ان کی آنکھوں کے سامنے ہوئے ۔ دلی کی تباہی ، معاشرے کی بربادی ، زمانے کی سفاکی اور انسان کی بے رحمی کے اےسے اےسے مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے آئے جنہوں نے اُن کو ہلا کر رکھ دیا۔

مولوی عبدالحق اس وقت کی دہلی کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

اس وقت کی دلی تاریخ میں خاص حیثیت رکھتی ہے ۔ وہ ہندوستان کی جان اور سلطنت مغلیہ کی راجدھانی تھی ۔ مگر ہر طرف سے آفات کا نشانہ تھی ۔ اسکی حالت اس عورت کی سی تھی ، جو بےوہ تو نہیں مگر بےواو،ں سے کہیں زیادہ دکھیاری ہے اوراولوالعزم تےمور اور بابر کی اولاد ان کے مشہور آفاق تخت پر بے جان تصویر کی طرح دھری تھی۔ اقبال جواب دے چکا تھا اور ادبار انحطاط کے سامان ہو چکے تھے اور سیاہ روز گرد وپیش منڈلا رہا تھا۔ نادر شاہ دستِ نگر اور امیر امرا مضمحل وپریشان تھے۔ سب سے اول نادر شاہ کا حملہ ہوا ۔ حملہ کیا تھا۔ خدا کا قہر تھا۔ نادر کی بے پناہ تلواریں اور اس کے سپاہےوں کی ہوسناک غارت گری نے دلی کو نوچ کھسوٹ کر ویران وبرباد کر دیا ۔ ابھی یہ کچھ سنبھلنے ہی پائی تھی کہ چندسال بعد احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی پھر مرہٹوں ، جاٹوں اور روہےلوں نے وہ

اودھم مچائی کہ رہی سہی بات بھی جاتی رہی ۔ غرض ہر طرف خود غرضی، خانہ جنگی ، طوائف الملوکی اور ابتری کا منظر تھا ۔ یہ حالات میرؔصاحب نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور دیکھے ہی نہیں ان کے جبر بھی سہے اور ان انقلابات کی بدولت ناکام شاعر کی قسمت کی طرح ٹھوکریں کھاتے پھرے ۔

زمانے کے ہاتھوں میرؔ کی حالت ِزارکا تذکرہ"ذکر ِمیر" میں موجود ہے۔

میں بھیک مانگنے کے لئے اٹھا اور شاہی لشکر کے سردار کے در پر گیا ۔ چونکہ شاعری کی وجہ سے میری شہرت بہت تھی ۔ لوگوں نے میرے حال پرخاطرخواہ توجہ کی۔ کچھ دن بلی کتے کی سی زندگی گزاری اور آخرکار حسام الدولہ کے چھوٹے بھائی وجیہہ الدین خاں سے ملا۔ اس نے میری شہرت اور اپنی اہلےت کے مطابق تھوڑی بہت مدد کی اور بہت تسلی دی۔

"ذکر میر " سے معلوم ہوتا ہے مسلسل دردناک واقعات میرؔ جےسے حساس اور انسان دوست شاعر کو متاثر کر رہے تھے۔ باپ کا مرنا میرؔ پر آسمان ٹوٹ پڑنا تھا ۔ بڑے بھائی نے بھی پہلو تہی کی اور میرؔ کو پہلی مرتبہ فکر معاش اور دنیا داری کی مصےبتوں سے سابقہ پڑا ۔اب وہ اپنے آپ کو بالکل بے یارومددگار محسوس کر رہے تھے ۔ گویا تمام معاشرہ غم والم کی تصویر بنا ہوا تھا ۔ جہاں ہر طرف بھوک ،افلاس، ڈر، خوف ، بے رحمی نے اپنے ڈھیرے جمائے ہوئے تھے۔بقول جمیل جالبی "ایک طرف زندگی کی بنیادی ضرورتیں تھیں جن کو پورا کرنامیرؔ کےلئے دشوارتھا اور دوسری طر ف صدیوں پرانا معاشی سماجی،سیاسی،تہذیبی نظام ان کی نظروں کے سامنے جاں کنی میں تھا۔

میرؔ جوانمردی اور حوصلہ مندی کا درس دیتے رہے اور انسان دوستی کا پرچار کرتے رہے۔میرؔ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اسکی کشمکش نے انسان کو بلندی سے پستی کی انتہا تک پہنچا دیا تھا۔خودغرضی ،لالچ کی گرم بازاری نے معاشرے میں انسانی ہمدردی کے جذبے کو ختم کر دیا تھا۔کوئی کسی سے ہمدردی کےلئے تیار نہ تھا ۔ذاتی مفاد کو ترجیح دی جاتی تھی۔آئے دن کی غارت گری نے انسان کی قدرو منزلت کوخاک میں ملا دیا تھا ۔میرؔجیسے انسان دوست شاعر نے معاشرے میں محبت ہمدردی،ایثار،قربانی اور وفاداری کے جذبے کو پروان چڑھایا اور آدمیت کا پیغام عام کیا۔ان کی رباعی کے چنداشعار ملاحظہ کیجئے۔

ملیے اُس شخص سے جو آدم ہووے
ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے یک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

(کلیات

میرؔ)

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی!

میرؔ کے مزاج میں جو گرمی ہے۔ ان کی طبیعت میں جو شدت اور انتہائی پسندی ہے وہ در حقیقت ان کی نسلی خصوصیت کا عکس ہے۔ حمیت اور غیرت جو ان کے یہاں سب سے زیادہ نمایاں ہے اس کے پیچھے بھی ان کی نسلی خصوصیت کا ہاتھ کار فرما نظر آتا ہے میر کے یہاں جو نیکی اور شرافت ہے ان کے کردار میں جو ایک استواری اور اور ثابت قدمی ہے اور بلندی اور بلند آہنگی ایثار اور قربانی، وقار اور سپردگی کی جو خصوصیات ہیں وہ سب کی سب بڑی حد تک ان کی نسلی خصوصیات کی آئینہ دار ہیں ۔

میرؔ نے ایک انسان دوست شاعر کی حیثیت سے جہاں محبت ومروت کے پیغام کو عام کیا وہیں انہوں نے مختلف العقائد لوگوں کو رواداری اور وسیع المشربی کا سبق بھی دیا ہے۔اسکی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میرؔ کا خارجی ماحول بھی اس قسم کا تھا کہ ان کا بیشتر وقت سیدامان اللہ جو اُن کے والد کے مرید تھے اور جن کو وہ چچا کہتے تھے ان کی محبت میں گزرہ۔ وہ میرؔ کو اکثر درویشوں اور پیروں کے رمنوں ، تکیوں اور خانقاہوں میں لے جاتے تھے۔ جنہوں نے انہیں انسان دوستی کا سبق دیا۔ایسی انسان دوستی جس میں دیرو حرم کی حدبندیوں سے بلندی ،کفر و ایمان دونوں کے ساتھ رواداری ،رسم پرستی اور تنگ نظری کے خلاف بغاوت نمایاں ہے ۔گویا صحیح معنوں میں آدمی کو انسان بنا نے پر زور دیا ہے ۔یہ حقیقت ہے کہ میرؔ کے حلقہ احباب میں تمام مذاہب اور فرقوں کے لوگ شامل تھے ۔جس کے باعث مذہبی اثرات ان کے مزاج کا حصہ بن گئے اور وہ ہمیں تصوف کے وحدت الوجودی نظریے کے قریب دکھائی دیتے ہیں ۔ہمیں اس روئے زمین پر کوئی خطہ ایسا دکھائی نہیں دیتا جہاں لوگ کسی ہستی کی پوجا نہ کرتے ہوں ہر قوم میں الہ کا ایک تصور موجودہے۔

مشہور یونانی مورخ پوتارک نے درست کہا ہے کہ

زمیں پر چلتے پھرتے تم ایسے شہر بھی دیکھوگے جن کی دیواریں نہیں ہیں ۔ایسے بھی جن میں سائنس کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی ،ایسے بھی جہاں حکمران کوئی نہیں ،ایسے بھی جہاں نہ محلات ہیں ، نہ خزانے، نہ ورزش گاہیں ، نہ تھیٹر۔ لیکن تم کوئی ایسا شہر نہیں پاؤ گے ۔جہاں دیوتاوں کے مندر نہ ہوں ۔ جہاں دعائیں نہ مانگی جاتی ہوں ،جہاں منتیں نہ مانی جاتی ہوں جہاں پیشگوئیاں نہ کی جاتی ہوں ۔ایسا شہر نہ آج تک کسی انسان نے دیکھا ہے نہ کبھی دیکھنے میں آئے گا۔

میرؔ جب کائنات کے ذرے ذرے پر غور کرتے ہیں تو انہیں یقین ہوجاتا ہے کہ اس کائنات کی کوئی چیز فضول اور بیکار نہیں ۔اس کائنات کو خلق کرنے والی ہستی ضرور موجود ہے اور یہی تجزیہ الہ کے تصور کو جنم دیتا ہے ۔میرؔ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا خالق و مالک ہے ۔وہ ازل سے ہے اور ابد تک قائم ودائم رہے گا۔وہ لم یزل ہے۔ وہی رب ہے۔ جس نے انسان کی فلاح و بہتری کی راہیں کھول رکھی ہیں ۔میرؔ کے نزدیک اس کائنات کی تمام رونق اسی رب ذوالجلال کے دم قدم سے ہے۔یہی وہ ذات ہے جو محبت،احترام اور سجدے کے لائق ہے۔میرؔ ناصرف خود رب تعالیٰ کے عشق میں ڈوبا دکھائی دیتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی غوطہ زن ہونے کی تلقین کرتاہے۔کیونکہ یہی عشق ابدیت کا حامل ہے ۔میرؔ کی مثنوی معاملاتِ عشق کے چند اشعار دیکھئے۔

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق
حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ
عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ
عشق حاضر ہے عشق غائب ہے
عشق ہی مظہر عجائب ہے
(کلیات میر جلد ششم
،ص: ۵۱)

میرؔ چونکہ وحدت الوجودی عقیدے سے متاثر تھے لہٰذا وہ اسی ذات کو تمام کائنات کے حسن اور خوبصورتی کا مرکز و منبع قرار دیتے ہیں ۔ان کی مثنوی "اعجاز عشق "کے اشعار اس کی واضح جھلک پیش کرتے ہیں۔

سبھوں میں نمود اس کی ہی شان
یہ قالب ہیں سارے وہی جان ہے
گل و غنچہ و رنگ و بود و بہار
یہ سب رنگ اللہ ہی کے ہیں یار
سما ارض و خورشید یا ماہ ہے
جدھر دیکھو اللہ ہی اللہ ہے
(کلیات میر ، جلد ششم
،ص: ۹۱)

میرؔ خود بھی ایک محبت بھرا اور حساس دل لیکر پیدا ہوئے تھے۔ دوسرے جس وقت انہوں نے اس جہاں میں آنکھیں کھولیں ان کے چاروں طرف ایک ایسی فضا چھائی ہوئی تھی جس کے ذرے ذرے میں تصور عشق سمایا ہوا تھا ۔ خود میرؔ کے والد علی متقی نے ان کو آغوش میں لے کر عشق کے متعلق یہ تعلیمات دیں ۔

بیٹا عشق اختیار کرو ۔عشق ہی اس کارخانے پر مسلط ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو یہ سارا نظام درہم برہم ہوجاتا۔ بے عشق زندگی وبال ہے اور عشق میں دل کھونا ، اصل کمال ہے ۔

عشق ہی بناتا ہے اور عشق ہی بگاڑتا ہے ۔ عالم میں جو کچھ ہے عشق کا ظہور ہے۔ آگ سوز عشق ہے ، پانی رفتارِ عشق ہے ، ہوا اضطرار عشق ہے ، موت عشق کی ہستی ہے ، حیات عشق کی ہوشیاری ہے ، رات عشق کا خواب ہے ، دن عشق کی بیداری ہے ، تقویٰ قربِ عشق ہے ، گناہ بعُدِ عشق ہے ، بہشت عشق کا شوق ہے ، دوزخ عشق کا ذوق ہے اورمقام عشق تو عبودیت ، عارفیت ، زاہدیت ، صدیقیت ، خلوصیت اور حبیبیت سے بلندوبرتر ہے۔

میرؔ نے اپنی مثنوی " دریائے عشق " میں جذبہء عشق کو " تازہ کارو تازہ خیال " کہا ہے ۔ جس سے ان کے صوفیانہ اندازِ نظر کا بخوبی انداز ہوتا ہے ۔ گویا میرؔ کے عشقیہ جذبات اور خیالات کو یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ عشق وجہ سکون بھی ہے اور سبب جنون بھی ۔ جس عاشق کو عشق کا روگ لگ جاتا ہے وہ اپنے دل و جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ ان اشعار پر میرؔ کے والد کے عشق کی تعلیم کے اثرات صاف نمایاں ہیں ۔

عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال
ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا
کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا
کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
(کلیات میر ششم
،ص: ۲۵)

میرؔ نے اپنی مثنوی " شعلہء عشق " میں محبت کو وہ جذبہ بتایا ہے جس نے ظلمت کے پردے ہٹا دیے اور نور کا ظہور ہوا ۔ اگر محبت نہ ہوتی تو جلوہء خداوندی کا ظہور بھی نہ ہوتا اور نہ انسان کا وجود دکھائی دیتا ۔

محبت نے ظلمت سے گاڑھا ہے
نور
نہ ہوتی محبت ، نہ ہوتا ظہور
محبت بن اس جا نہ آیا کوئی
محبت سے خالی نہ پایا کوئی
محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت سے سب کچھ زمانے میں
ہے
(کلیاتِ میر، جلد ششم،
ص: ۰۱)

اس پس منظر میں جب میرؔ کا عشق خان آرزو کے گھر کے حوالے سے اور میرؔ کی مثنویات کے مطالعے سے ہمارے سامنے آتا ہے تو یوں

بھی محسوس ہوتا ہے کہ میرؔ کا تصور حسنِ تجرید سے تجسیم اور تجسیم تک کا سفر کرتا رہا ۔ یہی وجہ ہے کہ جب میرؔ اس پسِ منظر کو لے کر عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو ایک سچے اور صادق عاشق کی طرح انہیں ہرسُو اللہ تعالیٰ کا جلوہ ہی کارفرما دکھائی دیتا ہے ۔

نظر کر کے ٹک دیکھو ہر جا ہے وہ
نہاں و عیاں سب میں پیدا ہے وہ
بہر صورت آئینہ رہے گا جہاں
یہ سب عکس اس کے ہی پڑتے ہیں یاں
ملک ، جن و حیواں ، جماد و نبات
جو اس بن ہیں تو حیف ہے کائنات
(کلیاتِ میر جلد ششم ،ص: ۹۱)

میرؔ کو کائنات میں حسنِ مطلق کی جھلک سب سے زیادہ اشرف المخلوقات یعنی انسان میں دکھائی دیتی ہے ۔ چنانچہ میرؔ کی شاعری کا مرکز و محور انسان ہے ۔ وہ انسان جسے دنیاکے اکثر مفکرین نے اس کائنات کی کمتر اور حقیر شے تصور کیا ہے ۔ میرؔ کے نزدیک نہایت قابل احترام اور جملہ مخلوقات میں شاہکار اور مشیت کے لیے باعثِ فخروناز پیکر ہے۔ گویا انسان کو یہ عزت اور احترام دینے والی ذات رب تعالیٰ ہی کی ہے ۔

یہ صنعت گری اس ہی صانع سے آئے
کفِ خاک کو آدمی کر دکھائے
نہ آوے کسی کے جو ادراک میں
سو رکھ جائے وہ اس کفِ خاک میں
(کلیات میر جلد ششم ،ص:۸۹۔۹۰)

میرؔ کے ہاں انسانی فضیلت اور برتری کا جو تصور دکھائی دیتا ہے اس کا اصل سرچشمہ تصوف کے افکار سے ہی پھوٹتا ہے ۔ انہوں نے انسان کو مخلوق اور خدا کو ایک برتر ہستی ہی قرار دیا ہے اور خدا کے اس احسان کو مانا ہے کہ اس نے ہمیں پیدا کیا اور ساری مخلوقات پر فضیلت اور برتری کا شرف عطا کیا ہے ۔ میرؔ کی رباعی کے اشعار اس حقیقت کے غماز ہیں ۔

کیسا احسان ہے خلق عالم کرنا
پھر عالم ہستی میں مکرم کرنا
تھا کار کرم ہی اے کریم مطلق
ناچیز کفِ خاک کو آدم کرنا

(کلیاتِ میر جلد
پنجم ،ص:٤)

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی!

میرؔ کی شخصیت میں انسانی زندگی کی کامیابیوں اور کامرانیوں ، حسرتوں اور ناکامیوں دونوں کا شدید احساس نظر آتا ہے۔ میرؔ انسان اور انسان زندگی کو سمجھتے ضرور تھے وہ اس کے بنیادی معاملات کا شعور ضرور رکھتے ہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے یہاں اس کی المناکی کا احساس نسبتاً زیادہ ہے لیکن وہ اس کی مسرتوں سے بھی واقف نہیں ہیں بلکہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انسانی زندگی ان دونوں پہلووں سے عبارت ہے۔ انسان کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ مسرتوں کے ساتھ غموں کو بھی برداشت کرتا رہے۔ اسی لیے میرؔ انسان کے ساتھ ایک ہمدردی رکھتے ہیں ۔ انہیں انسانی زندگی سے محبت ہے۔ شاید اس لیے کہ انسان انہیں عظیم نظر آتا ہے اور عظیم اس لیے نظر آتا ہے کہ وہ دنیا میں مجبور ومعذور ہونے کے باوجود اس سے نبرد آزما ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ ! میرؔ کے ہاں انسانی عظمت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔

میرؔ کا ایک اہم موضوع انسان ہے ۔ انسان کے متعلق ان کے تصورات میں ایک اثباتی سی جھلک پائی جاتی ہے ۔ اس اثباتیت میں کچھ جذبہ ، کچھ عقلی تجزیہ ، کچھ تخیل کار فرما ہے ۔ ان کے اس تصور کا اصل سرچشمہ تو تصور کے افکار سے پھوٹتا ہے کیونکہ صوفیوں نے انسان کی فضیلت اور فوقیت پر بڑا زور دیا ہے۔ چنانچہ اسی تفکر کا سلسلہ انا الحق اور سبحانی ما اعظم شانی سے جاملتا ہے ۔

میرؔ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انہوں نے ساری عمر دلی اور دل کے مرثیے لکھے ۔ دراصل ان کا دل اور دلی سے تعلق اور اس کے زوال اور بربادی کا ملال ان کی انسان دوستی کا مظہر ہے ۔ وہاں تہذیب کے بگڑنے کا غم ساری زندگی ان کے دم کے ساتھ رہا ۔ وہاں کی گلیاں اور کوچے جو اوراق مصور کی طرح بیش قیمت اور قابلِ دید تھے بکھر کر رہ گئے اور ان گلیوں اور کوچوں میں رہنے والے لوگ ان کا مخصوص مزاج جسے نظام اقدار سے تعبیر کیجئے وہ بھی منتشر ہو کر رہ گیا ۔ تہذیب ایک زندہ لاش بن کر رہ گئی ۔ ظلم و بربریت نے نہ صرف خارجی زندگی کو لہولہان کر کے رکھ دیا ہے بلکہ داخلی زندگی بھی ریزہ ریزہ ہوکر رہ گئی ۔ انسان دوست میرؔ اپنی ایک رباعی میں دلی شہر کی حالت کا نقشہ بیان کرتے ہیں ۔

دلی میں بہت سخت کی اب کے گزران ---- دل
کو کرسنگ

غیرت نہ رہی عاقبت کار نہ شان ---- کھینچا یہ ننگ
یاروں میں نہ تھا کوئی مروت جو کرے ----
اجڑے تھے گھر
تاحدِ نظر صاف پڑے تھے میدان ---- عرصہ تھا تنگ
(کلیات میر جلد پنجم،ص:۲٤)

زوال وانحطاط کے اس دور میں شعرأ جو فطرتاً حساس ہوتے ہیں ماحول اور حالات سے نسبتاً زیادہ متاثر ہوئے۔ ایسی صورتحال میں میرؔ جیسا انسان دوست شاعر بھی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اپنے جذبات اور رنج والم کو شاعری کی شکل میں پیش کیا۔

میرؔ نے اپنے شہر آشوب "درحال لشکر" میں زوال آمادہ سلطنت کے انتشار و انحطاط ، کمزوری وناتوانی، اقتصادی بدحالی اور درباری ماحول کا عبرت انگیز مرقع کھینچا ہے۔ میرؔ کو اقتصادی بد حالی کا بڑا شعور تھا۔ اس وقت ہندوستا ن کا اقتصادی نظام بھی بدحالی کا شکار ہو چکا تھا۔ بھوک وافلاس نے سپاہیوں کو بے حال کررکھا تھا۔ ایک ایک پارچہ، نان پر سو سوجگہ پر خاش ہو رہی تھی۔ میرؔ نے سپاہیوں کی اس خستہ حالی اور مفلسی کی بڑی عمدہ پیرائے میں تصویر کشی کی ہے۔

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش
آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش
ہے لبِ ناں پہ سو جگہ پر خاش
نے دمِ آب ہے ، نہ چمچہ آش
(کلیاتِ میر جلد پنجم، ص:۱۰۵)

شورش وبدامنی شہروں اور دیہاتوں میں یکساں تھی۔ جس سے زراعت کی حالت تباہ حالی کا شکار ہوگئی۔ ملک میں اناج کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگی تھی۔ صوبے داروں نے مرکزی خزانے میں مالیہ بھیجنا بند کردیا۔ جس کے نتیجے میں حکومت کے لیے اپنے معمولی سپاہ کو تنخواہ دینا بھی محال ہوگیا۔ سپہ گری جس پر سلطنت کی بنیاد تھی اور سب سے معزز پیشہ سمجھا جاتا تھااب سب سے حقیر پیشہ بن گئی۔ مالی پریشانی سے تنگ آکر سپاہیوں نے مجبوراً ہتھیار بیچ بیچ کرنان ونمک کا بندوبست کرنا شروع کیا۔ میرؔ جیسے دردِ دل رکھنے والے شاعر نے ان کے غم اور دکھ درد کو شدت سے محسوس کیا ہے اور اپنی نظم "مخمس در حالِ لشکر" میں اس کی تصویر کشی کی ہے۔

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال
کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال

پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال
ایک تلوار بیچے ہے ، اک ڈھال
بادشاہ وزیر سب قلاش
(ایضاً، ص: ۱۰۵)

میر اپنی نظم "مخمس دیگر درہجولشکر" میں بھی سپاہیوں کی خستہ حالی کا ذکر درد بھرے انداز میں کرتے ہیں ۔

فوج میں جس کو دیکھ سو ہے اداس
بھوک سے عقل گم ، نہیں ہیں حواس
بیچ کھایا ہے سب نے ساز و لباس
چیتھڑوں بن نہیں کسو کے پاس
یعنی حاضر براق ہیں گے سپاہ
(ایضاً، ص: ۱۰۲)

معاشی تنگی سے شاہی گھرانے اور بادشاہ کو بھی مفر نہیں تھا۔ اس افلاس زدہ معاشرے میں جب شاہی نوکروں کو اجرت نہ ملتی تو وہ مجبوراً بادشاہوں کے ساتھ گستاخی سے پیش آتے۔ میرؔ جیسا انسان دوست شاعر بادشاہ کی اس مفلسی اور بے چارگی کو اپنی نظم "مخمس دیگر" میں اس طرح بیان کرتا ہے۔

آٹھ آنے ہیں شاہ پر بھاری
اس کی لوگوں نے کی ہے اب خواری
آپ ہے تو یہ ہے گرفتاری
فوج ہے گی تو قحط کی ماری
کیوں نہ جس جا رہے ہیں واں تھا نال
(ایضاً، ص: ۱۱۲)

میرؔ کا پورا معاشرہ تہی دستی اور فاقہ کشی کی تصویر بن چکا تھا۔ میرؔ جیسے انسان دوست شاعر کو بھوک کی اس گرم بازاری نے بے حد متاثر کیا تھا۔ اپنی "نظمِ مخمس در حال لشکر" میں اس کی بہترین عکاسی کرتے ہیں ۔

جبے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر
تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر
ہیں معذب غرض صغیر و کبیر
مکھیاں سی گریں ہزاروں فقیر
دیکھیں ٹکڑا گر برابر ماش

(ایضاً، ص: ۱۰۶)

میرؔ کی ایک نظم "نسنگ نامہ" ایک سفر کی روداد ہے۔ میرؔ جیسے انسان دوست شاعر نے اس مثنوی میں جابجا اس دور کی معاشرت ، قصبوں ، شہروں کے معاشرتی ومعاشی حالات، عام لوگوں کی زندگی اور سفر کے طریقوں کو بیان کیا ہے۔ اطراف وجوانب میں جاٹوں ، مرہٹوں اور سکھوں کی فتنہ اندازیاں اور اس سے گاؤں و قصبوں کا متاثر ہونا بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ان قصبوں میں ماش کی دال کے علاوہ چند گلے سڑے اناجوں کے کھانے پینے کی اشیاناپید تھیں ۔ موسم برسات کی عام اور فصلی سبزیاں بھی دکھائی نہ دیتی تھیں ۔ اس معاشی بدحالی کے باعث ہر وقت بے ایمانی ، چوری، دغا بازی کا کھٹکا رہتا تھا۔ غرض میرؔ جیسے ہمدرد اور انسان دوست شاعر نے اس نظم میں وہ تمام سماجی، معاشی، تمدنی اور اخلاقی مسائل بے نقاب کیے ہیں ۔ جس کے پس پست سیاسی عوامل کار فرما تھے۔

ماش کی دال کا نہ کرے گلا
گوشت یاں ہے کبھو کس کو ملا
بکری لینے کو پیسے ہیں کس پاس
کھاو دال اور پا دو بے وسواس
جی اگر چاہے کوئی ترکاری
گول کدو ملے بہ صدی خواری
(کلیات میر جلد ششم، ص: ۱۴۰)

زنگ ضلع کرناں پنجاب میں واقع تھا۔ جہاں سکھوں کی چیرہ دستیوں سے امن وامان کو خطرہ تھا۔ میرؔ نے اس کا حال بھی بیان کیا ہے۔ اور ایک انسان دوست شاعر کی حیثیت سے اس دکھ درد کو محسوس کیا ہے کہ کسی شخص کی عزت اور جان ومال محفوظ نہیں تھا۔

بڑی آفت خطر تھا سکھوں کا
کیونکہ وہ ملک گھر تھا سکھوں کا
اس میں آ جاتے تو قیامت تھی
مال و جاں غرض سب کی رخصت تھی
(ایضاً، ص: ۱۴۹)

میرؔ نے نسنگ کی آبادی اور بازار کا حال بھی بڑے دکھ اور کرب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور اس مفلسی بدحالی اور ویرانی کا ذکر عمدہ پیرائے میں کیا ہے جس کے لوگ شکار تھے۔

اور آگے گئے تو تھا بازار
اس میں بینوں کی تھیں دکانیں چار

ایک کے پاس دال کچھ آٹا
تس کو بھی مکھیوں نے تھا چاٹا
ایک کے سانو اور تھوڑے چنے
چیتھڑوں میں خاک دھول ایک کنے
جو تھا باقی رہا سو تھا کنگال
نام کو کہتے تھے اسے بقال

(ایضاً)

میرؔ جیسے انسان دوست شاعر کی شاعری کے موضوعات نہایت عام ہیں ۔ ان کے مضامین میں غم والم ، خلوص اور صداقت کی کار فرمائی موجود رہتی ہے۔ دوسروں کے لیے جو باتیں خیالی ہیں میرؔ کے لیے وہ حالی ہیں ۔ وہ جس طرح کسی بات کو محسوس کرتے ہیں ایک ہمدرد انسان کی طرح اسی طرح بیان کردیتے ہیں ۔ایک مثنوی "درہجو خانہ خود" برسات کی شکایت میں لکھی ہے۔ جس میں بارش کی شدت سے گھر کا گرنا، مہینہ برسنے میں گھروالوں کا نکلنا اس انداز سے بیان کیا ہے کہ تمام عبرت سامانیاں اور حسرت ناکیاں آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں ۔ جہاں جہاں انہوں نے اپنی ذات کو ہدف طنز وملامت بنایا ہے وہاں یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ان کی اپنی ذات تنہا نہیں ایک انجمن ہے۔ ان کی دشواریاں تنہا ان ہی کی نہیں بلکہ اس ماحول کی پروردہ ہیں ۔ جب ایک تہذیب کا خاتمہ ہو رہا تھا اور ایک نیا سماج جنم لے رہا تھا۔ پھر اس تغیر پذیر دور میں ان کی ذات تنہا کیسے رہ سکتی تھی۔ ان کے گھر کا حال اس بات کا غماز ہے کہ اس دور میں لوگ ایسے ہی خستہ حال مکانوں میں اپنی زندگی کی کٹھن گھڑیاں گزارنے پر مجبور تھے۔

کب لکھوں میر اپنے گھر کا حال
اس خرابے میں میں ہوا پامال
کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک
کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیری ہے خاک
کہیں کھونسوں نے کھود ڈالا ہے
کہیں چوہے نے سر نکالا ہے

(کلیاتِ میر جلد ششم، ص: ۱۸۰۔۱۸۱)

میرؔ جیسا انسان دوست شاعر چونکہ معاشر ے میں امن کا خواہاں ہے۔ اس لیے معاشرے میں موجود ہر برائی کو جڑ سے ختم کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔنے نے اپنے زمانے کے برے کرداروں اور عام شہریوں کی ملمع سازی اور اخلاق ذمیمہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ انہوں نے اپنے دور کے سماجی احوال کا بڑی باریک بینی سے

مشاہدہ کرے کھوکھکی زندگی سے بے باکانہ پردہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے اپنی ایک مثنوی "دیگردربیان کذب" میں جھوٹوں کو نشانہ تضحیک بنایا ہے جس کے باعث معاشرے میں بدامنی کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔

اے جھوٹھ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے
شیوہ یہی سبھوں کا یہی سب کا طور ہے
اے جھوٹھ تو شعار ہوا ساری خلق کا
کیا شاہ ، کیا وزیر کا ، کیا اہلِ دلق کا
اے جھوٹھ تجھ سے ایک خرابی میں شہر ہے
اے جھوٹھ تو غضب ہے قیامت ہے قہر ہے
(ایضاً، ص: ۲۵٦)

یہ سچ ہے کہ حضرت یوسف کو بھی دو سروں کے جھوٹ کی وجہ سے زنداں میں رہنا پڑا۔ کو ہکن بھی اسی جھوٹ سے دلالہ کے فریب میں آکر تیشہ مار کر مر گیا ۔ اسی جھوٹ نے میرؔ کو بھی پریشان کیا۔ کوئی سچ بات نہیں کرتا۔ میرؔ نے اپنی تنخواہ کی فرد دسخطی ایک دوسرے شخص کو دے رکھی تھی لیکن وہ جھوٹے وعدوں پرٹالتا رہا اور اسی طرح مہینوں ہی نہیں برسوں گزر گئے لیکن ایک پیسے کی بھی ادائیگی نہیں کی گئی۔ میر اپنی نظم "مخمس دیگر" میں بادشاہ کی خستہ حالی اور عمدوں اور سپاہیوں کا حال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔

عمدے جو ہیں دنوں کو بھرتے ہیں
سو بھی اسباب گروی دھرتے ہیں
ہیں سپاہی سو بھوکے مرتے ہیں
لوہو پی پی کے زیست کرتے ہیں
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال
(کلیات میر جلد پنجم، ص: ۱۱٦)

دراصل میرؔ اپنے دور کے ٹوٹتے بکھرتے انسانی اور ڈگمگاتی اخلاقی اقدار پر گریہ کناں ہیں ۔ وہ ایک انسان دوست اور حقیقت پسند انسان تھے۔ وہ مغرب کے قنوطیوں کی طرح انسان کو اندھی مشیت کا کھلونا سمجھنے کے لیے تیار نہیں ۔ وہ دنیا کی بے ثباتی اور انسان کی مجبوریوں کا ذکر اس لیے کرتے ہیں تاکہ اس کی نگاہ ظاہر کی رنگینوں میں کھو کر نہ رہ جائے بلکہ حقائق کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھنے

کی کوشش کرے۔ وہ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ پیش کرکے اس کی اصل حقیقت دنیا پر آشکار کرنا چاہتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی مثنوی '"درمذمتِ دنیا" کے چند اشعار دیکھیے۔

سنو اے عزیزان ذی ہوش و عقل
گہ اس کارواں گہ سے کرنا ہے
نقل
پیمبر ہے ، شہ ہے کہ درویش ہے
سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے
جسے دیکھو چلنے کا گرم تلاش
یہ منزل نہیں جائے بود اور باش
(کلیاتِ میر جلد ششم،
ص: ۲۵۱)

ایک صوفی کے نزدیک مادی زندگی اہمیت نہیں رکھتی لیکن مادی زندگی میں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے اس سے دلچسپی نہ رکھنے کے باوجود وہ اس کو دیکھتا ضرور ہے۔انسانی زندگی کی ناپائیداری کے باوجود وہ زندگی کو اہمیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک اس زندگی میں ایک مخصوص نظام اخلاق کا ہونا لازمی ہے۔ اس اخلاق کی بنیاد محبت اخوت اور شرافت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ انسانیت اور انسانی اقدار کو عزیز رکھتا ہے اور اپنی اقدار کی ترویج اس کے پیش نظر ہوتی ہے۔ میرؔ کے یہاں بھی اسی صورتحال کا احساس ہوتا ہے۔

میرؔ جیسے انسان دوست شاعر نے کچھ واقعاتی مثنویاں بھی لکھی ہیں ۔ جن میں "شکارنامے" ، "جنگ نامے" "ساقی نامے"، "جشن کدخدائی ہولی" اور پالتو جانوروں سے متعلق مثنویاں شامل ہیں ۔ میر کو چونکہ زمانے نے بہت زیادہ گھریلو بنا دیا تھا اس لیے انہیں گھر اور دنیا کی فطرت کے مطالعے کا تمام عمر موقع ملتا رہا۔ یہی سبب ہے کہ خانگی اشیاء پر بڑی شائستگی سے روشنی ڈالتے ہیں ۔ میرؔ جیسا ہمدرد انسان ناصرف انسانوں سے محبت کرتا ہے بلکہ جانوروں کے ساتھ ان کی محبت بھی قابلِ دید ہے۔ اس سلسلے میں ان کی مثنوی "موہنی بلی" قابل ذکر ہے۔ میر اس مثنوی میں بلی کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسے جو کچھ بھی ملتا وہ قناعت کرکے کھالیتی ۔ اگر بدقسمتی سے کوئی چھینکا ٹوٹ جاتا تو اس طرف ایک نظر بھی نہ دیکھتی۔ چلتے میں نہ کسی کا راستہ کاٹتی تھی نہ ہی چھینکتی تھی۔ وہ اس قدر پاکیزہ اور نرم دل تھی کہ چوہے کو دیکھ کر ڈرجایا کرتی تھی۔ دراصل بلی کی یہ قناعت پسندی، وضع داری اور درویش خوئی خود میرؔ اور عہد میر کے غیرت مند، وضع دار مگر غریب طبقہ کی نمائندگی کرتی ہے۔

چھیچھڑا ٹکڑا جو کچھ پایا کرے
فقر میرا دیکھ کر کھایا کرے
بختوں سے ٹوٹا ہے جھینکا بھی
اگر

ان نے اودھر کی نہیں مطلق نظر
دخل کیا ہے جھانکے یہ چھینکے
کی اور
ٹکڑے کو دیکھے نہ گو بھوکی ہو
زور
اس مروت پیشہ سے کیا ہے گلا
خوف سے آپھی گئے چوہا ملا
(کلیاتِ میر جلد ششم، ص: ۲۹۰)

میرؔ کی تمام تر شاعری میں ہمیں انسان دوستی ، مذہبی رواداری اور بے تعصبی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ شاید یہ سب کچھ میرؔ کے عہد اور اس کے گھریلو ماحول کی دین ہے۔ دراصل میر تمام مذاہب اور اس کے پیروکاروں میں یکجہتی دیکھنے کے متمنی ہیں ۔ کیونکہ یکجہتی پر امن معاشرے کی ضامن ہے۔ ان تمام کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس عہد میں ہمیں تمام مذاہب کے لوگ ایک لڑی میں پروے ہوئے ایک قوم کی صورت میں نظر آتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال ہولی کی عید عام طور پر ہندو اور مسلمان دونوں ملکرمناتے تھے اور بادشاہ اور امر اس میں خاص طور پر دلچسپی لیتے تھے۔ انسان دوست میرؔنے اپنی مثنوی "دربیانِ ہولی" میں اس کا نقشہ اتارا ہے۔

ہولی کھیلا آصف الدولہ و زیر
رنگ محبت سے عجب ہیں خرد و
پیر
شیشہ شیشہ رنگ صرفِ دوستاں
صحنِ دولت خانہ رشکِ بوستاں
دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جواں
جیسے گل دستہ تھے جووں پر
رواں
(کلیاتِ میر جلد ششم،
ص: ۲۸۱)

انسان دوستی کے عناصر میرؔ کی تمام اصنا ف شاعری میں ملتے ہیں ۔ وہ میر کی مثنویات ہوں یا مراثی، میر ہمیں ہر جگہ انسان دوستی کے نعمے الاپتے نظر آتے ہیں ۔ جب ہم میرؔ کے مریثوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ سوز گداز، اثر آفرینی اور رنج وغم کی گہری تاثیر کے حامل نظر آتے ہیں ۔ میرؔ کے مریثوں میں محرم کی چاند رات سے لے کر سفر امام حسین از مدینہ خطبہ امام حسین، حضرت قاسم کی شادی، شب عاشورہ اور بعد عاشورہ کے واقعات اور شہادت امام کے بعد کے حالات وواقعات کا بیان بڑے اندوہناک انداز میں ملتا ہے۔ حق وباطل کے معرکے کی تصویر کشی میں وہ اپنے مخصوص لب ولہجہ سے بھی خوب خوب کام لیتے ہیں اور خاندان امام حسین علیہ السلام کی عورتوں کی توہین کو بھی موضوع بناتے ہیں اور ان کے دکھ درد میں شریک نظر آتے ہیں ۔

کہیں زینب بہن ، زہرا سے مادر!
کرے گا کون اب ہم سوں کا آدر
پڑا ہے خاک میں بے سر برادر
لیے جاتے ہیں چھینے سر کی چادر
کہاں لے جاوں بھائی کو اٹھا کر
اڑاوں خاک کس کے آگے جا کر
(کلیاتِ میر جلد پنجم، ص: ٤١٢)

میرؔ نے ایک مرثیے میں محرم کے چاند کو موضوع سخن بنایا ہے جس کے نکلتے ہی قیامت کا سماں بندھ جاتا ہے۔ ہر طرف سوگواری کی فضا دکھائی دیتی ہے۔ مردوزن، بچے جواں سب خستہ حال اور گریباں چاک دکھائی دیتے ہیں ۔

الف داغ کھینچے کہیں جائیں گے
کہیں نعل سینوں پہ جڑوائیں گے
بہت لوہو روتے ہوئے آئیں گے
بہت سینہ کوبی سے ہوں گے نڈھال
(کلیات میر جلد پنجم، ص: ٢٦٠)

غرض میرؔ کی شاعری میں انسان دوستی ، پیار ومحبت صبرو تحمل، ایثار وقربانی، وفا شعاری، نیکی اور خلوص کے جذبات جابجا دکھائی دیتے ہیں ۔ جو انہیں ایک انسان دوست شاعر بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ یہی انسان دوستی ان کی بہت بڑی خوبی ہے۔ جس کے باعث انہوں نے ہر دور اور ہر عہد کے انسانوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔

میرؔ کی شاعری اپنی تمام گریہ وزاری کے باوجود حوصلہ شکن شاعری ، بے حوصلگی کی شاعری، دنیا سے بے زاری کی شاعری ، بیمار تصورات کی شاعری ہرگز نہیں ہے۔ یہ شاعری پامردی کی شاعری ہے۔ میرؔکی آواز میں ایک للکار چھپی ہوئی ہے۔ یہ ایک مردانہ وار آواز ہے۔ یہ آواز ایک ایسے دلیر اور سورما کی آواز ہے جو ایک لٹتے اور مٹتے ہوئے ہندوستان اور موت سے دو چار ہوتی ہوئی ایک زندگی کی آواز ہے۔ میرؔ کی شاعری ہمیں موت نہیں دیتی زندگی دیتی ہے۔ یہ شخص سر سے پیر تک گھائل ہو کر بھی زندگی کی آبرو پر آنچ نہیں آنے دیتا ۔

میر حسن اور انسانی دوستی (١٧٤١-١٧٨٦)

میر و سوداؔ ہی کے دور میں قائم ، میروسوز ، میر اثر اور میر حسن جیسے اہم شعراء بھی تھے ۔ میر حسن نے شاعری میں میر و سودا

کی پیروی کی ۔ ان کی شاعرانہ زندگی کا لافانی کارنامہ ان کی مثنوی " سحر البیان " ہے۔ جس میں شہزادہ بے نظیر اور پری بدر منیر کا افسانہ عشق بیان کیا گیا ہے ۔ اس مثنوی میں اس زمانے کی معاشرتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں ۔ رسم و رواج کا بیاں بڑی تفصیل سے ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی مثنوی کے کردار خیالی نہیں معلوم ہوتے بلکہ ان میں انسانی کرداروں کی تمام کیفیتیں ملتی ہیں ۔ سحر البیاں کے کرداروں میں بے عملی میں عمل اور جمود میں حرکت پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے ۔ جس کی عکاسی نجم النساء کا کردار ادا کرتا نظر آتا ہے ۔ اس کے علاوہ میر حسن ، شہزادہ بے نظیر کے اوصاف حمیدہ کو پیش کر کے اپنے اشعار میں اپنے فلسفہ انسان دوستی کی جھلک دکھاتے ہیں ۔

سو ان کمالوں کے کتنے کمال
مروت کی خو آدمیت کی چال
رزالوں سے نفروں سے نفرت اسے
سدا قابلوں سے محبت اسے
گیا نام پر اپنے وہ دل پذیر
ہر اک فن میں سچ مچ ہوا بے نظیر
(مثنوی سحر البیان)

مثنوی " سحر البیاں " کی خصوصیات پر بحث کرتے ہوئے احتشام حسین کہتے ہیں ۔

سحر البیاں میں انسانی ہمدردی کا ایسا تصور پایا جاتا ہے کہ اس کے مافوق الفطرت عناصر کی حیرت انگیزی اس کے سامنے پست معلوم ہونے لگتی ہے اور یہی اس مثنوی کو اہم بناتی ہے۔

گلزار نسیم اور انسان دوستی

دیا شنکر نسیم بلا کے ذہین آدمی تھے ۔ زبان و بیان پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی ۔ بیس پچیس سال کی عمر میں فن شعر میں وہ کمال پیدا کیا کہ ان کی مثنوی " گلزارِ نسیم " اردو کے زندہ جاوید کارناموں میں شمار کی جاتی ہے ۔ یہ مثنوی لکھنوی تہذیب و تمدن کی فضا اور مزاج کی بہترین عکاس ہے ۔ مثنوی میں اگرچہ مناظر قدرت ، فلسفہء تصوف کی طویل مباحث ، حسن و عشق اور رزم و بزم کی داستانیں بخوبی نظم ہو سکتی ہیں ۔ لیکن جدید شاعری کے آغاز سے پہلے اردو مثنوی میں زیادہ تر حسن و عشق کی داستانیں اور عشق و عاشقی کے ا فسانے ہی بیان کیے گئے ہیں ۔ حالیؔ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مثنوی میں اخلاقی ، قومی اور سیاسی مسائل بھی بیان کیے ہیں ۔ نسیمؔ کی مثنوی کا جائزہ لیا جائے تو اس کے کرداروں کی کوئی مکمل اور زندہ شخصیت مرتب نہیں ہوتی ۔ یہ مخلوق نہ ناری ہے

نہ خاکی۔ تاہم ان کرداروں میں قلب انسانی کی تڑپ موجود ہے ۔ بعض سہیلیوں میں انسانیت اور انسان دوستی کے جذبات موجود ہیں ۔ اس کے علاوہ گلزار نسیم کا تہذیبی ، اخلاقی اور انسان دوستی کا پہلو بھی اس کی انفرادیت کا حامل ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ کریں :

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجئے
جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجئے
(مثنوی گلزارِ نسیم، ص :٤٦)

میٹھا اس دیو کو کھلاؤ
گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو
(ایضاً، ص: ٢٥)

کانٹوں میں اگر نہ ہو الجھنا
تھوڑا لکھا بہت سمجھنا
(ایضاً، ص: ٥٤)

کیا لطف جو غیر پر وہ کھولے
جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے
(ایضاً، ص: ٥٤)

ڈاکٹر اعجاز حسین دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم کے بارے میں رقم طراز ہیں ۔

اس مثنوی میں اختصارو معنی آفرینی ہر لحاظ سے نہایت قابلِ قدر ہے ۔ ایک شعر میں معنی کے اعتبار سے کئی کئی شعر کے مضامین بھروئے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ہر جگہ مطلب واضح ہو جاتا ہے ۔ شازو نادر ہی کوئی موقع ایسا ہوتا ہے کہ مفہوم صاف نہ ہو ۔ نسیم کے یہاں رنگین بیانی کی وجہ سے سوزو گداز مثنوی میں بہت کم ہو گیا ہے لیکن بقول چکست نسیم کے اشعار زبان کی پاکیزگی اور ترکیب الفاظ کی چستی کے لحاظ سے تاثیر کا طلسم بنے ہوئے ہیں "۔

انیس ودبیر اور انسان دوستی (١٨٠٣۔١٨٧٤)

مثنویات کے علاوہ مراثی گوئی بھی شعری ادب کا میدان خاص ہے۔اس لہذا سے دیکھا جائے تو ارود مرثیہ اور انیس ہم معنی الفاظ ہیں ۔اردو مرثیہ کا تذکرہ انیس کے بغیر نامکمل اور ادھورہ ہے۔مرثیہ نگاری اگرچہ ان سے پہلے ارتقاکی بہت سی منازل طے کر چکی تھی اورخلیق،ضمیر دلگیر اور فصیحؔ جیسے مرثیہ گو کافی شہریت حاصل کرچلے تھے۔ لیکن جو قبول عام اور شہرت دوام انیسؔ اور ان کے حریف

دبیرؔکا مقدر بنی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔اور یوں یہ دونوں ہی مرثیہ گوئی کے فن کے امام مانے جاتے ہیں ۔
پروفیسرڈاکٹر نعیم نقوی انیس کے زمانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔
میر انیس نے اس زمانے میں جب قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا ۔محلات کو تباہ کیا جا رہا تھا۔مال ومتاع لوٹا جا رہا تھا۔ عورتوں کے ساتھ بہیمانہ سلوک روا تھا۔ عزت و ناموس لٹ رہی اور وطن میں رہ کر ہر شخص غریب الوطنی کی اذیت سہہ رہا تھا۔ہر سمت لا وارثی کے بادل منڈلارہے تھے۔ ایک ایسی المناک تاریخ کو شعری قالب میں ڈھالا جس سے طمانیت کی فضا قائم ہو اور قوم اعلیٰ قدروں کا درس لے اور عزت سے مرنا اور جینا سیکھے۔مرثیہ نگاری کے حوالے سے میرا نیس اس طرح نقیب آزادی بن کر ابھرے کہ ان کے کلام سے سننے والوں کو سکون حاصل ہوا اور ان کے دل میں بھی حریت اور آزادی کے جذبات انگڑائیاں لینے لگے۔
میر انیسؔ کے مراثی کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں اخلاقی مضامین اور انسانیت دوست قدروں کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔شعر کا ایک ایک مصرع اصول اخلاق کا سمندر محسوس ہوتا ہے اور انسانی قدروں اور انسان دوستی کی متعدد مثالیں مرثیوں میں ملتی ہیں ۔دنیا کی بے ثباتی کا فلسفہ جو درس اخلاق اور انسان دوستی کا جزو خاص ہے اس کو عمدگی سے بیان کرتے ہیں ۔اشعار ملاخطہ کیجیے۔

تھوڑے سے بستروں کی ہے درکار ہم کو جا
جنگل ہوا تو کیا جو ترائی ہوئی تو کیا
ہے عمر بے ثبات زمانہ ہے بے وفا
آرام کا محل نہیں یہ عاریت سرا
اب وہ کہاں ہیں شہر جنہوں نے بسائے ہیں
سب اس زمین پہ خاک میں ملنے کو آئے ہیں
(انیس کے مرثیے)

میرانیسؔ نے اپنے مرثیے میں حضرت امام حسین کی سادگی،عجزوانکساری ،پیار و محبت اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی کے جذبات کو عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اپنی شہادت سے کچھ دیر پہلے میدان کربلا میں آنے والے ایک مسافر کی ہر طرح مدد کرنا اس کے لئے دعائے خیرکرنا اور حسن سلوک سے پیش آنا ان سب کا بیان ملتا ہے۔ اس انسان دوستی سے متاثر ہو کر مسافریوں کہہ اُٹھتا ہے۔

دیکھی جو یہ عنایت سلطان بحر و بر
رونے لگا وہ مرد مسافر جھکا کے سر
دل سے کہا خدا کا ولی ہے یہ خوش سیر
اس حال میں غریب نوازی ہے اس قدر
دیکھی نہ باپ میں یہ محبت نہ بھائی میں
اب تک ہیں اس طرح کے بھی بندے فدائی میں
(انیس کے مرثیے)

انیسؔ نے اپنے مرثیوں میں زوال پذیر معاشرے پر جو طنز کے تیر برسائے ہیں وہ اپنی جگہ اصلاحی پہلو رکھتے ہیں۔وہ اپنے ماحول کا گلہ خدا سے کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ناقدری عالم کی شکایت نہیں مولا
کچھ دفتر باطل کی حقیقت نہیں مولا
باہم گل و بلبل میں محبت نہیں مولا
میں کیا ہوں کسی روح کو راحت نہیں مولا
عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں
(انیس کے مرثیے، حصہ اوّل، ص:٥٤)

مرزا انیس کے مرثیوں میں اخلاقی مضامین اس طرح جگہ پاگئے ہیں جس طرح انسان میں روح۔ انیسؔ اپنے دور کے سچے ترجمان تھے ان کے نزدیک لوگوں میں جب برائی اور بھلائی کی تمیز ختم ہو جاتی ہے تو ہیرا بھی ان کو پتھر معلوم ہونے لگتا ہے۔ سچے قدردانوں کی کمی کا جو احساس انیسؔ کے ہاں ملتا ہے اس کی ایک جھلک ان کے اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے۔

الماس سے بہتر یہ سمجھتے ہیں خذف کو
ڈر کر تو گھٹاتے ہیں بڑھاتے ہیں

صدف کو
اندھیر ہے یہ چاند بتاتے ہیں کلف کو
کھو دیتے ہیں شیشے کے لیے درِ نجف کو
ضائع ہیں در و لعل بدخشاں و عدن کے
مٹی میں ملاتے ہیں جواہر کو سخن کے
(انیس کے مرثیے، ص:٥٤)

انسان دوست انیسؔ دراصل اپنے مرثیوں کے ذریعے مثالی کردار پیش کر کے اپنے معاشرے کی اصلاح کے خواہش مند تھے ۔ وہ لوگوں کو کاہلی اور سستی کو چھوڑ کر حرکت و عمل کی ترغیب دیتے تھے ۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگوں میں راہ حق میں مر مٹنے کی تڑپ پیدا ہو۔ وہ طاغوتی قوتوں کے سامنے اپنا سر تسلیم خم نہ کریں ۔باطل کے خلاف آواز بلند کریں ۔دراصل حیات انسانی کے لئے ان اقدار کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ اس طرح ایک صالح اور انسان دوست معاشرہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ عظیم الحق جنیدی میر انیس کے مریثوں میں انسان دوستی کے پہلو کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔

مرثیہ کے مضامین نے اخلاق اور محبت کا وہ سبق عام کیا جو واقعی محبت کو آفاقی بنا دیتا ہے۔ایثار ، صبروضبط، حق کی خاطر جان دینا اور باطل کے آگے سر نہ جھکانا وہ اوصاف ہیں جو انسانیت کو اس کا حقیقی شرف عطا کرتے ہیں ۔مرثیہ میں یہ اس حسن و خوبی سے بیان کئے گئے ہیں کہ سننے والا بے اختیار سرفروشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔رزمیہ شاعری کے میدان میں اردو نے انیسؔ ودبیرؔ کے مرثیوں کے طفیل قدم رکھا۔ میر انیسؔ اور دبیر نے اس فن کو کمال تک پہنچایا۔ان کے بعد نہ کوئی ان سے بہتر کہہ سکا اور نہ اس پر اضافہ ہی کرسکا۔ مرثیہ گوئی نے لکھنو کی شاعری پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ اخلاقی مضامین داخل ہوئے۔ جس کے نتیجہ میں فی الواقع لکھنوی شاعری میں ایک خوشگوار انقلاب آگیا۔

انجمن پنجاب کی نظم نگاری میں انسان دوستی کے رجحانات پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس سے پہلے پورے عہد میں اکلوتے انسان دوست نظم گو نظیر اکبر آبادی کی نظم گوئی میں انسان دوستی کے میلانات کا جائزہ لیا جائے تاکہ نظم کی روایت میں ان کے مقام ومرتبے کا تعین ہوسکے۔

نظیر اکبر آبادی اور انسان دوستی(١٧٣٥۔١٨٣٠)

شیخ ولی محمد نظیر اکبر آبادی ١٧٣٥ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ لیکن نو عمری میں ہی اپنے والدین کے ساتھ اکبر آباد چلے گئے۔یہ وہ دور

تھاجب ہندوستان کی سیاسی اور اونچے طبقے کی زندگی زوال کا شکار ہو چکی تھی۔اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کاشیرازہ بکھر چکا تھا۔یہ دور نکمے اور عیش پرست حکمرانوں کا دور تھا۔اس دور میں ملک کا معاشی نظام عدم توجہی کا شکار ہوتا چلا گیا ۔جس کانتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں انتشار اور بدامنی کی فضا عام ہوئی۔اسی عالم میں نادرشاہ ایک ناگہانی آفت کی طرح حملہ آور ہوا اور ہر طرف قتل و غارت ،لوٹ اور تباہی کا بازار گرم ہوا۔ جاٹوں نے بغاوت کی ،اس کے بعد رو ہیلوں کی بغاوت بھی ایک مصیبت بن کر آئی۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نظیرؔ کے ماحول پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

زمانے اور ماحول کے اعتبار سے نظیر ؔنے سیاسی و معاشی دارو گیر کے عین شباب میں آنکھ کھولی۔نادراور ابدالی کے حملے مرہٹوں ،جاٹوں ،روہیلوں اور سکھوں سے لیکر ایسٹ انڈیا کمپنی تک کی غارت گریوں کے سانحات ان کے سامنے گزرے ۔

یہ ایسی صورتحال تھی جس نے بڑے بڑے امرا اور روسا کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ جبکہ غریب عوام میں اس قدر انتشار اور بدامنی کی غیریقینی کی فضا عام تھی کہ لوگوں کا ایمان متزلزل ہوچکا تھا۔لوگ دینا سے فرار کی راہ ڈھونڈھ رہے تھے اور زندگی سے تنگ آچکے تھے۔ ایسے میں نظیرؔ جیسے انسانیت نواز اور انسان دوست شاعر نے جب لوگوں کے دکھوں اور پریشاینوں کو دیکھا تو ان کا دل عوام کی محبت و ہمدردی سے بھر گیا۔ بقول پروفیسر حامدی کاشمیری " نظیر اکبر آباد میں رہتے ہوئے بھی ایک باشعور اور حساس فنکار کی طرح اپنے ملک کی تقدیر کی برگشتگی کا نظارہ کر رہے تھے اور تباہی و بربادی کے اس المناک نظارے سے متاثر ہو رہے تھے"۔

اُردو شاعری میں نظیر ؔکی انسانیت نوازی اور انسان دوستی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔اُردو شاعری کی دنیا میں انسانوں سے محبت اور پیار کرنے والا یہ شاعر ان کے دکھ درد میں برابر کا شریک دکھائی دیتا ہے اور انہیں اس مشکل سے نکالنے کےلئے مصروف عمل نظر آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں دنیا کی بے ثباتی کے موضوعات کو اپنایا اور لوگوں کو اس کی حقیقت سے آگاہ کیا تاکہ لوگ دنیٰا کی محبت اور اس کی چاہ میں ناحق پریشان نہ ہوں ۔انہوں نے اپنی نظم "ہنس نامہ " میں ایک ہنس کے ذریعے اس حقیقت کو بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ دنیا کے تمام رشتے ناتے عارضی اور وقتی ہیں ۔کوئی کتنا ہی پیارو محبت کرنے والا کیوں نہ ہو۔موت کے سامنے بے بس ہے۔جس طرح ہنس کو تمام پرندوں کی محبت حاصل تھی کہ ہر کوئی اس کے ساتھ اس کے وطن جانے کو تیارتھا لیکن اس کو اکیلے ہی وطن سدھارنا پڑا بالکل اسی طرح انسان بھی دوستوں اور پیاروں کی محبت چھوڑ کر اکیلے ہی رخصت ہوتا ہے۔ نظیرؔ ہنس کے ساتھیوں کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں اشعار دیکھیے۔

اور ہنس کی ان سب کو رفاقت ہوئی غالب
جب وہاں سے چلا وہ تو ہوئی بے بسی غالب
کلفت تھی جو فرقت کی وہ سب پر ہوئی غالب
دو کوس اُڑے تھے جو ہوئی ماندگی غالب
پھر پر میں کسی کے نہ رہا قوت و یارا
(کلیات نظیر ،ص: ٦٢٤)

جبکہ دوسری طرف نظیرؔ دنیا کی اصل حقیقت واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

دنیا کی جو الفت ہے اس کی یہ کچھ راہ
جب مشکل یہ ہووئے تو بھلا ہے کیونکر ہو نرباہ
ناچاری ہو جس جا میں تو واں کیجئے کیا چاہ
سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیرؔ آہ
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا
(کلیات نظیرؔ، ص: ٦٢٤)

نظیرؔ کی " آدمی نامہ" انسان دوستی کی معراج ہے ۔اس میں ہمدردی ،دلسوزی ،خلوص اور انسان دوستی کے جلوے کارفرما دکھائی دیتے ہیں ۔ نظیرؔ دراصل ایک زندہ دل ،بے ضرر، سادہ مزاج اور زندگی اور زندگی کے ہنگاموں سے محبت کرنے والا شخص تھا۔اس نے عوام کی اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر ایک سچے شاعر اور فنکار کی حیثیت سے زندگی کی عکاسی اور ترجمانی کے فرائض سر انجام دیئے ہیں ۔"آدمی نامہ " میں انہوں نے ایک انسان دوست شاعر کی حیثیت سے مفلس عوام کے زخموں پر مرہم لگانے کی کوشش کی ہے۔جہاں ہر شخص آدمی ہونے کی حیثیت سے ایک ہی کشتی کا سوار نظر آتا ہے ۔انسانی عظمت کے سامنے طبقات کی تقسیم بے معنی ہے۔ہر شخص جو ایک مرد و عورت سے پیدا ہوا ہے وہ "آدمی " ہے۔ نظیر نے دراصل اس نظم میں انسان کے رنگ اور رتبے کی تصویر کشی کرتے ہوئے بڑے لطیف پیرائے میں مساواتِ بشر کا خیال عام کیا ہے۔

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بینوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
(کلیات نظیر، ص: ٦٠٤)

طارق ہاشمی اپنی کتاب "اُرود نظم اور معاصر انسان " میں منظوماتِ نظیر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ "انسان کی عظمت کے سامنے طبقات کے تفوق اور پستی کا سر جھکتا ہے۔ہر شخص جو ایک مرد اور عورت سے پیدا ہوا ہے وہ آدمی ہے اور اسی احساس کی تفسیر نظیرؔ کے بہت سے خیالات ہیں "۔

نظیرؔ کی نگاہ میں آدمی نہ محض فرشتہ ہے اور نہ شیطان آدمی بہر حال آدمی ہے۔وہ آدمی جو گناہ و ثواب سے مرکب ہے۔وہ برائیوں اوراچھائیوں ،دوستیوں ، دشمنیوں ، چوریوں ،ہمدرریوں اور محبتوں کا ایک مجموعہ ہے۔چونکہ وہ آدمی ہے اس لئے منفی ومثبت عناصر سے عبارت ہے ۔یہ نظم " آدمی نامہ " دراصل آدمی کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے اور اس تفہیم میں نظیرؔ ہر بار آدمی کے مثبت پہلوؤں کے ساتھ اس کے منفی پہلو بھی اجاگر کرتا ہے۔

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور
یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور
شیطان بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی
(ایضاً، ص: ٦٠٥)

نظیرؔ کے "آدمی نامے" کو اردو نقا د بہت سراہتے ہیں ۔آل احمد سرور تو یہاں تک لکھتے ہیں ۔"آدمی نامہ تو ایک طور پر انسان دوستی

کی ایسی دستا ویز ہے جو یو رپی ہیو منزم کے چارٹر سے پہلے وجود میں آئی"

نظیر کی شاعری میں درد مندی سو زوگداز اور ہمد ردی کے ساتھ ساتھ ایک خاص سطح کی حکمت اور اخلاق کی جھلک بھی موجود ہے ۔ وہ اس روش میں شدید ناصحا نہ رویہ اختیار نہیں کر تے بلکہ ان کا انداز نہایت نرم اور ملائم ہے ۔" کلجگ" جیسے عنوان پر جب نظیر لکھتے ہیں ۔ تو اس سے ہمارے اندر ہو شیاری کے ساتھ ساتھ زندگی کی ایک نئی لہر پیدا ہوتی ہے۔ جس کو دنیا "کلجگ" کہتی ہے نظیر اس کو "کر جگ "بتاتے ہیں اور سمجھاتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم" کلجگ" کا ایک بند ملا حظہ فر مائیے۔

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی سات لے
نیکی کا بدلا نیک ہے بد سے بدی کی بات لے
میوہ کھلا میوہ ملے پھل پھول دے پھل پات لے
آرام دے آرام لے دکھ درد دے آفات لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے
(کلیات نظیر، ص: ٥٤٤)

نظیر " کلجگ " میں یہی پیغام دیتا ہے کہ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو اور سب کو زندہ دیکھ دیکھ کر خوش ہو۔اردو میں نظیرؔ پہلے شاعر ہیں جن کی شاعری انسانیت کی آواز معلوم ہوتی ہے اور جو انسانیت کی فطری اور اصلی قدر سے ہم کو آگاہ کرتی ہے ۔اسی طرح نظیر اپنی نظم "بنجارہ نامہ" میں اس حقیقت سے پردہ آشکار کرتے ہیں کہ کسی بھی وقت بٹ مارا اجل کا آ پہنچے گا اور بنجارہ سب کچھ چھوڑ کر سفر آخرت کو سدھارے گا ۔" بنجارہ نامہ" کو پڑھ کر ہم اپنے اندر بس ایک آگاہی پانے لگتے ہیں جیسے کسی نے سوتے سوتے چونکا دیا ہو اور ہم ہوشیار ہوگئے ہیں ۔نظیرؔ کہتا ہے کہ اسی لئے ضروری ہے کہ اس دنیا میں رزق حلال ہی کمایا جائے کسی کی حق تلفی نہ کی جائے اور انسان دوستی کا پیغام عام کیا جائے۔

ہر آن نفع اور ٹوٹے میں کیوں مرتا پھرتا ہے بن بن
ٹک غافل دل میں سوچ ذرا ہے ساتھ لگا تیرے دشمن
کیا لونڈی باندی دائی دوا کیا بندا چیلا نیک چلن
کیا مندر مسجد تال کنویں کیا گھاٹ سرا کیا باغ چمن
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد

چلے گا بنجارا
(ایضاً ،ص:
۴۹۹)

ڈاکٹر تبسم کا شمیری نظیرؔ کی نظم بنجارا نامہ پر ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔

بنجارا اس آدمی کی علامت ہے جو ہر طرح سے مر فہ ا لحال ہے۔آسودہ ہے زندگی کو پورے اطمینان اور یقین سے بسر کر رہا ہے۔ مگر یہ نہیں جانتا ہے کہ اس کے عقب میں کیا ہے۔عقب کی صورتحال کو جاننے سے وہ بے خبری کا شکار ہے اور یہ بے خبری کیا ہے ؟ یہ بے خبری موت اور فنا کے استعاروں کو فراموش کردینے میں ہے۔ " بنجارہ نامہ" ان ہی استعاروں کی بار بار یاد دلاتا ہے اور موت کے قطعی اور آخری انجام کو دکھا کر آدمی کو ہوا اور حرص کی دنیا سے باخبر کرتا ہے ۔" بنجارہ نامہ " میں نظیر ؔ " قزاق اجل " کی دہشت پیدا کرکے ہوا و حرص کی جبلتوں میں توازن پیدا کر رہا تھا۔

نظیرؔ کے عہد کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی مسئلہ تھا اور نظیرؔ کی شاعری میں یہ مسئلہ بہت نمایاں ہے ۔وہ جب اپنے عہد کی بدحالی اور انتشارکا تجزیہ کرتے ہیں اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کو تیز ی سے مٹتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان سب کی تہہ میں انہیں اقتصادی مسائل ہی نظر آتے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی نظموں میں آٹے ،دال ،روٹی مفلسی ،پیسہ وغیرہ جیسے اہم مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے۔وہ انسان دوست ہیں ۔اس لئے زندگی میں عام آدمیوں کی طرح شامل ہیں ۔وہ دنیا کی حقیقت کو سمجھتے ہیں وہ سماجی عوامل سے اچھی طرح واقف ہیں ۔ نظیرؔ کو اس دنیا اور اس دنیا کے لوگوں سے بڑی محبت ہے۔جس طرح وہ ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں شریک ہے۔ اسی طرح وہ اُن کے غموں پر آنسو بہاتا ہے۔وہ ایک سچے فنکار کی طرح بہتر معاشرے کا خواہاں ہے۔ایسا معاشرہ جس سے رنج و غم اور کلفت و یاس کا خاتمہ ہو جائے ۔اپنے زمانے کے جاگیر دارانہ نظام سے علیحدہ ہو کر اس نے عوام سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہا۔یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرے میں مساوات کے قائل تھے۔ ان کی نظر میں انسانوں کے تمام امتیازات اخلاقی اقدار ،زر و دولت ،عہدہ و خاندان اور لباس کی وجہ سے قائم کئے جاتے ہیں جو سب کے سب عارضی اور سطحی ہیں ورنہ تما م انسان امیر و غریب ،ادنیٰ و اعلیٰ ،زاہد و رند وغیرہ سب برابر ہیں ۔ ان میں انسان ہونے کی قدر مشترک ہے۔

اب آئیے نظیر ؔ کی ان نظموں کا جائزہ لیتے ہیں جن میں انہوں نے اقتصادی مسائل کو پیش کیا ہے۔اس سلسلے میں ان کی ایک اہم نظم "پیٹ کی فلاسفی" کا جائزہ لیتے ہیں ۔اس میں نظیرؔ نے انسان کی دلی کیفیات کو عیاں کیا ہے اور بتایا ہے کہ انسان پیٹ کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا ۔یہ پیٹ انسان سے سب کچھ کرواتا ہے۔ اس کی خاطر وہ ہر قسم کی ذلت اور مصائب برداشت کرتا ہے۔یہاں تک کہ اپنا ضمیر تک فروخت

کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا ۔دنیا کی گہما گہمی کا باعث پیٹ ہی ہے اور دنیا میں موجود ہر انسان محض پیٹ کی خاطر مصروف عمل ہے ۔

کرتا ہے کوئی جور و جفا پیٹ کے لیے
سہتا ہے کوئی رنج و بلا پیٹ کے لیے
سیکھا ہے کوئی مکر و دغا پیٹ کے لیے
پھرتا ہے کوئی بے سرو پا پیٹ کے لیے
جو ہے سو ہو رہا ہے فدا پیٹ کے لیے
(کلیات نظیرؔ، ص:٥٩٦۔ ٥٩٧)

نظیرؔ کے بارے میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ " اس نے اقتصادی مسئلہ کو اقدار حیات میں ایک بنیادی قدرکی حیثیت سے بڑی اہمیت دی ہے"۔(٦١) اب نظیرؔ کی نظم " آٹے دال کی فلاسفی " دیکھئے۔ اس میں وہی جذبہ کار فرما ہے جو " پیٹ کی فلاسفی" والی نظم میں موجود تھا ۔نظیرؔ اس نظم میں بھی اس مادی دنیا کی حقیقت بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔اس میں شک نہیں کہ آٹا دال ہی دنیا کی اہم ترین حقیقت ہے۔ اس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا ۔آٹا دال سے مراد بنیادی ضروریات زندگی سے ہے ۔نظیرؔ کا عقیدہ ہے کہ آٹا دال ہی سے انسان کی زندگی میں رونق ہے اور زندگی کے آثار موجود ہیں ورنہ صورتحال اس کے برعکس ہو۔ چاہے بادشاہ ہو یا فقیر سب کے سب اسی کے متلاشی ہیں ۔

اسی آٹے دال ہی کا جو عالم میں ظہور ہے
اس سے ہی منہ پہ نور ہے اور پیٹ میں سرور
اسی سے ہی آ کے چڑھتا ہے چہرے پہ سب کے نور
شاہ و گدا امیر اسی کے ہیں سب مزدور
سب چھوڑو بات طوطی و پدڑی و لال کی
یارو کچھ اپنی فکر کرو آٹے دال کی
(ایضاً ،ص: ٥٩٢)

نظیرؔ کی نظم " روٹی کی فلاسفی " کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ نظیرؔ جیسے انسان دوست نے انسانی زندگی کے معاشی مسئلہ کو کتنی سنجیدگی سے دیکھا ہے۔غور کیا جائے تو نظام حیات میں " روٹی " پیٹ کی ضرورت کو پورا کرنے کےلئے اہم مادی فریضہ پورا کرتی ہے۔ نظیرؔ کے زوال یافتہ معاشرے کے بد ترین معاشی انحطاط میں بھوکے انسان کےلئے روٹی کیا تھی۔ اس کا اندازہ آج ہم نہیں کر سکتے۔ ہاں نظیرؔ جیسے انسان دوست شاعر کی نظم "روٹی " پڑھنے سے بھوک کی اس شدت کو ضرور محسوس کر سکتے ہیں جس کا تجربہ نظیرؔ اور اس جیسے لاکھوں انسان شب و روز کر رہے تھے۔یہ حقیقت ہے کہ جو شخص بھوکا ہے اسے تو چاند اور سورج بھی روٹیاں نظر آتے ہیں ۔ جیسا کہ ایک فقیرکی مثال نظیرؔدیتے ہیں ۔

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں
(ایضاً ،ص: ۵۹٤)

نظیرؔ کی نظم " کوڑی کی فلاسفی " بھی ان کے اقتصادی شعور کی ترجمان ہے ۔اور ان کے اصل خیالات کی ترجمانی کرتی ہے ۔ان کے نزدیک جہاں دنیا کی تمام گہماگہمی " کوڑی " کی بدولت ہے۔زندگی میں رونق و خوشحالی اسی کے دم سے ہے۔وہاں ہی "کوڑی " فتنہ وفساد کا سبب بنتی ہے ۔دنیا میں ہونے والا کشت و خون بھی اسی " کوڑی " کی بدولت ہے۔ گویا دنیا کی تعمیر و تخریب اسی " کوڑی " کی وجہ سے ہے اور دنیا کا کارخانہ اسی کے دم سے قائم ہے۔

کوڑی ہے جن کے پاس وہ اہل یقین ہیں
کھانے کو ان کے نعمتیں سو بہترین ہیں
کپڑے بھی اُن کے تن میں نہایت مہین ہیں
سمجھیں ہیں اُس کو وہ جو بڑے نکتہ چیں ہیں
کوڑی کے سب جہاں میں نقش و نگین ہیں

کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں
(ایضاً ،ص: ۵۷۷)

اقتصادی مسائل پر نظیرؔ کی نظم " پیسے کی فلاسفی " دوسری خیال افروز نظم ہے۔جس میں انہوں نے اقتصادی مسائل کو عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے ۔انہوں نے انسان دوست شاعر کی حیثیت سے اس تلخ حقیقت کو بیان کیا ے کہ پیسے کے بغیر انسان کی دنیا میں کوئی عزت اور حیثیت نہیں لوگ اعمال و افکار کو تسلیم نہیں کرتے وہ صرف ایک ہی حقیقت کو بڑی حقیقت سمجھتے ہیں اور وہ ہے پیسہ۔جس نیک شخص کی جیب میں پیسہ نہیں اسکی نیکی بھی رائیگاں ہے۔گویا دنیا کی سب سے بڑی حقیقت پیسہ ہے۔

دین دار اس سے دہر میں کہلاتا نام ہے
پیسا جہاں کے بیچ وہ قائم مقام ہے
پیسا ہی جسم و جان ہے پیسا ہی کام ہے
پیسے ہی کا نظیرؔ یہ آدم غلام ہے
پیسا ہی رنگ و روپ ہے پیسا ہی مال ہے
پیسا نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے
(ایضاً ، ص: ۵۸۲)

" مجنوں گورکھپوری " نظیرؔ کی انسان دوستی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں ۔" نظیرؔ پہلے شاعر تھے جن کو میں نے زمین پر کھڑے ہوئے زمین کی چیزوں کے متعلق بات چیت کرتے ہوئے پایا اور پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ شاعری کا تعلق روئے زمین سے بھی ہے "۔نظیرؔ کا زمانہ معاشی اور اقتصادی بد حالی کا زمانہ تھا ۔وہ معاشرے جہاں "چھتیس پیشوں والوں کے کاروبار " بند تھے۔ زوال کی آخری حدوں کو چھو چکا تھا ۔اقتصادی تباہی کا نیتجہ خوفناک مفلسی کی صورت میں سامنے آیا تھا ۔اس مفلسی نے انسان کو اخلاقی ، روحانی ،اور مادی طورپر پستی کا شکار کر دیا تھا ۔نظیرؔ کے بارے میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ "اس نے اقتصادی مسئلے کو اقتدارِ حیات میں ایک بنیادی قدر کی حیثیت سے بڑی اہمیت دی ہے"۔

نظیرؔ ایک انسان دوست شاعر ہونے کے ناتے اپنی نظم " مفلسی کی فلاسفی " میں اس کا ذکر یوں کرتے ہیں ۔

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر
دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر
جس طرح کتے لڑتے ہیں اک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی
(کلیات نظیرؔ ،ص: ۵۸۷)

بقول عمران ازفر !

نظیر کی شاعری میں روپیہ کا روپ آٹا دال ،مفلسی جیسی نظمیں بہ ذات خود تمثال کاری کی مثالیں ہیں ۔ اپنی اس اقتصادی قسم کی شاعری میں نظیرؔ قاری کے سامنے انسانی نفسیاتی پیچیدگیوں اور معاشی بحرانوں کی تمثال کاری کرتا ہوا نظر آتا ہے۔جہاں انسان معاشی جبر کے شدائد میں پستا ہوا نظر آتا ہے۔مفلسی،کوڑی جیسی نظموں میں انسان کی مادی بے بسی اوربے چارگی کا مظاہرہ دیکھا جا سکتا ہے۔

نظم " مذمت اہل دنیا "میں نظیر جیسا انسان دوست جس سماجی منظر کے روبرو کھڑا ہے وہ اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کی تصویر دکھاتا ہے۔ نادر شاہ مرہٹوں ، جاٹوں اور درانیوں کے مسلسل حملوں کے بعد مغلوں کے بنائے ہو ئے دستور، ملکی نظام اور نظم وضبط کی بنیا دیں ہل چکی تھیں ۔ حملہ آوروں کی حرص نے لو ٹ ماراور قتل وغارت کی بدترین مثالیں قائم کیں ۔ ہر فرد اور گروہ نفسانفسی کا شکار تھا اور اپنا مقصد پوار کرنے کے لیے اخلاقیات کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ نظیرؔ کی نظم "مذمت اہل دنیا" میں دنیا کو ٹھگوں کا "دشت" کہاگیا ہے کیو نکہ لالچ ، خودغرضی اور نفسانفسی نے معاشرے کو تمام مثبت اقدار سے خالی کردیا تھا۔ نظیرؔ جیسے انسان دوست کو اس چیز کا شدید دکھ اور احساس تھا کہ معاشرے سے اخلاقی اقدار ناپید ہو تی جارہی ہیں ۔ نظیرؔ اس نظم میں معاشرے کی نفسانفسی کی کیفیت کو عمدہ طر یقے سے بیان کرتے ہیں ۔

کیا کیا فریب کہیے دنیا کی فطرتوں کا؟
مکر و دغا و دزدی ہے کام اکثروں کا
جب دوست مل کے لوٹیں اسباب مشفقوں کا
پھر کسی زباں سے شکوہ اب

کیجئے دشمنوں کا
ہشیار یار جانی یہ دہشت ہے ٹھگوں کا
یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

(کلیات نظیر،ص:۵۵۰)

نظیرؔکا "شہر آشوب" عوامی خصو صیات کا حامل ہے ۔ اس میں نظیرؔ نے ایک انسان دوست شاعر کے نا تے دربار اور امراد کی بجائے عام پیشہ وروں کی اقتصادی تصویر پیش کی ہے۔اس " شہر آشوب "' میں محض آگرہ کی اقتصادی بے چینی کا تذکرہ ہے۔آگرہ کے صراف بنیئے ،جوہری ،سیٹھ ،ساہوکار ،دکان دار ، سودا گر، بیوپاری، پنساری ،نان بائی جیسے عام پیشہ وروں کی فلاکت کا ذکربہت عمدگی کے ساتھ کیا ہے۔اس کے ساتھ سپاہ کی دربدری،آگرے کے کارخانہ جات کے بند ہونے کا بھی ذکر ہے۔ جس سے بے روزگاری پھیلی اور معاشرہ اقتصادی طور پر بد حالی کا شکار ہوا۔یہاں تک کہ چھتیس پیشہ والوں کے کاروبار بھی بنددکھائی دیتے ہیں۔ نظیرؔ جیسا انسان دوست شاعر اس پریشانی و تکلیف کو محسوس کرتا ہے اور خلوص اور درد مندی کا اظہار کرتا ہے۔

صراف بنیئے جوہری اور سیٹھ ساہوکار
دیتے تھے سب کو نقد سو کھاتے ہیں اب ادھار
بازار میں اڑے ہے پڑی خاک بے شمار
بیٹھے ہیں یوں دکانوں پہ اپنی دکاندار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

جبکہ دوسری طرف کہتے ہیں

مارے ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار
اور جتنے پیشہ ور ہیں روتے ہیں زار زار
لوٹے ہے تن لوہار تو پیٹے ہے سر سنار
کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشہ والوں کے ہیں کاروبار بند

(کلیات نظیرؔ ،ص:
٤٤٤)
بقول سجاد باقر رضوی " نظیرؔ انسان پرست نہیں ،انسان دوست ہیں ۔ان کی انسان دوستی عام انسانی زندگی کی محبت سے پیدا ہوتی ہے۔" نظیرؔ ایک ایسے شاعر ہیں جو اپنی زندگی اور شاعری کے اعتبار سے طبقہ ء عوام میں سے ہیں ۔ انہوں نے اپنی شاعری کے لئے موضوعات بھی عوام ہی میں سے چنے ہیں ۔اسی لئے ان کی شاعری میں عوامی زندگی کی دھڑکنین سنائی دیتی ہیں ۔ وہ عوام کی سطح سے بولتے ہیں ۔وہ عوام کی بدحالیوں ، غریبوں کی مجبوریوں ، فلاکتوں پر بھی طبع آزمائی کرتے ہیں اور ان سب کے اظہار کےلئے ان کا سارا رنگ بھی عوامی ہی ہے اور لہجہ بھی وہ عوامی ہی اختیار کرتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "برسات کی بہاریں " قابل ذکر ہے۔ نظیرؔ جیسے انسان دوست کی نظر اور توجہ عوام کے مختلف گروہوں کی طرف جاتی ہے۔ اس خوشی و شادمانی کے موسم میں نظیرؔ کو سب سے پہلے وہ اداس عورت دکھائی دیتی ہے جس کا پردیسی اس موسم میں لوٹ کر نہیں آیا اوروہ اداسی اور غم کی تصویر بنی بیٹھی ہے۔

ہے جن کی سیج سونی اور خالی
چارپائی
رو رو انہوں نے ہر دم یہ بات ہے
سنائی
پردیسی نے ہماری اب کے بھی
سدھ بھلائی
اب کے بھی چھاونی جا پردیس میں
ہے چھائی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی
بہاریں

(کلیاتِ
نظیر)

جبکہ دوسری طرف نظیرؔ کے پیش نظر وہی اقتصادی مسائل ہیں اور وہ غریب عوام کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہوئے غریب عوام کی بے کسی اور بے چارگی کا نقشہ بیان کرتا ہے۔مگر یہ بھی بتاتا ہے کہ مفلس کو حو ےلی کے گرنے کی فکر نہیں وہ اپنے جھو نپڑ ے میں خو ش بےٹھا ہے۔ گویا غریب کا توکل اور یقین ہی اس کی عظمت کا ثبوت ہے۔

کتنوں کو محلوں اندر ہے عیش کا
نظارا
یا سائباں ستھرا یا بانس کا سہارا
کرتا ہے سیر کوئی کوٹھے کا لے
سہارا

مفلس بھی کر رہا ہے پولے تلے گزارا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
(کلیاتِ نظیر)

نظیرؔ ایک بے تعصب شاعر اور بے تعصب انسان تھے ۔ وہ نفرتوں ،کدورتوں ، تعصبات اور کینہ پروریوں سے بے نیاز اور بلند تر تھے۔ ان کے دماغ کے دریچے ہر جانب کھلے تھے۔ ان کے دل میں کسی کے بارے میں کوئی عنادیا میل نہیں تھا۔ ان کا حلقہ احباب وسیع تھا اور اس حلقہ میں امیر وغریب ، عالم وجاہل پیشہ ور اور غیرپیشہ ور ، ہند و مسلمان کسی کی قید نہ تھی۔ اس وسیع النظری اور وسیع المشربی کا اثر ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہندووئں کے تہواروں مثلاً بسنت ،ہولی، دیوالی اور راکھی وغیرہ پر نظمیں لکھیں تو دوسری طرف مسلمانوں کے تہوار شب رات ،عید الفطر وغیرہ پر بھی نظمیں تحریر کیں ۔مذہبی نظموں میں جہاں اسلام کے بعض رہنماؤں حضرت سلیم چشتی اور حضرت داتاگنج بخش کو خراج تحسین پیش کیا ہے وہاں گرونانک شاہ سے بھی ان کی عقیدت قابل دید ہے۔ مسلمانوں کے تہوار شب برات پر ان کی نظم " شب برات " دیکھئے جس میں تفریح کے سامان کے ساتھ ساتھ کھانے بھی ہیں اور آتش بازی کا سامان بھی ۔

کیونکر کرے نہ اپنی نموداری شب برات
چلپک چپاتی حلوے سے ہے بھاری شب برات
زندوں کی ہے زباں کی مزیداری شب برات
مردوں کی روح کی ہے مددگاری شب برات
لگتی ہے سب کے دل کو غرض پیاری شب برات
(کلیاتِ نظیر، ص:٤٠٧)

شب برات کے بعد دیوالی کا نظارہ کیجئے۔ نظم "دیوالی " میں نظیرؔ کی وسیع المشربی صاف دکھائی دیتی ہے۔ تعصب نام کو نہیں ملتا ۔ نظیرؔ کی انسان دوستی بلکہ انسان پرستی قدم قدم پر سامنے آکر متاثر کرتی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے جیسے وہ تمام مذہبوں اور تمام فرقوں کے لوگوں سے بحیثیت انسان کے پیش آتے ہیں ۔ " دیوالی کے میلے میں بھی وہ شریک ہیں ۔ جس طرح ان کے پیروکاروں کو اس مبارک تقریب پر خوشی و مسرت کے سامان نظر آتے ہیں ۔ اسی طرح نظیرؔ کو بھی

راحت و مسر ت محسوس ہوتی ہے ۔ اس سے زیادہ وسیع المشربی اور پاک نظری کیا ہوگی کہ وہ دوسرے مذہب کے لوگوں کی خوشیوں میں اپنی خوشی سمجھ کر شریک ہوتے ہیں اور پرجوش ہوکر اپنے شعری جذبات میں اسے بیان بھی کرتے ہیں ۔

ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا
دیوالی کا
ہر اک طرف کو ہوا اجالا دیوالی کا
سبھی کے دل میں سماں بھا گیا
دیوالی کا
کسی کے دل کو مزا خوش لگا
دیوالی کا
عجب بہار کا ہے دن بنا دیوالی کا
(کلیاتِ نظیر ،
ص:٤٢٦)

نظیرؔ کی وسیع المشربی اور انسان دوستی کا نمونہ ان کی نظم " گرونانک شاہ " میں ملاحظہ کیجئے ۔

ہیں کہتے نانک شاہ جنہیں وہ
پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر جگ میں یوں
روشن جیسے ماہ گرو
مقصود ، مراد امید سبھی بر لاتے
ہیں دل خواہ گرو
نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم
لوگوں کا نرباہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں
بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا اَرداس کرو اور ہر دم
بولو "واہ گرو"
(کلیاتِ نظیرؔ
،ص:٤٠٥)

جبکہ دوسری طرف ایسی ہی عقیدت و محبت نظیرؔ کو حضرت سلیم چشتی سے ہے ۔ جس کا اظہار نظیر " نظیر روضہ حضرت سلیم چشتی پر " ان الفاظ میں کرتے ہیں ۔

ہیں دو جہاں کے سلطان حضرت
سلیم چشتی
عالم کے دین و ایمان حضرت سلیم
چشتی
سر دفتر مسلماں حضرت سلیم
چشتی

مقبول خاص یزداں حضرت سلیم
چشتی
سردار ملک عرفاں حضرت سلیم
چشتی
(ایضاً ، ص:
۴۰۲)

ڈاکٹر سنبل نگار نظیرؔ کی وسیع المشربی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتی ہیں :

نظیرؔ ایک وسیع المشرب انسان تھے ۔ اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لیے ان کے دل میں بے پناہ محبت تھی ۔ انہوں نے جہاں ہندؤوں کے تہواروں ، میلوں اور رسموں پر شعر کہے وہیں مسلمانوں کے عرسوں اور تہواروں کو بھی یاد رکھا ہے ۔ اس کے علاوہ ان کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو صرف اپنے ملک کے لیے نہیں بلکہ دنیا بھر کے انسانوں کی خوشیوں اور ان کے دکھ درد سے متعلق ہیں ۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ نظیرؔ کُل عالمِ انسانیت کے شاعر ہیں ۔

مختصر یہ کہ نظیرؔ نے معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ایک ہمدرد اور انسان دوست شاعر کی نظر سے دیکھا ہے ۔ اپنے عہد میں انسانی قدروں کے زوال اور بنی آدم کی عام بے قدری اور ذلت کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے ایک فرض شناس معلم اور ایک حساس و باشعور فنکار کی طرح لوگوں کو تلقین و ہدایت بھی کی ہے۔ اور انسان دوستی ہمدردی اور پیار ومحبت کا پیغام عام کیا ہے۔

ڈاکٹر سنبل نگار نظیرؔ کی انسان دوستی کو سراہتے ہوئے کہتی ہیں ۔

نظیر اکبر آبادی بہت کھلے دل کے انسان تھے ۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ انہیں عزیز تھے۔ مسلمان صوفیوں کے علاوہ ہندو سنتوں سے بھی انہیں عقیدت تھی ۔ ہر مذہب کے بزرگوں کا وہ دل سے احترام کرتے تھے ۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ صاف دل صوفی تھے اور مذہب کی پابندیوں پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ ہندوستان کی کسی زبان کا کوئی شاعر ایسا نہیں جس کی شاعری سے ایکتا ، بھائی چارہ اور قومی یکجہتی کی ایسی تعلیم ملتی ہے جیسی نظیرؔ کی شاعری سے ملتی ہے ۔

انجمن پنجاب کی نظم نگاری کی تحریک اور انسان دوستی

۱۸۵۷ کے ہنگامے کے بعد ملک میں ایک تعطل پیدا ہو گیا تھا۔ اس تعطل کو دور کرنے اور زندگی کو ازسر نو متحرک کرنے کے لیے حکومت کے ایما پر مختلف صوبوں اور شہروں میں علمی و ادبی

سوسائٹیاں قائم کی گئیں ۔ سب سے پہلے بمبئی ، بنارس ، لکھنو ، شاہ جہاں پور، بریلی اور کلکتہ میں ادبی انجمنیں قائم ہوئیں ۔ ایسی ایک انجمن لاہور میں قائم کی گئی۔ جس کا پورا نام "انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب" تھا۔ جو بعد میں انجمن پنجاب کے نام سے مشہور ہوئی۔

ڈاکٹر لائٹنر نے کرنل ہالر ائیڈ جو اس وقت پنجاب کے سرشتہ تعلیم کے منظم اعلیٰ تھے کے مشورے سے ۲۱جنوری۱۸٦۵ء کو انجمن پنجاب قائم کی۔ ڈاکٹر لائٹنر نے اردو ادب پر گہرے نقوش مرتسم کیے۔ خطے کی تعلیمی ، معاشرتی ، ادبی اور سماجی اصلاح کے لیے اس انجمن کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد کا تعین کیا گیا ۔

"قدیم مشرقی علوم کا احیا" دوم :صنعت و تجارت کا فروغ سوم : باشندگان ملک میں دیسی زبان کے ذریعے علوم مفیدہ کی اشاعت چہارم : علمی و ادبی ، معاشرتی اور سیاسی مسائل پر بحث و نظر پنجم : صوبے کے بارسوخ اور اہل طبقات اور افسران حکومت میں رابطہ۔

انجمن پنجاب کے زیر اہتمام ۱۸٧۵میں جدید شاعری کے مشاعرے شروع ہوئے جنھوں نے جدید نظم کی بنیاد رکھی۔

بقول انور سدید !

جدید اردو شاعری کا بیج اس وقت سے بار آور ہونا شروع ہو گیا تھا جب قدیم دلی کالج کا شیرازہ بکھر گیا اور اسے لاہور منتقل کرنے کے بعد گورنمنٹ کی تحویل میں دے دیا گیا۔ چنانچہ علم و ادب کی وہ شمع جس نے قرون اول میں شمال سے جنوب کی طرف سفرکیا تھا اور ولی دکنی کے زمانے میں جنوب سے شمال کی طرف مراجعت شروع کی تھی۔ اب لاہور کی طرف روانہ ہو چکی تھی اور شمع برداروں کے اس قافلے میں مولوی کریم الدین احمد، پنڈت من پھول، مولوی سید احمد دہلوی ،الطاف حسین حالی، پیارے لال آشوب اور محمد حسین آزاد جیسے ادبا شامل تھے۔

انجمن کے جلسوں میں ایسے مضامین پڑھے گئے جن کے سننے سے اخلاق کی تہذیب ہوئی۔ اس انجمن کے جلسوں میں خاص طور پر ایسے معا ملات پیش کیے گئے جن کا تعلق ہندوستان کے رہنے والوں کی بہتری اور فلاح وبہبود سے تھا۔ گویا انجمن پنجاب نے اپنی انسان دوستی کا بھرپور اظہار کیا۔

انجمن کے جلسوں میں مفید علمی ادبی، تاریخی ، معاشی اور اصلاحی مضامین بھی پڑھے جاتے تھے۔۔۔ اصل میں یہ مضامین انجمن اور ارباب انجمن اور اس دور کی ضرورتوں کی دلچسپ اور قابل قدر تصاویر ہیں ۔ کوئی تاریخ کوئی کتاب یا کوئی رسالہ اس دور کی زندگی پر اتنی روشنی نہیں ڈال سکتا جس قدر یہ مضامین ۔

المختصر انجمن کے مشاعروں نے اردو شاعری میں ذہنی، فکری اور تہذیبی انقلاب پیدا کیا۔ حب الوطنی ، انسان دوستی ، مروت، محبت،

اخلاق اور معاشرے کے مختلف موضوعات کو ان مشاعروں کا موضوع بنایا گیا۔

آئیے اب انجمن پنجاب سے منسلک نظم گو شعرا کے ہاں انسان دوستی کے رجحانات ومیلانات دیکھتے ہیں۔

محمد حسین آزاداور انسان دوستی (۱۹۱۰۔۱۸۳۳)

مولانا محمد حسین آزادؔ ۱۰جون ۱۸۳۰کو پیدا ہوئے۔ ابھی چار سال ہی کے تھے کہ والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور ان کی پرورش ان کے والد صاحب مولوی محمد باقر نے کی۔ زمانہ طالب علمی میں اپنی ذہانت وفطانت کے خوب جوہر دکھائے۔ آزادؔ کوئی ۲۵برس کے تھے کہ ۱۸۵۷کی جنگِ آزادی چھڑ گئی۔ آزادؔ کے والد مولوی باقر حسین انگریزوں کے انتقامی جذبے کا شکار ہوئے اور پھانسی کے گھاٹ اتار دئیے گئے اس وقت مغلیہ سلطنت کا ستارہ اقبال کہن چکا تھا۔ دہلی میں تباہی و بربادی کا ڈیرہ تھا۔

ڈاکٹر اسلم فرخی آزادؔ کے عہد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

> شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کا عہد(۱۹۱۰۔۱۸۳۰) ملکی تاریخ کا عبوری دور ہے۔ تہذیبی تصادم وتضارب کا یہ دور جس میں ۱۸۵۷ نقطہ عروج کی حیثیت رکھتا ہے۔ زوال، انحطاط ، مایوسی، محرومی اور احساس شکست کا آئینہ دار بھی ہے اور غیر ملکی اقتدار کا مرقع بھی۔ اسی عہد میں ملی تحریکات کی نشو و نما بھی ہوئی اور اسی دور میں دماغوں سے قدامت کا رنگ بھی چھوٹنا شروع ہوا۔ اسی دور میں مسلمانوں کی سات سو سالہ حکومت کا خاتمہ بھی ہوا اور انہوں نے ترقی کے میدان میں قدم بھی آگے بڑھایا۔ اسی دور میں قدیم و جدید کی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچی اور اخیر کار قدیم تہذیب ، قدیم علوم اور قدیم انداز فکر کو شکست تسلیم کرنی پڑی معاشرے نے کروٹ بدلی اور تمدن کے ایک شاندار دور کا خاتمہ ہو گیا۔

اگرچہ ۱۸۵۷کی ناکام جنگِ آزادی کے چند سال بڑی افراتفری اور اضطراب میں گزرے۔ لیکن جب کچھ امن و امان ہوا تو اردو کے کچھ ادیبوں اور شاعروں کو ادب اردو کی کم مائیگی کا احساس دامن گیر ہوا اور یوں اس کی اصلاح و ترقی کے لیے کمر بستہ ہوئے۔ ان میں اگرچہ سرسید تو راہنمائے اعظم تھے جن کی حیثیت مانند آفتاب تھی۔ جس کے گرد بہت سے دانشور اور رہنما ستاروں کی طرح گردش کر رہے تھے۔ ان سے کچھ دور محمد حسین آزاد نے ۱۸۷٤ میں کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں لاہور میں ایک نئے قسم کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ اس مشاعرے میں مصرع طرح کی بجائے کوئی عنوان دیدیا جاتا تھا اور شعرا اس پر نظمیں لکھا کرتے تھے۔ یوں جدید نظم کی ترقی میں روز

بروز اضافہ ہوتا چلا گیا اور شعرا کی توجہ غزل کی بجائے نظم پر مرکوز ہوئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اردو شاعری نے ایک نیا پلٹا کھایا اور مشاعروں کا ایک گروہ میدان میں آگیا۔ جن کا مقصد شعر و شاعری کو مفید اور کار آمد بنانا اور اس کے ذریعے ملک و قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھانا تھا۔ آزادؔ نے ان مشاعروں کے ذریعے صحیح معنوں میں انسان دوستی کا حق ادا کیا۔

ڈاکٹر وقار احمد رضوی ان مشاعروں کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ

لاہور کے ان مشاعروں نے اردو شاعری میں ذہنی، فکری اور تہذیبی انقلاب برپا کیا۔ حب الوطنی ، انسان دوستی ، مروت ، محنت ، اخلاق، معاشرت کے مختلف موضوعات کو ان مشاعروں کا موضوع بنایا گیا۔ لاہور کے مشاعروں نے فرضی، خیالی اور رسمی عشقیہ شاعری کو بدل کر رکھ دیا۔ مبالغہ آمیز خیالات کو چھوڑ کر ہر قسم کے فطری اور حقیقی جذبات کو سادگی اور صفائی سے پیش کرنے پر زور دیا ۔جسے اس زمانے میں نیچرل شاعری سے تعبیر کیا گیا۔

آزادؔ جدید شاعری کے بانی ہیں ۔ ان ہی کی وجہ سے اردو شاعری بندھے ٹکے پیمانوں سے باہر نکل کر ایک وسیع دنیا میں قدم رکھتی ہے۔ اس دنیا میں کہ جہاں مناظر فطرت بھی ہیں ، غم روزگار بھی ہے۔ آزادی وحریت کے لیے نعروں کی گونج بھی ہے اور ظالم کے خلاف جدوجہد کی پکار بھی۔ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے انسانوں کو اعلیٰ اقدار و روایات کی پاسداری کا درس دیا ۔محنت شاقہ کے زریں اصولوں پر عمل پیرا ہونے کا پیغام دیایہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر وہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہو سکتے ہیں ۔ آزادؔ اپنی مثنوی " موسوم بہ شب قدر" میں اہلِ قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کی تلقین کرتے ہیں ۔ گدا خاک پر، شاہ تخت پر، مچھلی پانی میں اور امیر و فقیر ،عورت، مرد بچے غرض سب نیند کی وادی میں گم ہیں ۔ اشعار دیکھیے۔

سوتا گدا ہے خاک پہ اور شاہ تخت پر
ماہی بزیر آب ہے طائر درخت پر
القصہ ہے امیر کوئی یا فقیر ہے
عورت ہے یا کہ مرد ، جواں ہے کہ پیر ہے
جس کو پکارو وہ سوئے خواب عدم گیا
دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہو تھم گیا
(کلیات نظم آزاد ص :۱۳٦)

انسان دوست آزادؔ اپنی قوم کی زبوں حالی پر افسوس کناں ہیں ۔ ان کے نزدیک قوم کی حالت اس مرد بیمار کی سی ہے جس کے چاروں طرف بے کسی، بے بسی اور اداسی کے سائے منڈلا رہے ہیں ۔ لیکن اس تاریکی میں ایک روشن چراغ کی ضرورت ہے جو تاریکی پر غالب آجائے اور وہ چراغ ہوش و خرد، محنت شاقہ اور تائید الہٰی میں پوشیدہ ہے۔ آزادؔ کی " مثنوی موسوم بہ شب قدر" کا اختتام اسی خوبصورت خیال سے ہوتا ہے۔

پر جائے حیف حال اسی جاں بہ لب کا ہے
سب جس کو کہہ رہے ہیں کہ مہمان شب کا ہے
دن بھر دوا غذا میں رہا غیر حال ہے
لیکن ہے اب یہ حال کہ بچنا محال ہے
بتی چراغ عمر کی ہے جھلملا رہی
اور بے کسی سرہانے ہے آنسو بہا رہی
کون اس کا ساتھ دیوے گا ہو صبح جب تلک
روئے گا کوئی شام کے مردے کو کب تلک
کوئی گھڑی تو ہوش خرد سے بھی کام لے
وقت سحر قریب ہے اللہ کا نام لے

(کلیات نظم آزاد ،ص: ۱۴۵)

آزادؔ قوم کے تن مردہ میں زندگی کی روح دوڑا دینا چاہتے ہیں ۔ وہ قوم کے پست حوصلوں کو اوج ثریا کو چھونے کی تلقین کرتے ہیں ۔ ان کی مثنوی "موسوم بہ صبح امید" اسی ہمت اور حوصلے کی پیامبر ہے۔ مثنوی کا آغاز نہایت حوصلہ اور امید افزا فضا میں ہوتا ہے۔ صبح کی آمد کا منظر نہایت روح پرور ہے۔ وہ صبح جو نور روشنی ، اجالے اور امید کا پیغام اپنے اندر سموئے ہوتی ہے۔

برگ برگ اس کا ہے آئینہ لیے پیش نظر
جن میں ہیں جلوہ نما دل کی مرادوں کے ثمر
آرزوں سے کھلے ہیں گل رعنا یک سر

جن سے نکلیں گے ثمر ہائے تمنا یک سر
قلہئِ کوہ کہ تھا چرخ بریں سے ہم راز
رکھتا تھا طولِ امل سے بھی سوا راہ دراز
کہ چڑھائی جو نظر آرہی تھی دور بہت
دل یہ کہتا تھا کہ ہمت میں ہے مقدور بہت
(کلیات نظم آزاد ، ص :١٤٦۔١٤٧)

آزادؔ رجائیت پسند شاعر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کی بدحالی اور مفلسی کے دن انہیں ختم ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ اپنے اردگرد پھیلے اندھیرے میں انہیں امید کا دیا جگمگاتا اور امید کی پری رقص کناں نظر آتی ہے۔

پیرِ دہقاں ہے کہیں بے سرو ساماں بیٹھا
باغباں خاک پہ حیران و پریشان بیٹھا
ہوتا اس وقت مصیبت میں نہیں یار کوئی
نہ مددگار کوئی نہ غم خوار کوئی
ہاں مگر تو کہ جب اس وقت میں آجاتی ہے
جلوہ گر باغ مراد اس کو دکھا جاتی ہے
(کلیات نظم آزاد ،ص :١٥٢)

بقول ڈاکٹر اسلم فرخی!
انسان کی حیثیت سے آزادؔ شگفتہ طبیعت اور سادہ مزاج تھے۔ زندگی کی ابتدائی منزل میں انہوں نے اپنی بنی بنائی جنت کو آنکھوں کے سامنے مسمار ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کی خوش مزاجی اور خوش دلی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خوش مزاجی اور خوش دلی ان کی طبیعت کا نمایاں وصف تھی۔ وہ غم روزگار کو ہنس کر ٹالنا چاہتے ہیں ۔ طلبہ میں دوستوں میں گھر والوں میں جلسوں میں انجمنوں میں ہر جگہ آزادؔ اپنی انہی خصوصیات کی وجہ سے ممتاز

نظر آتے ہیں ۔ شخصیت کے اس وصف کاپر تو ان کی تصانیف میں بھی جابجا نمایاں ہے۔

انسان دوست آزادؔ معاشرے میں امن کے خواہاں ہیں ۔ وہ امن جس کے گلشن میں علم کے شعر پھلتے پھولتے ہیں ۔ نظم ونثر کی شاخیں پھٹتی ہیں دولت و اقبال میں ترقی ہوتی ہے۔ ساری دنیا اسی "امن" کی متمنی ہے۔ جس ملک میں امن جگہ پا لیتا ہے وہاں ہر طرح کی صنعت و حرفت ترقی کی منازل طے کرتی ہے۔ اور جہاں "امن" مفقود ہوتا ہے وہاں تباہی وبربادی، خونریزی اور قتل و غارت گری اپنے ڈیرے ڈال لیتی ہے۔ آزادؔکی مثنوی " خواب امن" واقعی امن کی ترجمان ہے۔ اور یہ امن انسان دوستی ہی کی قدر ہے۔ اشعار دیکھیے۔

ذوق گل گشت کا اک دے کے اشارہ مجھ کو
ایسے گل زاروں میں لے جا کے اتارا مجھ کو
اس قلم رو میں رواں تھا قلم امن و اماں
پتے پتے کے ورق پر رقم امن و اماں
پانی نہروں میں پڑا بہتا تھا اور شور نہ تھا
موجیں بھی دست و گریباں تھیں مگر زور نہ تھا
(کلیات نظم آزاد، ص:۱۸۶)

آزادؔ کی نظموں کا مرکز و محور وہ مسلمان قوم تھی جو روبہ زوال تھی۔ وہ انہیں انصاف، تہذیب، دوستی ، محبت اور اولوالعزمی کا بھولا سبق یاد دلا کر معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں ۔ انہوں نے قوم کے سامنے عمل اور تحریک کا نظریہ پیش کرکے اہلِ قوم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ان کی نظم "محنت کرو" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جس میں وہ محنت کا پیغام عام کرتے ہیں ۔

محنت جو کی جو توڑ کر ہر شوق سے منہ موڑ کر
کر دو گے دم میں فیصلہ محنت کرو محنت کرو
کھیتی ہو یا سودا گری، ہو بھیک یا ہو چاکری
سب کا سبق یکساں سنا ، محنت کرو محنت کرو
جس دن بڑے تم ہو گئے دنیا کے

دھندوں میں پھنسے
پڑھنے کی پھر فرصت کجا ، محنت
کرو محنت کرو
(کلیات نظم آزاد
،ص :۱۸۶)

انسان دوست آزادؔ قوم کے زبوں حال افراد کو مسلسل آگے بڑھنے کی تلقین کرتے ہیں ۔ چاہے راستے میں دریا کی طغیانی ہو یا بیاباں کا سناٹا۔ ہمت سے چلنے ہی میں مصلحت ہے۔ جو کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرتی ہے۔نظم " اولو العزمی کے لیے کوئی سد راہ نہیں " کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔

ہمت کے شہ سوار جو گھوڑے
اٹھائیں گے
دشمن فلک بھی ہوں گے تو سر کو
جھکائیں گے
طوفاں بلبلوں کی طرح بیٹھ جائیں
گے
نیکی کے زور اٹھ کے بدی کو
دبائیں گے
بیٹھو نہ تم مگر کسی عنواں ، چلے
چلو
(کلیات نظم آزاد ،
ص :۴۱۳)

آزادؔ وسیع المشربی اور روا داری کا پیغام عام کرتے ہیں ۔ اگرچہ وہ اثنا عشری گھرانے میں پیدا ہوئے اور انہیں معتقدات پر قائم رہے۔ لیکن مذہب کے معاملے میں وہ تنگ نظر نہیں بلکہ روا دار تھے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے دینیات کی تکمیل دلی کے ایک مشہور سنی عالم سید محمد سے کی تھی ۔ اس طرح وہ دونوں فرقوں کے اختلافی مسائل سے بخوبی واقف تھے اور تعصب سے پاک تھے۔ مذہبی رواداری کے بارے میں " دربار اکبری" میں اپنے مسلک کی وضاحت یوں کرتے ہیں ۔

ہم سب ایک ہی منزل مقصود کے مسافر ہیں اتفاقاً گزر گاہ دنیا میں یکجا ہو گئے ہیں رستے کا ساتھ ہے بنایا کارواں ہے چلا جانا ہے اتفاق اور ملنساری کے ساتھ چلو گے مل جل کر چلو گے، ایک دوسرے کا بوجھ اٹھاتے چلو گے، ہمدردی سے کام بٹاتے چلو گے، تو ہنستے کھیلتے رستہ کٹ جائے گا۔ اگر ایسا نہ کرو گے اور ان جھگڑالووئں کے جھگڑے تم بھی پیدا کرو گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ آپ بھی تکلیف پاؤ گے ساتھیوں کو بھی تکلیف دو گے۔ جو مزے کی زندگی خدا نے دی ہے بد مزا ہو جائے گی۔

انسان دوست آزادؔ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار دکھائی دیتے ہیں ۔ وطن سے محبت دراصل انسان دوستی کی ایک اعلیٰ شکل ہے۔ جس

میں انسان ذات، برادری اور مذہب کی حد بندیوں سے آزاد ہوکر ہر ایک میں پیار و محبت کے پھول بانٹتا پھرتا ہے۔

بقول وزیر آغا!

مولانا آزادؔ صحیح معنوں میں اپنی دھرتی کے سپوت تھے اور انہیں مادر وطن سے بے پناہ انس تھا۔ مگر یہ انس محض چند سیاسی یا سماجی نعروں کے تابع نہیں تھا۔ وہ ایک تاریخ دان بھی تھے اور انہوں نے اپنی دھرتی اور تہذیب کا غائر نظر سے مطالعہ بھی کیا تھا۔ اس لیے جب وہ وطن کی بات کرتے ہیں تو ان کی نظریں صدیاں عبور کر کے وطن کی ثقافتی جڑوں تک اترتی چلی جاتی تھیں اور وہ اپنے نتائج اس ارضی اور ثقافتی رشتے کی روشنی میں مرتب کرنے پر خود کو مجبور پاتے تھے۔ حب الوطنی کی یہ معراج ہے کہ انسان وطن کے خارجی اور ارضی پیکر ہی پر اپنی جان نچھاور نہ کرے بلکہ ان معنوی رشتوں کو بھی تلاش کرے جو وطن کی ثقافتی فضا پر مشتمل ہوتے ہیں ۔ آزادؔ انہی ثقافتی رشتوں کی تلاش میں تھے اور ہر نئے انکشاف پر ان کی طبیعت کھل اٹھتی تھی۔

آزادؔ کی مثنوی "حب وطن " وطن کی محبت کی بہترین عکاس ہے۔ جس میں قوم کو حب الوطنی کا درس بڑے موثر انداز میں دیا گیا ہے۔ اشعار دیکھیے۔

ہے قول جملہ تجربہ کاران فارسی
اور کہتے ہیں یہ نظم نگاران فارسی
حب وطن زملک سلیماں نکوتر است
خار وطن زسنبل و ریحاں نکوتر است

(کلیات نظم آزاد، ص :٦٣)

آزادؔ اس نام نہاد حب الوطنی کے مخالف ہیں جس کی محبت میں انسان گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر رہ جائے اور ترقی کے تمام راستے اپنے اوپر بند کر دے۔

حب وطن اسے نہیں کہتے کہ گھر رہیں
بچوں کے منہ کو چومنے آٹھوں پہر رہیں
روئیں سفر میں دوست کہے یار کے لیے
اور گاہ سیرِ کوچہ و بازار کے لیے

اے دوست یہ تو دوستی سنگ و خشت ہے
یہ روشنی تو خوب نہیں بلکہ زشت ہے
(کلیات نظم آزاد، ص :۱۶۴۔۱۶۵)

آخر میں انسان دوست آزادؔ اپنی قوم کو تابناک مستقبل کی بشارت ان خوبصورت اشعار کے ساتھ دیتا ہے۔

آو سیہ سفید کا فیصل حساب ہے
چمکایا چہرہ صبح نے با آب و تاب ہے
ظلمت پہ نور ہونے لگا فتح یاب ہے
اور شب کے پیچھے تیغ بکف آفتاب ہے
تم بھی ہو آفتاب درخشاں ، چلے چلو
(کلیات نظم آزاد ،ص :۴۱۴)

وزیر آغا آزادؔ کی شخصیت کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جب میں دنیائے ادب پر ایک نظر ڈالتا ہوں تو مجھے لگتا ہے جیسے ہر ملک اور ہر شہر سے ظلم ، تاریکی اور جہالت سے لڑنے والے یہ مشعل بردار ایک ہی منزل کی طرف روانہ ہیں ۔ تاہم ان میں سے ہر ایک ہی کی رفتار اور طریق کار دوسروں سے مختلف ہے۔ خود ہمارے ادب میں مولانا آزادؔ ایک ایسے ہی شخص تھے۔ لیکن آزاد کا دائرہ عمل نہایت وسیع اور ان کی رفتار دوسروں سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ پھر آزادؔ مشعل برداروں کے ایک متحرک گروہ سے بھی متعلق تھے۔ ایک ایسا گروہ جس میں ان کے علاوہ ذوقؔ ، انشاءؔ، سوداؔ اور شاید ولیؔ بھی شامل تھے۔

مولانا الطاف حسین حالی اور انسان دوستی (۱۸۳۷۔۱۹۱۴)

اس عہد کے سب سے بڑے شاعر مولانا حالی تھے۔ اور سچ یہ ہے کہ انہوں نے ہی نئے ادب کی بنو مضبوط کی اور انسان دوستی کے پیغام کو عام کیا ۔حالی نے شعوری طور پر اس امر کی کوشش کی کہ شاعری کا قبلہ درست کیا جائے اور ادب سے اخلاق سنوارنے کا کام لیا جائے۔

بقول فرزانہ سید :

انہوں نے وقت کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کر لیا تھا اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ مسلمان اپنی نشاۃ ثانیہ کے

دور سے گزر رہے ہیں ۔ لہٰذا انہوں نے اپنے عہد کی روایتی اور ریت کی شاعری کے بجائے مقصدی شاعری پر توجہ دی۔ وہ بار بار مسلمانوں کو ان کے شاندار ماضی کے حالات و واقعات سنا سنا کر ان کی موجودہ صورتحال سے آگاہ کرتے رہے کہ اب مسلمانوں کی کسمپرسی اور بربادی کے تذکرے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اب اصلاح احوال کا وقت ہے اور بیداری کی لہر دوڑانے کی ضرورت ہے۔ دوسرے لفظوں میں حالات کے پیش نظر الطاف حسین حالی نے ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زیست کی راہ اختیار کی اور وہ بڑی استقامت کے ساتھ اپنی منتخب کردہ اس راہ پر گامزن رہے۔

اس عہد کے حالات ایسے دگرگوں تھے کہ انہوں نے ہر خاص و عام کو متاثر کر رکھا تھا۔ اور جہاں تک شاعر طبقے کی بات ہے تو وہ معاشرے کا خاص ترین طبقہ ہوتا ہے۔ جو ہر دکھ تکلیف، ظلم و زیادتی کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ اسی لیے شاعر کو معاشرے کی آنکھ قرار دیا جاتا ہے۔ ایسے میں حالیؔ جیسا شاعر جس کی طبیعت میں قومی ہمدردی کا احساس اور مسلمانوں کی اجتماعی ترقی کا شعور بے پایاں تھا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس کا اندر کا انسان دوست جاگ اٹھا۔
بقول مولوی عبدالحق :

مولانا حالی کی سیرت میں دو متضاد خصوصیتیں تھیں ۔ ایک سادگی دوسری درد دل ۔ اور یہی شان ان کے کلام میں ہے۔ ان کی سیرت اور انکا کلام ایک ہے یا یوں سمجھئے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں ۔ مجھے اپنے زمانے کے بعض نامور احباب سے اور اپنی قوم کے اکثر بڑے بڑے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لیکن مولانا حالی جیسے پاک سیرت اور خصائل کا بزرگ مجھے اب تک کوئی نہیں ملا۔ نواب عماد الملک فرمایا کرتے تھے کہ سرسید کی جماعت میں بحیثیت انسان کے مولانا حالیؔ کا پایہ بہت بلند تھا۔ اس بات میں سرسید بھی نہیں پہنچتے تھے۔ جن لوگوں نے انہیں دیکھا ہے یا جو ان سے ملے ہیں وہ ضرور اس قول کی تصدیق کریں گے۔

حالیؔ نے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں نئی طرز شاعری کی بنیاد ڈالی اور انسان کے مسائل اور مناظر فطرت کو شاعری کا موضوع بنایا ۔آئیے اب حالی کے کلام میں " انسان دوستی" کے عناصر تلاش کرتے ہیں ۔ حالیؔ نے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعروں میں اپنی پہلی مثنوی " برکھارت" پڑھی۔ اس مثنوی میں حالیؔ نے برسات کی مختلف کیفیات کا ذکر ایک انسان دوست شاعر کی حیثیت سے بہت عمدہ انداز میں کیا ہے۔ کیونکہ حالیؔ خود ایک درمیانے درجے کے شہری تھے اور بچپن میں ہی انہوں نے غموں کو سینے سے لگایا لیا

تھا ۔ اس لیے ان کے اندر ایک درد مند دل پیدا ہو چکا تھا۔ لہٰذا ابتدا میں برسات سے قبل گرمی کی جو شدت ہوتی ہے اس کی حالت کا بیان اور گرمی کی ساری جزئیات کا تذکرہ کیا ہے۔ جانداروں کا تڑپنا ،کہساروں کا تپنا ، دریا کے پانی کا کھولنا، جنگل میں گرمی کی شدت، باغوں کی ویرانی، جانوروں کی پریشانی ، آندھیوں کی تندی، لو کی شعلہ سامانی، انسانوں کی بے چینی، شہر کی کیفیت ، چھوٹے بچوں کی بے حالی ان سب چیزوں پر حالیؔ جیسے انسان دوست شاعر کی نگاہ پڑتی ہے۔

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاندار
اور دھوپ میں تپ رہے تھے
کہسار
بھوبل سے سوا تھا ریگ صحرا
اور کھول رہا تھا آبِ دریا
تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں
اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں
(کلیات نظم حالی ،جلد اول،
ص:۳٤۲)

نظم کے دوسرے حصے میں حالیؔ نے اس پس منظر میں برسات کی آمد کا ذکر کیا ہے اور پرواکی آمد ، ابر کی کیفیت، بجلی کی چمک، گھنگھور گھٹاؤ ں کا عالم ،باغوں کی ہریالی، درختوں کی شادابی، کوئل کی کوک، انسانوں کی مسرت ان سب کو حالیؔ جیسے انسان دوست نے آنکھوں کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے۔

برسات کا بج رہا ہے ڈنگا
اک شور ہے آسماں پہ برپا
گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
جنت کی ہوائیں آرہی ہیں
کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی
قدرت ہے نظر خدا کی آتی
(کلیات نظم حالی ، جلد
اول، ص:۳٤٦)

" برکھارت " کو حالیؔ نے ایک جذباتی انداز میں ختم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ برسات کے موسم میں وطن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ برسات کی ہوا کے جھونکے جہاں دل کو فرحت اور روح کو تازگی عطا کرتے ہیں لیکن برسات کی یہ کیفیت آنکھوں کے سامنے ماضی کی رنگین یادوں کو لا کھڑا کر دیتی ہے۔ اس کے دل میں اشکوں کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں ۔ وہ بے کل اور بے چین ہو جاتا ہے۔ آنکھوں سے آنسووں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ کبھی گنگناتا ہے، کبھی خوشی میں آکے گانے لگتا ہے۔ اس گیت کا موضوع وطن کی محبتوں کی یاد ہوتی ہے۔ اس کی یہ فریاد دل میں نشتر کی طرح چھبنے لگتی ہے اور سننے والے دل کو پکڑ کر رہ جاتے ہیں ۔

ابر اتنے میں اک طرف سے اٹھا
اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا
برق آکے لگی تڑپنے پیہم
اور پڑنے لگی پھوار کم کم
آنے جو لگے ہوا کے جھونکے
تھے جتنے سفر کے رنج بھولے
سامان ملے جو دل لگی کے
یاد آئے مزے کبھی کبھی کے
دیکھے کوئی اس گھڑی کا عالم
وہ آنسووں کی جھڑی کا عالم
(ایضا ، ص
:۳۸۲)

حالیؔ کی انسان دوستی پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر خلیق احمد نظامی کہتے ہیں :

حقیقت یہ ہے کہ اخلاق سے بھی اونچی ایک منزل ہے جس کا نام ہے " انسانیت " جہاں انسان کا دل درد مندی خلق میں دھڑکتا ہے۔ حالیؔ اس منزل پر پہنچ گئے تھے۔ وہ کسی انسان کو نہ پریشانی میں مبتلا دیکھ سکتے تھے نہ سن سکتے تھے۔

حالیؔ کی دوسری مثنوی " نشاطِ امید " ہے۔ اس نظم میں حالیؔ بتاتے ہیں کہ جس وقت سے انسان پیدا ہوا ہے امید اور اسکی خوشی اس کے دم کے ساتھ ہے۔ وہ ہمیشہ اور ہر حال میں اسکی رفیق اور دوست ثابت ہوئی ہے۔ مایوسیاں اور ناکامیاں اس کے دم سے گوارا بن جاتی ہیں ۔ افلاس اور عسرت میں انسان اس کے سہارے غنی رہتا ہے۔ وہ دکھے ہوئے دلوں کا مداوا ہے۔ انسان کی بلندی اور نیکیوں کا راز امید ہی میں پوشیدہ ہے۔ کبھی وہ حور بن کے دل کو لبھاتی ہے اور کبھی شراب طہور کا جلوہ دکھاتی ہے۔ غرض یہ کہ دنیا کا سارا کارخانہ اسی امید کے دم قدم سے چل رہا ہے۔ اس مثنوی میں حالیؔ نے بڑی اہم حقیقتوں کی نقاب کشائی کی ہے اور اہم نفسیاتی نکتے کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ حالیؔ جیسے انسان دوست نے افسردہ ، دکھی دل اور اداس انسانوں کے دلوں میں امید کی شمع روشن کی ہے اور بہتر مستقبل کی نوید سنائی ہے اور یہی ایک انسان دوست شاعر کی پہچان ہے۔

ہوتا ہے نومیدیوں کا جب ہجوم
آتی ہے حسرت کی گھٹا جھوم جھوم
لگتی ہے ہمت کی کمر ٹوٹنے
حوصلے کا لگتا ہے جی چھوٹنے
جی میں یہ آتا ہے کہ سم کھائیے
پھاڑ کے یا کپڑے نکل جائیے
جاتا ہے قابو سے دل آخر نکل
کرتی ہے ان مشکلوں کو تو ہی حل

(کلیات نظم حالی،جلد اول، ص:
۳۹۰۔۳۹۱)

حالیؔ کی تیسری مشہور مثنوی " حبِ وطن" ہے۔ اس مثنوی میں انہوں نے نہ صرف وطن سے محبت کا درس دیا۔ بلکہ ایثار، انسان دوستی اور مساوات کا سبق بھی ملتا ہے۔ حالیؔ کی انسان دوستی ان کے جذبہ حب الوطنی سے صاف عیاں ہے۔ انہوں نے اس مثنوی میں جس طرح وطن اور اہل وطن کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ وہ ان کے انسانیت نواز احساسات کا ترجمان ہے۔ وطن سے محبت کو وہ ایک فطری جذبہ قرار دیتے ہیں ۔ جو آپس میں اتحاد و اتفاق کے جذبے کو فروغ دیتا ہے اور ربط و تعلق کے مضبوط رشتے پیدا کرتا ہے۔ جو مذہب رنگ و نسل اور ذات برادری کی تفریق کو ختم کر دیتا ہے۔ حالیؔ دراصل حب وطن کو اصل حیات و کائنات مانتے ہیں ۔ ان کے نزدیک جو دل وطن کی محبت سے خالی ہیں ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ یقین و ایمان کے اس جذبے سے بھی خالی رہتے ہیں جو انسان کو کسی عظیم مقصد کے لیے کٹ مرنا سکھاتا ہے۔

جن و انسان کی حیات ہے تُو
مرغ و ماہی کی کائنات ہے تُو
ہے نباتات کو نمو تجھ سے
روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے
تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

(ایضا،
ص:۳۹٤)

حالیؔ جب قوم کی خدمت کو وطن کی محبت بتاتا ہے تو اسکی قوم صرف نفع وما لداروں اور سرمایہ داروں کا گروہ نہیں ہوتا جو جونک کی طرح دوسرے طبقوں کا خون چوسیں نہ صرف ان غریبوں کا جو سب سے جلنا اور اپنے سوا سب کو گالیاں دینا ضروری سمجھتے ہیں ۔ اس کی قوم خالی مسلمان نہیں نہ صرف ہندو بلکہ دینی اور معاشی امتیازات و تفریقات سے بری وہ سب کی خدمت کی تلقین کرتے ہوئے انسان دوستی کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو!
اٹھو اہل وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ ، پیو ، چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ
دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ

(ایضا،
ص:۳۹۹۔٤۰۰)

حالیؔ جیسی انسان دوست شخصیت میں تعصب نام کو نہ تھا ۔ ہر قوم و ملت کے آدمی سے یکساں خلوص و محبت سے پیش آتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ اور یہی درس وہ دوسروں کو دیتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو
بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
(ایضا ، ص :۴۰۱)

حالیؔ جیسا درد دل رکھنے والا انسان دوسروں کی تکالیف کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہی تڑپ اور احساس وہ ملک کے عیش پرستوں اور دولتمندوں کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے تا کہ وہ غریبوں کی حالت زار کی طرف متوجہ ہوں ۔

اہل دولت کو ہے یہ استغنا
کہ نہیں بھائیوں کی کچھ پروا کی
شہر میں قحط کی دہائی ہے
جان عالم لبوں پہ آئی ہے
عیش میں جن کے کٹتے ہیں اوقات
عید ہے دن تو شبرات ہے رات
قوم مرتی ہے بھوک سے تو مرے
کام انہیں اپنے حلوے مانڈے سے
(ایضا ،ص :۴۰۲-۴۰۳)

"صالح عابد حسین" حالی کی چاروں مثنویاں برکھارت، نشاط امید، حب ِ وطن اور مناظرہ رحم و انصاف کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

یہ چاروں نظمیں بڑی دلکش شیریں اور دلچسپ ہیں ۔ خصوصا "حب وطن " اپنا جواب آپ ہی ہے حالیؔ سے پہلے اور غالبا بعد میں بھی اس موضوع پر اتنی پر خلوص پر کیف اور پر اثر نظم کسی نے نہیں کہی۔

جبکہ دوسری طرف ایم حبیب خان اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں ۔

حالی کی مثنویوں نے اردو شاعری میں ایک نئی شاہراہ قائم کی روشنی خور ایک نیا مینار تعمیر کیا۔ اس کو نیا آہنگ نیا ساز دیا۔ اس آہنگ میں سچائی، سادگی، درد، خلوص، ایثار، قربانی، خود اعتمادی ہے۔ وطن و قوم کی داستان ، سماج کی بیماریوں کا علاج ہے۔

دہلی کے دوران قیام میں حالیؔ پوری طرح سرسید احمد خاں اور ان کی تحریک کے زیر اثر آگئے تھے۔چنانچہ سرسید ہی کی تحریک پر انہوں نے۱۸۷۹ء میں اپنی مشہور مسدس "مدو جزر اسلام" لکھی۔ حالیؔ ایک انسان دوست، مخلص اور کھرے انسان تھے۔ انہوں نے بغیر کسی مبالغہ کے مسلمانوں کے عروج کی داستان بھی بیان کی ہے اور زمانہ حال کے مسلمانوں کی غفلت اور گمراہی کا نقشہ بھی پیش کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی حالت زار کے بارے میں کہتے ہیں ۔

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے
فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے
چپ و راست سے یہ صدا آرہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

(کلیات نظم حالی ،جلد اول ،ص :۵۸)

حالیؔ مسلمانوں کی عظمت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان جب دین و ایمان اور امن و آشنی کا علم لیکر نکلے اس وقت اقوام عالم پر تاریکی اور جہالت مسلط تھی۔ ایسے عالم میں مسلمان رحمت کی گھٹا بن کر ساری دنیا پر چھا گئے اور گمراہ اور وحشی انسانوں کو علم و آشتی اور تہذیب و تمدن کا سبق پڑھایا۔

کیا امیوں نے جہاں میں اجالا
ہوا جس سے اسلام کا بول بالا
بتوں کو عرب اور عجم سے نکالا
ہر اک ڈوبتی ناو کو جا سنبھالا
زمانے میں پھیلائی توحید مطلق
لگی آنے گھر گھر سے آواز حق حق

(کلیات نظم حالی ،جلد اول ، ص :۴۸)

حالیؔ مسلمانوں کے عروج و کمال کے حالات بیان کرنے کے بعد نہایت تفصیل اور درد مندی سے ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی، اخلاقی، تجارتی اور سیاسی پستی اور تنزل کا حال لکھتے ہیں ۔ حالیؔ جیسا حساس دل اور انسان دوست شاعر مسلمانوں کی حالت زار دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور انکی پستی پر آنسو بہاتا ہے۔ مسلمانوں میں وہ کون سی خرابی تھی جو پیدا نہ ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ ان کے عقائد بھی جن پر دین و ایمان کا انحصار ہے درست نہ رہے۔ شرک، قبر پرستی اور پیر پرستی عام ہو گئی تھی۔ حالی مسلمانوں کی اس گمراہی پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

بنی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں

مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں
شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے
(کلیات نظم حالی ،جلد دوم، ص:۱۱۱)

ڈاکٹر عبادت بریلوی " مسدس حالیؔ " کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

"مسدس حالیؔ" میں حالی کا قومی شعور اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ اس نظم میں وہ خود بھی روتے ہیں اور دوسروں کو رلاتے ہیں ۔ اسلام کی بلندی و برتری کو وہ خود بھی محسوس کرتے ہیں اور دوسروں کو محسوس کراتے ہیں ۔ یہ نظم ایک دکھے ہوئے دل کی پکار ہے ایک سچے مسلمان کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز ہے۔ ایک مخلص انسان کی آنکھوں سے پٹکا ہوا آنسو ہے۔ ایک رہنما مصلح کا پیام ہے۔ ایک راہ نما کا نعرہ ہے اور ایک مخصوص ماحول میں پرورش پائے ہوئے ایک بندئہ حق آگاہ اور مرد وفا پیشہ کی زخمی سی چیخ ہے۔ اس نظم میں حالیؔ کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کا خلوص اپنی بلند ترین منزلوں پر دکھائی دیتا ہے ان کے احساس کی شدت اپنی اتھاہ گہرائیوں میں محسوس ہوتی ہے اور ان کا شعور اپنی انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔

حالیؔ کا سب سے عظیم اور یادگار کارنامہ ان کی مثنوی " مناجات بیوہ" ہے۔ یہ پوری مثنوی انسان دوستی کا چشمہ صافی محسوس ہوتی ہے۔ دراصل دکھ درد والوں کی ہمدردی اور بے بسوں کی حمایت حالیؔ نے ہمیشہ کی ہے۔ ان کا کلام اسکا شاہد ہے۔ حالیؔ نے جن خیالات پر "مناجات بیوہ" کی بنیاد رکھی وہ گہرے سماجی شعور کا نتیجہ ہیں ۔ حالیؔ کو ہندوستانی سماج کی پیچیدگیوں کا پوری طرح اندازہ ہے۔ اس سماج میں وہ عورت کی حیثیت کو بھی صحیح طور پر محسوس کرتے ہیں ۔ غلط رسوم و رواج کا بھی انہیں احساس ہے۔ سماجی بندشیں بھی ان کے پیش نظر ہیں ۔ سماج میں بیوہ عورت کا جو مقام ہے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں ۔ یہ ایک بیوہ کی درد بھری کہانی ہے اور وہ بھی اسکی زبانی۔ اور کس کے آگے؟ بارگاہ باری تعالیٰ کے سامنے انسان اسکا اہل نہیں کیونکہ وہ اس سے مایوس ہو چکی ہے۔ حالی نے بیوہ کے دکھ درد کو اسی کی زبانی ایسے سوزوگداز سے بیان کیا ہے جو انکی انسانی ہمدردی اور انسان دوستی کا روشن ثبوت ہے۔ اس نظم کے لیے مولانا نے

ایسی زبان اختیار کی ہے جو ہماری شاعری کے لیے بالکل نئی اور انوکھی ہے۔ یہ ایسی سادہ ، پاک صاف، مضمون کے مناسب اور دل گداز ہے کہ پتھر کا دل بھی ہو تو پگھل جائے۔ میر کے بہتر نشتر مشہور ہیں لیکن یہاں ہر شعر تیر و نشتر کاحکم رکھتا ہے اور ہر مصرع درد و سوز میں بجھا ہوا ہے۔ ایک بیوہ بارگاہ الہیٰ میں دعا کرتی ہے ۔

تیرے سوا اے رحم کے بانی
کون سنے یہ رام کہانی
ایک کہانی ہو تو کہوں میں
ایک مصیبت ہو تو سہوں میں
حال نہ ہو دشمن کا ایسا
میرا نازک حال ہے جیسا
رو کے پلک نم کر نہیں سکتی
ہنس کے غلط غم کر نہیں سکتی
ہنسیے تو ہنسنا عیب ہے ہم کو
کیونکہ الہی کاٹیے غم کو
(کلیات نظم حالی ،جلد دوم، ص :۲۲)

ان اشعار میں ایک بیوہ کے احساسات و جذبات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔

آئیں بہت دنیا میں بہاریں
عیش کی گھر گھر پڑیں پکاریں
پڑے بہت باغوں میں جھولے
ڈھاک بہت جنگل میں پھولے
گئیں اور آئیں چاندنی راتیں
برسیں کھلیں بہت برساتیں
پر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی
وہ جو کلی مرجھائی تھی دل کی

بابائے اردو مولوی عبدالحق "مناجات بیوہ" کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔

اس نظم کو مسلسل پڑھنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ ایک انسان کیوں کر ایک دکھیاری کے جذبات میں ڈوب کر ایسی چیزیں لکھ سکتا ہے اور یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ کلام انسانی نہیں الہامی ہے۔ میں نے ایک بار مولانا سے کہا کہ اگر آپ چاہیں کہ پھر ایک صفحہ بھی ایسی نظم کا لکھیں تو شاید آپ نہیں لکھ سکتے۔ انہوں نے اس کا اعتراف کیا کہ یہ بالکل سچ ہے یہ ایک ایسی نظم ہے کہ ویسی نہ اس سے پہلے کوئی تھی اور نہ اس کے بعد کوئی ہو گی ۔یہ ہمیشہ زندہ رہے گی اور اپنے پڑھنے والوں کو تڑپاتی رہے گی۔

صالحہ عابد حسین حالی کی مثنوی " مناجات بیوہ" پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں ۔

اس نظم کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ حالیؔ مرد ہوتے ہوئے بھی ایسا درد آشنا ، ایسا حساس ، ایسا نازک دل کہاں سے لائے جس نے کمسن بدنصیب بیوہ کے ہر ہر جذبہ اور ہر ہر دکھ کو بالکل اس طرح محسوس کیا جیسے وہ اس پر بیت رہا ہو۔

حالیؔ کی ایک اور نظم " چپ کی داد" ہے۔ جس میں انہوں نے ہندوستان کی عورتوں کے حق میں جو سب سے بے بس اور ضعیف طبقہ ہے آواز بلند کی ہے۔ درد مندوں کی ہمدردی اور ضعیفوں کی حمایت مولانا کی سیرت اور کلام دونوں میں پائی جاتی ہے۔ دیکھنے میں " چپ کی داد" دو نہایت سادہ اور معمولی لفظ ہیں لیکن ان میں ہزاروں خنجر پوشیدہ ہیں ۔ ہمارا ادب عورتوں کی مکاری و عیاری کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن حالیؔ جیسا انسان دوست عورت کی مہر و محبت اور وفا کے گن گاتا ہے۔ اسکے نزدیک ہندوستانی عورت کا وجود خدمت سے عبارت ہے۔ بچپن میں ماں باپ اور بہن بھائیوں کی خدمت اور شادی کے بعد شوہر اور سسرال والوں کی خدمت۔ ایک عورت جب ماں بنتی ہے تو اسکی تربیت کے سایے میں دنیا کے بڑے نامور لوگ پیدا ہوتے ہیں ۔ لیکن حالیؔ کے خیال میں انسانی تہذیب نے عورت کو ان تمام باتوں کا صلہ نہیں دیا۔ اسکی اہمیت کو نہیں سمجھا ۔ اسے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ اسے محکوم رکھا گیا۔ کہیں پیدا ہوتے ہی زندہ زمین میں دفن کر دیا گیا۔کہیں اسے مردہ خاوند کے ساتھ نذر آتش کر دیا گیا۔ کہیں بیوگی کے عالم میں اس پر خوشیوں کے دروازے بند کر دئیے گئے۔ گویا اسے گمنامی کے اندھیروں میں دھکیل دیا گیا۔ حالیؔ جیسا درد دل رکھنے والا انسان عورت کی اس صورتحال پرکڑھتا ہے اور اس کے دکھ درد کو محسوس کر کے اسے اس اذیت سے نکالنے کے لیے کمر بستہ دکھائی دیتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ انصاف کا وقت قریب ہے۔

حالیؔ کا عورتوں کی اہمیت کو ذہن نشین کرانا ہی اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس کے متعلق روایتی صورتحال کو بدلنا چاہتے ہیں ۔ جب وہ یہ کہتے ہیں ۔

اے ماوا بہنو، بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں قوموں کی عزت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں ایماں سلامت تم سے ہے

(کلیات نظم حالی ،جلد
دوم، ص:٤٦)

حالیؔ کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ انسانی زندگی کے بعض شعبے ایسے ہیں جن کی تکمیل صرف عورت ہی کے باعث ممکن ہے۔ مردوں کے بس کی بات نہیں ۔

تھا پالنا اولاد کا مردوں کے بوتے سے سوا
آخر یہ اے دکھیاریو خدمت تمہارے سر پڑی
پیدا اگر ہوتیں نہ تم بیڑا نہ ہوتا پار یہ
چیخ اٹھتے دو دن میں اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ

(ایضا ،ص:
٤٨-٤٩)

لیکن اس سب کے باوجود جب حالیؔ عورت کی ہستی کو اس زندگی میں نظر انداز ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو انسان دوست اور ہمدرد ہونے کے ناتے چیخ اٹھتے ہیں ۔

افسوس! دنیا میں بہت تم پر ہوئے جور و جفا
حق تلفیاں تم نے سہیں بے مہرباں جھیلیں سدا
اکثر تمہارے قتل پر قوموں نے باندھی ہے کمر
دیں تاکہ تم کو یک قلم خود لوح ہستی سے مٹا
گاڑی گئیں تم مدتوں مٹی میں جیتی جاگتی
حامی تمہارا تھا مگر کوئی نہ جز ذات خدا
تم سخت سے سخت امتحاں دیتی رہیں پر رائیگاں
کیں تم نے جانیں تک فدا کہلائیں پھر بھی بے وفا
گو صبر کا اپنے نہ کچھ تم کو ملا انعام یاں
پر جو فرشتے سے نہ ہو وہ کر گئیں تم کام یاں

(ایضا ص

:۴۹،۵۰)

ڈاکٹر عبادت بریلوی نظم " چپ کی داد" میں عورت کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔

> حالیؔ نے اس نظم میں عورت کو ماں ، بہن اور بیٹی کہہ کر پکارا ہے ۔ ورنہ اس سے قبل تو اردو شاعری میں عورت صرف محبوب تھی، صرف تعیش کا ذریعہ تھی اور اکثر جگہ تو وہ طوائف ہی نظر آتی ہے۔حالیؔ نے سب سے پہلے عورت کو معاشرے میں ایک مرتبہ دیا۔ مختلف زاویوں سے اسکی اہمیت ذہن نشین کرائی۔ انہوں نے عورت کو قوم کی عزت قرار دیا ۔ اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ عورت ماں ، بہن اور بیٹی ہے اور زندگی اس کے بغیر نا ممکن ہے۔ گھر وں میں رونق انہیں کے دم سے ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں خلوص ہوتا ہے، محبت ہوتی ہے، صداقت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر حال میں عورت کا وجود زندگی کے لیے لازمی ہے۔ زندگی ایک کش مکش کا نام ہے اور اس کش مکش میں عورت ایک سہارا ہے ایک تسلی ہے۔ وہ کش مکش کی ان منزلوں کو آسان کر دیتی ہے۔

حالی کی ایک مثنوی " تعصب و انصاف" ہے۔ اس میں حالیؔ کی انسان دوستی اپنا رنگ دکھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ حالیؔ خود تعصب سے پاک انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی ہندو مسلم نزاع کا کوئی واقعہ سنتے تھے انہیں بہت رنج اور افسوس ہوتا تھا۔ تحریر و تقریرمیں کیا نج کی اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے کبھی کوئی کلمہ ایسا سننے میں نہیں آیا جو کسی فرقے کی دل آزاری کا باعث ہو۔ بلکہ اگر کوئی تعصب بھری بات کہتا تو برا مانتے اور نصیحت کرتے تھے۔ بے تعصی کا وصف ان ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کو ہر طرح کے تعصب سے پاک رہنے کی تلقین کرتے ہیں ۔ حالیؔ کی یہ غیر معمولی انسان دوستی ہے کہ وہ اس روگ سے نجات حاصل کرانا چاہتے ہیں ۔ جسکی وجہ سے انسانی رشتے اپنا وجود کھو دیتے ہیں ۔ سماج بکھر جاتا ہے اور آپس کی لڑائیوں سے آبادیاں ویرانوں کا روپ دھار لیتی ہیں ۔ وہ در حقیقت وسیع النظری کا درس دیتے ہیں ۔ حالیؔ قوم کی تنزلی کا سبب جن عناصر کو قرار دیتے ہیں انکی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

مجلسیں غیبت و بہتان سے پُر
صحبتیں جھوٹ کے طوفان سے پُر
منقطع بھائی کی بھائی سے امید
اپنا بیگانہ ، لہو سب کے سفید
فقرا مکر و ریا کے پتلے
اغنیاء حرص و ہوا کے پتلے

شیخ عیا تو زاہد پُرفن
مولوی عقل کے سارے دشمن
(کلیات نظم حالی،جلد اول،
ص :٤٣٧)

حالی کی شخصیت چونکہ انسان دوستی، رحم و مساوات، فلاح و بشر اور وسیع المشربی کا مرقع تھی۔ لہٰذا تمام عمر وہ انہی باتوں کی تعلیم دیتے رہے۔ وہ صرف پیغام ہی نہیں دیتے بلکہ دعوت عمل بھی دیتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "جواں مردی کا کام" قابلِ توجہ ہے ۔جس میں ایک باپ اپنے بیٹوں سے جواں مردی سے کام سر انجام دینے پر انعام کا وعدہ کرتا ہے۔ تینوں بیٹے اپنے کارناموں کا تذکرہ کرتے ہیں ۔ پہلے کا کہنا یہ ہے کہ اس نے ایک شخص کی امانت لوٹا کر جواں مردی کا ثبوت دیا۔ جبکہ دوسرا ڈوبتے بچے کی جان بچاتا ہے اور اپنے لیے بہت بڑا کارنامہ سمجھتا ہے۔ باپ کے نزدیک یہ دونوں کارنامے جواں مردی کے کام نہیں ۔ اس پر سب سے چھوٹا بیٹا اپنا کارنامہ بیان کرتا ہے۔ جس کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

شب تاریک میں وہ ابر سیاہ
کہ جہاں کام نہ کرتی تھی نگاہ
کوندی اک سمت سے بجلی ناگاہ
جس سے آگے کو کھلی راہ نگاہ
پڑی اک غار پہ واں میری نظر
جس کی صورت سے برستا تھا خطر
مرد نکلا وہ شناسا میرا
تھا مگر خون کا پیاسا میرا
آ گیا مجھ کو مگر خوف خدا
اور پہلو سے یہ دی دل نے صدا
مرتے کو مارنا بے دردی سے
ہے بہت دور جواں مردی سے
حوصلے کا ہے یہی وقت کہ آج
ہے عدو اپنی مدد کا محتاج
واں سے جا اس کو اٹھا لایا میں
موت کی زد سے بچا لایا میں
منہ کو دامن سے مگر ڈھانک لیا
اس کو شرمندہ احسان نہ کیا
(کلیات نظم حالی،جلداول،ص:٣٦٨،
٣٦٩، ٣٧٠)

باپ چھوٹے بیٹے کے اس کارنامے کو جواں مردی سے تعبیر کرتا ہے۔ دراصل حالیؔ کے نزدیک سب سے بڑی جواں مردی انسان دوستی اور انسانیت کے کام آنا ہے۔ دراصل انسانیت نام ہی ہے بے غرضی اور

بے لوثی سے نیکی کی جستجو کرتے رہنا اور نئی خوشیوں کو حاصل کرنے کے لیے سرگرم عمل رہنا۔

حالیؔ کی انسان دوستی کا رنگ ان کے مراثی اور باعیات میں بھی غالب دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۸۶۹ء میں غالبؔ جیسا استاد دنیا سے رخصت ہو ا تو حالیؔ جیسا شاگرد رو پڑا ۔ حالیؔ نے استاد کی یاد میں ایک مرثیہ لکھا جس میں خود خون کے آنسو بہائے اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کو بھی رلا دیا۔ اپنے شفیق استاد کے دنیا سے اٹھ جانے پر حالیؔ جیسے حساس دل اور انسان دوست کا دنیا سے دل اٹھ گیا اور ہر چیز بے کار اور بے وقعت دکھائی دینے لگی۔ حالیؔ کی استاد سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ غالب کا بے جان جسم جو خاک کا جز ہے اگر اس کے بدلے میں خاتم سلیمانی جیسی قیمتی چیز بھی دی جائے تو میں اس کو بھی نہ لوں بلکہ غالبؔ ہی کو زندہ دیکھنا پسند کروں ۔

لوں نہ اک مشت خاک کے بدلے
گر ملے خاتم سلیمانی
(کلیات نظم حالی ،جلد اول، ص:۳۲۷)

صرف مولانا ہی رنج و غم میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج
اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج
(ایضاً ،ص:۳٤۱)

پورا شہر غم میں کیوں مبتلا ہے اس لیے کہ

نازش خلق کا محل نہ رہا
رحلت فخر روزگار ہے آج
تھا زمانہ میں اک رنگین طبع
رخصت موسم بہار ہے آج
(ایضاً ، ص:۳٤۱)

جب پورا شہر غم میں مبتلا ہے تو مولانا تو شاگرد ہی تھے اپنی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں ۔

تھی ہر اک بات نیشتر جس کی
اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج
(ایضاً ، ص:۳۲۱)

حالیؔ نے دوسرا مرثیہ مہین برادر جناب خواجہ امداد حسین صاحب کے نام لکھا۔ ایسے شفقت کرنے والے بھائی کے انتقال پر حالیؔ کو کتنا صدمہ ہوا ان کو اپنی زندگی اجیرن اور بے کیف معلوم ہونے لگی۔ حالیؔ کا کہنا ہے کہ جب تک زندگی ہے۔ ہنسنا اور بولنا بھی رہے گا لیکن زندگی

کا لطف جب باقی نہ رہے تو ہنسنے اور بولنے میں زندگی اور زندہ دلی کا فقدان ہی ہو گا لیکن جب تک موت نہیں آتی زندگی کسی نہ کسی طرح تو گزارنا ہی ہو گی خواہ بے کیف ہی گزرے۔

بولیں گے بھی سو بار ہنسیں گے بھی جہاں میں
یہ ناو ہے ہر طرح ہمیں پار لگانی
پر آہ کلی وہ جو ہے مرجھا گئی دل کی
مشکل ہے وہ ہنس بول کے آپس میں کھلانی
باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر
ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی
(کلیات نظم حالی ،حصہ اول، ص :۳۳۷)

حالی! مرثیے کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔" مرثیہ کا مقصد صرف رونے رلانے کی بجائے صبر، استقلال، شجاعت، ہمدردی، وفاداری، غیرت، حمیت وغیرہ کا اظہار ہونا چاہیے۔"انسان دوست حالیؔ نے اپنی ربا عیات سے اصلاح معاشرہ کا کام لیا ہے۔ انہوں نے قوم کی پست حالت کو سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ نوجوان طبقے کو اچھے اخلاق اپنانے اور تحریک و عمل کی ترغیب دی۔

کوشش میں ہے شرط ابتدا انساں سے
پھر چاہیے مانگنی مدد یزداں سے
جب تک کہ نہ کام دست و بازو سے لیا
پائی نہ نجات نوح نے طوفاں سے
(کلیات نظم حالی،جلد اول، ص :۲۳۲)

حالی کی ان اصلاحی رباعیات کے بارے میں ڈاکٹر شجاعت سندیلوی رقم طراز ہیں ۔

حالیؔکی ربا عیات میں اخلاقی و اصلاحی پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ انہوں نے قوم کی پستی و بد حالی کو دور کرنے، اس کو محنت و مشقت، ہمت و حوصلہ ، جوش و استقلال کے ساتھ کام کرتے رہنے اور اعلیٰ کردار، بلند اخلاق پیدا کرنے کی ترغیب دی۔ اس کے اندر جمود و قنوطیت کے بجائے حرکت اور روحانیت کے جذبات بیدار کیے۔ اس کو علم وعمل کی طرف توجہ دلائی۔ ہمدردی اور انسانیت کا درس دیا۔

آخر میں مولوی عبدالحق حالیؔ کی عظمت اور انسان دوستی کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو وہ ایسے ہی پاک نفیس بزرگوں کی صحبت میں آسکتے ہیں ۔ ورنہ یوں دنیا میں پندو نصائح کی کمی نہیں دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں ۔ کیسا ہی برا زمانہ کیوں نہ ہو، دنیا کبھی اچھوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اب بھی بہت سے صاحب علم و فضل ، با کمال، ذی وجاہت، نیک سیرت اور نیک دل لوگ موجود ہیں ۔ مگر افسوس کہ کوئی حالی نہیں ۔

اسمٰعیل میرٹھی اور انسان دوستی(۱۸٤٤ـ۱۹۱۷)

اصلاحی تحریک کے شاعروں میں مولوی اسمٰعیل میرٹھی کا نام قابل ذکر ہے۔ انہوں نے جدید اردو شاعری میں نہ صرف نئے موضوعات متعارف کروائے بلکہ مقامی اور دیہی زندگی کی تصویریں مہارت سے پیش کیں ۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے وقت ان کی عمر تقریبا چودہ برس تھی۔ اس دلگداز سانحہ کا مشاہدہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے کیا۔ اور یوں اپنی مدرسانہ زندگی میں بھی انہیں ایسے ماحول اور معاشرے کا گہرا مشاہدہ کرنے کا موقع ملتا رہا۔ اس طرح اسمٰعیل میرٹھی اپنے عہد کے معاشرتی حالات سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس کے علاوہ لاہور کی جدید شاعری کی تحریک کے اثرات اور نئے مغربی علمی و ادبی رجحانات کے اثرات کی جھلک بھی ان کی شاعری میں جھلکتی ہے۔ وہ شبلی ، آزادؔ اور حالیؔ سے خاص طور پر متاثر معلوم ہوتے ہیں ۔ مولوی صاحب کو مسلمانوں کی خستہ حالی نے بہت متاثر کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ہمدردی اور انسان دوستی کے جذبات ان کی شاعری میں جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں ۔

اسمٰعیل میرٹھی مشرقی تہذیب و معاشرت کے دلدادہ تھے۔ وہ مغرب کی تقلید و پیروی کو ملک و قوم کے لیے مضر خیال کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم " قصیدہ جریدئہ عبرت" اہمیت کی حامل ہے۔ اس نظم میں انہوں نے ایک انسان دوست شاعر کی حیثیت سے مسلمان قوم کی زبوں حالی پر افسوس کیا ہے اور ساتھ ہی مختلف پیشوں کے افراد کی خستہ حالی کا تذکرہ بھی بڑے پرسوز انداز میں کیا ہے۔ شاعروں پر طنز کے نشتر چلاتے ہیں ۔ جن کے قالب میں جھوٹ نے بسیرا کر رکھا ہے۔ معلموں کا پرانا طریقہء تعلیم زندہ دلی کے وصف سے خالی نظر آتا ہے جو زندگی کی علامت ہے۔ امام، حافظ، واعظ، موذن اور مفتی سب دنیا دار اور دین سے دور ہو چکے ہیں ۔ مخلوق خدا میں نیکی، ہمت اور پختہ عزم جو انسان دوستی کی اقدار ہیں سب ختم ہوتی دکھائی دیتی ہیں اہل قوم کے دلوں میں حب وطن اور حب قوم کی جگہ بعض وعناد کی حکمرانی ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی کا مقصد چونکہ معاشرتی اصلاح ہے اس لیے انہوں نے ان طبقات اور عوام کی بے راہ روی اور انسان دوستی کی قدر سے نا

آشنائی پر بڑی تنقید کی ہے۔ اور انہیں خواب غفلت سے بیدارکرنے کی سعی کی ہے تاکہ ہر ایک انسان نیک دل اور اعلیٰ اوصاف و کردار کا مالک بن کر قومی عزت و وقار کا محافظ بن سکے اور انسان دوستی کی فضا پیدا ہو سکے۔

عوام کی ہے یہ صورت کہ بس خدا کی پناہ
ہر ایک پیشہ بے غیرتی میں کارگذار
نہ کوئی علم نہ صنعت نہ کچھ ہنر نہ کمال
تمام قوم کے سر پر سوار ہے ادبار
زمانہ چونک پڑا ہے پر اے مسلمانو
جھنجھوڑنے سے بھی ہوتے نہیں تم بیدار

(مولوی محمد اسماعیل میرٹھی، ایک مطالعہ ۔ ڈاکٹر سید خاور رضوی،ص:۵۸)

اسمٰعیل میرٹھی نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ پر خون کے آنسو بہائے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم " آثار سلف" توجہ کی طالب ہے۔ جس میں آگرہ کے قلعہ اکبر آباد کے درو دیوار زباں حال سے اپنی عظمت رفتہ کی داستان سناتے ہیں اور شاہان سلف کے جاہ و جلال، عدل و انصاف اور رعایا پروری کا سماں آنکھوں میں بندھ جاتا ہے۔ اور دوسری طرف زمانہ حال کی بے بسی اور بے چارگی ایک تلخ حقیقت کے روپ میں دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

یا رب یہ کسی مشعل کشتہ کا دھواں ہے
یا گلشن برباد کی یہ فصل خزاں ہے
یا برہمیٔ بزم کی فریاد و فغاں ہے
یا قافلہء رختہ کا پس خیمہ رواں ہے
ہاں دور گزشتہ کی مہابت کا نشاں ہے
بانیئ عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے

(ایضا، ص:٤٤)

اسمٰعیل میرٹھی ماضی و حال کا تفاوت بیاں کرنے کے بعد قوم کے نوجوانوں کو دیدہ بینا کے استعمال اور آثار صنادیدکی عینک کو لگانے کی ترغیب دیتے ہیں اور راہ طلب و شوق میں اک شمع جلانے کا پیغام عام

کرتے ہیں ۔ کیونکہ وہ اپنی قوم سے نا امید اور مایوس نہیں بلکہ انہیں مستقبل کے لیے ہمت و استقلال سے کام لینے کی تلقین کرتے ہیں اور خدمت قوم کے لیے میدان عمل میں صف آرا ہونے کی دعوت بڑے والہانہ انداز میں دیتے ہیں ۔ کیونکہ شاعر کا مقصد قوم کی تعمیر ہے نا کہ تخریب اور یہی انسان دوستی کا پیغام ہے۔

ہے قوم اگر آنکھ تو تم نور بصر ہو
ہے قوم اگر چرخ تو تم شمس و قمر ہو
ہے قوم اگر کان تو تم لعل و گہر ہو
نظارگی ہے قوم تو تم مدنظر ہو
موسیٰ بنو اور قوم کو ذلت سے بچاو
گوسالہءغفلت کی پرستش کو چھڑاؤ

اسمٰعیل میرٹھی نے اپنی نظم "قصیدہ نوائے زمستان" میں بھی مسلمانوں کی بے حسی اور بے رحمی کا نقشہ بڑی خوبصورتی سے کھینچا ہے۔ جن کے دلوں سے ہمدردی،پیار و محبت اور انسان دوستی کے جذبات ختم ہو چکے ہیں ۔

نہیں غم کسی کو مصیبت زدوں کا
نہ فکر ایامیٰ نہ ذکر یتیماں
عیال خدا کی مدارات ایسی
اور اس پر یہ دعوٰی کہ ہم ہیں مسلمان
یہ بچے جو پھرتے ہیں آوارہ جاہل
گھسیٹتے ہیں کانٹوں میں گل ہائے خنداں

(مولوی محمد اسماعیل میرٹھی،ڈاکٹر سید خاور رضوی ،ص:۵۰)

انسان دوست اسمٰعیل میرٹھی مسلمانوں کو دعوت عمل دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انسان کی قدر صرف عمل کے حسن سے ہے۔ وہ قوم یا فرد جسکی زندگی عمل سے خالی ہوتی ہے۔ وہ ایک ڈھول ہے جو اندر سے بالکل خالی ہوتا ہے مگر آواز زیادہ دیتا ہے۔ عمل ایک ایسی قوت ہے جس سے قوموں میں جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ حرکت میں برکت ہے۔ وہ پانی جو چلتا رہتا ہے تازہ رہتا ہے مگر جو پانی کھڑا رہتا ہے اس میں بو پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جن قوموں کی زندگی حرکت و عمل سے آراستہ ہے وہ قومیں تاریخ اور زندگی کے میدان میں کامیاب و کامران ہیں اور جو قومیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہیں تاریکی اور ظلمت اسکا مقدر بن جاتی ہے۔ اور وہ دنیا کے نقشے سے یوں مٹ جاتی ہیں جیسے خزاں رسیدہ پتا درخت سے گرتا اور ہوا کے دوش پر لڑھکتا پھرتا ہے۔ گویا ایک انسان دوست معاشرے کے قیام کے لیے

حرکت و عمل کے اصول پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے اور اسی کی تلقین اسمٰعیل میرٹھی کچھ اس انداز میں کرتے نظر آتے ہیں ۔

بے کوشش و بے جہد ثمر کس کو ملا ہے
بے غوطہ زنی گنج گہر کس کو ملا ہے
بے خون پسینے لقمہئ تر کس کو ملا ہے
بے جور کشتی تاج و ظفر کس کو ملا ہے
جو رتبہ والا کے سزاوار ہوئے ہیں
وہ پہلے مصیبت کے طلبگار ہوئے ہیں

(ایضا، ص:۷۹)

اسمٰعیل میرٹھی اپنی ایک نظم " کوشش کیے جاؤ " میں کوشش اور عمل کا پیغام بڑے خوبصوارت انداز میں دیتے ہیں ۔ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل
تو بے شبہ گھس جائے پتھر کی سل
رہو گے اگر تم یوں ہی مستقل
تو اک دن نتیجہ بھی جائے گا مل
کیے جاو کوشش مرے دوستو

(ایضا ،ص :۱٤۲)

اسمٰعیل میرٹھی اپنی قوم سے مایوس نہیں وہ رجائیت پسند شاعر ہیں ۔ ان کے نزدیک زندگی تبدیلی کا دوسرا نام ہے۔ یہاں ایک سے حالات کبھی نہیں رہ سکتے۔ کبھی بہار ہے تو کبھی پت جھڑ کا موسم اپنا حسن دکھاتا ہے۔ کبھی تپتے صحراوں کی سی گرمی کا احساس ہوتاہے تو کبھی برسات کی جل تھل ہے ۔ کبھی دروازے پر خوشیاں دستک دیتی ہیں تو کبھی صحن میں ماتم کی صدائیں گونجتی ہیں ۔ انسان کو چاہیے کہ وہ حالات سے دلبرداشتہ کبھی نہ ہو ۔ برے سے برے حالات بدل جانے کے لیے ہوتے ہیں کیونکہ رات کے بعد صبح کا آنا لازم ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم " اچھا زمانہ آنے والا ہے"کے اشعار دیکھئے۔

تنے گا مسرت کا اب شامیانہ
بجے گا محبت کا نقارخانہ
حمایت کا گائیں گے مل کر ترانہ
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ
نہ ہم روشنی دن کی دیکھیں گے لیکن

چمک اپنی دکھلائیں گے اب بھلے
دن
(ایضا، ص
۱۳٦:)

اسمٰعیل میرٹھی انسان دوستی کا پیغام سارے عالم میں عام کرتے ہیں ۔ ان کے نزدیک آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ انہیں انسانی آزادی و عظمت کائنات کی ہر چیز سے عزیز تر ہے۔ وہ کسی بھی انسان کو اس سے محروم نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ آزادی سے انکار دراصل انسان کے وجود سے انکار ہے۔ ان کی نظم " آزادی غنیمت ہے" کے اشعار آزادی کے مفہوم کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں ۔

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے
بہتر
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر
ہو
بھلی اس محل سے جہاں کچھ خطر
ہو
(انتخاب کلام اسمٰعیل
میرٹھی، ص :۲۲)

اردو شاعری کا دامن کبھی بھی عظمت بشر اور شرف انسانیت کے شعور سے خالی نہیں رہا۔ مولانا کے ہاں انسان چونکہ جملہ مخلوق سے اشرف و افضل ہے۔ اس لیے حسن و خوبی میں کوئی اور مخلوق اس کے مد مقابل نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مسجود ملائک ٹھہرایا اور احسن تقدیم خلق کیا ہے اور اس با کمال فنکار نے اپنے اس فن میں ہر جمالیاتی واخلاقی خوبی کو مجتمع کر دیا ہے۔ نظم " انسان" کے اشعار انسانی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہیں اور انسان دوستی کے غماز ہیں ۔

ابر و باد و مہ خورشید میرے کام
میں ہیں
مرغ و ماہی و دد و دام میرے دام
میں ہیں
آب و آتش میری خدمت کے سر
انجام میں ہیں
کل جمادی و نباتی مرے خدام میں
ہیں
مجھ میں قدرت نے عجب فضل و
شرف رکھا ہے
میں نے فردوس کے میووں کا
مزہ چکھا ہے

(ایضا، ص

:۳۳)

مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی نے تمثیلات کے پردے میں اخلاقی مطالب ادا کیے ہیں ۔ اور انسان دوستی کا پیغام عام کیا ہے۔کچھوے اور خرگوش کی حکایت کے ذریعے انسان کو محنت اور صبر و تحمل کا درس دیا ہے۔ کیونکہ محنت ہی میں کامیابی کا راز مضمر ہے۔

صبر و محنت میں ہے سرفرازی
کچھوے نے جیت لی بازی
نہیں قصہ یہ دل لگی کے لیے
بلکہ عبرت ہے آدمی کے لیے
(مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی ایک مطالعہ ،ص :۱۰۵)

ایک نظم اتفاق و اتحاد پر لکھی ہے اور ایک قطرے کے ذریعے انسان کو اتفاق و اتحاد کا درس دیا ہے۔ ایک قطرے کی ہمت و شجاعت کو دیکھ کر تمام قطروں نے اسکی پیروی کی اور یوں موسلا دھار بارش ہوئی جس سے بیاباں اور چمن جل تھل ہو گئے۔ اتفاق و اتحاد کا درس دیتے ہوئے دراصل وہ انسان دوستی کے پیغام ہی کو عام کرتے ہیں ۔ اشعار دیکھیے۔

اے صاحبو! قوم کی خبر لو
قطروں کا سا اتفاق کر لو
قطروں ہی سے ہو گی نہر جاری
چل نکلیں گی کشتیاں تمہاری
(ایضا ،ص

:۸۲)

غرض اسمٰعیل میرٹھی کی نظموں میں انسانی عظمت اور بنی نوع انسان سے ہمدردی اور انسان دوستی کی حرارت موجود ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی کی فنی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا شبلی کہتے ہیں ۔" حالی کے بعد اگر کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ مولوی اسمٰعیل میرٹھی ہیں "۔

اکبر الہ آبادی اور انسان دوستی (۱۸٤٦۔۱۹۲۱)

بیسویں صدی کے تقریبا آغاز میں انگریزی تہذیب و معاشرت کے اثرات ہندوستان پر گہرے ہونے لگے۔ ہر طرف مغرب کے علم و ادب اور تہذیب و تمدن کی یلغار دکھائی دینے لگی۔ہندوستان کے لباس انگریزی لباس، انگریزی رہن سہن کی پیروی کرنے لگے۔ہندوستان کے لوگ مشرقی روایات کو مغربی تہذیب کے مقابلے میں کمتر سمجھنے لگے ۔ سرسید کی علیگڑھ تحریک بھی یورپ کے کلچر اور علم تحقیق کی فضیلت بیان کرنے والوں کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ یہ ایک ایسا سیلاب تھا جس میں خطرہ تھا کہ پورا مشرق اپنی روشن روایات و اقدار

کے سرمایے کے ساتھ بہہ جائے گا۔ ان حالات کی سنگینی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں ۔

> یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی سماجی مذہبی، سیاسی اور معاشی زندگی کی سنگین دیواروں میں مغرب کی طرف سے بڑھتے ہوئے سیلاب نے ایسے شگاف پیدا کر دیے تھے کہ معاشرے کی ساری عمارت کے گر جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایسے میں اکبر کے ذہن اور بازو میں جنبش پیدا ہوئی اور طنزکے نوکیلے تیروں کی بارش شروع ہوگئی۔

اکبر کے ذہن پر یہ تمام باتیں بجلی بن کر گریں ۔ اس المیے سے دو چار ہوتے ہوئے انہوں نے مشرقی اقدار کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا اور مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے شعر و سخن کا سہارا لیا۔ مغربی نظریات و افکار، رہن سہن اور تہذیب و تمدن پر تنقید کر کے مسلمانوں کو احساس کمتری سے نجات دلانے اور احساس زبان سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ گویا اکبرؔ ایک بہت بڑے نباض ملک و قوم تھے۔

اکبر کی اس خوبی کا اعتراف مولانا عبدالماجد دریا بادی یوں کرتے ہیں ۔

> اکبرؔ صاحب نظر تھے ۔ ایک خاص دل و دماغ رکھتے تھے۔ ایک مخصوص پیام کی تبلیغ کا باران کے شانہ پر تھا۔ یوں کہیے کہ فطرت کی جانب سے ایک رسول بن کر آئے تھے۔ صاحب کتاب، حقیقی رسولوں کے جانشین اور ادنیٰ خادم، دل کڑھا، دماغ متاثر ہوا، آنکھوں نے بہت کچھ دیکھ لیا جو دوسروں کی نظر سے اوجھل تھا۔ ان کا پیغام اسی تحریک مغربیت کے خلاف رد عمل تھا۔ ان کی شاعری اول سے آخر تک اس مادیت و فرنگیت کا جواب ۔ ان کے ترکش کا ایک ایک تیر اس نشانہ پر آکر لگتا ہے۔

اکبرؔ کی شاعری میں ان کے سچے جذبات، میلانات، خواہشات، انسان دوستی، خلوص و محبت اور ہمدردی کی ایک صاف و شفاف تصویر نظر آتی ہے۔جو شاعر کی نہ صرف ذہنی سوچ بلکہ قلبی واردات کی بھی آئینہ دار ہے۔

اکبرؔ کی شاعری میں پندو نصائح اور سنجیدگی کے حامل اشعار ان کی انسان دوستی کو تہ در تہ عیاں کرتے جاتے ہیں ۔ یہ اشعار بظاہر تو ہمیں قہقہہ لگانے پر مجبور کرتے ہیں مگر جونہی ہنسی کی رو گزر جاتی ہے تو ہم اپنے باطن کی دنیا میں اصلیت کو تلاش کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم حقیقت حال سے جونہی آشنا ہوتے ہیں تو دل ہی دل میں ندامت محسوس کرتے ہیں ۔ انسان دوست اکبر دراصل صرف اپنے ماحول اور اردگرد کے حالات کے پیش نظر سنجیدہ موضوعات کو مزاح کے پردے میں عیاں کرتے چلے گئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کے کلام کے سمندر میں ضرور غوطہ زن ہونا

پڑے گا اور پھر یہ تو غوطہ زن پر منحصر ہے کہ وہ اس سمندر کی تہہ سے ہیرے چنتا ہے یا خالی سیپ اسکا مقدر بنتے ہیں ۔

انسان دوست اکبرؔ انگریزوں کی اس چال سے بخوبی واقف تھے کہ وہ سیاسی حقوق جو ہمیں دن بدن حاصل ہو رہے ہیں انہیں ہم اپنی ترقی کی علامت سمجھ کر خوش ہو رہے ہیں ۔ حالانکہ انگریز ہماری حرص و ہوس اور جاہ پرستی کا صحیح اندازہ لگاکر ہمیں ایک سیاسی شکنجے میں جکڑ رہے ہیں اور جسکی گرفت اور جسکا حلقہ دن بدن ہم پر تنگ ہو رہا ہے اور ہم ترقی و تنزلی کے اس غار میں دھنستے چلے جار رہے ہیں ۔ اکبرؔ کو اس کا شدید دکھ تھا۔

ہاون تو ہے ہوس کا دستہ ہے پالیسی کا
لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا
اس قبلہ رو جماعت کا انتشار دیکھو
اس باغ میں خزاں کی اکبرؔ بہار دیکھو

(کلیاتِ اکبر)

اکبرؔ نے اردو شاعری کو ایک نئی زبان ، نئی آواز ، نیا لہجہ اور نئی طرز ادا سے روشناس کرایا ۔ان کی اس نئی آواز نئے آہنگ اور نئے لہجے کا اعتراف پروفیسر رشید احمد صدیقی یو ں کرتے ہیں ۔

اکبرؔ نے اردو شاعری کے ساتھ جتنی بے تکلفی برتی ہے اس سے پہلے شاید ہی کسی نے برتی ہو۔ انہوں نے جو موضوع چاہا اختیار کیا، جو زبان چاہی استعمال کر ڈالی ،جو لہجہ جی میں آیا اختیار کر لیا۔ انہوں نے ہر بات ہر طریقے سے کہی ۔ثقات کی زبان میں عوام کی زبان میں ، مولویوں کی زبان میں ، صوفیوں کی زبان میں ۔ شاعر کی زبان میں اورسب سے بڑی بات یہ کہ شخص کی زبان میں جہاں تک شخص کی زبان کا تعلق ہے ہماری شاعری میں اس کے نمونے بہت ہی کم ملتے ہیں ۔

سرسید کی کوششوں سے جس طوفان کے دروازے وا ہوئے جو ہیجان برپا ہوا۔ جو ہنگامہ وجود میں آیا اسکی طاقت کا اس کے جوش کا اس کے بعض مضر اثرات کا خود سرسید کو بھی اچھی طرح اندازہ نہ تھا۔ جبکہ اکبرؔ سرسید کے نقاد ہونے کے باعث ان چیزوں کو زیادہ بہتر طور پر دیکھ سکتے ہیں ۔ چنانچہ موجودہ نظام تعلیم کیا کچھ دے رہا ہے۔ حاکموں کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہے۔ علیگڑھ سے مسلمان کس قدر پیدا ہو رہے ہیں اورکلرک کس قدر ان تمام نتائج پر انسان دوست اکبرؔ کی گہری نظر تھی۔

شیخ در گور قوم در کالج
رنگ ہے دور آسمانی کا

انجن آیا نکل گیا زن سے
سن لیا نام آگ پانی کا
علم پورا ہمیں سکھائیں اگر
تب کریں شکر مہربانی کا
(کلیاتِ
اکبرؔ)

اکبرؔ نے اپنے زمانے کی ادبی، معاشرتی اور سیاسی رجحانات پر جو تنقید کی ہے۔ وہ ان کی انسان دوستی کا بھرپور اظہار ہے۔ ان کا اصل مقصدمشرق کو مغرب کے تنقیدی اثرات سے محفوظ رکھنا ہے۔ گو وہ جدید تہذیب و تمدن اور تعلیم کے مخالف نہیں لیکن اس سے مشرق کی روحانی روایات و اقدار کو جو نقصان پہنچا ہے اسکی مخالفت وہ ضرور کرتے ہیں ۔ وہ یہ ہرگز نہیں چاہتے کہ ملک کے نوجواں تقلید مغرب میں اپنی قومی خصوصیات اور قومی تشخص فراموش کردیں ۔

اک برگ مضمحل نے یہ اسپیچ میں
کہا
موسم کی کیا خبر نہیں ڈالیو تمہیں
اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے
دیا
موسم سے بے خبر ہوں تو کیا جڑ
کو چھوڑ دوں
(کلیات اکبر ،ص
:۳۲۸)

اکبرؔ نے زندگی کے مختلف مسائل و رجحانات کی تصویر کشی اپنے مخصوص رنگوں سے اس طرح پیش کی ہے جو ہر ایک کی نظر میں گھپ گئی۔ اکبرؔ کو ماضی کی عظمت و شوکت سے غرض نہ تھی۔ انہیں عزیز تھا تو صرف ماضی کی تہذیبی ومعاشرتی اقتدار کا وہ سر چشمہ جو مذہب و اخلاق سے پھوٹتا تھا۔ اکبرؔ بہت حساس انسان تھے۔ ان کا دل قومی اور ملی جذبات سے دھڑکتا تھا۔ وہ اپنے سینے میں دل درد رکھتے تھے۔ ان کی انسان دوستی نے انہیں مسلمانوں کی بے چارگی، بے بسی سے آگاہ کر رکھا تھا۔ مگر مشرق کا علاج مغرب میں نہیں ڈھونڈتے بلکہ انکی نظر تو اس قومی ورثہ پر تھی جو قومی غیرت و خودداری سے ابھرتی تھی۔ اکبر کو اپنے دور کی زندگی اور معاشرت میں مضحک پہلو وہاں نظر آتے ہیں جہاں ایک ہندوستانی اپنی اصلیت کو بھول کر ایک نقلی انگریز بننے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف نظر آتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

سید سے آج حضرت واعظ نے کہا
چرچا ہے جا بجا حال تباہ کا
ہے تجھ سے ترک صوم و صلوۃ و
زکوٰۃ و حج

کچھ ڈر نہیں جناب رسالت پناہ کا
اس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج
راحت میں جو منحل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا
(کلیات اکبر حصہ دوم، ص :۱۹)

ایک اور قطعہ دیکھئے جس میں اکبر نے لوگوں کی مغرب پرستی اور انگریزی راج کی فیوض و برکات پر رطب اللسان ہونے پر ان کی غلامی اور محکومی کا خوب مضحکہ اڑایا ہے۔

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشیں برٹش راج
کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے
جو چاہے کھول لے دروازہ عدالت کو
کہ تیل بیچ میں ڈھیلی اسکی چول بھی ہے
خلل نہ شغل میں بدھو کے نہ حسو کے
کہ شیخ سدو بھی ہیں اور قدم رسول بھی ہے
(کلیات اکبر، ص :۳٥٤)

انسان دوست اکبرؔ مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید کے خلاف تھے اس سے جن برائیوں کے پر چار کا خطرہ تھا اسکو بھانپ چکے تھے۔ بقول آل احمد سروروہ ایک عاشق ہیں اور اپنے عشق میں سب سے منفرد۔ میرؔ عشق سے محبت کرتے ہیں ، حسرتؔ حسن سے، غالبؔ زندگی سے، نظیرؔ اسکی نعمتوں سے، اقبالؔ توانائی اور تخلیق سے ،جوشؔ شباب سے، اکبرؔ ایک تہذیب ایک تمدن کے عاشق ہیں ۔ حالیؔ، شبلیؔ، اقبالؔ ، ابو الکلام آزاد کسی نے مشرقیت سے اس طرح عشق نہیں کیا۔ جس طرح اکبرؔ نے ۔ ان کے زمانے میں تہذیب پر ہر طرف سے حملے ہوئے اور انہوں نے بڑی بے جگری سے ان حملوں کا مقابلہ کیا۔ آج ہم اس تہذیب کے خدو خال اسکی عظمت ورفعت اور اسکی کوتاہیاں جس طرح اکبرؔ کے کلام میں دیکھ سکتے ہیں دوسری جگہ ممکن نہیں ۔

اکبرؔ قوم کے بارے میں ایک نئے جوش و جذبے اور منفرد انداز سے شاعری کرتے ہیں ۔ وہ حالیؔ کی طرح آنسو نہیں بہاتے اور نہ ہی

آزادؔ کی طرح نئی صبح کے ترانے گنگناتے ہیں ۔ بلکہ اس انداز سے شاعری کرتے ہیں کہ پڑھنے والا روتا نہیں بلکہ طنز کے نشتروں پر ہنستا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم " برق کلیسا" اہمیت کی حامل ہے۔ جس میں انہوں نے ایک واقعے کا سہارا لیکر مسلمانوں کی حالت زار پر طنز کیا ہے۔ اور اس دور کے مسلمانوں کی تصویر کشی اس عمدہ پیرائے میں کی ہے جو کردار کی بجائے صرف گفتار کا غازی بن کر رہ گئے ہیں اور دین پرستی کی بجائے زن پرستی کو اوّلیت دیتے ہیں ۔ اس دور کا مسلمان اپنی حالت زار کا بیان کچھ اس انداز میں کرتا ہے۔

اب کہاں ذہن میں باقی ہیں براق و رفرف
صرف ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف
ہم میں باقی نہیں اب خالد جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ
یاں نہ وہ نعرئہ تکبیر نہ وہ جوش سیاہ
سب کے سب آپ ہی پر پڑھتے ہیں سبحان اللہ
(کلیات اکبرؔ،حصہ دوم، ص :٣٦)

اکبرؔ نے نواب محسن الملک کی فرمائش پر ایک قومی نظم مسدس کی صورت میں لکھی۔ جس میں ان کی انسان دوستی واضح طور پر جھلکتی ہے۔ قوم کے نوجوانوں کو ہوش میں آنے کی تلقین کرتے ہیں اور خواب غفلت سے بیدار ہونے کا درس دیتے ہیں ۔ دلوں میں غیرت کے جذبات جگانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اور مغربی تہذیب کے طلسم سے باہر نکالتے ہوئے انہیں جھنجھوڑتے ہوئے کہتے ہیں ۔

مسلمانو بتاو تو تمہیں اپنی خبر کچھ ہے
تمہارے کیا مدارج رہ گئے اس پر نظر کچھ ہے
اگر کچھ ہے تو سوچو دل میں بھی اس کا اثر کچھ ہے
حریفوں کی تعلی باعث سوز جگر کچھ ہے
تمہیں معلوم ہے کچھ رہ گئے ہو کیا سے کیا ہو کر
کدھر آنکلے ہو راہ ترقی سے جدا

ہو کر

(کلیات اکبر ؔ،حصہ

دوم، ص :۷۵)

اختر انصاری اکبر آبادی، اکبرؔ کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔

اکبر الہ آبادی اردو زبان کے پہلے شاعر ہیں ۔ جنہوں نے انگریزی تمدن، مغربی تہذیب اور فرنگی سیاست کے خلاف اس دور میں آواز بلند کی جب کہ جبر و استبداد نے زبانوں پر خاموشی کی مہریں لگا دی تھیں ۔ ان کی طنز میں پیغام ہے انقلاب ہے اور اصلاح و ہدایت کا جوہر بھی۔ اکبرؔ کی شاعری نے تہذیب فرنگ اور سیاست مغرب کی مخالفت اور اس سے بیزاری کا سب سے پہلے ہندوستان کے لوگوں کے دل میں بیچ بویا ۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کی اکبر کا کلام انقلاب آفریں بھی ہے۔

اکبرؔ کی انسان دوستی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ مذہب ونسل کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان دوری کو ناپسند قرار دیتے ہیں اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی ہیں ۔ وحدت واتحاد کے فلسفے کو خوبصورت رنگ میں یوں پیش کرتے ہیں ۔

یہ میرے سامنے شیخ و بر ہمن
کیوں جھگڑتے ہیں
اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہوں
دونوں کا قائل ہوں

(کلیاتِ

اکبرؔ)

وسیع المشربی اور اتحاد واتفاق سے رہنے کی تعلیم دیتے ہوئے کہتے ہیں

ہندو مسلم ایک ہیں دونوں
یعنی یہ دونوں ایشیائی ہیں
ہم وطن ہم زبان و ہم قسمت
کیوں نہ کہہ دوں کہ بھائی بھائی
ہیں

(کلیات اکبر، حصہ دوم،

ص :۱٦۳)

ایک اور جگہ کہتے ہیں ۔

خدا کی ہی عبادت
جن کو ہو مقصود اے اکبرؔ
وہ کیوں باہم لڑیں گو
فرق ہو طرزِ عبادت میں

(کلیاتِ
اکبرؔ)

اسی قسم کی وسیع تعلیم کچھ اس طرح بھی دیتے ہیں

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں پہ اڑو چرخ پہ جھولو
پر ایک سخن بندہ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو
(کلیات
اکبرؔ)

اکبرؔ جس فضا میں سانس لے رہے تھے وہ نکبت و افلاس اورمحکومی کیوجہ سے مسموم ہو چکی تھی۔ اعلیٰ اقدار دم توڑ چکی تھیں ۔ ایسی صورت میں اکبرؔ ہماری اعلیٰ اقدار کے بہترین ترجمان کے طور پر سامنے آئے اور ان تمام محاسن اخلاق کو اپنانے کی تلقین کی جس سے انسان دوستی کی بہترین فضا پیدا ہو سکتی ہے۔ ان کا پیغام یہ تھا کہ برے کام کرنے سے بہتر ہے کہ کچھ نہ کیا جائے۔ ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دینی چاہیے۔

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا
افعالِ مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبرؔ نے سنا ہے اہل غیرت سے یہی
جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا
(کلیات
اکبرؔ)

اکبرؔ کی شاعری کبھی مردہ نہیں ہو سکتی کیونکہ ان کا پیغام حرکت و عمل کا پیغام ہے۔ اس چراغ سے رہتی دنیا تک فکر و عمل کے دیپ روشن رہیں گے۔ ان کے ہاں صرف پندو نصائح ہی نہیں بلکہ زندگی کے اصول اور جینے کے قرینے بھی ہیں اور یہی انسان دوستی کا پیغامِ عام ہے ۔

اعمال کے حسن سے سنورنا سیکھو
اللہ سے نیک امید کرنا سیکھو
مرنے سے مضر نہیں ہے جب اے اکبرؔ
بہتر ہے یہی خوشی سے مرنا سیکھو
(کلیات
اکبرؔ)

اکبر کے ہاں عافیت نیکی اور شرافت ہی میں ہے۔ اور یہی نیکی اور شرافت انسان دوستی کی اقدار ہیں ۔

دل اس کے ساتھ ہے کہ خدا جس کے ساتھ ہے
لیکن خبر نہیں کہ خدا کس کے ساتھ ہے
البتہ پیش چشم ہے قانون عافیت
جو نیک اور شریف ہے وہ اس کے ساتھ ہے

(کلیات اکبرؔ)

اکبرؔ حوصلہ مندی اور صبر و شکر کے ساتھ زندگی گزارنے کی تلقین کرتے ہیں ۔ قناعت پر ان کا تکیہ تھا۔ فقر و قناعت کے بندے ہمیشہ انسان دوست رہے ہیں ۔ اس فقر و قناعت نے انہیں ہمیشہ مصلحت کوشی اور بزدلی سے پاک رکھا۔ اکبرؔ کے نزدیک قناعت سے آبادی اور حرص بربادی کا پیش خیمہ ہے۔

سنیں تو آپ قناعت کے غل مچانے کو
وہ کہہ رہی ہے نہ چھوڑو غریب خانے کو
تمہاری حرص بدل کر تمہیں کرے گی ہلاک
تمہارا صبر بدل دے گا اس زمانے کو

(کلیات اکبرؔ)

ڈاکٹر خواجہ زکریا اخلاقیات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں ۔
تمام اخلاقیات کی بنیاد یہ ہے کہ میں کسی کے ساتھ ایسا سلوک نہ کروں کہ وہی سلوک مجھ سے کیا جائے تو مجھے تکلیف پہنچے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ میں دوسروں کی جان، ملکیت اور رائے وغیرہ کا احترام کروں اور دوسرے میرا خیال رکھیں ۔ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو ہم محفوظ رہ سکتے ہیں اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے اگر ہم حسد، لالچ، کینہ، بددیانتی وغیرہ کو ترک کر دیں اور قناعت کی زندگی بسر کریں ۔ زیادہ خواہشات نہ رکھیں تاکہ دوسروں کی اشیاء کا احترام کر سکیں ۔ اکبرؔ نے اخلاقیات کے ان اصولوں کا بہت پر چار کیا۔

اکبرؔ نے جس اخلاقیات کی تعلیم دی ہے۔ ہر مذہب میں اسکو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ قوم یقینا اکبرؔ کو مصلح شاعر اور انسان دوست شاعر

کی حیثیت سے مانتی ہے۔ مگر ان کو زندئہ جاوید بنانے میں ان کے دل کی دھڑکنیں شامل ہیں ۔ جنہیں ہر صاحب دل اور صاحب احساس ان کی رباعیوں اور قطعات میں سن سکتا ہے۔

بقول پروفیسر طیب انصاری !

دراصل ان کی نظر تہذیب کے بکھرتے ہوئے شیرازے پر تھی اور وہ تیزی سے عام ہوتی ہوئی ابن الوقتی کو دیکھ کہ کڑھ رہے تھے۔ وہ غالب کی طرح نہ دنیا کو بازیچہ اطفال سمجھتے تھے اور نہ ہی سرسید احمد خان کی طرح ہواکے رخ پر چلنے کو تیار تھے۔ بلکہ اکبر ؔکے نزدیک ایک اعلیٰ و ارفع مقصد کے حصول کا وسیع و بسیط میدان ہے اور جہاں اعلیٰ و ادنیٰ، نیک و بد اور صداقت و گمراہی ، دست و گریباں ہیں ۔ وہ خود ہمیشہ زندگی کے اس ہنگامے میں اعلیٰ نیک اور صداقت کے نقیب و علمبردار بن کر زندہ رہے اور ان ہی قدروں کے تحفظ و بقا و ترقی کے لیے انہوں نے قلم بھی اٹھایا۔

اکبرؔ کو ہم اردو کا ایک ممتاز انسان دوست شاعر تسلیم کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھیں گے اگر ہم ان کے کلام کے اس حصہ پر نظر ڈالیں جہاں وہ انسانی عظمت کے قائل نظر آتے ہیں اور انسان کو کائنات کا مرکز قرار دیتے ہیں ۔ وہ ابو الوقت ہیں اور وقت کو اپنے ساتھ لے کر چلنے کے قائل ہیں ۔ ان کے نزدیک سب سے بڑی قوت انسان کا ارادہ ہے اور سب سے بڑی حقیقت اسکی قوت تسخیر ہے۔ ان کے نزدیک انقلاب آتا نہیں لایا جاتا ہے۔ زمانہ انسان کو نہیں بدلتا بلکہ انسان زمانے کو بدل دیتا ہے۔ جدید نظریہ حیات جس میں فطری قوتوں کے مقابلہ میں انسان کو حقیر اور کمتر سمجھتا ہے۔ اسکی ذات کی نفی اور گو ناگوں صلاحیتوں سے انکار کیا جاتا ہے۔ انسان دوست اکبرؔ اس حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں ۔

ہوس پرستوں کو کیوں یہ کد ہے ان انقلابوں کی کیا سند ہے
اگر زمانہ بدل رہا ہے بدلنے ہی کو بدل رہا ہے
عروج قومی زوال قومی خدا کی قدرت کے ہیں کرشمے
ہمیشہ رد و بدل کے اندر یہ امر پولیٹکل رہا ہے
(کلیاتِ اکبرؔ)

اکبر ؔکے ہاں مرکزی حیثیت انسان کی ہے۔ ان کے نزدیک شخصی اور اجتماعی زندگی کی سب سے بڑی قدر اسکی ابوالوقتی ہے۔

لوگ کہتے ہیں بدلتا ہے زمانہ سب کو
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل

دیتے ہیں

(کلیاتِ اکبرؔ)

علامہ اقبال اکبرؔ کی وفات پر ان کی عظمت اور انسان دوستی کا اعتراف ان کے فرزند عشرت حسین سے ان الفاظ میں کرتے ہیں ۔

ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں میں مرحوم کی شخصیت قریباً ہر حیثیت سے بے نظیر تھی۔ اسلامی ادیبوں میں تو شاید آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کی ادبیات کو اکبرؒ نصیب نہیں ہوا۔ فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بڑی بخیل ہے۔ زمانہ سینکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے جب جا کے ایک اکبرؔ اسے ہاتھ آتا ہے۔ کاش اس انسان کا معنوی فیض اس بد قسمت ملک اور اسکی بد قسمت قوم کے لیے کچھ عرصہ اور جاری رہتا ۔

شبلی نعمانی اور انسان دوستی (۱۸۵۷۔۱۹۱٤)

مولانا شبلی نعمانی کو اردو ادب میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔ انہوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی وہ تمام تر علمی اور ادبی تھا۔ اسی فضا میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی اور اسی میں ان کا ادبی ذوق و شوق پروان چڑھا۔ ان کی شہرت علمی بھی ہے اور ادبی بھی۔ شبلیؔ سرسید تحریک کے ایک مخلص علمبردار تھے۔ سرسید اور ان کے پیش نظر ایک ہی مقاصد تھے۔ وہ دونوں مسلمانوں کو پستی کی اتھاہ گہرائیوں سے نکالنے کے خواہشمند تھے۔ دراصل شبلیؔ جس دور کے نمائندہ شاعر ہیں وہ مسلمانوں کے تنزل و زوال ہی کا دور تھا۔

اختر وقار عظیم شبلیؔ کے زمانے کا نقشہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

شبلیؔ کا زمانہ ہندوستان کیا، ساری دنیا کے مسلمانوں اور دنیائے اسلام کے لیے ایک نازک زمانہ تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ استعماری قومیں ہر طرف مسلمانوں کو اپنے آ ہنی شکنجے میں کس رہی تھیں اور دنیا کے ہر حصے میں اسلامی حکومتیں رو بہ انحطاط تھیں ۔ مسلمانوں کے لیے یہ بڑی بے بسی کا زمانہ تھا۔ اقتدار ان کے ہاتھ میں نہ تھا۔ ان کے بازو شل تھے اور زبانیں گنگ۔ شبلیؒ کے حساس دل نے ان حالات سے اثرقبول کیااور انہوں نے اس دوران میں ہندوستان اور دنیائے اسلام کے مسائل پر نظمیں لکھیں جو اس عہد کے خارجی حالات اور داخلی کیفیات کی صحیح ترجمان ہیں ۔ اقتدار کی کنجی انگریز کے ہاتھ میں تھی وہ ہر بات کو اپنے مطلب کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا تھا۔ حساس شبلیؒ کے لیے یہ بات نا قابل برداشت تھی۔ متعصب انگریزوں نے ہر بات کو اپنے رنگ میں پیش کر کے اسلام

اور دنیائے اسلام کے خلاف نعرے بلند کیے تو شبلیؒ ڈھال بن کر سامنے آگئے اور انہوں نے ان الزامات کو اسلامی نقطہ نظر سے واضح کر کے سچ اور جھوٹ میں تمیز پیدا کر دی۔

انسان دوست شبلیؒ کو اسلام سے محبت اور سچائی سے پیار تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں ۱۹۱۲ء کا واقعہ کانپور بے حد نازک واقعہ تھا۔ کانپور کے محلے مچھلی بازار میں ایک مسجد کے قریب سے ایک نئی سڑک نکالنے کے لیے حکام نے مسجد کا ایک حصہ منہدم کر دیا۔ اس واقعہ سے مسلمانوں میں جوش اسلامی کا شعلہ بھڑک اٹھا۔ انہوں نے مل کر شہر میں ایک جلسہ منعقد کیااور جلسے کے بعد شرکائے جلسہ نے مسجد کی راہ لی اور اس کی منہدم دیوار کو چننا شروع کر دیا۔ حکام نے نہایت بے رحمی سے ان نہتے مسلمانوں پر جن میں بچے بھی شامل تھے گولیاں چلائیں ۔ جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ شہید ہوئے۔ اس خونی حادثے کی وجہ سے پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ اور تیزی سے پھیل گئی۔ شبلیؒ پر بھی اس واقعہ کا گہرا اثر ہوا ۔ انہوں نے کئی طرح سے درد ناک نظمیں لکھیں ۔ ان نظموں سے اس ہمدردی کا اظہار ہو رہا تھا جو انہیں شہیدان کانپور سے ہے۔ ان میں درد مندی بھی ہے اور گداز بھی اور انسان دوستی کا وہ جذبہ بھی جس کے ذریعے وہ انسانی خون کو گراں قدر قرار دیتے ہیں اور ظلم و بربریت کی ہر صورت میں مذمت کرتے ہیں ۔ شبلیؒ کی نظم " ہم کشتکان معرکہ کانپور ہیں " کے چند اشعار دیکھئے ۔جس میں شبلیؒ کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔

کل مجھ کو چند لاشہ بے جان نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خور و سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آگئی ہے منتظر نضح صور ہیں
(کلیات شبلی ،ص :۱۲۸)

شبلیؒ نے اپنی ایک اور نظم " علمائے زندانی " حادثہ کانپور کے متعلق کہی۔ جس میں بچے کھچے لوگوں اور علما کی گرفتاری کا ذکر ایک انسان دوست شاعر کی طرح بڑے دکھ اور کرب کے ساتھ کیا ہے۔

پہنائی جا رہی ہیں عالمان دین کو زنجیریں
یہ زیور سید سجاد عالی کی وراثت ہے
یہی دس بیس اگر ہیں کشتکان خنجر اندازی
تو مجھ کو سستی بازوے قاتل کی شکایت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے
(کلیات شبلی ص:۱۲۹،۱۳۰)

ایک طرف ہندوستان میں کانپور کی زمین پر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جارہی تھی اور دوسری طرف جنگ بلقان میں مسلمان مظالم کا نشانہ بن رہے تھے۔ شبلیؔ کی انسان دوستی، خلوص، محبت اور درد مندی صرف ہندوستان کے مسلمانوں تک محدود نہیں تھی۔ وہ اس وقت بھی تڑپ اٹھتے تھے جب ان کے ہم وطنوں کے خون سے ہاتھ دھوئے جارہے ہوں اور اس وقت بھی جب دنیا کے کسی حصے میں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جا رہے ہوں ۔ انسان دوست شبلیؔ کی نظر بلقان پر بھی اسی طرح پڑتی ہے جیسے کانپور پر۔ چنانچہ بلقان کے تاریخی واقعات کا جو اثر شبلیؔ کے درد مند دل نے قبول کیا اسکی منہ بولتی تصویریں ان کی وہ نظمیں ہیں جو انہوں نے جنگ بلقان سے متاثر ہو کر کہیں ۔ شبلیؔ کو انگریزوں سے نفرت اور ترکوں سے محبت ہے۔ اسلامی رشتے سے ترک ان کے بھائی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ترکوں کے دکھ میں برابر کے شریک دکھائی دیتے ہیں ۔ شبلیؔ ترکوں کی فتح کے بھی متمنی ہیں ۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق ترکوں کی فتح عالم اسلام کی فتح ہے۔ ان کی نظم " شہر آشوب اسلام" ترکوں پر ہونے والے ظلم و بر بریت کی داستان پیش کرتی ہے۔

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں گے تمہاری کھتیاں کب تک
عروس بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ پائے خاک ہونگے زرفشاں کب تک
کہاں تک لو گے ہم سے انتقام فتح ایوبی

دکھاو گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک
(کلیاتِ ، شبلی، ص :۹۸)

یورپ کی مسلمان ملکوں کے خلاف سازش اورمتحدہ کوشش سے انسان دوست شبلیؔ کو کسی مسلمان ملک میں امن نظر نہیں آرہا تھا اور جہاں تھا بھی وہاں بھی آئندہ خطرہ نظر آرہا تھا ۔ اس لیے بڑی ہمدردی اور خلوص کے ساتھ اس خطرے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی سلطنتوں سے ہوتے ہوئے انگریزوں کی نا پاک نظریں کہیں حرم شریف کے تقدس کے در پے نہ ہو جائیں ۔

بکھیرے جاتے ہیں شیرازہ اورق اسلامی
چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک
کہیں اڑ کر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئے
غبارِ کفر کی یہ بے حجابا شوخیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلیؔ اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امان شام و نجد و قُرون کب تک
(کلیات شبلیؒ، ص:۹۹)

شبلیؔ کو عربوں اور ترکوں سے بڑی محبت تھی۔ عربوں سے اس لیے کہ وہ اسلام کے پہلے معمار ہیں اور ترکوں سے اس وجہ سے کہ وہ اس زمانے میں اسلام کے ظاہری اقتدار کے نمائندے تھے۔ اسی محبت خلوص اور انسان دوستی کا نتیجہ تھا کہ ڈاکٹر انصاری کا طبی وفد جو بلقان کی جنگ میں ترکوں کی طبی امداد کے لیے گیا تھا جب واپس آیا تو شبلیؔ نے ان کے خیر مقدم میں ایک نظم "خیر مقدم ڈاکٹر انصاری" کے نام سے لکھ کر بمبئی کے جلسے میں پڑھی اور اس وفد کی دادرسی اور خلوص و محبت کی دل کھول کر داد دی۔ اس لیے کہ وہ کسی کو ترکوں کی مدد کرتا دیکھتے تو ان کا دل جھوم اٹھتا تھا۔

ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی
یہی تھا درد اسلامی یہی تھی رسم غم خواری
جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی

کہ سب اہل وطن کو چھوڑ کر پہنچے پئے یاری
تمہارا ناز اٹھائیں اہل ملت جس قدر کم ہے
کہ تم نے غازیان دین کی کی ہے ناز برداری
(کلیات شبلیؒ، ص :۹۹،۱۰۰)

آل احمد سرور شبلیؒ کی انسان دوستی کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں :

شبلیؒ کے اثر سے نئی نسل میں اپنی تہذیبی میراث کا احترام آیا اور سستی مغربیت سے بیزاری۔ انہیں کے اثر سے مسلمانوں کی سیاست میں ترقی پسند اور حریت پسند عناصرپیدا ہوئے ۔ انہیں کے اثر سے نیا نوجوان ہندوستان میں مسلمانوں کی بادشاہت کو خون کی ہولی سمجھنے کے بجائے اسے اس کے اصلی رنگ میں دیکھنے لگا۔ ان کی علمی تصانیف سے ان کے ذہن کو جلا ہوئی۔ پھر ان کی نظموں کی چاشنی نے غیر محسوس طور پر اسے کچھ سیاسی اور سماجی قدریں عطا کیں ۔ وہ انہیں کے سہارے ترکوں کے دکھ درد میں شریک ہوا۔ اسلام کی ابتدائی سادگی، خلوص اور جوش سے آشنا ہوا اور اپنے زمانے کے ہنگاموں اور معرکوں کو ایک بڑے دائرے اور سلسلے میں دیکھنے لگا۔

شبلیؒ قوم کے سچے ہمدرد، خیر خواہ اور حساس دل شاعر تھے۔ جو مسلمانوں کے تنزل اور زوال کو دیکھ کر کڑھتے تھے۔ دراصل حالیؒ اور شبلیؒ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ دونوں مسلمانوں کی پستی کی نوحہ خوانی کرتے رہے۔ اگر حالیؒ کی مسدس ایک شاہکار ہے تو شبلیؒ کی نظم " صبح امید" بھی اس سے کم نہیں ۔ شبلیؒ اس مثنوی میں قوم کو ماضی کی شاندار جھلک دکھا کر ان میں احساس ذمہ داری کو بیدار کرنا چاہتے ہیں ۔ شبلیؒ کی اس مثنوی کا ہر شعر قومی ہمدردی اور قومی درد میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی انسان دوستی انہیں قوم کو اپنی حالتِ زار کا احساس دلانے پر مجبور کرتی ہے۔

کس نیند میں سو گئی تھیں آنکھیں ؟
بیکار سی ہو گئیں تھیں آنکھیں
ادراک و خرد سے برطرف تھا
دل یا کوئی پارئہ خزف تھا؟
بیکار تھا بے نظام تھا دل
پہلو میں برائے نام تھا دل

(کلیات شبلی، ص :۳۵)

شبلیؒ بھی حالیؒ کے پہلو بہ پہلو قوم کی تعمیر نو کے سلسلے میں جہاد بالتعلیم میں مصروف تھے۔ علیگڑھ کالج، علیگڑھ ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلما کے جلسوں میں انہوں نے اپنی قومی نظمیں پیش کیں ۔ جن میں قوم کے حوصلوں کو بلند کرنے کے لیے اس کو اس کاشاندار ماضی یاد دلایا اور نئے حالات کے تقاضوں سے آگاہ کیا۔ حالیؒ کے مسدس سے متاثر ہو کر شبلیؒ نے بھی قومی مسدس " تماشائے عبرت" لکھا۔ یہ قومی نظم علامہ شبلی نعمانی نے سرسید کے قومی تھیٹرعلیگڑھ میں پر درد لہجے میں سنائی اور مسلمانوں میں احساس غیرت کو بیدار کر کے انہیں ترقی کے حصول کی ترغیب دی۔

کون تھا جس نے کیا فارس و یونان تاراج

کس کی آمد میں فدا کر دیا جیپال نے راج

کس کو کسرٰی نے دیا تخت و زر و افسر و تاج

کس کے دربار میں تاتار سے آتا تھا خراج

تجھ پہ اے قوم اثر کرتا ہے افسوں جن کا

یہ وہی تھے کہ رگوں میں ہے ترے خون جن کا

(کلیات شبلی، ص :٥٤،٥٥)

بقول عبدالقادر سروری ! ان نظموں کی وجہ سے شبلیؒ کو بھی جدید شاعری کے بانیوں میں جگہ عطا ہوئی"۔ "آل احمد سرور شبلیؒ کے بارے میں کہتے ہیں : " اگر شبلی اپنی تمام قابلیتوں کے ساتھ اردو شاعری کے لیے وقف ہو جاتے تو وہ اگر دوسرے فردوسیؒ نہیں تو پہلے اقبالؒ ضرور ثابت ہوتے"۔

شبلیؒ نے ہر موقع پر انسان دوستی کا ثبوت پیش کیا ۔ جب انگریزوں نے مسلمانوں کی نظر میں ان کے آباواجداد کو گرانے کی کوشش کی تو شبلیؒ نے اپنی شاعری میں کئی ایسے واقعات نظم کیے جن سے مسلمانوں کے دل میں ان کے آباو اجداد کی یاد تازہ ہو جائے۔ حضرت زبیرؓ کی شہادت کا واقعہ شبلیؒ نے اس مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ سچائی بھی اپنی جگہ قائم ہے اور مسلم مردوں کی توخیر چھوڑئیے عورتوں ہی کی بہادری کی ایسی مثال سامنے آتی ہے جسکی نظیر مشکل ہی سے کہیں ملے گی۔ نظم "خواتین عرب کائنات و استقلال" کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔

زخم کھا کھا کے لڑے جاتے تھے لیکن کب تک
آخر الامیر گرے خاک پہ مجروح و نزار
لاش منگوا کے جو حجاج نے دیکھی تو کہا
اس کو سولی پہ چڑھاو کہ یہ تھا قابلِ دار
لاش لٹکی رہی سولی پہ کئی دن لیکن
ان کی ماں نے نہ کیا رنج و الم کا اظہار
(کلیاتِ شبلی ،ص :۹۵)

شبلیؒ نے حضرت عمر فاروقؓ کی رحمدلی، خدمت خلق اور انسانی ہمدردی کے جذبے کو اپنی نظم میں بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ایک نظم میں ایک خاتون کی آزادانہ گستاخی پر سرور کونین رسول اللہؐ کا حکم اور عفو کا عمدہ بیان کرتے ہیں ۔ تاریخ اسلام میں ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر اور مساوات اسلام کی بہترین تصویر کشی کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی جرات و صداقت کی بہترین مثالیں بھی پیش کرتے ہیں ۔ ایک نظم " اہل بیت رسول اللہؐ کی زندگی" میں حضرت فاطمہؓ کے افلاس اور محنت و مشقت کا وہ نقشہ بیان کیا ہے کہ سرور کائنات کی بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں ۔

افلاس سے تھا سیدہ پاک کا یہ حال
گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں
چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار
گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا
(کلیات شبلی، ص :۷۱،۷۰)

دراصل انسان دوست شبلیؒ کی یہ ایسی نظمیں ہیں جو ایک سچے مسلمان کے دل میں اسلامی غیرت و حمیت اسلامی خودداری، اسلامی انصاف پسندی، جرات و صداقت اور حریت ضمیر و فکر کے لطیف

جذبات کو پیداکرکے اس کو ان انسانی فرائض کی طرف متوجہ کر دیتی ہیں جن کو وہ اپنی غفلت کی وجہ سے بھلا بیٹھا ہے۔شبلیؒ نے نظم " عدل جہانگیری" میں شہنشاہ جہانگیر کے عدل و انصاف کی وہ مثال پیش کی ہے۔ جس سے اس مغل فرمانبروا کی انسان دوستی کی بہترین عکاسی ہوتی ہے۔ چند اشعار دیکھیے۔

یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی
تھی جہانگیر کے پردہ میں شہنشاہ زمن
اب نہ وہ نور جہاں ہے نہ وہ انداز غرور
نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدئہ صبر شکن
ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع
ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن
(کلیاتِ شبلیؒ)

شبلیؒ کی ایک نظم " خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا انصاف" بھی توجہ کی طالب ہے۔ جس میں انہوں نے عمر بن عبدالعزیز جو عدل میں ثانی ابن الخطاب تھا کی انصاف پسندی اور انسان دوستی کی صفت پر روشنی ڈالی ہے۔

سپر عبد عزیز اموی
عدل میں ثانی ابن الخطاب
جب ملا تخت خلافت ان کو
ہو گیا گلشن گیتی شاداب
بیکسوں کو میں ستاوں کیونکر
مجھ کو دینا ہے قیامت میں جواب
(کلیات شبلی،ص:۹۱،۹۰)

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں ہر شخص کو رنج و الم اور شادی و مسرت کے لمحات پیش آتے رہتے ہیں ۔ لیکن شاعر کی دنیا الگ ہوتی ہے جہاں ایک معمولی سا واقعہ ایک بلائے عظیم اور ایک چھوٹا سا حادثہ آفت نا گہانی بن جاتا ہے۔ انسان دوست شبلیؒ میں احساس بہت شدید تھا۔ اس لیے رنج و الم سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے چھوٹے بھائی مہدی نے سفر آخرت اختیار کیا تو شبلیؒ کے دل پر گہری چوٹ لگی۔ آخر عمر میں ایک اور ہونہار بھائی مولوی محمد اسحاق (وکیل ہائیکورٹ) داغ مفارقت دے گئے۔ اس جان لیوا حادثہ پر ایک درد ناک مرثیہ " بربادی

خانماں شبلی" لکھا۔ جس کو پڑھ کر شبلیؔ کے درد و غم اور بھائی سے شدید محبت و الفت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جس کا ایک ایک بند دل ہلا دینے والا ہے۔

آج افسوس کہ وہ خیر تاباں بھی گیا
میری جمعیت خاطر کا وہ ساماں بھی گیا
اب وہ شیرازہ اوراق پریشاں بھی گیا
عتبہ والد مرحوم کا دربان بھی گیا
گلہ خوبی تقدیر رہا جاتا ہے
نوجوان جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے

(کلیات شبلی، ص :١٦٤)

غرض شبلیؔ کے کلام میں پیار ومحبت ، ہمدردی اورانسان دوستی کے نمونے جابجا دکھائی دیتے ہیں ۔

علامہ اقبالؒ اور انسان دوستی(١٨٧٧۔١٩٣٨)

اقبال نے جس عہد میں ہوش سنبھالا وہ بڑا یاس انگیز عہد تھا ۔ ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط تھا ۔ ایشیائی قومیں بالعموم اور مسلمان بالخصوص استعمار کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ترکوں کی عظیم اسلامی سلطنت روس کی جارحیت کا شکار ہو چکی تھی۔ اقبالؒ نے پہلی جنگ عظیم کے دوران اس عظیم سلطنت کو پارہ پارہ ہوتے دیکھا ۔ اس جنگ کے دوران اقبالؒ نے یہ بھی دیکھا کہ وہ مسلمان جن کو حرم کی پاسبانی کے لئے متحد ہو جانا چاہیے تھا ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور عربوں نے ترکوں کے خلاف اتحادیوں کا ساتھ دیا ۔ مصر، سوڈان ، الجیریا، مراکش ، بیت المقدس غرض کہ ہر جگہ مسلمان جبر و استبداد کا نشانہ بن رہے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اسلامی دنیا پر جو تاریک رات چھائی ہے اسکو کبھی صبح کی روشنی نصیب نہ ہو گی۔ ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کے ساتھ ہندوؤں کی سازشوں اور عداوتوں نے بھی مسلمانوں کا حال برا کر رکھا تھا۔ اس پر مزید یہ کہ مسلمان خود بھی آپس کی چپقلش اور کشمکش سے فارغ نہ تھے۔ عوام کی حالت ابتر تھی۔ مرعوبیت اور گریز مسلمانوں کی عادت ثانیہ بن چکے تھے۔

اگرچہ ہندوستان میں شاہ ولی اللہ نے احیاء اسلام کی تحریک کا آغاز کیا اور سرسید احمد خان ، شبلیؒ، حالیؒ ، ظفر علی خان، محمد علی جوہر نے اپنے اپنے رنگ میں قوم کو مربوط و منظم کرنے کو کوششیں کیں لیکن قوم بھی ایک غنودگی کے عالم میں تھی۔ اس خوابناک فضا میں اقبالؒ کی آواز ایسے بلند ہوئی جیسے طبل جنگ پر چوٹ پڑتی ہے۔ انہوں نے اپنے نغمئہ قلندرانہ سے فضا کو چونکا دیا۔اقبالؒ کی آواز دنیا کے

انسانوں کے لیے شرف و عزت کا پیغام لائی۔ اس نے یاسیت کو دور کرنے کے لیے سب سے پہلے عظمت انسانی کا پیغام دے کر اپنی انسان دوستی کا ثبوت پیش کیا ۔ اور ایسے مثالی انسان کا تصور پیش کیا جو اس جمود کو توڑے اور نشاۃ ثانیہ کے لیے ایسی فضا پیدا کرے جس میں امت مسلمہ کی ترقی اور سربلندی کے لیے مناسب اور ساز گار فضا میسر آسکے۔

بقول خالد علوی !

> اقبال مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا نشان ہے۔ وہ شاعر بھی ہے، مفکر بھی ہے اور حکیم بھی، تہذیب و تمدن کا نقاد بھی ہے اور محی الملۃ والدین بھی۔ وہ توقیر آدم کا مبلغ بھی ہے اور تحقیر انسانی سے درد مند بھی۔ اس کے کلام میں فکر و ذکر ہم آغوش ہیں ۔ اس کے ہاں عقل و دل کی ہم آہنگی اور استدلال و جذبات کا امتزاج بھی ہے۔

اقبالؒ کا کہنا یہ ہے کہ ہمیشہ یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ عمل اور تحرک کے تمام تر امکانات کا حامل انسان زمین پر کسی سزا کے لیے نہیں بلکہ نیابت حق کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس کی تخلیق اور شعور کے سامنے دیگر تخلیقات سرنگوں ہیں ۔ یہ زمین اسکی کار گاہ ہے۔ سب کچھ اس کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بال جبریل کی نظم " فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں " کے اشعار دیکھیے۔جس میں فرشتوں کی زبانی انسانی عظمت کی کہانی کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں کوکبی و مہ تابی
تری نوا سے ہے بے پروده زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی
(کلیات اقبال ،بال جبریل، ص:٤٦٠)

اقبالؒ جس آدم کا تصور پیش کرتے ہیں روح ارضی اس آدم کا استقبال انتہائی خوش دلی اور بے تابی کے ساتھ کررہی ہے، کائنات کی ہر چیز بادل، گھٹائیں ، گنبد افلاک، خاموش فضائیں ، کوہ، صحرا، سمندر اور یہ ہوائیں سب انسان کے تصرف میں ہیں ۔ گویا اس تمام کائنات کو آدم کے لیے سجا دیا گیا ہے۔ وہ صاحب علم و ادراک ہے۔ وہ نطشے کا خود سر

فوق ابشر نہیں ہے اور نہ ہی روایتی تصوف کا فنا گزیدہ زاہد ہے۔ بال جبریل کی نظم " روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" کے اشعار انسانی عظمت کے عکاس ہیں ۔ جس میں اقبال نے اپنے انساں کو مرکز مکاں قرار دیا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس کا مرکز و محور انسان ہے۔

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکرِ گِل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

(کلیات اقبال ، بال جبریل،ص: ٤٦١)

مذکورہ نظم کے بر عکس " طلوع اسلام" میں انسان مرکز مکاں نہیں بلکہ مرکز لا مکاں ہے۔ خودی کی صفت سے مالا مال ہونے کے باعث اسکی منزل چرخ نیلی فام سے بھی آگے ہے ۔ وہ خدا کا ہاتھ اور زبان بن جاتا ہے۔ اس کا وجود ازل اور ابدکی حدود سے بالا تر دکھائی دیتا ہے۔ " طلوع اسلام" کا یہ بند دیکھئے۔

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو ، زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تُو ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تُو ہے
مکاں فانی ، مکیں آنی ، ازل تیرا ، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو ، جاوداں تو ہے

(بانگ درا ،حصہ سوم ،ص :٢٩٩)

اقبالؔ نے اپنی شاعری میں انسانی عظمت کو جس عمدگی سے بیان کیا ہے۔ گوپی چند نارنگ اسکی تعریف اس انداز میں کرتے ہیں

اقبال کی شاعری صحیح معنوں میں نئے دور کی شاعری ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو نیا احساس، نیا لب ولہجہ، نئی ذہنی بلندی اور نیا شعور دیا ۔ اقبال کے نزدیک شاعری " شیریں دیوانگی" نہیں ، ایک اہم سماجی فریضہ ہے۔ عظیم شاعری سے عظیم پیام کی توقع کرنا غلط ہے۔ لیکن عظیم شاعری انسانی زندگی کی عظمت و منزلت کا احساس دلاتی ہے اور ان طاقتوں سے سمجھوتہ نہیں کرتی جو اسے ذلت اور گمراہی کی پستیوں کی طرف لے جاتی ہیں ۔ اقبال کی عظمت کا راز یہی ہے کہ انہوں نے پورے شاعرانہ رکھ رکھاو اور سلیقے سے ہمیں اس انسان کا عظیم الشان تصور دیا جو فطرت کا جزو ہوتے ہوئے فطرت کو بدل سکنے پر قادر ہے۔

اقبالؒ انسان کی تمام تر صلاحیتوں اور مخفی امکانات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک لائحہ عمل پیش کرتے ہیں جس پر عمل پیرا ہو کر انسان درجہ کمال کو پہنچ سکتا ہے۔ یہ لائحہ عمل خودی میں پوشیدہ ہے۔ اقبالؒ خودی کی تشریح کرتے ہوئے خودی کے تین مراحل بیان کرتے ہیں ۔ مرحلہ اول احکام الہیٰ کی اطاعت، مرحلہ دوم خودی کا ضبط نفس اور مرحلہ سوم خودی کی نہایت الہٰی۔ اقبالؒ کے اس لائحہ عمل کے مطابق کوئی بھی انسان احکام الٰہیٰ کا پابند ہو کر اور ان کو اپنی زندگی میں جاری و ساری کر کے اپنے نفس کو مغلوب کرتا ہوا انسانیت کے درجہ کمال یعنی نیابت الہیٰ کے بلند رتبے پر فائز ہوتے ہوئے اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

اقبالؒ کے نزدیک جو انسان ان مراحل کو طے کر لے وہی اقبالؒ کی نظر میں انسانی عظمت کے بلند ترین مقام پر فائز ہے اور اسے اقبال کبھی بندئہ مومن کہتے ہیں اور کبھی مرد مومن۔ اسی طرح مرد بزرگ، صاحب امروز، مومن جانباز ، صاحب لولاک، مرد حق، مرد آفاقی اور مختصر یہ کہ مرد مسلما ن۔ ضرب کلیم میں اقبال اس مر دمسلمان کی یہ عظمت اور شان بیان کرتا ہے۔

ہمسائیہ جبریل امیں بندئہ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفت سورہ رحمٰن

(ضرب کلیم

،ص:۵۴۳، ۵۴۴)

اقبالؔ تشکیل جدید کے خطبہ اول علم اور مذہبی مشاہدہ میں انسانی فضیلت و عظمت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں ۔

حقیقت کی کوئی شکل ایسی طاقتور ایسی ولولہ خیز اور حسین و جمیل نہیں ، جیسی روح انسانی۔ لہٰذا با اعتبار اپنی کنہ کے جیسا کہ قرآن پاک کا ارشاد ہے انسان ایک تخلیقی فعالیت ہے۔ انسان ہی کے حصے میں یہ سعادت آئی ہے کہ عالم کی گہری سے گہری آرزوں میں شریک ہو جو اس کے گرد و پیش موجود ہیں اور اپنی علی ہذا کائنات کی تقدیم خود متشکل کرے۔ کبھی اس کی قوتوں سے توافق پیدا کرتے ہوئے اورکبھی پوری طاقت سے کام لیتے ہوئے اپنی غرض و غایت کے مطابق ڈھال کر اس لحظہ بہ لحظہ پیش رس اور تغیرزاعمل میں اللہ بھی اس کا ساتھ دیتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ پہل انسان کی طرف سے ہو۔

اقبالؔ کے فلسفہ کی بنیاد ہی انسان ہے جس کے گرد ان کے تمام افکار گردش کرتے ہیں ۔ نظم " والدہ مرحومہ کی یاد میں " نظام کائنات میں انسان کے مقام اور اس کی عظمت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ستارے اپنی تمام تر آب و تاب ، چمک دمک اور طوالت عمر کے باوجود قدرت کے تکوینی نظام کے بے بس کارندے ہیں اور نہ جانے کب سے ایک محدود دائرے کے اندر اپنا مقررہ فرض ادا کر رہے ۔اس کے مقابلے میں انسان کے مقاصد کہیں زیادہ پاکیزہ اور اس کی نگاہ کہیں زیادہ دور رس اور وسیع ہے اور اس کی لا محدود کائنات میں اس کا مرتبہ کہیں زیادہ بلند ہے۔ نظام کائنات میں انسان کا مقام ایسا ہی ہے جیسے نظام شمسی میں سورج کا مرتبہ۔

پھر یہ انساں آں سوئے افلاک ہے
جس کی نظر
قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے
جو پاکیزہ تر
جو مثالِ شمع روشن محفل قدرت
میں ہے
آسماں اک نقطہ جس کی وسعتِ
فطرت میں ہے

(بانگ درا، حصہ
سوم، ص :۲٦۱)

انسانی عظمت کی ایک اور عمدہ مثال " انسان اور بزم قدرت" میں ملتی ہے۔ جو بانگ درا کے حصہ اول میں شامل ہے۔انسان کی ذات اور حقیقت کا بھرپور عرفان بزم قدرت کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم میں انسان کو کائنات کی افضل ترین مخلوق قرار دیتے ہوئے

اشرف المخلوقات کے منصب پر فائز کرتے ہوئے بزم قدرت کی ہر شے سے افضل قرار دیا ہے۔

انجمن حسن کی ہے تُو تری تصویر ہوں میں
عشق کا تو ہے صحیفہ تری تفسیر ہوں میں
میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے
بار جو مجھ سے نہ اٹھا وہ اٹھایا تو نے
نورِ خورشید کی محتاج ہے ہستی میری
اور بے منتِ خورشید چمک ہے تیری
(بانگ درا ،حصہ اول، ص :۸۶۔۸۷)

اقبالؔ نے اپنی نظموں میں جس خوبصورتی سے انسانی عظمت کے گیت الاپے ہیں ۔ دنیائے علم و فکر میں یہ آواز کہیں اور اس طرح سنائی نہیں دیتی۔ جگن ناتھ آزا د اس خیال کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں :

" اقبال کا کلام ایک انسان کا کلام ہے اور اسے اسی خیال سے پڑھنا لازمی ہے۔ اس کلام پر ایمان لانا ہمارے لیے ضروری نہیں بلکہ دوسرے بڑے شعرا کے کلام کی طرح ہمیں اس کے حسن و قبح کو اپنی پرکھ کی کسوٹی پر رکھ کر دیکھنے کا حق حاصل ہے۔ اس میں ہمیں غلط اندیشیاں بھی نظر آسکتی ہیں ۔ ہم بعض نظریات سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں ۔ لیکن اس فنکار کا کمال یہ ہے کہ ہم کہیں بھی کلام اقبال کی عظمت سے منکر نہیں ہو سکتے ۔ فکر اقبال میں یہ عظمت اقبال کے اس بنیادی عقیدے سے پیدا ہوئی ہے کہ انسان عظیم ہے اور جادئہ عظمت پر گامزن ہے۔ اقبالؔ کے کلام کو ہم مختصر سے مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو اسے صحیفہ عظمت آدم کے سوا اور کوئی نام نہ دے سکیں گے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی اقبالؔ کی انسان دوستی کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں :

اقبال بنیادی طور پر عظمت انسانی، انسانیت اور انسان دوستی کے شاعر ہیں ۔ ان کے تمام افکار وخیالات اسی انسان اور انسانیت کے مختلف انفرادی اور اجتماعی معاملات و مسائل کے گرد گھومتے ہیں ۔ انہوں نے ان مسائل کو سلجھانے اور

حل کرنے کا اہم کام سر انجام دیا ہے۔ ان کے فکر و فلسفہ کا بنیادی موضوع یہی انسانی معاملات و مسائل ہیں ۔ ان کے یہاں خودی کا جو تصور ملتا ہے تسخیر کائنات کے جو خیالات نظر آتے ہیں ، مرد مومن اور انسان کا مل کی جو تصویریں ابھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں ۔ ان سب کی تہہ میں انسان سے ان کی دلچسپی اور انسانیت، انسان دوستی اور انسانیت پرستی کے رجحانات و میلانات کا ہاتھ کار فرما نظر آتا ہے۔ وہ انسان سے محبت کرتے ہیں وہ اسکی عظمت کے قائل ہیں ۔

اقبالؔ وہ انسان دوست شاعر ہے جس نے پوری دیانت کے ساتھ معاشی استحصال کو محسوس کیا اور بلند ادبی سطح پر استحصالی نظام اور مغربی سامراج کے خلاف آواز بلند کی جو معاشی استحصال کا سرچشمہ ہیں ۔ انہوں نے بندئہ مزدور کو بیدار ہونے کا پیغام دیا۔ اپنی نظم " خضر راہ" میں مزدور کو خضر کی زبان سے جو بیداری کا پیغام دیا وہ ان کی مزدور دوستی کا بین ثبوت ہے۔ اقبالؔ نے سرمایہ و محنت کی کش مکش میں محنت کے موقف کی بھر پور تائید کی۔ وہ سماجی انصاف کے علمبردار تھے۔ چنانچہ کمزوروں ، مظلوموں اور محروموں کی حمایت اپنا فرض تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اسلام کا پیغام اور کائنات کا پیغام دو مختلف چیزیں نہیں ہیں ۔ حضرت خضر کا یہ پیغام دراصل انسانیت کی پکار ہے۔

بندہ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دوست آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

(بانگ درا ،حصہ سوم، ص:۲۹۱)

نظم "شمع و شاعر" میں بھی اقبالؔ " دہقاں " سے مخاطب ہو کر اسے اپنی حقیقت سے آشنا ہونے کی تلقین کرتا ہے کہ تو دانہ، کھیتی، باراں ، رہبر اور منزل سب کچھ ہے۔ اشعار دیکھئے جس میں اقبالؔ کی انسان دوستی نمایاں ہے۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی

تو، حاصل بھی تو
آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو ، منزل بھی تو
(بانگ درا ،حصہ سوم،ص :۲۱۹)

"ثاقب رزی" انسان دوست اقبالؔ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں :

اقبال اپنے عہد کا پہلا فلسفی شاعر تھا جس نے اپنی شاعری میں لا طبقاتی معاشرے کا تفصیلی خاکہ پیش کیا۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال ختم ہو جاتا ہے اور انسانیت کے سامنے خوشحالی نیکی اور امن کے راستے کھل جاتے ہیں ۔ اقبالؔ نے نہ صرف "ہست" یعنی اپنے عہد کے معاشرے پر تنقید کی بلکہ "بائست" یعنی آئندہ مثالی معاشرے کا خواب بھی دیکھا۔ ایک لا طبقاتی معاشرے کا تفصیلی خاکہ پیش کرنا اقبالؔ کی عظیم انسانی دوستی کا پتہ دیتا ہے۔

اقبالؔ کو بلا شبہ مزدوروں ، کسانوں ، مجبوروں ، محروموں اور مظلوموں کے ساتھ ہمدردی ہے۔ اسی ہمدردی ، محبت اور انسان دوستی کا نتیجہ ہے کہ وہ دنیا سے سرمایہ داروں ، زمینداروں ، جابروں ، دولت مندوں اور ظالموں کے استبدادو استحصال کا خاتمہ چاہتے ہیں اور مزدوروں کی حمایت میں ایسی آواز بلند کرتے ہیں جسکی باز گشت رہتی دنیا تک سنائی دیتی ہے۔"فرمان خدا" جیسی زور دار نظم کسی اور انسان دوست کے قلم سے نہیں نکلی۔

اٹھو ! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشئہ گندم کو جلا دو
(بال جبریل ،ص :٤٣٨)

اقبالؔ کی غریبوں کے ساتھ ہمدردی اور انسان دوستی دیکھ کر " ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی " اقبالؔ کی کتاب علم الاقتصاد " کے مطالعے سے بھی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ

یہ نوجوان شاعر و مفکر اپنے اہل وطن کے افلاس و غربت کا شدید احساس رکھتا ہے اور وہ معاشی خوشحالی کو اہل وطن کی اخلاقی و تمدنی ترقی کی ناگزیر شرط قرار دیتا ہے۔ مصنف لکھتا ہے " غریبی قوائے انسانی پر بہت برا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینے کو اس قدر زنگ آلود کر دتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اسکا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے---- اپنی موجودہ اقتصادی حالت کو سنوارنا ہماری تمام بیماریوں کا آخری نسخہ ہے اور اگر یہ نسخہ استعمال نہ کیا گیا تو ہماری بر بادی یقینی ہے۔

اقبالؔ میں روا داری اور وسیع المشربی کی خوبی موجود تھی۔ نہ کسی طاقتور کی خوشامد کی اور نہ کسی مسلمان کی بے جا تعریف کہ وہ مسلمان ہے۔ بلکہ حق بات اور سچ بات کہنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے۔ ایک طرف حافظ اور محی الدین ابن عربی پرتنقید کرتے ہیں اور دوسری طرف گو تم، نانک اور رام کی تعریف کرتے ہیں ۔ دراصل وہ جغرافیائی حد بندی کے خلاف ہیں جہاں انسانیت کو تقسیم کر دیا جائے۔ ان کے نزدیک دنیا کا ہر شخص قابل احترام اور قابل محترم ہے۔ اپنے متعلق ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہء مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

(کلیاتِ اقبال)

اقبالؔ انسان دوستی کا پیغام دیتے ہوئے ملک و ملت کے تفرقے اور طبقاتی تفریق کو ختم کرنا چاہتے ہیں ۔ انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنانا چاہتے ہیں ۔ وہ انسانیت میں اتحا دو اتفاق ، اخوت و محبت کا پیغام عام کرنا چاہتے ہیں ۔ وہ انسانیت جو قومی، نسلی اور ملکی تفریق کے باعث زخموں سے چور ہے۔ انہیں اخوت کا بیان ہونے ، محبت کی زبان

ہونے اور اچھل کر بیکراں ہو جانے کا پیام دے کر ان کے زخموں کو بھرنے کا پیام عام کرتے ہیں ۔ نظم " طلوع اسلام کے اشعار دیکھئے۔

ہوس نے کر دیا ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کربے کراں ہو جا
غبار آلودہ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم! اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
(بانگ درا حصہ سوم ،ص : ۳۰٤)

اقبالؔ ساری دنیا میں محبت کی شمع روشن کرنا چاہتے ہیں ۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ پیار و محبت کے ساتھ پیش آنے کی تلقین کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کا سبق دیتے ہیں ۔کیونکہ انسانیت کی معراج اسی انسان دوستی کے رشتے کو استوار کرنے ہی میں ہے۔ بانگ درا میں نظم "شاعر" میں اقبال جذبہ ہمدردی کو خوبصورت رنگ میں پیش کرتے ہیں ۔

قوم گویا جسم ہے ، افراد ہیں اعضائے قوم
منزل صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفل نظم حکومت چہرہ زیبائے قوم
شاعر رنگیں نوا ہے دیدہ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ
(بانگ درا، حصہ اول، ص :۹۳)

اقبالؔ غلامی کو خواہ وہ کسی شکل میں ہو نوع انسان کے لیے سب سے بڑی لعنت سمجھتے ہیں اور ہر فرد کو آزاد دیکھنے کے متمنی ہیں ۔ کیونکہ محکوم قوموں میں نئے حقائق منکشف کرنے، نئے علوم و فنون

حاصل کرنے اور نئے آلاتِ تسخیر ایجاد کرنے کا وہ ذوق و شوق نہیں ہو تا جو آزاد فرد اور قوموں کا خاصہ ہے۔ محکوم کا مذہب تقلید پر مبنی اور دلی آرزو اغیار سے مستعار لی ہوتی ہے۔ جبکہ آزادوں کا مذہب ایمان و یقین کی وہ قوت ہے جو اسے کسی غیر کے آگے جھکنا نہیں سکھاتی۔ انسان دوست اقبالؒ ان نادان انسانوں کو جو اپنی غلامی پر مطمئن ہیں آزادی کا پیغام دیتے ہوئے غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا درس دیتے ہیں ۔ نظم " ہندی مکتب" کے اشعار دیکھئے۔

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیام ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتار خرافات
(ضرب کلیم ،ص :۵۹۱)

ڈاکٹر بشیر سیفی اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار یو ں کرتے ہیں ۔"اقبال کی شاعری میں انسان دوستی اور حب الوطنی بھی ہے اور سامراج دشمنی اور آزادی کی تڑپ بھی"۔

اقبالؒ کی انسان دوستی اس بات کی متقاضی ہے کہ قوم و وطن کے تنگ اور محدود دائرہ سے نکال کر نسل انسانی کو اخوت کی لڑی میں پرو دیا جائے۔ اقبالؒ اس بات پر حیران تھے کہ مغرب انسان دوستی کا نعرہ بلند کرتا ہے لیکن اسکا وجود سرتاپا انسان دشمنی پر مبنی ہے۔ خاص طور پہ اس نے قوم پرستی کا جو تصور دنیا کے انسانوں کو ٹکڑوں میں بانٹنے کے لیے پیش کیا وہ انسانیت کے لیے بے انتہا خطر ناک ہے۔ قوم پرستی کا سب سے بڑا نقصان مسلم ممالک کو ہوا جو اسلام کے انسان دوستی کے تصور کے تحت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ اور قوم پرستی نے ان کو رنگ وخون اور جغرافیائی سرحدوں کی دیواریں کھڑی کر کے الگ کر دیا ۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے قوم پرستی سے اقبال کے انحراف کو یوں بیان کیا ہے۔

> اقبال نے ہر قسم کی قوم پرستی کی مذمت کی اورایک قوم کی طرف دوسری قوم پر بے انصافی کی تمام برائیوں کے لیے اور ان جنگوں کے لیے جو بے گناہوں اور کمزوروں پر اس قدر تباہی لاتی ہیں قوم پرستی ہی کو ملزم قرار دیا ۔ ان تمام باطل خداوں میں سے جن کی انسان نے کبھی پرستش کی ہے۔ اقبال نے قوم پرستی کو جو وطن پرستی کی جدید

تعقل سے پیداہوئی ہے سب سے زیادہ تباہ کن اور مذہب کے منافی بتایا ۔ انہوں نے کہا کہ قوم پرستی اور اسلام متناقض ہیں ۔ ایک مسلمان تہ دل سے قوم پرست نہیں ہو سکتا۔

اقبالؒ نے ۱۹۳۵میں اپنے پیغام میں دنیا کو انسان دوستی کی طرف بلایا اور قومیت کی ہلاکت خیزیاں یاد دلائیں ۔

وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے۔ جو نسل و زبان و رنگ سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت اس نا پاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے "الخلق عیال اللہ" کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا۔ جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا۔ اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندئہ معنی نہ ہو نگے۔

وطنیت کے مغربی تصور کے خلاف اقبالؒ کا احتجاج ان کے سارے کلام میں جاری و ساری ہے۔بانگ درا میں اقبال نے "وطنیت " کے عنوان سے جو نظم لکھی اس میں وطنی قومیت کے نظریہ کو انسانیت اور اسلام کے خلاف سمجھتے ہوئے بڑی سختی سے رد کیا ہے۔ اپنی نظم "وطنیت" میں اسکی خامیوں کی نشاندہی یوں کرتے ہیں۔

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

(بانگ درا، حصہ سوم ،ص :۱۸۸)

اقبالؒ کی نگاہ فرنگی تہذیب کی بنیادی کمزوریوں اور اس فساد تک پہنچ چکی تھی جو اسکی سرشت اور اسکی وطنیت میں موجود تھا۔ انہوں نے فساد قلب و نظر کو اس تہذیب کی روح کی ناپاکی کا ثمر قرار دیا ہے۔ جس نے اس سے قلب سلیم کی دولت چھین لی۔ ان کے نزدیک لا دینی تہذیب کی اساس ہی دین و اخلاق کی دائمی دشمنی پر ہے۔اس تہذیب کا

شعار انسانیت کی تباہی و بربادی اور نوع انسانی کی ہلاکت ہے۔ مغربی تہذیب کے ہوتے ہوئے دنیا میں امن و اطمینان اور پاک محبت کا قیام عمل میں لانا ممکن نہیں جو انسان دوستی کی بنیادی اقدار ہیں ۔ اگرچہ یہ تہذیب اپنی طبعی موت نہیں مر سکتی تو اپنے ہی خنجر سے خود کشی کرے گی اور شاخ نازک پر بنایا ہوا آشیانہ ضرور ناپائدار ہوگا۔ اسکی بلوریں دیوراایں حالات و حوادث کے سنگین حملوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہیں۔ اگرچہ یہ تہذیب آنکھوں کو چندھا رہی ہے لیکن اس میں کوئی موسٰی نہیں جو خدائی کلام و الہام سے مشرف ہوتا اور نہ کوئی ابراہیمؑ ہے جو بت شکن بنتا اور آگ کو گلزار بنا دیتا۔ اس تہذیب میں ایک طرف عقل پروان چڑھتی ہے تو دوسری طرف انسانی جذبات دم توڑتے ہیں ۔

یورپ میں علم و ہنر کی روشنی تو ہے۔ مگر بحر ظلمات چشمہ حیواں نہیں ۔ ایک طرف مغربی قائدین بنی آدم کا خون پیتے ہیں تو دوسری طرف انسانی مساوات اور عدل و انصاف کا علم بلند کرتے ہیں ۔ بیکاری، عریانی، افلاس اور مے نوشی فرنگی مدنیت کی فتوحات ہیں ۔ جو قوم فیضان سماوی سے محروم ہوتی ہے اسکے کمالات کی حد اور اسکا مبلغ علم برق وبخارات سے آگے نہیں ہوتا۔ جس تہذیب میں مشینوں کی حکومت ہو صنعت وفروخت کی بادشاہی ہو اور انہی کا سکہ جلتا ہو اس میں دلوں کی موت، احساس مروت اور انسانی شرف کی ہلاکت یقینی ہے۔ اس لیے انسان دوست اقبالؔ قوم کو اس مغربی تہذیب سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں جو منافقت کا شکار ہے۔

نظم "لینن (خدا کے حضور میں) کے اشعار دیکھیے۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیوان ہے یہ ظلمات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

(بال جبریل، ص: ۴۳۴-۴۳۵)

پروفیسر محمد منور مغربی تہذیب کا اصل چہرہ دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ"علامہ اقبال یورپ کو شیطان کی کار گاہ اسی لیے کہتے ہیں کہ یورپ نے مادہ پرستی کے نظریات کو فروغ دے کر اور چھینا جھپٹی

کو تہذیب و تمدن کی علامت بنا کر پارے عالم انسانیت کو بنیادی قدروں سے محروم کر دینے میں بڑا پر زور کردار ادا کیا ہے"۔

غرض اقبالؔ کی انسان دوستی اور ہمدردی ان کے سارے کلام میں موجود ہے۔ جس کی آواز دنیا کے ہر انسان دوست کو ہر دور میں سنائی دیتی رہے گی۔

ڈاکٹر سلیم اختر اقبالؔ کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں ۔

> اقبال خواب دیکھنے والا تھا اور مستقبل بیں بھی۔ اس کے خواب بسیط بھی تھے اور لا محدود بھی، وہ نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کا شعر مسلمانوں کی وحدت کا خواب دیکھتا ہو یا مسلمانان ہند کے لیے الگ مملکت کا ، وہ کشت ویراں کے لیے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے کی صورت میں ساقی کا خواب دیکھے یا فاطمہ بنت عبداللہ کی تربت خاموش میں ایک قوم تازہ کے پلنے کا وہ ہر حال میں اقبالؔ رہتا ہے۔ وہ شاعر جو بحیثیت فرد خود کو اپنی ذات کی سطح سے جب بلند کرتا ہے تو اسکا رخش فکر ستاروں کو گرد راہ بناتا ہوا تسخیر کے لیے ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں کا نعرہ لگاتا ہے۔

خوشی محمد ناظر اور انسان دوستی (۱۹۴۴۔۱۸۴۹)

خوشی محمد ناظر کو معاصرین اقبال میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہ حالیؔ کی اصلاحی شاعری کی تحریک سے نہ صرف متاثرتھے بلکہ ان سے اصلاح شعر و سخن بھی لیتے رہے۔ ان کی شاعری میں انسان دوستی کے ساتھ ساتھ نیچرل اور قومی نوعیت کے موضوعات کا رنگ غالب دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے مناظر فطرت میں ڈوب کر شاعری کی ہے۔ اور یوں فطرت کے حسین اور دلفریب منظر کی تصویر کشی عمدہ پیرائے میں کرتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں فردوس زمین، شمشاد چنادر، کانگڑی اور جوگی وغیرہ قابل توجہ ہیں ۔ ان کی فطرت نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالوحید لکھتے ہیں ۔" ایک طرف تو شاعر کو قدرت کے ان خوبصورت مناظر سے انتہائی شگفتگی ہے اور دوسری طرف اس نے اپنے عینی مشاہدات کو اس قدر دل کش انداز میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا محو ہو جاتا ہے۔"

ناظرؔ کی شاعری میں نظم "جوگی" کو منفرد مقام حاصل ہے۔ اس نظم کے ذریعے ناظرؔ کا نظریہ انسان دوستی کھل کر سامنے آتا ہے۔ ایک طرف وہ فطرت کی رنگینیوں کا بیان کرتا ہے اور جوگی کا حلیہ پیش کرتا ہے ۔

جبکہ دوسری طرف وہ جوگی کا فکر و فلسفہ بڑے خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہوئے اپنی انسان دوستی کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ نظم "جوگی" کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔ جس میں شاعر جوگی کی زبانی دنیا کے لوگوں کاآصل چہرہ دکھاتا ہے۔ جو حرص و ہوا کا شکار ہیں ۔ دراصل اس حرص وہوا کے باعث معاشرے کا امن وامان برباد ہو رہا ہے اور انسان دوستی کی فضا معدوم ہو رہی ہے جس کا ناظرؔ کو بے حد دکھ ہے۔

ہے حرص و ہوا کا دھیان تمہیں اور یاد نہیں بھگوان تمہیں
سل پتھر ، اینٹ ، مکان تمہیں دیتے ہیں یہ راہ بھلا بابا
پرماتما کی وہ چاہ نہیں اور روح کو دل میں راہ نہیں
ہر بات میں اپنے مطلب کا تم گھڑ لیتے ہو خدا بابا
تن من کو دھن میں لگاتے ہو ، ہر نام کو دل سے بھلاتے ہو
ماٹی میں لعل گنواتے ہو ، تم بندہ حرص و ہوا بابا!

(نغمہ فردوس،ص :٦-٧)

نظم کے دوسرے حصے میں ترانہ وحدت میں ناظرؔ جوگی کی تعلیمات سے متاثر ہو کر دنیا کے فریب اور دھوکے سے منہ موڑ کر جب جنگل کی راہ لیتا ہے تو جوگی سے عرض حال کی صورت میں اپنے دکھ اور درد کو یوں بیان کرتا ہے کہ اب دنیا دشت بلا کی آماجگاہ بن چکی ہے۔ رشتہ الفت ٹوٹ چکا ہے ہر طرف ویرانی اور آہ و بکا کی پکار سنائی دے رہی ہے۔ انسانیت کی اعلٰی قدریں دم توڑ چکی ہیں ۔ نظم "جوگی" کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔

کل رشک چمن تھی خاک وطن ہے آج وہ دشت بلا جوگی
وہ رشتہ الفت ٹوٹ گیا ، گوئی شمہ لگا نہ رہا جوگی
برباد بہت سے گھرانے ہوئے ، آباد ہیں بندی خانے ہوئے
شہروں میں ہے شور بپا جوگی ، گاوں میں ہے آہ و بکا جوگی
وہ جوش جنوں کے دور ہوئے ، انسان ڈنگر ڈھور ہوئے
بچوں کا قتل روا جوگی ، بوڑھوں کا ہے خون بہا جوگی

(نغمہ فردوس
،ص : ۹،۱۰)

ناظرؔ نے اپنی نظم "جوگی" میں اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اخلاقی مسائل کا بیان عمدہ پیرائے میں کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں انسان دوستی، ہمدردی، اتحاد و اتفاق کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ وہ مذہبی تفریق کے بغیر سب کو ایک ہی لڑی میں پروتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

کوئی ہندی ہو کہ حجازی ہو ، کوئی ترکی ہو یا تازی ہو
جب نیرپیا اک ماتا کا سب ایک گھرانے والے ہیں
سب ایک ہی گت پر ناچیں گے ، سب ایک ہی راگ الاپیں گے
کل شیام گھنیا پھر بن میں مرلی کو بجانے والے ہیں
اپنوں کے مٹانے والوں کو کل غیر مٹانے والے ہیں

(نغمہ فردوس، ص:۱۰)

نظم " جوگی" پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں ۔ " قبول عام کی سند حاصل کرنے میں حالیؔ کا "مسدس" اقبالؔ کا " شکوہ" اور ناظرؔ کی "جوگی" کم و بیش برابر تھے۔اس نظم کی مقبولیت میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کوئی کمی نہیں آئی بلکہ آج تک قائم و دائم ہے۔ بقول ڈاکٹر سہیل احمد خان! "یہ نظم ایک خاص طرز احساس کی علامت بن گئی ہے اور ہمارے ادبی شعور کی تاریخ میں اس کا ایک اہم حصہ ہے۔

ناظرؔ کے ہاں منظر فطرت کے ساتھ ساتھ مولانا آزادؔ اور حالیؔ کے رنگ خاص میں قومی اور اصلاحی نظمیں بھی ملتی ہیں ۔ ان کے ہاں بدلتے ہوئے حالات سے سبق سیکھنے اور مسلسل آگے بڑھنے کا رجحان ملتا ہے۔ وہ حرکت و عمل اور جہد مسلسل کا پیغام عام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ ان کے ہاں علم دوستی ، انسان دوستی اور قومی ترقی کا رنگ علیگڑھ، سرسید، مولانا حالی اور ان کے افکار سے منسلک دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس تحریک اور ادارے سے بہت سی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں ۔

علیگڑھ ایک بھٹی ہے کہ جو اس میں سے نکلے گا
پرکھتے جاو گے جتنا وہ اتنا ہی کھرا ہوگا
پھر اے خاک حرم کوئی خلیل اللہ

پیدا کر
کہ جس کا خون یغما قوم کا حاجت
روا ہو گا
(نغمہ فردوس،
ص:۱۹)

انسان دوست ناظرؔ کے ہاں اخلاق و کردار کا اعلیٰ رنگ دکھائی دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ عشق کے روایتی تصور کے خلاف آواز بغاوت بلند کرتے ہیں اور نوجوانان قوم کو اس کے مضر اثرات سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں اور انہیں با عمل اور با کردار بننے کا درس دیتے ہیں ۔ نظم " درس عشق" کے اشعار دیکھئے۔

جس کو دیکھا ہے جنوں کا پائے بند
اور قید عقل سے آزاد ہے
سر میں شیخ و شاب کے ہے شورِ عشق
کچھ مزاجوں کی یہی افتاد ہے
(نغمہ فردوس،
ص :۲۳)

ناظرؔ کے ہاں عورتوں سے ہمدردی اور محبت کا رنگ موجود ہے۔ وہ عورتوں میں وہ تمام خوبیاں دیکھنے کے متمنی ہیں جو ایک رہبر قوم ، رہنما یا معلم میں ہو سکتی ہیں ۔ نظم "خواتین سے خطاب" کے اشعار دیکھئے جس میں عورتوں کے فرائض وفضائل پر خوبصورتی سے روشنی ڈالتے ہیں ۔

تیرے دل کا آئینہ ، گرد کدورت سے ہو صاف
گو غبار آلود رنگ چرخ زنگاری رہے
تیرے جوئے شیر سے پیدا ہوں ایسے کوہکن
شوق جانبازی کا جن سے سلسلہ جاری رہے
نیند کے ماتوں کو اس خواب گراں سے تو جگا
تیری بیداری سے اک عالم میں بیداری رہے
(نغمہ فردوس،
ص :۲۳)

ناظرؔ کی نظم "انقلاب" ان کی انسان دوستی کی بہترین عکاس ہے۔ جس میں وہ ایک پر امن، خوشحال اور باعمل معاشرے کے قیام کی پیش گوئی کرتے ہیں ۔

تو لے جائیں گے ترازو میں شکم کے خیر و شر
طرفہ معیار صواب و ناصواب آنے کو ہے
دل کہ شمع طور تھا بے نور ہو جانے کو ہے
جوہر تیغ زباں میں آب و تاب آنے کو ہے
(نغمہ فردوس
ص :٦٢)

ناظرؔ نے اپنی شاعری میں حریت فکر، آزادی اخوت اور اسلامی بھائی چارے اور معاشرتی نظام میں تبدیلی کا پیغام دیتے ہوئے دراصل انسان دوستی کا پیغام عام کیا ہے۔ نظم "سرودِ افلاک" میں جذبہ آزادی کی بیداری کو یوں بیاں کیا ہے۔

خدا کی عادت رہی سدا لا یغیر اللہ ما بقوم
مگر بدلتی رہی ہیں قومیں عمل کی پاداش اپنے پا کر
یہ بحر ملاح کے تھپیڑے ڈبوتے ہیں غافلوں کے بیڑے
ہیں پہنچے ساحل پر اہلِ ہمت طلب کے چپو چلا چلا کر
(نغمہ فردوس،
ص :١٠٦)

حقیقت یہ ہے کہ ناظرؔ کے ہاں انسان دوستی کا گہرا رنگ دکھائی دیتا ہے۔

مولانا ظفر علی خان اور انسان دوستی (١٩٥٦۔١٨٧٣)

انسان دوست مولانا ظفر علی خان کو قدرت نے ایک درد مند دل عطا کیا تھا۔ انہوں نے پر آشوب زمانے کے پیچ وخم کو خوب دیکھا تھا۔ حالیؔ اور سرسید نے جس بحرانی کیفیت کو دور کرنے کی کوشش کی تھی وہ ان کی نگاہ میں کماحقہ موجود تھی۔ قنوطیت پسند سماج اور زوال پذیر معاشرے کی پوری زندگی کا عکس انکی نگاہوں میں تھا۔
بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار!

ظفر علی خان برعظیم جنوبی ایشیا کی ان چند عظیم المرتبت ہستیوں اور ہمہ گیر شخصیتوں میں سے ہیں جنہوں نے اس خطہ ارضی کی تاریخ کے ایک نازک ترین دور میں آنکھ کھولی۔ زندگی کے ہنگاموں میں بھر پور حصہ لیا اور اپنے خون جگر سے اپنے عہد کی داستان خونچکاں میں

رنگِ عمل بھرا۔ ظفر علی خان ایک فرد نہیں تھے بلکہ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے۔ ایک قوم مجبور و محکوم قوم کے رہنما اور ایک عہد کی تاریخ تھے۔ان کی ذات میں سینکڑوں ہنگاموں نے پرورش پائی۔ بیسیوں تحریکوں نے جنم لیا اور جہاد آزادی کو منزل مراد تک پہنچایا۔

حالیؔ کی بالواسطہ اور شبلیؔ کی بلاواسطہ رہنمائی نے ان کی ذاتی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں بھر پور کردارادا کیا اور انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ذہنوں کی آبیاری کی اور دوسروں کو ہمت و حوصلے اور انسان دوستی کا پیغام بھی دیا۔ظفرؔ کی شاعری توکل و رضا کی شاعری ہے۔ جو مصیبتوں میں شکر اور بلاوں میں توکل کا درس دیتی ہے اور ہار جیت کا فیصلہ خدا پر چھوڑنا سیکھاتی ہے۔ کیونکہ رضائے الہیٰ پر راضی رہنا اطمینان قلب کی دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ اسی لیے ظفر کہتے ہیں

اس کی بھی ہے وہی رضا جو ہے رضائے کرد گار
مطمئن اس کا قلب ہے جیت میں اور ہار میں
(کلیات ِ ظفر)

مولانا ظفر علی خان تحریک پاکستان کے وہ نامور فرد تھے جنہوں نے برصغیر سے برطانوی سامراج کے انخلا اور تحریک آزادی میں عملی طور پر حصہ لیا۔ وہ اپنے اخبار زمیندار کے ذریعے بالخصوص مسلمانان ہند اور بالعموم مسلمانان عالم کی نمائندگی کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی تحریر و تقریر سے ماحول کو گرمایا اور ملت اسلامیہ کے دل میں آزادی کی چنگاری پیدا کی۔ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے ملت اسلامیہ کے شاندار ماضی کا احساس پیدا کیا۔ حال کے زوال اور شکست سے بیزاری پیدا کی اور ایک شاندار مستقبل کی جھلک دکھائی ۔ نظم "پردہ استقبال کی چھننی ہوئی روشنی" کے اشعار دیکھئے۔

کوئی دن جاتا ہے پیدا ہوگی اک دنیا نئی
خون مسلم صرف تعمیر جہاں ہو جائے گا
بجلیاں غیرت کی تڑپیں گی فضائے قدس میں
حق عیاں ہو جائے گا باطل نہاں ہو جائے گا
ہم کو سودا ہے غلامی کا کہ آزادی کی دھن
چند ہی دن میں ہمارا امتحاں ہو

جائے گا

(کلیات ظفر ، چمنستان، ص :۱۰۵)

ظفرؔ کے نزدیک فلسفہ حیات یہی ہے کہ مسلمان کا جینا اور مرنا صرف اسلام کے لیے ہو۔ فرزندان توحید کی یہی روش ہونی چاہیے کہ ان کا سر خدا کے سر کشوں کے سامنے نہ جھکے اور انکا وجود ستم زدوں کی ڈھال بن جائے۔ وہ ہر جگہ محبت اور انسان دوستی کی شمع روشن کرتے رہیں ۔

دیر سے کٹ حرم سے جڑ ایک خدا سے لو لگا
قصہ حبل کا پاک کر، توڑ طلسم لات کا
روزہ بھی ہو نماز بھی حج بھی ہو اور زکات بھی
لب لباب ہے یہی فلسفہء حیات

(کلیات ظفر علی خان،نگارستان، ص :۱۸۸)

ظفرؔ ان مسلمانوں کی منافقت کا پردہ چاک کرتے ہیں جو بظاہر کلمہ تو پڑھتے ہیں لیکن مسلمانوں کے خلاف سیاسی غیر مسلم جماعتوں میں حصہ لیکر مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے ہیں ۔ اسی لیے ہندو کی گہری دشمنی اور مسلمانوں کی ناعاقبت اندیشی کے فلسفے کو نظم "عید الفطر" میں یو ں بیان کرتے ہیں ۔

کاٹ کر پیپل کی شاخیں شیخ جی خوش ہو گئے
یہ نہیں سوچا کہ ہیں اس کی جڑیں پاتال میں
سب سے بڑھ کر ہے انہی کو دشمنی اسلام سے
آج ہے جن کا شمار اقطاب اور ابدال میں
صورت آدم کی مگر سیرت میں رشک اہر من
نام کو انساں مگر ابلیس ہیں اعمال میں

(کلیات ظفر علی خان ، بہار ستان، ص :٤٥٥)

ظفرؔ مصائب کا مقابلہ ڈٹ کر کرنے کی تلقین کرتے ہیں ۔ اور انسان کی صورت اور سیرت میں یکسانیت پر بھر پور زور دیتے ہیں ۔ ان کی

انسان دوستی کا اظہار نظم صورت و سیرت "کے اشعار سے بخوبی ہوتا ہے۔

تمہیں صورت پہ غرّہ ہے ، مجھے
سیرت پہ نازش ہے
تمہیں پروا ہے دنیا کی ، مجھے
ہے فکر عقبیٰ کی
کسی کے کام آنے کی اگر توفیق
ہے مجھ میں
ہے تخصیص اس سعادت میں آبا
کی نہ آقا کی
دلوں کو بندہ پرور دیکھئے کالے
ہوں یا گورے
کہ یوں تو آپ بھی خاکی ہیں اور
بندہ بھی ہے خاکی
(بہار ستان ،ص
:٤٤٢)

ظفرؔ زندگی کے معاشی مسائل اور ان کے حل کیطرف بھی توجہ دیتے ہیں ۔ وہ کلیسائی نظام کی مخالفت کرتے ہیں ۔ جو محتاج کو محتاج اور غنی کو غنی تر بنانے میں مدد گار ثابت ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کا معاشرتی نظام غریبوں کو فقط تسلی کی افیون نہیں کھلاتا بلکہ اقتصادی نظام کے اصول پیش کر کے مسلمانوں کی معاشی نا ہمواریوں اور مسائل کا حل زکوٰۃ اور تجارت کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ اسلام سرمایہ داری کے خلاف ہے اور مزدور کو اس کا حق دینا اسلام کا بنادی نقطہ نظر ہے۔ نظم "الکا سب حبیب اللہ" جن میں سرمایہ اور محنت کی بحث جاری ہے کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔

سرمایہ نے یوں جب دون کی لی محنت نے
چمک کر اس سے کہا
اس وقت تو بیشک گردش میں ہم فاقہ کشوں کا
ستارا ہے
لیکن تجھے اس کی بھی ہے خبر تو نے نہ سنا
اب تک ہو تو سن
تقدیر پلٹتی رہتی ہے تقدیر کا رنگ نیارا ہے
جس ڈھلتی پھرتی چھاؤں کو تو اپنا ہی اجارا
سمجھا ہے
آج اس پہ اگر قبضہ ہے ترا کل دعوئ اس پہ
ہمارا ہے
اسلام نے جب یہ بحث سنی سرمایہ کو ڈانٹا اور
کہا

اٹھے گا وہ اک دن ٹاٹ ترا مزدور خدا کا پیارا
ہے
(کلیاتِ ظفر
،نگارستان،ص:۱٤۹)

انسان دوست ظفرؔ اتحاد و اتفاق کی فضا کو ہموار کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہندو مسلم دونوں ملکر صلح و آشتی کے ذریعے ایک دوسرے پر اعتماد کریں اور اس اعتماد کے سبب اقتصادی زبوں حالی پر قابو پایا جا سکے۔ نظم "اقتصاد" کے اشعار دیکھئے۔

شیخ اور برہمن میں بڑھی صلح و
آشتی
برما میں چل رہی ہے ہوا اتحاد کی
بغض و نفاق و کینہ سے سینے
ہوئے ہیں پاک
جڑ کاٹنے چلا ہوں میں نخل فساد
کی
اب بدگمانیوں کا زمانہ نہیں رہا
حاجت ہے ایک دوسرے پر اتحاد
کی
محکم بنا اسی سے ہے قصر فرنگ
کی
تو بھی کر استوار اساس اقتصاد کی
(نگار ستاں ،
ص:۱۰۸)

تحریک خلافت نے جب اتحاد بین الہنود و المسلمین کے جذبہ میں پورے ہندوستان میں سر فروشی کی لہر دوڑادی تھی تو انسان دوست ظفر علی خان بھی اسی اتحاد کے لیے گاندھی کی تعریف کر رہے تھے اور لا جپت رائے کی موت پر آنسو بہا رہے تھے۔ انہوں نے کہیں دسہرے کی اہمیت کو واضح کیا اور کہیں گو کل کی بانسری کی گونج سنائی۔ اور اسی اتحاد کے لیے دسہرے اور محرم کی تقریبات کو ایک دوسرے کے لیے ہمدردی اور دل سوزی سے پورا کرنے کے لیے کہا۔

خوشی ہے ہندووں کو اس لیے یہ
فرض ہے انکا
کہ دنیا کو دکھا دیں شان اک دلسوز
ہمدم کی
مسلمانوں سے اس غم میں کریں
اظہار ہمدردی
بنیں تصویر اس تقریب پر خلق
مجسم کی
مسلمان بھی نہ ان کے عیش و

عشرت میں مزاحم ہوں
یہی اک کارگر تدبیر ہے اخلاص باہم کی
(کلیات ظفر، بہار ستاں ،ص:۳۰۷)

ظفرؔ کے ہاں اتحاد کے لیے جنگِ آزادی میں شامل ہونے والے ہر شخص کی تعریف و توصیف اور خراج عقیدت کے بے شمار نمونے ملتے ہیں ۔ جنہوں نے آزادی وطن کے لیے اپنی قیمتی جانوں کے نذرانے پیش کر دیے۔نظم "شراب خانہ ساز" کے اشعار دیکھئے۔

آزادی وطن کا پھریرا اڑائے جا
ہندوستان کے نام کا ڈنکا بجائے جا
ہندو شیر ہوں تو مسلمان ہو شکر
دونوں میں اتفاق کا رشتہ بڑھائے جا
خاشاک ذلت صد و پنجاہ سالہ کو
دریائے اتحاد کی زد میں بہائے جا
(کلیات ظفر،بہار ستاں ، ص :۳۲٤)

ظفرؔ نے اپنی نظموں کے ذریعے ہندوستان میں عموماًاور سرحد میں خصوصاً انقلاب برپا کرنے کی بھی بھر پور کوشش کی۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں مثلاً سرحد کا غیور مسلمان، شراب انقلاب، صدائے وقت، انقلاب ہند، عزت قومی، عزم آزادی، مجاہدین سرحد اور شورِ زنجیر قابلِ ذکر ہیں ۔ظفرؔ اس انقلاب کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

وقت آ پہنچا ہے برپا ہو اک نیا انقلاب
اور نظمِ زندگی باردِگر منظوم ہو
وقت آ پہنچا کہ ہو تقسیم قوموں کی نئی
اک نئی دنیا ہو اور اس کا نیا مقسوم ہو
وقت آ پہنچا ہے کہ ہو نابود تہذیب جدید
ہست بود اس کا وجود نقطئہ موہوم ہو
وقت آ پہنچا کہ محنت کا ملے بندوں کو اجر
ساعت آ پہنچی کہ جو خادم ہے وہ مخدوم ہو

(کلیات ظفر،حبسیات، ص
:۸۸-۸۹)

مولانا ظفر علی خان نے نعت میں بھی استغاثہ و استمداد سے کام لیتے ہوئے اپنے قومی اور وطنی مسائل کو بیان کیا ہے اور یوں وہ عصر آشوب کو اسلامی اخلاقی شعائر اور اصول زندگی سے تبدیل کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں ۔ نعت کے اشعار دیکھئے جس میں ظفرؔ مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرتے اور ان کی بد اعمالیوں کے مناظرات اور نفاق و دشمنی پر شرمندہ کرتے نظر آتے ہیں ۔

مسلمانوں خدا کا فضل اس سے بڑھ کر کیا ہوگا
رسول اللہ کا خرمن ہے جس کے خوشہ چیں تم ہو
تمہار ا عروۃ الوثقی واعتصموا بحبل اللہ
پھر اسی رسی کو یارو تھام لیتے کیوں نہیں تم ہو
اخوت کا سبق تم کو پڑھایا ہے پیمبر نے
مگر دل میں لیتے پھرتے نفاق و بغض کیوں تم ہو

(کلیات ظفر ،بہارستان،ص:۳۲)

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ظفرؔ کی نعت گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

ظفر علی خان جذبہ عشق رسولؐ سے سرشار تھے۔ یہ جذبہ ان کے باقی سب جذبوں پر حاوی اور ابتلاوآزمائش کے موقعوں پر ان کے لیے تسکین دل کا سب سے بڑا سہارا تھا۔ محبت کی یہ وہ لطیف اور پاکیزہ فضا ہے جو ہر دینوی آلائش سے پاک اور منزہ ہے۔ ظفر علی خان اسی فضا کی واردات و کیفیات کی عکاسی کرتے ہوئے حقیقت کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ انتہائی عقیدت اور سرشاری کے باوجود وہ حضرت خیر البشر کی ذات و صفات سے متعلق ایسی باتیں منسوب کرتے جو خلاف عقل یا دینوی عقائد کے منافی ہوں ۔ نعت پیمبر میں انہوں نے عصری مسائل کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور ان کی نعتوں میں گریز کا موضوع علی العموم وہ امور و مسائل ہوتے ہیں جو امت خیرالوریٰ کو عصر حاضر میں درپیش ہوں ۔ عقیدت مندی اور حقیقت پسندی کی اس آمیزش نے ظفر علی خان کی نعتیہ شاعری کو موثر بھی بنایا ہے اور پر سوز بھی۔

ظفرؔ کی نعتوں میں امت مسلمہ کی یکجائی، اتحاد ، انسان دوستی اور ان کی بہتری کے لیے دعائیں بھی ملتی ہیں اور دوسری طرف مسلمانان ہند کی زبوں حالی کی تصویر بھی سمٹی ہوئی نظر آتی ہے۔وہ اس صورتحال کو بدلنے کے لیے حضورؐ کے حضور منت و زاری اور گریہ زاری کرتے نظر آتے ہیں ۔نظم "وقت کے حق میں پیغمبر کی دعا " کے اشعار دیکھیے۔

مسلم ہے خدا کے بعد جس کی شان یکتائی
ہے نام اس کا محمد ابن عبداللہ بطحائی
وہ جب آیا تو ساتھ اس کے اک ایسا انقلاب آیا
کہ ہیں اس وقت تک مہر و مہ انجم تماشائی
ہم اب تک بھی اسی کے ہیں مگر یہ کیا قیامت ہے
کہ خود منظور ہم کو ہند میں ہے اپنی رسوائی
یہاں تک لکھ چکا تھا میں کہ یثرب سے ندا آئی
یہ نابینا ہیں یا رب مرحمت کر ان کو بینائی
عطا کر اگلے وقتوں کی بلندی ان کی ہمت کو
اور ان کے بازووں کو بخش پہلی سی توانائی
پرایوں کی غلامی سے انہیں آزاد کر یا رب
بجے ان کی حویلی میں پھر آزادی کی شہنائی
برے ہیں یا بھلے ہیں پھر بھی یہ تیرے ہی بندے ہیں
مری امت ترے ہی کعبہ کی یا رب ہے شیدائی

(کلیات ظفر علی خان،نگارستان، ص :۱۰۔۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ ظفرؔ کے ہاں ایک آزاد، خود مختار، انصاف پسند اور سب سے بڑھ کر انسان دوست معاشرے کے قیام کی خواہش کار فرما رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی انسان دوستی میں استعماریت کے ظلم و ستم اور جبر و استبداد کے خلاف بغاوت کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔

مولانا ظفر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں ۔

ان کا سیاسی مسلک وہی تھا جو شبلیؒ یا محمد علی کا تھا۔ وہ مسلمانوں میں انفرادی اور اجتماعی آزادی کی لگن پیدا کر کے انہیں ہندوستان کی سیاست میں اہم رکن بنانا چاہتے تھے۔ انگریزی اقتدار کے وہ سخت مخالف تھے اور ہندوستان کو ایک آزاد اور خود مختار ملک دیکھنے کی تمنا کرتے تھے۔

سید غلام بھیک نیرنگ اور انسان دوستی(۱۸۷٦۔۱۹۰۰)

سید غلام بھیک نیرنگ کی علمی و ادبی نشو ونما میں جن شخصیات نے اہم کردار ادا کیا ان میں علامہ محمداقبال، سرفضل حسین، میاں عبدالعزیز فلک پیما اور بخشی ٹیک چند کا نام قابل ذکر ہے۔ اپنی انسان دوستی کے باعث نیرنگ اصلاحی مذہبی، تہذیبی، مجلسی، سیاسی کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ تحریک پاکستان میں عملی حصہ لیکر اپنی حب الوطنی کا ثبوت پیش کیا۔ ان کا شمار پنجاب کے ان شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے علیگڑھ تحریک سے متاثر ہو کر مقصدی اور تعمیری شاعری میں اپنے ان مٹ نقوش چھوڑے ۔

بقول ڈاکٹر عبدالوحید !

موصوف کا شمار پنجاب کے شاعروں کے اس گروہ سے ہے جو مولانا حالی کے بعد سرسید سے متاثر ہوئے اور جنہوں نے اردو شاعری میں زندگی اور زندگی کے مسائل کو داخل کیا۔ اس گروہ کے دوسرے حضرات علامہ اقبال ، خوشی محمد ناظر، جسٹس شاہ دین ہمایوں اور سید اعجاز حسین صاحب تو پہلے ہی ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکے تھے۔ لے دے کے ایک حضرت نیرنگ باقی تھے جن کی موت سے گویا پنجاب میں سرسید اسکول کی آخری شمع بھی بجھ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ غلام بھیک نیرنگ کو اقبالؒ کی صحبت نے مقاصد کی ہم آہنگی کی وجہ سے متاثر کیا اور ان کے ذوق شعری کی تربیت کی۔ بقول ڈاکٹر معین الدین عقیل " علامہ اقبال سے رفاقت اور ذوق کی مطابقت نے نیرنگ کے ذوق شاعری اور مشق سخن میں جلا پیدا کی۔

نیرنگؔ کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو ان کی نظموں میں اصلاحی و اخلاقی رنگ نمایاں ہے۔ وہ انسان دوستی اور ہمدردی کی تعلیم دیتے ہیں ۔ وہ عام اشیا اور موضوعات کے ذریعے فلسفیانہ نکات کو کامیاب مہارت سے بیان کرنے کا فن جانتے ہیں ۔ جو ان ہی کا طرۂ امتیاز ہے۔ "مر جھایا ہوا پھول" " تلاش محبت" اور "خار" ان کی اس قبیل کی نظموں میں شمار ہوتی ہیں ۔ اپنی نظم "مرجھایا ہوا پھول" میں اپنی انسان دوستی

کا پیغام عام کرتے ہوئے سب کو ہنسی خوشی زندگی گزارنے ، زندگی میں خوشیاں بانٹنے اور دوسروں کو دکھ یا تکلیف نہ دینے کی تلقین کرتے ہیں ۔

چار سو پھیلے جہاں میں ہو ترے اخلاق کی
دیکھ کر تجھ کو دلوں سے دور ہو غم کا اثر
کاٹ دے ہنس کھیل کر اس مختصر ہستی کو تُو
دے خوشی سب کے دلوں کو اور نہ مت پہنچا ضرر
کل کو چھا جائے نہ ان پر موت کی پژمردگی
التفات دوستاں کی آج ناداں قدر کر
ہے مری پژمردگی تاویل رویائے حیات
میری ایک اک پنکھڑی تفسیر آئین ممات
(کلام نیرنگ، ص:۸۲)

نیرنگؔ کی نظمیں انسانی ہمدردی اور انسانی محبت کا رنگ لیے ہوئے ہیں ۔ وہ مخلوق خدا سے پیار ومحبت اور ان کی قدر دانی کا پیغام دیتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "خار" قابل توجہ ہے جس میں وہ خار کی زبانی خاک نشینوں کی قدر دانی اور مخلوق خدا سے مہربانی کا درس دیتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

راہ رو سے نہیں صحرا میں کبھی مجھ کو خلش
ہاں اگر بھائے اسے آپ غفلت کی روش
خود ہی مجھ خاک نشیں کو کچل ڈالے اگر
تو کبھی اس کو بتاتا ہوں سلامت کی ڈگر
سیکڑوں مور و ملخ وہ تو کچل دیتا ہے
یوں ہی چٹکی سی کبھی بندہ بھی لے لیتا ہے
اس سے ہے نیند سے رہرو کو جگانا مقصود

اس سے کیا بڑھ کے کروں کام میں انسانوں کا!
میں نگہباں ہوں کھیتوں کا ، خیابانوں کا
یوں مری قدر کو جانے کہ نہ جانے کوئی
(کلام نیرنگ ص :٦٨)

نیرنگؔ کے ہاں انسان کی بے بسی، لاچاری اور مجبوری کا دکھ نمایاں ہے۔ غریب غربت کی چکی میں پس رہا ہے۔ حالات کا جبر سہنا اسکا مقدر بن چکا ہے۔ وہ حرماں و حسرت کی تصویر دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نظم "کوہستان کانظارہ" کے اشعار دیکھئے جس میں فطری نگاری کے رجحان میں ان کی درد مندی اور انسان دوستی کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔

ہائے اس حسن کے مسکن میں بھی آفت ہے وہی
اس گلستاں میں بھی انساں کی مصیبت ہے وہی
پیش ہر وقت وہی پیٹ کا دھندا اس کو
جبر حالات کا ہر دم وہی رونا اس کو
وہی غربت، وہی ذلت ہے مقدر اس کا
وہی حرماں ، وہی حسرت ہے مقدر اس کا
(کلام نیرنگ ص :١٠٦)

نیرنگؔ کی نظموں میں اقبالؔ کے فکر کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ ان کی قومی نظموں میں بھی اقبالؔ کے مزاج کا رنگ جھلکتا ہے۔ اپنی ان قومی نظموں میں وہ مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیداری اور آزادی و حریت کا پیغام دیتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "پیغام عمل" خصوصیت کی حامل ہے جس میں وہ امت مسلمہ کو بیداری کا سبق دیتے ہوئے حرکت و عمل کی تلقین کرتے ہیں ۔

ہم نفس عہد سلف کی یاد خوانی ہو چکی
چھوڑ اس قصے کو رنگیں داستانی ہو چکی
گردشِ دوراں کا شکوہ بخت و

اڑوں کا گلہ
داستانِ انقلابِ دارِ فانی ہو چکی
تابکے آخر رہے گا شغلِ یاد رفتگاں
دور ماضی کی بہت کچھ نوحہ خوانی ہو چکی
کام کے میدان کی اب کھائیے چل کر ہوا
یعنی سیر باغ الفاظ و معانی ہو چکی
(کلام نیرنگ، ص:۱۷٦)

نیرنگؔ کی نظموں میں دعوت عمل کا پیغام دراصل ان کی انسان دوستی کا غماز ہے۔ ان کی ایک نظم "دعوت عمل" پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کہتے ہیں ۔ " نیرنگ نے "دعوت عمل" میں قوم کو اسکی بد حالی کا مرقع دکھا کر اسے ابھارنے کے لیے بڑا دل نشیں پیرایہ اختیار کیا ہے۔

نیرنگؔ کی ایک اور نظم "آہنگ عمل" بھی قابل توجہ ہے جس میں ان کا فکری و انقلابی پیغام پوشیدہ ہے۔ ان کے خیال میں حرکت و عمل زندگی کی علامت ہے اور ٹھہراو موت کے مترادف اس لیے چلتے رہنے اور آگے بڑھنے ہی میں کامیابی کا راز مضمر ہے۔ اس لیے وقت کی پکار کو سنتے ہوئے اپنے آپ کو تبدیل کرنا ہی دانائی ہے۔

تجھے اے بلبل رنگیں نوا! سوجھی ہے گانے کی
مگر مجھ کو پڑی ہے فکر تیرے آشیانے کی
کبھی سو جھا بھی ہے تجھ کو کہ اب رنگ چمن کیا ہے
کبھی سوچا بھی ہے تو نے ہوا ہے کیا زمانے کی
یہ گلچیں ، باغباں ، صیاد یہ تیرے کرم فرما
لیے بیٹھے ہیں دل میں حسرتیں تیرے مٹانے کی
مگر اک تو ہی غافل ہے مآل کارِ گلشن سے
ترے حصے میں آئیں غفلتیں سارے زمانے کی
پرانے برگ و گل سب چھانٹے جائیں گے خیاباں سے

لگی ہے باغباں کو دھن نیا گلشن سجانے کی
اگر گلشن میں رہنا ہے بدل لے تو بھی ڈھنگ اپنا
سماعت اب نہیں ہو گی کسی حیلے بہانے کی
(کلام نیرنگ، ص ۳،٤:)

نیرنگ نے اپنی نظموں میں مناظر فطرت کی بھی بھر پور عکاسی کی ہے۔ فطرت سے ان کی والہانہ محبت کا اظہار ان کی مختلف نظموں میں ملتا ہے جن میں خصوصاً کوستان کا نظارہ، فصل بہار، چاندنی اور بادل بھونرا اور باطن وغیرہ شامل ہیں ۔ڈاکٹر عبدالوحید ان کی فطرت نگاری کی خوبی کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں ۔

غلام بھیک نیرنگ ایک فطری شاعر تھے اور انہوں نے اردو شاعری کے جدید رجحانات سے متاثر ہو کر نیچرل شاعری کے جو نمونے چھوڑے ہیں وہ ایک ایسی مسلمہ اہمیت کے مالک ہیں کہ انہیں فراموش کر دینا نہ صرف شاعر کے ساتھ بلکہ خود اردو شاعری کے ساتھ بڑی نا انصافی ہے۔

عمومی طور پر نیرنگؔ کی شاعری میں انسان دوستی کی مختلف اقدار خصوصا ہمدردی، آزادی، حریت، انقلاب اور دعوت عمل اپنی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہیں ۔

چکبست لکھنوی اور انسان دوستی(۱۸۸۱-۱۹٤٦)

چکبستؔ کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جن کے ہاں حب وطن اور حب قوم کی شاعری کے نمونے کثرت سے ملتے ہیں ۔ جو اس دور کی شاعری کا خاصہ ہیں ۔ ان کی شاعری میں مذہب، سیاست، اخلاق، انسان دوستی اور طنز وظرافت سبھی کا بیان ملتا ہے۔ ان کی شاعری اور شخصیت توازن اور ہم آہنگی کی عمدہ مثال ہے۔ بقول رام لعل نابھوی! "چکبست ایک فنکار کا دل اور دماغ رکھتے تھے وہ قدرت کی طرف سے خدا شناسی ، انسان دوستی اور حب الوطنی کا جذبہ لیکر آئے تھے۔ چکبست کے دل و دماغ میں حب الوطنی کا ایک بے پایاں سیلاب تھا جو ان کی شاعری میں ٹھاٹھیں مارتا ہے"۔

چکبستؔ نے حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر بہت سی نظمیں لکھیں ۔ جن میں خصوصاً "خاکِ ہند"، "وطن کا راگ"،" ہمارا وطن"، آوازئہ قوم"، "وطن کوہم"، اور "وطن ہم کو مبارک" جیسی نظمیں قابل ذکر ہیں ۔ وہ انسان دوستی کے ذریعے وطن میں امن و امان کے خواہاں تھے۔ نظم " آواز قوم" کے اشعار دیکھئے جس میں وہ ہندوستانی عوام کے عام جذبات کی ترجمانی عمدہ پیرائے میں کرتے ہیں ۔ اس وقت

ہندوستان انقلابات کی آما جگاہ بن رہا تھا اور چکبست اس کے ماضی اور حال کا مقابلہ کر رہے تھے۔

یہ خاک ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار
ہمالیہ سے اٹھے جیسے ابر دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار
ہوئی ہیں خاک کے پردے میں ہڈیاں بیدار
زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے
(کلیات چکبست ،نظم، ص:۲۲۷)

مجموعی طور پر ان کی شاعری میں قومیت، معاشرتی اصلاح اور وطن پرستی کا جذبہ ہی کار فرما دکھائی دیتا ہے۔ برطانوی حکومت سے ہوم رول حاصل کرنے کی خواہش کے ساتھ وہ حکومت کو اپنی وفاداری کا برابر یقین دلاتے اور کبھی کبھی دبی زبان سے حقیقت حال بھی بیان کر دیتے تھے۔

ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے
نکلے ہیں لوٹنے چمن روزگار کو
وطن میں بے وطن مجھ کو کیا ہے اک ستم گر نے
نہ میں ہندوستان کا ہوں نہ ہے ہندوستاں میرا
(کلیات چکبست حصہ(نظم))

چکبستؔ نے جس عہد میں شاعری کے میدان میں قدم رکھا اس وقت بڑے بڑے اساتذہ سخن جن میں صفیؔ، ثاقبؔ، محشرؔ، آرزو وغیرہ شامل ہیں اپنی شاعری کے جوہر دکھا رہے تھے۔ اس وقت ہندوستان میں آزادی کے لیے کش مکش جاری تھی۔ اکبر اور اقبالؔ جیسے عظیم المرتبہ شعرا کے ہاں اس زمانے کی سیاسی آزادی کا رنگ دکھائی دیتا ہے لیکن سر عبدالقادر سروری کے مطابق! "اقبال کے حب وطن کے نظریے میں ہلکا سا مگر بنیادی تغیر پیدا ہوتا گیا۔ چکبستؔ شروع سے آخر تک وطن اور قوم کی محبت میں ڈوبے رہے۔"

انسان دوست چکبستؔ کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو ان کی شاعری کو چار مختلف حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ حب قومی، حب

وطنی، سیاسی نظمیں دوست احباب اور ایک معتدبہ حصہ قومی رہنماوں پر کہے گئے مرثیوں پر مشتمل ہے۔ ان میں کہیں تو وہ حکومتِ برطانیہ کا تحسین آمیز انداز میں تذکرہ کرتے ہیں اور کہیں غیر ملکی حکومت کے لیے سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ جلیانوالہ باغ، امرتسر کے سانحہ پر ہندستانیوں کے غم و غصہ کے جذبات کی بہترین عکاسی کی ہے۔

انہیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرز جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے
یہ رنگ بے کسی رنگ جنوں بن جائے گا غافل
سمجھ لے یاس و حرماں کے مرض کی انتہا کیا ہے
امیدیں مل گئیں مٹی میں دور ضبط آخر ہے
صدائے غیب بتلا دے ہمیں حکم خدا کیا ہے
تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن
دیں اسی کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن
(کلیات چکبستؔ حصہ (نظم)

چکبست کے کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عبدالوحید ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ "چکبست ان شعرا میں سے ہیں جو از ابتدا تا انتہا وطن و قوم کی محبت میں ڈوبے رہے اور سیاسی و معاشرتی آزادی ہمیشہ ان کا نصب العین رہی"۔

چکبستؔ اپنی شاعری کے ذریعے وسیع المشربی اور روا داری کا درس دیتے ہیں ۔ یہ وہ وسیع المشربی تھی جو ہندوستانی فلسفے کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ اسی نے چکبستؔ کو تمام مذاہب و مسلک کا احترام کرنے کا سبق دیا ۔ اور یہی ان کی بسیط انسان دوستی کی بنیاد ہے۔ نظم " مذہب" کے اشعار دیکھئے جس میں خود بینی ، تکبر اور غرور میں مبتلا مذہب پرستوں کو طنز اور تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جو اپنے سوا کسی کو دیندار نہیں سمجھتے۔ ایسے مذہبی پیروکاروں اور رہنماؤں پر چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

سودائے محبت میں انہی کے نہیں خامی
خود بیتی سے خالی نہیں مذہب کے

بھی حامی
عرفاں کی خبر لاتی ہو گو طبع گرامی
ہے نفس کی منظور حقیقت میں غلامی
کچھ قوم کی پروا ہے نہ فکر کہہ و مہ ہے
ہو جائے نجات اپنی تمنا ہے تو یہ ہے
(کلیات چکسبت ؔ، ص :۱۱۸۔۱۱۹)

چکبستؔ کی ایک نظم " مرقع عبرت" قوم کی حالت زار اور نوجوانوں کی حالت زار کی بہترین عکاس ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اس نظم کے ذریعے مذہبی روا داری، اتحاد و اتفاق اور آزادی و حریت کا پیغام عام کرتے ہیں اور اپنی انسان دوستی کا ثبوت پیش کرتے ہیں ۔ ایک بند میں قوم کی حالت زار کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں ۔

ہے قوم پہ چھایا ہوا یہ ابرِ نحوست
نظروں سے ہے پنہاں رخ خورشید بغاوت
میدان ترقی سے قدم رکھتے ہیں باہر
سائے کی طرح ساتھ ہے ادبار کی صورت
وہ بار الم ہے کہ اٹھایا نہیں جاتا
بگڑا ہے وہ نقشہ کہ بنایا نہیں جاتا
(کلیات چکبست، ص:۱۰۷)

چکبستؔ کی ابتدائی قومی نظموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے عبدالقادر سروری کہتے ہیں ۔

> اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قومی شاعری کا الہام چکبستؔ نے اقبالؔ کے کلام سے حاصل کیا۔ چنانچہ چکبستؔ کی ابتدائی نظموں جیسے خاک ہند، وطن کا راگ، ہمارا وطن، آوازئہ قوم وغیرہ پر اقبال کے اثرات نمایاں ہیں لیکن بعد میں چکبستؔ نے اپنی انفرادیت قائم کرلی۔

چکبستؔ نے بیسویں صدی میں وطن پرستی کے نغمے الاپے اور قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا پیغام عام کیا تو اس کے ساتھ ساتھ بنی نوع انسان سے محبت، ہمدردی اور انسان دوستی کا بھی درس دیا۔ وہ انسانوں پر ظلم و ستم کے سخت مخالف ہیں ان کی نظم " درد دل" کے اشعار قومی درد اور ہمدردی کے بہترین عکاس ہیں ۔

قوم کے درد سے ہوں سوزِ وفا کی تصویر

مری رگ رگ سے ہے پیدا تب غم کی
تاثیر
ہے مگر آج نظر میں وہ بہارِ دل گیر
کر دیا دل کو فرشتوں نے طرب کے
تسخیر
یہ نسیم سحری آج خبر لائی ہے
سال گزرا میرے گلشن میں بہار آئی
ہے
(صبح وطن،
ص:۳۳)

چکبستؔ کی شاعری میں ہمدردی اور دلسوزی کے پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر فاطمہ تنویر رقمطراز ہیں ۔

ان کی شاعری میں قدم قدم پہ اخلاق اور شرافت کا سبق ملتا ہے۔ وہ دل سوزی اور دلداری کو انسانی شخصیت کا مرکزی وصف سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک انسانی تہذیب کا یہ اولین تقاضا ہے تہذیب کا آئین ہے دلسوزی احباب۔

چکبستؔ کی نظموں میں فطرت کے حسن کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ ان کے خیال میں وطن کا ہر زرہ دیوتا ہے۔ انہیں اپنے وطن کے مناظر دلفریب اور دلر با دکھائی دیتے ہیں ۔ کیونکہ اس میں اپنی مٹی کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔"برسات کا موسم"، "کشمیر" ، "سیر دوہرہ دون " اور "جلوہ صبح" جیسی نظمیں فطرت نگاری کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہیں ۔

سنبل نگار چکبست کی فطرت نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتی ہیں ۔

چکبستؔ کو اپنا وطن اور اسکی خاک کا ہر ذرہ عزیز ہے۔ اس لیے اس سرزمین کے ادلتے بدلتے موسم اور رنگ برنگے منا ظر بھی انہیں بہت پیارے ہیں ۔ مختلف نظموں میں فطرت کے دلکش مناظر بیان کیے ہیں ۔

مجموعی طور پر چکبستؔ کا مسلک انسان دوستی اور حب الوطنی ہے۔ وہ دنیا میں موجود ہر انسان کے درمیان محبت، ہمدردی اور بھائی چارے کے داعی ہیں ۔ وہ کسی قسم کی تفریق و امتیاز کے قائل نہیں ۔ نفرت و وحشت کے سخت مخالف ہیں ۔ بلند اخلاق کی تربیت کرنا اُن کا منصب فرضی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نوجوانوں کو بلند اخلاق کی تلقین کرتے ہوئے اپنا یہی پیغام بار بار دہراتے ہیں ۔ اپنی نظم "نوجوانوں سے خطاب " میں لکھتے ہیں۔

ایک ذرا جذبہ اخلاق کو اعلیٰ کر
دو
قوم مرحوم کی تربیت پہ اجالا کر

دو

(کلیاتِ

چکبست)

غرض چکبستؔ کا پیغام یہی ہے کہ د نیاکے ہر کونے میں انسانیت اور انسان دوستی کی شمع کو روشن کیا جائے۔

تلوک چند محروم اور انسان دوستی

(۱۹۶۶۔۱۸۸۷)

ادب کی تخلیق میں ادبا اور شعرا کی شخصیت اور روایات کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکونظر انداز کر کے کسی ادیب اور شاعر کی تخلیقات کو اچھی طرح سمجھنا ممکن نہیں ۔ شاعر کے شعور کو جاننے کے لیے جہاں اسکی ہم عصر تحریکات اور رجحانات کو جاننا ضروری ہے ساتھ ہی اس کے ذاتی ماحول، تعلیم و تربیت اور افتاد طبع کا علم اور قومی و ادبی روایات سے واقفیت بھی بے حد ضروری ہےلہٰذا محرومؔکی شخصیت اور مزاج کو سمجھنے کے لیے ان کی زندگی کے واقعات پر نگاہ ڈالنا ضروری ہے تلوک چند نام اور محروم تخلص تھا۔ جو یقینا شاعر کی افتاد طبع اور اس کے جذباتی مزاج کے مطابق تھا۔

۱۸۸۷ء میں عیسیٰ خیل ضلع میانوالی میں ایک متوسط ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے۔ محرومؔ صاحب بچپن ہی سے شعر و سخن کے دلدادہ رہے ہیں ۔ ان کا کلام اس وقت "مخزن" اور "زمانہ" جیسے رسالوں میں چھپا۔ جبکہ وہ دسویں جماعت میں تھے۔ ان کو سرور جہاں آبادی، نادر کا کوروی اور چکبست جیسے قادر الکلام شعرا کی ہم عصری کا شرف حاصل ہے۔

> اکبر کے طنزیاتی تنبیہات، اقبال کے مفکرانہ نصائح، اسمٰعیل میرٹھی کی سنجیدہ حقیقت نگاری اور سرورکے ادیبانہ مطالعہ فطرت سے اس وقت کی فضائے شاعری گونج رہی تھیں اور انہیں آوازوں میں ایک آواز محرومؔ کی بھی تھی۔ لیکن ان سے ذرا مختلف اس میں نہ اقبالؔ کے فلسفے کی گونج تھی نہ اکبرؔ کے طنزیاتی نشتر کی سی تیزی۔ نہ اسمٰعیل و سرورؔ کی سی مادی یا تنزیبی نقاشی بلکہ ایک مجروح احساس کی سی درد انگیزی ، ایک اجتماعی درد و غم کی سی کسک اور ایک ٹھہرا ہوا شعور مداوا جو صلائے جنون و گریباں چاکی نہ تھا بلکہ ایک نوع کی دعوت نجیہ گری تھی۔

محرومؔ نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ اقتصادی اور تہذیبی اعتبار سے پسماندگی کا شکار تھا۔ لوگوں کو ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لیے بڑی تک و دو کرنی پڑتی تھی۔ گو یا لوگ زندگی کی بنیادی ضروریات کے لیے ترستے تھے۔ ہر طرف بھوک اور افلاس نے ڈھیرے جمائے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ہر وقت ڈاکووں اور درندوں کا خطرہ بھی سرپر منڈلاتا رہتا تھا۔ محرومؔ کے ذہن کی اسی ماحول میں

تربیت ہوئی۔ محرومؔ کا تعلق جس علاقے سے تھا وہاں کے لوگ خلوص، قناعت، راست بازی، اور جرات مندی کی خصوصیات سے مالا مال تھے۔ چنانچہ اردگرد کے حالات نے ان کی طبیعت میں سادگی قناعت،خلوص، ایثار اور پیار و محبت جیسی خصوصیات پیدا کر دیں جنہوں نے انہیں انسان دوست بننے میں مدد دی۔

جہاں تک ملکی حالات کا تعلق ہے محرومؔ کا زمانہ وہ تھا جب ہندوستان مضبوطی کے ساتھ حکومت برطانیہ کے چنگل میں تھا۔ اگرچہ ۱۸۵۷سے پہلے بھی سیاسی اقتدار انگریزوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا اور شاہ دہلی کی حیثیت شاہ شطرنج کی سی تھی لیکن بغاوت کے فرو ہونے کے بعد تو رہا سہا قصہ بھی پاک ہو گیا۔ محرومؔ نے اپنے عہد کے حالات کا مسلسل جائزہ لیا اور پھر تمام لوگوں کے دکھوں اور سکھوں میں برابر کے شریک رہے۔ محرومؔ کی انسان دوستی کی مثالیں ان کی نظموں میں جا بجا دکھائی دیتی ہیں ۔

بقول گوپی چند نارنگ

> محرومؔ کے کلام کو غور سے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اس کی تہہ میں ایک گہرا لیکن تھما ہوا درد ہے۔ مجروح احساس کی درد انگیزی ہے۔ ایک بے نام سی بے چینی اور دبی دبی سی شورش ہے۔ یہ شورش پیدا ہوئی ہے، انسانی قدروں کی پامالی سے اور یہی محرومؔ کا انفرادی رنگ سخن ہے۔ انسان کو اخلاقی طور پر استوار، ملک کو آزاد اور قوم کو خوشحال دیکھنا ہی ان کی سب سے بڑی تمنا ہے اور یہی ان کی شاعری کی جان ہے۔ وہ وسیع معنوں میں انسانیت کے شاعر ہیں۔

انسان دوست محرومؔ دنیا میں امن و سکون اور محبت کے متلاشی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر رنجشیں ، فریب و ریا کاری اور ظلم و نا انصافی دیکھتے تھے تو ان کو بہت دکھ اور افسوس ہوتا۔ وہ دنیا سے اور انسانی زندگی سے غلامی ، افلاس، ناانصافی ، عداوت اور ظلم کا خاتمہ چاہتے تھے۔ ان کا پیغام محبت، امن و سلامتی، ہمدردی اور انسان دوستی کا پیغام تھا۔ ہندوستانیوں کے ہر غم اور دکھ کو انہوں نے دل سے محسوس کیا ہے۔ انکی پریشان حالی پر اظہار غم کیا ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم " جنوبی افریقہ کے مظلوم ہندوستانی" اہمیت کی حامل ہے جس میں انہوں نے مقامی حکام کے ظلم و ستم کے خلاف حکومت برطانیہ سے فریاد کی ہے۔ کیونکہ حقیقت میں یہ ظلم و ستم انہی حکام کی شرارت اور فرعونیت کا نتیجہ ہے۔

گورنمنٹ سے فریاد اب ہماری ہے
کہ اے وطن کی ممد اے نگاہدارِ
وطن
یہ خواہ مخواہ کی ہم سے کدورتیں
کیسی

اڑائے دیتے ہیں اغیار کیوں غبارِ وطن
سمجھ کے بیکس و تنہا نہ دیں انہیں عذاب
شریک حال غریبان ہیں سوگوار وطن
(کاروان وطن
ص :۴۰)

جب وطن کا چپہ چپہ غم و الم کی تصویر بنا ہوا ہو اور دلوں میں آزادی کی شمع روشن ہو تو اپنی ذات سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ ایسی حالت میں شاعری اپنا مقصد آپ ہی نہیں رہتی بلکہ اس سے جہد آزادی کے لیے فضا تیار کرنا اور بہتر مستقبل کی تمنا کرنا بھی شاعر کا فرض ہو جاتا ہے۔ انسان دوست محرومؔ نے شاعری کے اسی نظریے کو تسلیم کیا اور ساری عمر اسی روش پر گامزن رہے۔ محرومؔ کو زمانہ طالبعلمی سے ہی سامراجی ظلم و بر بریت اور وطن کی زبوں حالی کا احساس دامن گیر تھا۔ ان کے لبوں پر اختر ہند کو اوج ثریا کر دے یہی دعا جاری و ساری رہتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انسان دوست محرومؔ نے سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں ہی سامراجیت اور خود مختاری اور آزادی و غلامی کے بنیادی مسائل پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا تھا۔اپنی ایک نظم "بھارت ماتا کیوں روتی ہے" میں ہندوستان کی ذلت و خواری اور تباہی و بربادی کی خاصی موثر تصویر کھینچی ہے اور ہر بند کے بعد پوچھا ہے کہ تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا۔ ایک بند ملاحظہ کیجئے۔

نہ رہی اپنوں میں کچھ بوئے محبت باقی
نہ پرایوں میں ہیں آثارِ مروت باقی
نہ ہے دولت ، نہ ہے شوکت نہ ہے عزت باقی
رہ گئی دہر میں اک خواری و ذلت باقی
تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟
(کاروان وطن،
ص:۳۱)

انسان دوست محرومؔ ہندوستانیوں کی حالت زار پر کڑھتے تھے۔ ان کو غلامی کی زنجیروں میں قید دیکھ کر ان میں جذبہ آزادی بیدار کرتے ہیں اور انہیں اس بات کی نوید دیتے کہ اب کہ فصل بہار ایک نئی آن سے وارد ہوئی ہے۔ لہٰذا وقت کی مصلحت یہی ہے کہ سنگ اسیری کو

ہمیشہ کے لیے سینے سے اٹھا پھینکا جائے۔ نظم "اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں" میں کچھ اس انداز سے ہم وطنوں سے مخاطب ہوتے ہیں ۔

نہ سنگ اسیری کو سینے پہ دھرنا
جو مرنا تو صحن گلستاں میں مرنا
اگر کچھ حمیت ہے یہ کام کرنا
پھڑکنا ، تڑپنا ، اچھلنا ، ابھرنا
اسیرو ، کرو کچھ رہائی کی باتیں
(ایضا ،ص :٤٨)

انسان دوست محرومؔ کا زمانہ اقتصادی اور معاشی بد حالی کا دور تھا۔ محرومؔ چونکہ انسانوں کے ہمدرد داور خیر خواہ تھے۔ اس لیے انہیں اس بد حالی کا راز کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ جس کو دور کرنے کے لیے انہوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ چونکہ تمام ہندو ستان پر انگریز قابض تھے اور ان کی اجارہ داری تھی۔ لہٰذا اس کو ختم کرنے کے لیے ایک تحریک سودیشی تحریک کے نام سے منظر عام پر آئی۔ جس کا مقصد انگریزوں کی معاشی لوٹ گھسوٹ کے خلاف جدوجہد تھا۔ سودیشی تحریک کی براہ راست ضرب ولایتی کپڑے پر پڑی۔جس کی کھپت میں 38%کمی ہوئی۔ سگریٹ اور بعض دوسری ولایتی مصنوعات بھی اس سے متاثر ہوئیں ۔ محرومؔ نے بھی اس تحریک پر لبیک کہا اور سودیشی تحریک کے پیغام کو عام کرنے کے لیے نظمیں لکھیں ۔ اور انگریزی مال کا بائیکاٹ کرنے کی تلقین کی تاکہ ہندوستان سے انگریزوں کی اجارہ داری کا خاتمہ ہو ۔ اور ہندوستانی سکھ کا سانس لے سکیں ۔ نظم "سودیشی تحریک" کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

وطن کے درد نہاں کی دوا سدیشی ہے
غریب قوم کی حاجت روا سدیشی ہے
تمام دہر کی روح رواں ہے یہ تحریک
شریک حسنِ عمل جا بجا سدیشی ہے
ثبوت ہے یہی اپنے وطن کی الفت کا
عزیز خاطر اہل وفا سدیشی ہے
(ایضا ،ص :١١١)

جلیانوالے باغ کا واقعہ ہمارے سفر آزادی کا ایک بڑا ہی درد ناک واقعہ ہے۔ امر تسر میں ١٣اپریل ١٩١٩کو جلیانوالہ باغ کے پر امن جلسے

پر جنرل ڈائر نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی ۔جس سے تقریبا ۳۷۹آدمی ہلاک اور ۱۲۰۰زخمی ہوئے۔ شہید ہونے والوں نے قربانی کی ایسی درخشندہ مثال قائم کی کہ اس ایک چراغ سے کئی چراغ روشن ہوئے۔ انسان دوست محرومؔ نے اس سے جو اثر لیا وہ بہت کم شاعروں کے حصے میں آیا ۔ انہوں نے اس سے متاثر ہو کر کئی نظمیں لکھیں یہ سب کی سب انگریزوں سے نفرت کے زہر میں بجھی ہوئی ہیں اور ان کے ظلم و استبداد کے خلاف درناک احتجاج کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ نظم "ڈائر اور نادر" کے یہ اشعار توجہ کے طالب ہیں ۔

تھی درمیان باغ ہزاروں کی بھیڑ بھاڑ
ناگاہ اک طرف سے چلی گولیوں کی باڑ
پھر وہ ہوا کہ جس سے لرزتی ہے تن میں جاں
پتھر کا دل بناوں تو کچھ ہو سکے بیاں
ڈائر کے قتل عام نے خون وفا کیا
لوہو سے لال دامن برطانیا کیا
(ایضا ص :۱۳۶۔۱۳۷)

بقول نیاز فتح پوری!

محرومؔ کے جذبات کا خلوص، اندازِ بیان کی متانت گویا ایک ٹھہرا ہوا سمندر ہے جو طوفان سے زیادہ گہرائی اپنے اندر رکھتا ہے اور ان کی شاعری محض ماتم ملک وملت نہیں بلکہ داستان ہے۔ ان کے درد مندانہ احساسات کی اور خود ان کے نفسیات وبطون کی جس کی عظمت سے انکار ممکن نہیں ۔

انسان دوست محرومؔ تنگ نظری، تعصب اور فرقہ واریت کے سخت مخالف تھے۔ وہ معاشرے میں باہمی اتحاد اور اخوت کے جذبات کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی ایک نظم "ہندو مسلمان" میں یہ بتایا ہے کہ ہم اگر غفلت اور بے خبری کا شکار ہیں تو ہمیں ہندوستانی کہلانے کا کوئی حق نہیں ۔ہندو یا مسلمان صرف وہی ہے جس کا کردار صالح ہے۔ اور جس کے دل میں مذہب کی محبت کے ساتھ ساتھ وطن کی خدمت کا جذبہ بھی موجزن ہے۔ محرومؔ نے انسان دوستی کے پیغام کو عام کرنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔

ہندو مسلماں ہیں بھائی بھائی
تفریق کیسی ، کیسی لڑائی
ہندو ہو کوئی یا ہو مسلماں
عزت کے قابل ہے بس وہ انساں
نیکی ہو جسکا کار نمایاں

ہستی ہو جسکی تصویر احساں
(ایضا ،ص
:۲٤۳)

انسان دوست محرومؔ اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ شیخ و برہمن کی کشا کش سے دامان اتحاد کی دھجیاں اڑ گئی ہیں اور شہیدوں کے خون سے جس خیابان اتحاد کو سینچا گیا تھا وہ نا حق تا راج ہو رہا ہے۔ لوگوں کے دل بعض اور کینے سے بھر گئے ہیں اور وہی جنھوں نے اتحاد کے پیمان باندھے تھے اب انہیں توڑنے میں پیش پیش نظر آتے ہیں ۔اپنی ایک نظم "اہل وطن کی خدمت میں " ہندو مسلمان دونوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

گھر سے نکلو گھروں کو آگ لگاؤ
بیکسوں ، بے بسوں کو اس میں
جلاؤ
بے گناہوں کو راہ چلتوں کو
گھیر لو اور ذبح کر ڈالو
چیختی عورتوں پہ وار کرو
نیزے بچوں کے دل سے پار کرو
کیا یہی چیز آدمیت ہے؟
یہی مذہب ، یہی شرافت ہے؟
(ایضا ،ص
:۲۸۸،۲۸۹)

انسان دوست محرومؔ ملک میں ہونے والی ہرتبدیلی کو محسوس کر رہے تھے۔ ۱۹۳۲میں کانگریس کی شدید مخالفت کے باوجود کمیونل اوارڈ ہندوستان میں نافذ ہوگیا۔ اور اس نے آزادی کی قریب آتی منزل کو دور تر کردیا اور فرقہ پرستی کی آگ کو بھڑکانے میں مدد دی جس سے ملکی امن و امان میں خلل پیدا ہوا۔ محرومؔ نے ہمدردی اور انسان دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے ان سیاسی حالات کا تجزیہ اپنی نظم "کمیونل اوارڈ" میں یوں کیا ہے۔

بھڑکی ہے اس سے فرقہ پرستی کی
آگ اور
ہر فرقہ اپنی ڈفلی پہ گاتا ہے راگ
اور
ڈھیلی ہوئی سمندِ عداوت کی باگ
اور
پھنکارتا ہے آج تعصب کا ناگ اور
ہے اس کے منہ میں زہر کمیونل
اوارڈ کا
ہندی ہیں اور قہر کمیونل اوارڈ کا

(ایضا ،ص
:۲۴۰)
۱۹۴۲ء میں آزادی کی تحریک شدت اختیار کر گئی۔ ملک بھر اور خصوصا بنگال میں دہشت پسندوں نے انگریزی اقتدار کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس موقع پر انگریزوں کی انصاف پسندی اور رعایا پروری کی اس سے بہتر مثال کیا ہو گی کہ بنگال میں شدید ترین قحط رونما ہوا اور غریب عوام لاکھوں کی تعداد میں بن آئی موت مر گئے۔ دیدئہ عبرت نگاہ کے لیے یہ صدمہ تازیانے سے کم نہ تھا۔ انسان دوست محرومؔ بھی دل کے درد کے ہاتھوں تلخ نوائی پر مجبور ہوئے۔ اپنی نظم "قحط بنگال" میں کچھ اس طرح سے منظر کشی کرتے ہیں -

خون خوار بلائیں ہیں ترے سامنے غافل
قحط اور وبائیں ہیں ترے سامنے غافل
کیا اہل وطن کا تجھے غم کچھ بھی نہیں ہے
بنگال کے مٹنے کا الم کچھ بھی نہیں ہے
سڑتی ہیں پڑی کوچہ و بازار میں لاشیں
ہیں نفس طرب دیدئہ اغیار میں لاشیں
سفاک بہت خوش ہیں تباہی پہ ہماری
یہ جور ہے ناکردہ گناہی پہ ہماری
(ایضا ،ص
:۲۵۶-۲۵۷)

انسان دوست محرومؔ کی شاعری امید کی شاعری ہے۔ انہوں نے تحریک آزادی کے تاریک ترین لمحات میں بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ۔ یہ وہ دور تھا جب ملک کو بہت نازک مراحل سے گزرنا پڑا۔ جہاں بڑے بڑوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ لیکن محرومؔ کی شاعری میں کہیں نا امیدی یا مایوسی کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ انہوں نے امید کی شمع کو روشن رکھا اور وطن کو آگے بڑھانے اور ہمت سے کام کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ تاکہ پر امن معاشرے کا قیام عمل میں آسکے اور انسان دوستی کی بہترین فضا قائم ہو سکے۔ ان کی نظم "بڑھے چلو" کے کچھ اشعار دیکھئے۔

دل میں کدورت اپنے شریک سفر سے کیا

گزری گئی پہ خاک ہی ڈالو ، بڑھے
چلو
گھبرائے کے راستے میں نہ بیٹھو
، دلاورو
منزل وہ سامنے ہے جیالو بڑھے
چلو
جب گوہر مراد کو پالو بڑھے چلو

انسان دوست محرومؔ کی نظم "ہمت کرو جوانو" کے بھی کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے۔جس میں نوجوانوں کی غیرت کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

بے فکر کیوں پڑے ہو کچھ ہاتھ
بھی ہلاو
گرداب سے نکل کر چاہو مزے
اڑاو
ساحل بھی سامنے ہے پھر بھی نہ
ہو بچاو
غیرت ہے اپنی ہستی گر اس طرح
مٹاو
ہمت کرو جوانو ! کشتی بھنور سے
نکلے
(ایضا ، ص
:۸۷)

گوپی چند نارنگ! محرومؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

محرومؔ کی شاعری انسانیت کی بنیادی قدروں کی شاعری ہے، شرافت و صداقت ، حق گوئی و حق پرستی، غیرت و حمیت، اتحاد ورواداری، مہر و وفا، ایثار و کرم کا انہوں نے اپنے کلام میں بار بار ذکر کیا ہے۔ لیکن انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ غلامی ان سب کی نفی ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری غلامی اور محکومیت کے خلاف سینہ سپر نظر آتی ہے اور وطن کی آزادی کا راگ ان کی شاعری کی بنیادی آواز بن گیا ہے۔ یہ محض ذاتی مسرتوں یا غموں کا ترانہ نہیں بلکہ اس کا رخ پورے ملک اور قوم کی طرف ہے۔ اگر ملک اور قوم کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرنا بھی شاعر کے فرائض میں شامل ہے تو محرومؔ کی شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں۔

انسان دوست محرومؔ کو اپنے وطن کے خادموں اور سرفروشوں سے گہری محبت و عقیدت رہی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ انکی ہمت افزائی کی ہے۔ ان کے حوصلے بڑھائے ہیں اور ان کی قربانی اور ایثار کے گیت گائے ہیں۔ انکی شاعری ایک ایسا نگار خانہ ہے جس میں ہندو ستان کی تمام قومی ہستیاں اپنی شان و شوکت کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔ ان میں

تلک،گوکھلے، موتی لال نہرو، مہاتما گاندھی اور ابوالکلام آزاد جیسے قومی رہنما ہیں تو لاجپت رائے اور حسرت موہانی جیسے سرفروش اور بھگت سنگھ اور ہری کشن جیسے شہیدان وطن بھی ہیں ۔ ان سب سے متعلق محرومؔ نے بے شمار نظمیں لکھیں ہیں ۔

محروم نے اپنی نظم "یاد تلک" میں بال گنگا دھر تلک کے اس دنیا سے چلے جانے پر دکھ کا اظہار کیا ہے۔ وہ لیڈر جو ملک و قوم کی اصلاح و ترقی کے لیے انتہائی دکھ درد کا بار اٹھانے کو تیار رہتا تھا۔ قومی عزت کے مقابلہ میں جسے دنیا کی کوئی چیزعزیز نہ تھی ایسے شخص کے لیے محرومؔ کا دل خون کے آنسو روتا ہے اور کہتا ہے۔

کارواں کو چھوڑ کر تو چل دیا
دشت میں اے کارواں سالار ہند
اے تلک ، اے یوسف مصر وطن
باعثِ صد گرمئ بازار ہند
قید ہو کر ذوقِ آزادی دیا
ہند کو اے سرورِ احرارِ ہند
(ایضا ،ص: ۱۰۲)

محرومؔ کی انسان دوستی، ان کے مریثوں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہ مرثیے انہوں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تحریر کیے ہیں ۔ جن میں ان کی انسان دوستی ، ہمدردی اور محبت واضح طور پر جھلکتی ہے۔ محرومؔ کے مرثیے "چار آنسو" میں انہوں نے فخر ہند گو پال کرشن گوکھلے کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور انکی قومی خدمات کو سراہا ہے۔ جنہوں نے ہندوستان میں آزادی کی شمع روشن کی۔ باہمی جھگڑوں کو ختم کرنے پر زور دیا۔ ذاتی عیش وآرام کو خیر باد کہہ کر ایثارِ نفس کی ترغیب دی اور حکام وقت کی سرد مہری اور تنگ نظری سے آگاہ کیا ۔ محرومؔ گوکھلے کی وفات پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

مرگ امید ہند ہے تیری وفات گوکھلے
زندگی ، امید تھی تیری حیات گوکھلے
حب وطن کا آہ تو نیر تابناک تھا
پھر وہی غم نصیب ہیں ، پھر وہی رات گوکھلے
گرم سفر تھا کارواں اور وہ میر کارواں
راہ میں آہ پڑ گیا موت کے ہات گوکھلے
(ایضا ص: ۱۰۱)

محرومؔ کی انسان دوستی ان کی عقیدت مذہبی یا علاقائی حدود کی پابند نہیں تھی۔ وہ اس شخص کے پر ستار تھے جو دوسروں کی خاطر تکالیف بردا شت کرتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کا رویہ اختیار کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ محرومؔ نے گاندھی جی پر بھی بہت سی نظمیں تحریر کیں ۔ جن میں ان کی انسان دوستی کی بھرپورعکاسی ہوتی ہے۔ گاندھی وہ لیڈر تھا جس نے اپنے ملک اور اس کے غریب باسیوں کی حالت سدھارنے کے لیے زندگی وقف کر دی تھی۔ لاکھوں ہندو مہاتما گاندھی کو "ولی" سمجھتے تھے۔ اکثر کے نزدیک وہ کسی ہندو دیوتا کا اوتار تھا۔

اس خود غرضی اور لالچ سے بھری ہوئی دنیا میں اس شخص نے دوسروں کو زندہ رہنے کے حقوق دلانے کے لیے اپنی جان قربان کر دی۔ محرومؔ کی نظم "مہاتما گاندھی" کے چند اشعار دیکھئے۔

منزل مقصود آزادی پہ لے آیا اسے
ملت مجبور کا وہ کارواں سالار تھا
رہبروں کو روشنی ملتی تھی اس کی ذات سے
ہند میں گاندھی مینار جلوئہ انوار تھا
وہ اہنسا کا پیمبر ، شانتی کا دیوتا
یا مسیح اس دور کا ، کٹو تم کا یا اوتار تھا
مار کر اس کو کسی کے ہاتھ آخر کیا لگا
قوم کے ماتھے پہ کالا داغ ہتیا کا لگا

(ایضا ص :۳٤۱)

محرومؔ کی ایک اور نظم "مہاتما گاندھی کے ایک برت پر "کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں ان کی انسان دوستی کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔

اپنے ہی دل پہ کھایا جس پیکر وفا نے
بھارت کے تن پہ آیا جب کوئی زخم کاری
انسانیت کی خدمت مسلک رہا ہے جس کا
کی جس نے نذر انساں عمر عزیز ساری

(ایضا ص
:۲۲۷)

انسان دوست محرومؔ کی درد بھری طبیعت دوسروں کے درد کو بھی معمول سے زیادہ محسوس کرتی ہے۔ انہوں نے اپنے بعض ہم عصروں کے بے وقت انتقال پر آنسو بہائے ہیں ۔ جن میں ان کی انسان دوستی اور سچی محبت اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ مولانا گرامی، طالبؔ، سرور جہاں آبادی، نادر کاروی، چکسبت لکھنوی وہ حضرات تھے جن کے اشعار کلام محروم کے ساتھ ساتھ بازیب اورق مخزن ہوئے۔ محرومؔ کو ان سے غائبانہ انس تھا۔ مگر وائے محرومی کہ وہ دیکے بعد دیگر ے چل بسے۔ گرامیؔ اور طالبؔ تو خیر عمر طبیعی کو پہنچ لیے تھے گو ان کے جانے سے شاعری کو نقصان پہنچا۔ مگر سرور، نادر اور چکسبت جوانی میں اس جہاں سے رخصت ہوئے۔

محرومؔ نے اپنی نظم " سرور جہاں آبادی" میں سرور کی یاد کو کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے۔

ساقئیے بزم سخن کے گو ہیں متوالے بہت
ہیں عروس شاعری کے چاہنے والے بہت
روتے ہیں چھم چھم دلوں میں پھوٹ کر چھالے بہت
اٹھتے ہیں دست دعا بن کے گو نالے بہت
ہے مگر وہ شاہد رعنا ترے آغوش میں
جو شش گریہ کا عالم غیر کے سر جوش میں
(گنج معافی
،ص :۷۰)

جبکہ چکبستؔ کا ذکر اپنی نظم "نوحہ چکبست" میں کچھ یوں کرتے ہیں ۔

سخن طرازوں میں چکبست بیمثال رہا
شہید جلوئہ معنی وہ خوشخصال رہا
متاع سوز قدیمی سے مالا مال رہا
کہ شمع انجمن دانش و کمال رہا
مٹا دیا اسے سفاک نے مٹانا تھا
کہ زد پہ تیرا اجل کی بڑا نشانہ تھا
(گنج معانی ،ص
:٤٤٢)

انسان دوست محرومؔ کی خواہش تھی کہ پوری ہندوستانی قوم مذہبی، تہذیبی اور لسانی اختلافات کو نظر انداز کر کے انسان دوستی، باہمی محبت اور اخلاص کو اپنا شعار بنا لے۔ لیکن ان کی توقع اور آرزو کے خلاف ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے تھے۔ جس سے وہ بہت دلبرداشتہ اور دکھی ہوتے تھے۔ان کے نزدیک فساد کرنے والے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان قوم کے دشمن تھے۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں جب پنجاب میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تو اس پر مظلوم عوام پر جو ظلم کے پہاڑ توڑے گئے ان کا ذکر اپنی نظم "بگڑے ہوئے پنجاب سے" میں یوں کرتے ہیں -

آج تک دیکھی سنی ہے کسی نے ایسی سرزمیں
بیگنا ہوں ، امن خواہوں کو اماں جس میں نہیں
چیر ڈالیں شیر خواروں کے جگر ارباب لیکن
بھون ڈالے جائیں یوں اپنے مکانوں میں مکیں
اس شقاوت کو شجاعت نام دیں ازراہِ شر
حیف اے پنجاب تجھ پر اور تیری تہذیب پر
(کاروان وطن ص:۲۸۷)

یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ زندگی ہماری نیک خواہشات کے اشاروں پر نہیں چلتی۔ چونکہ محرومؔ اور ان کے خاندان کو بھی ۱۹۴۷ میں دہلی آکر بسنا پڑا۔ تقسیم کے وقت اور اس کے بعد محرومؔ اور ان کے عزیزوں پر جو بیتی، فسادات نے ان کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رہ دیا۔ اگرچہ یہ آپ بیتی ہے لیکن یہ جگ بیتی بھی ہے کیونکہ جو کچھ ان کے ساتھ ہوا دونوں ملکوں کے لاکھوں آدمیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ انسان دوست محرومؔ نے ان فسادات کی تباہی و بربادی اور غارت گری کا ذکر اپنی نظم "پاکستان کو الوداع" میں کیا ہے۔ اس کے اشعار ملاحظہ کیجیے۔

کوچہ و بازار سب ویران ہو کر رہ گئے
گھر ملکیتوں کے لیے شمشان ہو کر رہ گئے
عورتوں کی عصمت اور بچوں کی جان پاک پر
وہ ستم ٹوٹے کہ فریادیں گئیں

افلاک پر
محشر آرائی سے تیری جو ستم کش بچ گئے
بے سرو ساماں وہ نکلے ڈھونڈنے کو گھر نئے
(کاروان وطن، ص:۳۰۹)

محرومؔ کی شاعری کا خاص وصف صلح و محبت کی تلقین ہے۔ دنیا کے سب بڑے بڑے مذہبی پیشواوں کی خوبیاں جناب محروم کے پیش نظر ہیں ۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان والے سب کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور ان کی بیش بہا زندگیوں سے سبق حاصل کریں ۔

محرومؔ اگرچہ ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے اور ان کے عقائد بھی ایک عام ہندو کے سے ہیں ۔ لیکن اس سب کے باوجود ان میں وسیع المشربی، رواداری اور بے تعصبی کی خوبی موجود ہے۔ ان کے دل میں ہر مذہب کے لوگوں کا احترام ہے۔ انسان دوست محروم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر مذہب کی خوبیوں کو پیش نظر رکھتا ہے اور خامیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ وہ مذہبی عقائد کی نزاعی باتوں کو پس پشت ڈال کر امن اور پیار و محبت کا درس دیتا ہے۔ ان کے خیال میں ہر انسان دوسرے انسان کی ہمدردی، محبت اور خلوص کا مستحق ہے۔ چاہے اسکا مذہب کچھ بھی ہے۔سب کے درمیان ایک انسانیت کا رشتہ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مذہبی تفریق سے بالا تر ہو کر مختلف مذاہب کے ہادیان دین ،رہنماوں اور بانیان مذاہب پر متعدد نظمیں لکھیں ۔ اس میں پیغمبر اسلام، حضرت علی، حضرت امام حسین،حضرت عیٰسی ، گورونانک ، گورو گوبند سنگھ، رام کرشن اور مہاتما ہنس راج کی سیرت اور تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی۔

انسان دوست محرومؔ کی ایک نظم "سیرت نبوی کی ایک مثال" میں حضرت محمد ؐ کی انسان دوستی اور انسانی ہمدردی کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے کہ جب حضرت محمد ؐ ایک مسجد میں بیٹھے ہیں ایک یہودی کا جنازہ آنے پر تعظیماً اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ۔ صحابہ ششدر رہ جاتے ہیں اور سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایک مشرک کے مردے کی تعظیم کیوں کی گئی ۔ پوچھنے پر جواب ملتا ہے۔

یہ فرمایا مجھے معلوم ہے وہ نا مسلماں تھا
میسر ہو سکی اس کو نہ توفیق خدا جوئی
مگر اس بات سے انکار ہرگز ہو نہیں سکتا
اسی جان آفرین پاک کی تخلیق تھا وہ

انسان دوست محرومؔ کی انسان دوستی، ہمدردی، خلوص، شفقت صرف انسانوں تک محدود نہیں بلکہ وہ جانوروں سے بھی شفقت و محبت کا درس دیتے ہیں ۔ یوں تو جانوروں سے محبت اور رحم کا جذبہ کسی کے بھی دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ جذبہ محرومؔ کی نظموں میں جس طرح دکھائی دیتا ہے وہ اپنی مثال آپ اور ان کی انسان دوستی کی بہترین مثال ہے۔ اس سلسلے میں ان کی چار نظمیں "بلبل کی فریاد"، چڑیا کی زاری"، مچھلی کی بیتابی" اور" کولھو کا بیل" قابل ذکر ہیں ۔ یہ چاروں نظمیں مظلوموں کی فریادوں پر مشتمل ہیں ۔ محروم کی نظم "چڑیا کی زاری" قابل توجہ ہے۔ کسی لڑکے نے جسے شاعر "بد نہاد اور نا بکار" قرار دیتا ہے۔ شرارتاً بیچاری چڑیا کا گھونسلہ توڑ ڈلا اور اس کے بچوں کو مار ڈالا۔ اسی پر وہ آہ و زاری کرتی ہے۔ نظم کی عام فضا ، چڑیا کے الفاظ، اس کے جذبات، اسکا لہجہ مل کر ہمیں حالیؔ کی مناجات بیوہ کی یاد تازہ کرا دیتے ہیں ۔ منظر بڑا دقت آمیز ہے۔

موجِ فنا میں ان کے تو نے بہا دیا کیوں ؟
ان کا نشان ہستی ظالم مٹا دیا کیوں ؟
مٹی پہ ہائے ہائے بیجاں پڑے ہوئے ہیں
کس نیند میں یہ میرے ناداں پڑے ہوئے ہیں
افسوس نسل انسانی تجھ میں وفا نہیں ہے
کہتے ہیں انس جس کو تجھ میں ذرا نہیں ہے
تجھ میں کہاں محبت جسکا ہے تجھ کو دعویٰ
تجھ میں کہاں صداقت جس پر ہے ناز بیجا

(کلام محروم، حصہ اول، ص :۸۴،۸۵)

نظم "بلبل کی فریاد" میں بلبل قفس میں بے چین و بے تاب ہے۔ وہ باغ کی آزاد فضاوں میں اڑنے کی متمنی ہے۔ اسکا دل خون کے آنسو روتا ہے جب اسے آزادی کے دن یاد آتے ہیں ۔غنچوں کا مسکرانا، پھولوں کا کھلکھلانا، دلکش گھٹائیں ، چاندنی رات کے نظارے سب اس کے سینے میں آگ لگا رہے ہیں ۔ انسان دوست محرومؔ اس دکھ اور کرب کو یوں بیان کرتے ہیں ۔

روتا ہوں خوں کے آنسو آتا ہے یاد جس دم
غنچوں کا مسکرانا ، پھولوں کا

کھلکھلانا
صحن چمن میں پھرنا وہ شب کو
چاندنی میں
دل میں سرور آنا آنکھوں میں
نور آنا
اس قید بیکسی کا کب تک تھا خیال
مجھ کو
ملجائیں کاش! واپس وہ ماہ و سال
مجھ کو
(کلام محروم حصہ
اول ص :۸۸)

انسان دوست محرومؔ اپنی نظم " کولھو کا بیل" میں کو لھو کی حالت زار کا نقشہ بیان کرتے ہیں ۔ وہ کو لھو کا بیل جو اپنی آزادی کھو کر تیلی کی غلامی پر مجبور ہے۔ وہ لگاتار گھومتے رہنے سے تنگ آچکا ہے۔اس زندگی سے نجات حاصل کرنے کے لیے موت کی دعا مانگتا ہے۔

اے اجل! آ کہ ہے اک تیرا سہارا ہم
کو
تیری آنکھوں سے ہے ڈہارس کا
اشارا ہم کو
ہائے تقدیر ہی تھی دشمن جانی اپنی
زندگی دے کے جفا کار نے مارا ہم
کو
قید ہستی سے رہائی کا ہو چارا
کوئی
اب ہے درکار نہ گھاس نہ چارا ہم
کو
اے خدا! ملک عدم میں نہ ہو کولھو
کوئی
ہم کو مل جائے نہ پھر آہ! جفا جو
کوئی
(کلام محروم ،حصہ
اول ،ص :۹۱)

انسان دوست محرومؔ نے بچوں کو معاشرے کا بہتر اور فعال انسان بنانے کے لیے بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں ۔ ان نظموں میں بچوں سے مشفقانہ خطاب کر کے انہیں نصحیتیں کی گئی ہیں ۔وہ ان میں نیکی، سچائی،محنت، خوداعتمادی اور انسان دوستی جیسی خوبیوں کو فروغ دینے کے متمنی ہیں اور انہیں سستی، خود غرضی، حسد، تعصب اور بدزبانی جیسی اخلاقی برائیوں سے دور رکھنا چاہتے ہیں ۔ محرومؔ کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظمیں ان کی انسان دوستی کا منہ بولتا ثبوت

ہیں ۔ ان کی نظم "کارخیر" کے اشعار دیکھئے جس میں وہ نیک کام کرنے کی تلقین کرتے ہیں ۔

مصروف کار نیک رہو تم تمام دن
تا شب کو پاؤ لذت فردوس خواب میں
پیری میں رہنا چاہو اگر نوجوان تم
دامان کار خیر نہ چھوڑو شباب میں
وہ فعل تم کرو کہ جو مانگو دعا کبھی
الفاظ یاس خیز نہ آئیں جواب میں
(کلام محروم ،حصہ اول، ص:۱۳۷)

محرومؔ بچوں کو محنت کی ترغیب دیتے ہیں ۔ کیونکہ محنت کر کے ہی معاشرے سے افلاس، تنگ دستی اور بھوک کو مٹایا جا سکتا ہے اور ایک پرا من اور انسان دوست معاشرے کا قیام عمل میں لایا جا سکتا ہے۔انسان جس قدر محنت کرتا ہے اتنا ہی چمکتا، نکھرتااور سنورتا چلا جاتا ہے ۔در حقیقت زندگی محنت، خلوص اور دیدہ ریزی سے عبارت ہے۔ اس دنیا میں کامیابی اس کے قدم چومتی ہے جو مسلسل محنت کرتا ہے اور پھر انسان کی تدبیر اللہ کی تقدیر بن جاتی ہے۔ بن محنت کچھ ہاتھ نہیں آتا ۔ محرومؔ اپنی نظم "محنت" میں محنت کی اہمیت کو یوں بیان کرتے ہیں ۔

کاہل جو ہیں جہاں میں ان کا مال دیکھو
افلاس کے سبب سے ہیں خستہ حال دیکھو
رہتے ہیں ہر گھڑی وہ غم سے نڈھال دیکھو
جو لوگ محنتی ہیں وہ ہیں نہال دیکھو
محنت کرو عزیزو ! محنت سے کام ہوگا
(کلام محروم، حصہ اول ،ص :۱٦۰)

محرومؔ بچوں کی اخلاقی تربیت کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں اور انہیں برائیوں سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں ۔ اپنی نظم "نوجوانو ! شراب سے بچنا" میں انہیں شراب کے مضر اثرات سے آگاہ کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے انسان انسانیت کے بلند مقام سے گر کر حیوانیت کی پست سطح پر آجاتا ہے۔ اس کے حواس مختل ہو جاتے ہیں اور وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو کر اچھے برے کی

تمیز بھول جاتا ہے۔اور یوں معاشرے کا امن و امان تباہ ہو جاتا ہے۔اس لیے نوجوانوں کو اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں ۔

نوجوانو! شراب سے بچنا
اثر زہر ناب سے بچنا
آب آتش لباس ہے یہ مے
رنگ سے آب و تاب سے بچنا
اس سے کب دل کی پیاس بجھتی ہے
ہاں فریب سراب سے بچنا
میکدہ یہ نہیں جہنم ہے
دور رہنا ! عذاب سے بچنا
(گنج معانی، ص :۳۴۸،۳۴۹)

انسان دوست محرومؔ بچوں کو رحمدلی جیسا وصف بھی اپنانے کی تلقین کرتے ہیں ۔ کیونکہ رحمدلی انسان دوست معاشرے کی بنیاد ہے۔جس معاشرے میں یہ صفت موجود ہو وہ معاشرہ امن و خوشحالی کا گہوارہ بن جاتا ہے۔رحمد لی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور انسانیت کی معراج ہے۔ محرومؔ کی نظم "رحم" کے چند اشعار دیکھئے۔

لیکن عصا سے رحم کا ہے مرتبہ بلند
نسبت عصا کو ہاتھ سے ہوتی ہے بیگماں
اور رحم تخت دل سے ہے شاہوں کے حکمراں
ہے رحم وصف خاص خداوند پاک کا
جب اس کا جلوہ ساتھ ہوا عدل کے عیاں
پیدا وہیں بشر میں ہوئی شان قدسیاں
(گنج معانی، ص:۳۸۰)

محرومؔ کی انسان دوستی ان کی نظم "نصیحت" کے چند اشعار میں بھی جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ جس میں وہ پیار و محبت کا درس دیتے ہیں اور دوسروں کو کسی بھی قسم کی تکلیف نہ دینے کی تلقین کرتے ہیں ۔

ہر ایک سے کیجئے محبت
چند ایک پہ اعتبار لیکن
دیجیے نہ کبھی کسی کو ایذا
طاقت میں عدو سے کم نہ رہے

لیکن کیجئے نہ پیش دستی
(گنج معانی،
ص:۳۸۸)

حفیظ جالندھری تلوک چند محرومؔ کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں ۔

تلوک چند محرومؔ زندگی کے اور معاملات میں محروم ہوں تو ہوں لیکن مبداء فیض نے ان کو جو کچھ دے رکھا ہے اس کو دیکھتے ہوئے کون ہے جو ان کو محروم کہہ سکے شاعر اور پھر تلوک چند محرومؔ کے مرتبے کا شاعر ہونا بہت بڑی بات ہے۔ان کی شاعری ہر لحاظ سے انسان کے قلب و نظر میں شریفانہ بلند نظری پیدا کرنے کا فریضہ دیتی نظر آتی ہے۔جس طرح سے وہ مکاتب تعلیم و تعلم میں استاد رہ چکے ہیں اسی طرح ان کی شعر و شاعری بھی مکتب سخن کے اطفال کی ذہنی رہنمائی کرتی ہے۔ اس میں محرومؔ کی شاعری کے کمالات کے ساتھ ہی ایک بلند شخصیت کا مرقع بھی ہے جو ابتدا سے انتہا تک انسانیت کی راہوں پر چلنے والوں کی رہنمائی کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔

اقبالؔ اور معاصرین اقبالؔ کی شاعری میں ملی، مذہبی، تہذیبی، اقتصادی اور اخلاقی شاعری کے نمونے بکثرت ملتے ہیں ۔خاص طور پر یہ عہد حب وطن، حب قوم، انسان دوستی، خلوص، قناعت، راست بازی، جرات مندی، اور ہمدردی کا بہترین عکاس ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ دور مقصدی اور رومانوی شاعری کے درمیان پل کا کام دیتا ہے۔ مجموعی طور پر اس دور میں اقبالؔ کے اثرات زیادہ نمایاں اور دور رس دکھائی دیتے ہیں ۔ محولا بالا شعرا کے علاوہ سرور جہاں آبادی، علی حیدر نظم طباطبائی، احمد علی شوق قدوائی، مولوی وحید الدین سلیم، عظمت اللہ خان وغیرہ کے ہاں بھی اقبالؔ کے فنی وفکری اثرات کا رنگ نمایاں انداز میں دیکھا جا سکتا ہے۔

cd

باب سوم

تر قی پسند نظم میں انسان دوستی کے میلا نا ت

۱۔ تر قی پسند تحر یک اور انسان دوستی
۲۔ جو ش اور انسان دوستی
۳۔ فراق اور انسان دوستی
٤۔ مخدوم محی الد ین اور انسان دوستی
٥۔ اسرا الحق مجا ز اور انسان دوستی
٦۔ فیض احمد فیض اور انسان دوستی
ے۔ علی سردار جعفری اور انسان دوستی
ے۔ احسان دانش اور انسان دوستی
۹۔ احمدند یم قا سمی اور انسا ن دوستی
۱۰۔ عا رف عبد المتین اور انسا ن دوستی
۱۱۔ حبیب جا لب اور انسا ن دوستی
۱۲۔ حو الہ جا ت

Fe

تر قی پسند تحر یک اور انسا ن دوستی

رو ما نیت اور حقیقت نگا ری کی تحر یکیو ں نے ایک طویل عرصے تک الگ الگ سمتوں میں اپنا سفر جاری رکھا ۔ اور جب تر قی پسند تحر یک کا آغا ز ہو ا تو یہ دو نو ں دھا رے آپس میں مل گئے۔درا صل یہ زما نہ سما جی اور سیا سی تحر یکیوں کے لیے اس لیے بھی سا زگا ر تھا کہ عوام اب اپنی جا نب دیکھنے پر ما ئل ہو چکے تھے اور غلا می کا جوا اتارنے پر آماد ہ تھے ۔ روس کے انقلاب عظیم نے دنیا بھر کے نچلے طبقے کی آنکھیں کھو ل دی تھیں اور سما جی انصاف اور مسا وات ممکن العمل نظر آنے لگے تھے ۔چنا نچہ اس دور میں ہندو ستان میں جو تحر یکیں پید ا ہوئیں ان میں مجبو ر ،لا چار اور بے بس انسان کی طر ف زیادہ تو جہ دی گئی ۔ "پر یم چند نے انسانی قدروں کا احترام کیا اور ہند وستان کے مظلوم عوا م کو اپنی ذات پر اعتماد کرنا سکھا یا"۔

پر یم چند جیسے افسانہ نگا رنے اپنی کہا نیوں کے ذریعے بھوک ، بیماری ، بیکا ری ، جہالت ، اور تو ہم پر ستی کے مسائل کو اجا گر کیا اور ایک عام فرد کی ذہنی الجھنوں ، سما جی بند شوں ، معا شر تی پیچید گیوں اور ان سے پید ا ہو نے والے غموں کو منظر عام پر لا نے کی بھر پو ر کو شش کی۔"ڈاکٹر سید عبداللہ نے اردو ادب میں چوٹی کے جن تین ناموں کا انتخاب کیا ہے ان میں سر سید اور اقبال کے ساتھ تیسرا اہم نا م پر یم چند کا ہے"۔

تر قی پسند تحریک کے ادیبوں نے پہلی ضر ب اخلا قیا ت پر لگاتے ہو ئے معا شرے کی چند اہم قدروں کے خلاف علم بغا وت بلند کیا ۔ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا مقالہ "ادب اور زند گی " اس لحا ظ سے اہمیت کا حا مل ہے کہ اس نے وہ اساس مہیا کی جس پر بعد میں تر قی پسند تحر یک نے اپنا سفر جا ری رکھا ۔

ڈاکٹر اختر حسین نے یہ بارو کرانے کی کو اشش کی کہ

اوّل : صحیح ادب کا معیا ر یہ ہے کہ وہ انسا نیت کے مقصد کی تر جما نی اس طر یقے سے کرے کہ زیادہ سے زیا دہ لوگ اس سے اثر قبول کر سکیں اس لیے دل میں خد مت خلق کا جذ بہ پہلے ہو نا چاہیے۔

دوم : ہر ایما ندار اور صا دق ادیب کا مشر ب یہ ہے کہ قوم و ملت اور رسم و آئین کی پابند یوں کو ہٹا کر زند گی ، یگانگی اور انسا نیت کی وحد ت کا پیغام سنائے ۔

سوم: ادیب کو رنگ و نسل اور قو میت اور و طنےت کے جذبات کی مخالفت اور اخو ت اور مسا وات کی حما یت کر نی چا ہیے اور ان

تمام عناصر کے خلا ف جہاد کا پر چم بلند کرنا چا ہیے جو دریائے زند گی کو چھو ٹے چھوٹے چوبچوں میں بلند کرنا چا ہتے ہیں ۔

اختر حسین رائے پوری کے خیالات وہی ہیں جن کا عملی اظہار "انگا رے" اور" شعلے " کے افسا نو ں اور احمد علی کے بیان مطبو عہ "لیڈر" میں کیا گیا تھا ۔ تا ہم اختر حسین رائے پوری کو تر قی پسند تحر یک کے ا ولین مشعل برداروں میں شا مل کرنا ا س لیے ضروری ہے کہ انہوں نے اس تحر یک کی تنقید ی جہت تلا ش کی اور عوامی بہبو د کو ادب کا اہم حصہ قرار دے کر زند گی اور ماحول کی تر جما نی پر ما مو رکر دیا ۔ چنا نچہ جہاں ادیب کو غریبوں اور مظلو موں کی بے حسی زا ئل کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ وہاں یہ بھی واضح کیا گیا کہ ادب کا مو ضو ع غر یب لو گ ہیں اور انہی کی حالت بد لنے سے سماج عر وج کی راہ ریکھ سکتا ہے ۔ پس ادب کا وہ قاری جسے ادب کی تخلیق کے وقت پیش نظر رکھنا ضر وری قرار دیا گیا غریب عوام ہی تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جا ئے تو تر قی پسند تحریک کے آغا ز ہی سے اس کی عوام دوستی اور واقعیت نگاری کا سراغ ملتا ہے ۔

ڈاکٹر اخترحسین رائے پوری کے ان تصورات کی با ز گشت مستقبل میں سا منے آنے والی تر قی پسند تحریک میں متعد د مر تبہ سنی گئی ۔ اور اس تحریک کا باضا بطہ منشور سامنے آیا تو اس میں بھی ان کی صد اموجود تھی۔

تر قی پسند تحریک میں سجاد ظہیر کا نام اسا سی حیثیت کا حامل ہے ۔اس تحر یک کا عر وج ان کی تنظیمی صلاحیتوں کا مر ہون منت ہے ۔ سجا دظہیر کی زند گی میں ۱۹۳۵کا سال بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اس سال چند ہند وستانی نو جوانوں نے لندن کے نان کنگ ریستوران میں Indian progressive .... Writer's Associationکے نا م سے ترقی پسند ا دبا کی انجمن قا ئم کی ۔ جس میں ملک راج آنند کو صد ر منتخب کیا گیا۔ سجاد ظہیر اس تر قی پسند انجمن کے روح رواں تھے۔ لندن میں ہند وستانی تر قی پسند ادیبوں نے اپنی تحر یک کا پہلا مینی فیسٹو تیا ر کیا ۔"جس پر ڈ اکٹر راج آنند، سجا د ظہیر،ڈاکٹر جیو تی گو ش ، ڈاکٹر کے ایس بھٹ ، ڈاکٹر ایس سنہا اور ڈاکٹر محمد دین تا یثر نے دستخط کیے"۔

لندن میں منعقد منشور میں یہ طے پایا ۔

اپنے ادب اور دوسرت فنون کو بچا ریوں اور پنڈ توں اور دوسرے قد امت پر ستوں کے اجارے سے نکال کر عوام سے قریب تر لا یا جا ئے ۔ انہیں زند گی اور وا قعیت کا آئینہ دار بنا یا جا ئے جس سے ہم اپنا مستقبل روشن کر سکیں ۔ ہم ہند و ستان کی تہذ یبی روایات کا تحفظ کر تے ہوئے اپنے ملک کے انحطا طی پہلو وں پر بڑی بے رحمی سے

تبصرہ کریں گے اور تخلیقی و تنقیدی اند از سے ان سبھی با توں کی مصوری کریں گے جن سے ہم اپنی منز ل تک پہنچ سکیں ۔ ہمارا عقید ہ یہ ہے کہ ہندو ستان کے نئے ادب کو ہماری مو جودہ زند گی کی بنیا دی حقیقتوں کا احترام کرنا چا ہیے اور وہ ہے ہمار ی روٹی کا، بد حا لی کا، ہماری سما جی پستی کا اور سیا سی غلا می کا سوال ۔ ہم اس وقت ان مسا ئل کو سمجھ سکیں گے ہم میں انقلا بی روح بیدار ہو گئی ہے۔ وہ سب کچھ جو ہمیں انتشار ، نفاق اور اند ھی تقلید کی طر ف لے جاتا ہے قد امت پسند ی ہے اور وہ سب کچھ جو ہم میں تنقیدی صلا حیت پید ا کرتا ہے، جو ہمیں عزیز روایا ت کو عقل و ادراک کی کسوٹی پر پر کھنے کے لیے اکساتا ہے، جو ہمیں صحت مند بناتا ہے اور ہم میں اتحا د اور یک جہتی کی قو ت پید ا کرتا ہے اس کو ہم ترقی پسندی کہتے ہیں ۔

اس اعلا ن نا مے پر نظر ڈالیں تو بے حد خو ش آئند اور انسا ن دوست نظر آتا ہے ۔ اس میں ادب کو نسلی تعصب ، فر قہ پرستی اور انسا نی استحصال کے خلا ف استعمال کر نے اور اسے عوام کے قر یب تر لا نے کا عہد نما یا ں ہے اور اس کے ساتھ سا تھ بنیا دی حقیقتوں کا احترام بھی ضروری ہے۔ جن میں روٹی، بدحالی، سما جی پستی اور سما جی غلا می کا سوال قا بل توجہ ہے۔

تر قی پسند تحر یک کی ابتد ا اگر چہ نا مسا عد حالا ت میں ہو ئی تھی ۔ تا ہم ہند و ستان میں اس تبد یلی کو قبول کر نے کے لیے فضا مو جو د تھی ۔ تر قی پسند تحر یک کی پہلی کلی ہند کا نفر نس ۱۵اپر یل ۱۹۳٦ کو لکھنو میں منعقد ہو ئی۔ جسکی صدارت منشی پر یم چند نے کی ۔ اس کا نفر نس میں سب سے اہم چیز منشی پر یم چند کا خطبہ صدارت تھا۔ جس میں انہوں نے ادب کی دائمی قد روں کو اجاگر کیا اور حسن صداقت ، آزادی اور انسان دوستی کو اعلیٰ ادب کا جز و لا ینفک قرار دیا ۔

چونکہ تر قی پسند ادب کے بنیا دی مقا صد انسا نیت اور آ ز ادی کی جد و جہد تھے اس لیے اس تحر یک کے قلم کاروں نے اپنی انسا ن دوستی کا ثبو ت پیش کر تے ہو ئے غریب عوام ، محنت کشوں ، مز دوروں اور کسانوں کے حقو ق کے لیے مسا وات کا علم بلند کیا اور سما ج میں ظلم و جبر اور استحصا ل کے خلا ف آواز بلند کی ۔ چنا نچہ تر قی پسند مصنفین نے اپنے پہلے اعلا ن نا مے میں اس با ت کا اقرار کیا کہ

ہم چا ہتے ہیں کہ ہند وستان کا نیا ادب ہماری زند گی کے بنیا دی مسا ئل کو اپنا مو ضو ع بنا ئے یہ بھوک ، افلا س ،سما جی پستی اور غلا می کے مسا ئل ہیں ۔ ہم ان تما م آثا ر کی مخالفت کر یں گے۔ جو ہمیں لا چاری ، سستی اور تو ہم پر ستی کیطرف لے جاتے ہیں ۔

ان قلم کا روں نے اپنی تحر یروں کے ذریعے اس بات کا پر چار کیا کہ وہ بنی نوع انسا نیت کی خد مت کرنا چاہتے ہیں ۔ تر قی پسند مصنفین نے ادب اور زند گی ،ادب اور عوام کا نعرہ بلند کر کے اس ٹو ٹے ہو ئے ر شتے کو جوڑنے کی کوشش کی ہے تا کہ وہ بلند منز ل حاصل ہو سکے جہاں ادیب عوام کے بہت قریب آجاتا ہے اورحسن اورانسانیت کی جد و جہد کا مغنی بن جا تا ہے۔ اس انجمن کی پہلی کا نفر نس کا خطبہ صدارت دیتے ہو ئے منشی پریم چند نے فرمایا تھا۔

ہماری نگا ہِ حس عا لمگیر ہو جائے گی۔ تب ہم اس معا شرے کو بر داشت نہ کر سکیں گے کہ ہز اروں انسان ایک جا بر کی غلا می کریں ۔ تب ہماری خود دار انسا نیت اس سر ما یہ داری اور عسکریت اور ملو کیت کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گی ۔ تب ہم صرف صفحہ کا غذ پر تخلیق کر کے مطمین نہ ہو جا ئیں گے بلکہ اس نظام کی تخلیق کریں گے جو حُسن اور مذاق ، خود داری اور انسا نیت کا منا فی نہیں ہے۔ ادیب کا مشن محض نشا ط اور محفل آرائی اور تفر یح نہیں ہے۔ اس کا مر تبہ اتنا نہ گرائیے ۔ وہ و طنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ ان کے آگے مشعل دکھا تی ہو ئی چلنے والی حقیقت ہے۔

منشی پریم چند ہی کے ہم ز بان اس ملک کے مشہو ر بنگا لی ادیب رابند ر نا تھ ٹیگور بھی تھے جو سر زمین وطن سے دکھ اور غم و اند وہ کو مٹانے کے متمنی تھے ۔ ان کے خیال میں ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ ہر انسان میں امید اور مسرت کا پیغام عام کر ے اور کسی کو بھی نا امید اور ما یو س نہ ہو نے دے ۔تر قی پسند مصنفین کے نام خط لکھتے ہو ئے ٹیگو ر نے ان کو یہ پیغام دیا کہ

عوام سے الگ رہ کر ہم بیگا نہ محض رہ جا ئیں گے۔ ادیبوں کو انسا نوں سے مل جل کر انہیں پہچاننا ہے ۔ میری طرح گو شہ نشین رہ کر ان کاکام نہیں چل سکتا ۔میں نے ایک مد ت تک سما ج سے الگ رہ کراپنی ریافیت میں جو غلطی کی ہے اب میں اسے سمجھ گیا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ آج یہ نصیحت کر رہا ہوں ۔ میرے شعور کا تقا ضا ہے کہ انسانیت اور سما ج سے محبت کر نا چا ہیے ۔ اگر ادب انسا نیت سے ہم آہنگ نہ ہو ا تو وہ نا کام و نامراد رہے گا ۔ یہ حقیقت میرے دل میں چراغ حق کی طرح روشن ہے اور کو ئی استدلال اسے بجھا نہیں سکتا ۔

پر یم چند کے خطبے نے تر قی پسند تحریک کے منشور کے لیے اسا سی حیثیت اختیار کر لی اور بعد ازاں اس تحر یک کے زیر اثر ہو نے والی شا عر ی کے لیے سمت متعین کر نے میں کلید ی کردار ادا کیا ۔

اس تما م بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تر قی پسند تحریک انسا ن دوستی کا پیغام عام کر تی ہو ئی دکھا ئی دیتی ہے لیکن کیسی انسان دوستی؟ اس کا جا ئز ہ لیا جا ئے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ دیکھا جا ئے تو انسان دوستی کی دو اقسام ہیں ۔ ایک بورژوا انسا ن دوستی ہے جس کا مقصد عا رضی طور پر کسی غریب یا مصیبت زدہ انسان کی مد دکر دی جا ئے یا رفاہ عامہ کا کو ئی کام سر انجام دے دیا جا ئے۔ لیکن اس سما جی نظام کو ہر حا لت میں قا ئم رکھا جا ئے جو انسان کے مصائب اور دکھوں کا ذمہ دار ہوتا ہے۔اس کے مقابلے میں انقلا بی انسا ن دوستی کا مقصد اس سما جی نظام کو بدل کر لوگوں کے دکھوں کا مد اوا کرنا ہوتا ہے۔ جو عوام کے مصا ئب اور دکھوں کا سر چشمہ ہو تا ہے ۔ تر قی پسند تحر یک دراصل اسی انقلا بی انسان دوستی کی حما یت کرتی ہے۔ ترقی پسند شاعر اپنے فن میں انسان کی عظمت اور تازہ کاری کی عکا سی کرتا ہے اور اسے رجا ئیت کا پیغام دیتا ہے کہ جبر و استحصال کی قو توں کے خلا ف انسان کی جد و جہد ہی ایک نئے خو شحال اور خیرآگیں معا شرے کی تخلیق کر تی ہے۔ تر قی پسند شا عر قنو طیت اور ما یو سی کی مخالفت کرتا ہے اور انسا ن دوستی کے ایک درخشاں مستقبل کی نو ید دیتا ہے۔ جب عالمی سطح پر استحصالی قو تیں دم توڑ دیں گی تو محنت کش عوام کے اتحاد کی صور ت میں انقلا بی انسا ن دوستی ار تقا پذ یز ہو گی۔

تر قی پسند نظم کے ذریعے نچلے طبقوں کو جو عز ت واحترام اور اہمیت دی گئی اس کے نتیجے میں انسان کی عظمت اورانسان دوستی کو نمایا ں کر نے میں خا صی مد دملی۔ آئیے ان عز ائم اور جذبات کے آئینے میں تر قی پسند شعرا کے کلام میں انسان دوستی کا جا ئزہ لیں ۔

جو ش ملیح آبادی اور انسان دوستی (۱۹۸۲۔۱۸۹۶)

جو ش ملیح آبادی بیسویں صدی کے ان با کمال شا عروں میں سے تھے جن کی نظیر ملنا مشکل امر ہے ۔ بیسویں صدی میں ٹیگور اور اقبالؔ کے بعد جتنی عز ت ، شہرت اور مقبولیت جو ش کو نصیب ہو ئی کسی دوسرے شا عر کے حصے میں نہیں آئی ۔ جو شؔ کی نظم گو ئی میں ایک پو رے عہد کی گونج سنا ئی دیتی ہے ۔ وہ اپنے عہد کے ایک نما ئندہ شا عر ہیں ۔ جو اس عہد پر اپنی نظم گو ئی کے حوالے سے گواہ بھی بنے اور تا ریخ سا ز بھی۔ جو شؔ نے اپنے عہد کا نقشہ ان الفا ظ میں کھینچا ہے ۔

بے شک میں عجیب انسان ہوں لیکن اس بات کو نہ بھولا کہ میں ایشیا کا با شندہ ہوں ۔ وہ ایشیا جو روایات ، اقوال اور اوہام کا پائے تخت ہے ۔ وہ ایشیا جہاں لا کھوں سال سے بھو توں ، چڑ یلوں ، شہید مردوں ، جنوں اور فرشتوں کی کہا نیوں کی چھا وں میں بچوں کو سلا یاجا رہا ہے ۔ جہاں "الف لیلیٰ" اندر سبھا" ، چہار درویش" اور"طلسم ہو ش رہا " کے عقلیں چگ لینے والے سا ئے میں ذہنوں کوپالا پو سا جا رہا ہے اور جہاں بر اہیں قا طع کی گردونوں پر صدیوں سے کشف وکرامات کی چھر یاں چلا ئی جا رہی ہیں ۔ اس ایشیا میں کسی خاص مفکر کا پیدا ہونا ایک محال امر ہے۔

اس دور میں شعرا کی انفرادی ،تخلےقی کاوشیں ایک مرکز پر سمٹ کر اجتماعی جدوجہد کی صورت اختیار کر لیتی ہیں ۔ اس اجتماعیت کا سہرا ترقی پسند تحریک کے سر جاتا ہے۔ جس نے ایک باضا بطہ منشور تحر یر کر کے ادےبوں اور شاعروں کی ایک خاص سمت راہنمائی کی۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیا دی مسائل کو اپنا موضوع بنا ئے یہ بھوک،پیاس،سماجی پستی اورغلامی کے مسائل ہیں ۔ ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے۔ جو ہمیں لاچاری سستی اور تو ہم پرستی کی طرف لے جاتے ہیں ۔

اس اقتبا س سے واضح ہوتا ہے کہ اس عہد کے شعرا کے ہاں اقتصادی زبوں حالی اور سماجی پستی کے مسائل کس قدر اہمےت رکھتے ہیں ۔ انگرےزوں کے فر وغ کردہ سرمایہ داری نظام نے غرےبوں ،کسانوں اور کا شتکاروں کے لیے زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا تھا۔ صنعتی انقلاب کے باعث مزدوردں کا طبقہ فاقہ کشی کا شکارہوا۔ دوسری جنگ عظےم کی تباہ کارےوں نے جہاں ہندوستان کو متاثرکیا وہاں قحط بنگال نے کا روبار حیات کو تہ وبالا کر دیا۔ مہنگائی اور فاقوں نے عوام کا رہاسہاخون بھی نچوڑ لیا۔ان حالات میں ہمارے شعرانے اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ان کی شاعری میں انسان دوستی کی گونج سنائی دینے لگی ۔ اس سلسلے میں جو ش ؔ، فیضؔ ، مجا زؔ ، جذ بیؔ ، مخدومؔ ، قا سمیؔ ، اختر ؔالا یمان اور ظہیر کا شمیری نے بے شمار ایسی نظمیں لکھیں جو ان کی انسان دوستی کی غما ز ہیں ۔

انسا ن دوست جو شؔ کی شا عر ی میں انسا نیت کا درد مو جود ہے ۔ انقلا ب و بغا وت کے تمام عنا صر انسا نیت کے دردکے پر تو ہیں ۔ جو شؔ کا دل ابتد ا ہی سے سیا سی و سما جی مسا ئل ، معا شرتی نا ہمواری اور مذ ہبی اجار ہ داری کے خلاف بھڑکتا رہا ہے ۔ اور یہی اجتما عی رو یہ ان کی شا عر ی میں بجلی کی سی کڑ ک کی صورت میں ظاہر ہوا

ہے ۔ سما جی اصلاح کے طور پر ان کی شاعری نے ایک تا زیا نے کا کام ضرور کیا ہے۔ جو شؔ کی انسان دوستی کی بہتر ین مثال ان کی نظم "کسان" میں ملتی ہے ۔ جس میں کسی نواب یا راجہ کا قصیدہ نہیں بلکہ ایک کسان کے کردار کو بڑی خو بی کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ ان کے نز دیک یہ کسان ار تقا کا پیشوا ، تہذ یب کا پر وردگا ر، تا جدار خاک ، امیر بوستان، ماہر آئین قدرت اور کھیتوں کا بادشاہ ہے ۔

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا ، تہذیب کا پروردگار
وارث اسرارِ فطرت ، فاتح امید و بیم
محرم آثار باراں واقفِ طبع نسیم
صبح کا فرزند خورشید زرفشاں کا علم
محنتِ پیہم کا پیماں سخت کوشی کی قسم
(شعلہ وشبنم، ص:۱۹،۲۰)

انسا ن دوست جو شؔ حال سے شد ت کے سا تھ نا آسو دگی ظاہر کرتے ہیں اور ہر قیمت پر اسے بد لنا چا ہتے ہیں ۔ کیونکہ وہ انسان جو اپنی محنت و مشقت سے دوسروں کے گھروں میں خو شیوں کے چراغ روشن کر تا ہے ۔ خود سر مایہ دار انہ استحصال کے باعث زند گی کی بنیادی سہو لیا ت سے محروم رہتا ہے ۔ جو شؔ اس نا انصا فی اور ظلم و ستم کے خلا ف آواز بلند کر تے ہیں اور ہر اس شخص کو ہد فِ تنقید بنا تے ہیں ۔ جوان کسا نوں اور کا شتکاروں کو ان کے بنیا دی حق سے محروم کر تے ہیں ۔

سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا
بے ردا بیوی کا سر ، بچوں کا منہ اترا ہوا
سیم و زر ، نان و نمک ، آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک دل اور یہ سوگواری ہائے

ہائے
یہ ستم اے سنگ دل سرمایہ داری
ہائے ہائے
(شعلہ و شبنم،
ص: ۳۹)

پھر جو شؔ کی انسا ن دوستی بام عر وج پر پہنچ جا تی ہے جب وہ سرمایہ دار انہ نظام کو للکارتے ہیں ۔ جو ہند وستان کے مظلوم عوام کے دکھ درد ، مصا ئب اور پر یشانیوں کا ذمہ دار ہے ۔ نظم "زوال جانبانی " کے اشعار دیکھیے۔

تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار
جن کے آگے خنجر چنگیز کی مڑتی ہے دھار
بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہیں تیرے ہاتھ
کیا چبا ڈالے گی اوکمبخت! ساری کائنات
ظلم اور اتنا کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی
(شعلہ و شبنم،
ص:۴۰،۲۲)

جو شؔ انسا ن دوستی کا یہ جذ بہ نظم کے علا وہ نثر میں یوں بیان کر تے ہیں "ایک مد ت سے میرے سینے میں انسان کے باپ یعنی حضرت آدمؑ کا دل دھڑ ک رہا ہے ۔ تر قی پسند جو شؔ کے دل میں کسانوں اور مز دوروں کے لئے محبت ، ہمد ردی اور انسا ن دوستی کے جذ بات موجود تھے۔ یہی و جہ ہے کہ وہ ان کی مجبو ریوں اور مسائل پر غور کرتے ہیں ۔ وہ اپنی نظم "حسن اور مزدوری "میں جب ایک عورت کو کنکر کو ٹتے دیکھتے ہیں تو اسکی مجبوریاں اور مسا ئل ان پر آشکار ہو جا تے ہیں کہ وہ عورت جس کی کلا ئی میں کنگن جگمگانا چا ہیے۔ وہ دست نا زک تیشہ اٹھا ئے محنت و مزدوری کرنے پر مجبور ہے ۔ جو شؔ اس دستِ نا زک کو رسن سے چھڑانے کے لئے آواز بلند کر تے ہیں ۔

ایک دوشیزہ سڑک پر دھوپ میں
ہے بے قرار
چوڑیاں بجتی ہیں کنکر کوٹتے
ہیں بار بار
نازکی سے جو اٹھا سکتی نہ ہوں
کاجل کا بار
اس سبک پلکوں میں بیٹھے راہ کا
بوجھل غبار
دست نازک کو رسن سے اب
چھڑانا چاہیے
اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا
چاہیے
(شعلہ و شبنم،
ص:۸،۹،۱۰)

جوشؔ کی انسان دوستی اپنی بھر پور تو انا ئی کے ساتھ اس وقت جلو ہ گر ہوتی ہے جب وہ اپنی نظم "بھو کا ہند و ستان" میں ایک لا چار ، مجبور اور تہی دست کی مفلسی کا نقشہ کھنچتے نظر آتے ہیں ۔

آہ اے ہندوستان اے مفلسوں کی
سرزمین
اس کرئے پر کوئی تیرا پوچھنے
والا نہیں
آہ اک دل بھی تیرے افلاس پر ہلتا
نہیں
اب تو اک روٹی کا ٹکڑا بھی تجھے
ملتا نہیں
ہندو مسلم نہیں اٹھتے تیری امداد
پر
کف ہے ایسی بے حمیت ناخلف
اولاد پر
(شعلہ و شبنم
،ص:۷۸)

جو شؔ اپنی نظم "مفلسوں کی عید " میں اپنی انسان دوستی کے رشتے کو نبھا تے ہوئے ان غر یبوں کی عید کا ذکر بھی درد بھر ئے انداز میں کرتے ہیں جو اس خوشی کے مو قع پر بھی خو شیوں سے لطف اٹھا نے سے محرو م رہتے ہیں ۔

اہل دول میں دھوم تھی روزِ سعید کی
مفلس کے دل میں بھی نہ کرن تھی امید کی
فرط سخن سے نبض کی رفتار رک گئی
ماں باپ کی نگاہ اٹھی اور جھک گئی
آنکھیں جھکیں کہ دست تہی پر نظر گئی
بچے کے ولولوں کی دلوں تک خبر گئی
(نقش و نگار،ص: ۹۷)

جو شؔ اپنی نظم "ٹھنڈی انگلیاں" میں ایک مفلس بچے کے جذ بات و احسا سا ت اور خو اہشات کا ذکر عمد ہ پیرائے میں کرتے ہیں ۔ جو ایک با پ کے سامنے کھلو نے کی خا طر زار و قطار رو رہا ہے ۔ لیکن مفلسی کے ہا تھوں یہ خوشی اسکی دسترس سے باہر ہے اور مفلس باپ مجبور اور بے بس ہے ۔ان اشعار میں جو شؔ کی انسان دوستی قا بل دید ہے ۔

سرد انگلی اپنے مفلس باپ کی پکڑے ہوئے
رو رہا ہے ایک بچہ اک دکاں کے سامنے
باپ کی نمناک آنکھوں میں پئے تکمیل یاس
کیا قیامت ہے پسر کے آنکھوں کا انعکاس
دل ہوا جاتا ہے بچے کے بلکنے سے فگار
کہہ رہا ہے زیرِ لب فریاد اے پروردگار
(نقش و نگا ر،ص:۱۰۸)

جوشؔ صا حب کے چار میلا نات جن کو چار یار کہنا زیادہ ٹھیک ہو گا کے بارے میں وہ خود یوں بیان کر تے ہیں ۔"شعر گو ئی ، عشق بازی ، علم طلبی ، اور انسا ن دوستی "۔ جو شؔ تمام عمر ریا کاری کا پر دہ چاک کرتے رہے۔

ان کی تمام سیا سی ، سما جی اور مذ ہبی نظموں کے موضوعات یہی ہیں جن میں اقدارکی پا ما لی اور معا شرتی بے حسی کا ذکر ہے ۔ ان کا بنیا دی فلسفہ حیات "انسان دوستی " ہے۔ ان کے نز دیک آدمی کی خاک میں صرف پیغمبر ی ہی نہیں ہے بلکہ داوری بھی ہے ۔ انسا نیت سے ان کا رشتہ بہت گہرا قر یبی اور قلبی تھا ۔ جوش لکھتے ہیں "جب کسی گھر میں جشن ہو تا ہے میں سمجھتا ہوں وہ جشن میرے ہی گھر میں ہو رہا ہے اور جب کسی گھر میں جنازہ نکلتا ہے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ جنازہ میرے ہی گھر سے نکل رہا ہے ۔"

ایسے زما نے میں جب مذ ہب و سیا ست کی بنیا د نفرت، عداوت اور تعصب پر رکھی گئی تھی اور جب مصلحت اور منا فقت ہی معیار و فا قرار پا ئی تھی تو جوشؔ کی انسان دوستی سے نہ تو اہل سیا ست خوشؔ تھے اورنہ اہل و طن ۔ جب جوشؔ نے اپنی نظموں کے ذریعے دونوں کی ریا کاری کا پردہ چاک کر نا شروع کیا تو جو ش دشمنی کا آغازہو گیا ۔ حا لانکہ جوش ؔکی انسا ن دوستی کے پس پشت ایک عظیم تر اور وسیع تر جما لیا تی احساس اور محر ک تھا ۔ اسی احسا س حسن سے آزادی کی لو اٹھتی ہے اور غلامی کی بد صورتی سے نفرت پیدا ہو تی ہے ۔" ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب "، "وطن"۔" شکست زنداں کاخواب"۔ "تلاشی "۔ " شریک ِزندگی "۔"غلاموں سے خطاب"۔"مردِانقلاب کی آواز"۔ " درد مشتر ک "۔ " زند ہ مردے "۔ "و فا داران ازلی کا پیام "۔ "غلام ہند وستان " اور " وقت کی آواز " جیسی نظموں میں بد صورتی ، ظلم و بر بریت کی شکل دیکھی جا سکتی ہے ۔

انہوں نے آزادی کے نغمے ایسے وقت میں لوگوں کو پہنچا ئے ہیں جس وقت ہند وستا ن میں بر طانوی سا مرا جیت آزادی کا نام لینے والوں پر مظالم ڈھارہی تھی اور ان کا جینا دشوار کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنی شا عر ی کے ذریعے عوام کو انگر یز ی سامراج کے خلا ف اکسا یا۔ ان میں آزادی حاصل کرنے کا شعور پید اکیا اور غلا می سے نفرت دلا ئی ۔ ان کی نظمیں پڑھ کر اور سن کر لوگوں کی رگوں میں خون گرما جاتا تھا ۔جوشؔ کی نظم " شکستِ زند اں کا خواب" دیکھے۔اس نظم میں وہ انسان دوست شا عر کی حیثیت سے سا منے آتے ہیں ۔ اشعار دیکھئے۔

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی
ہیں تکبریں

اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے
ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع
ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں
چھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں
کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی
ہیں تدبیریں
(شعلہ وشبنم،
ص:۵۱)

تر قی پسند جو شؔ بغا وت کے ترانے گا تے ہیں ۔ یہ بغا وت آگ ، بجلی ،آند ھی اور موت سے عبارت ہے جس کے لئے ضرورت ہے کہ عوام پر چھیاں ، بھالے ،کما نیں ، تیر، تلوار وغیر ہ اٹھا کر میدان عمل میں کو د پڑیں ۔ جوش کی نظم "شکست زنداں کا خواب" میں زنداں کا پس منظر بہت عمد گی سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ زنداں ہند وستان ہے عوام قیدی ہیں جو دیواروں کے نیچے آآکر جمع ہو گئے ہیں جن کے سینوں میں تلا طم ہے بغا وت کے لئے ان قید یوں نے اپنی زنجیر یں توڑ لی ہیں دیواریں بیٹھ گئی ہیں اور انقلا بات نے پر چم کھول دیا ہے یہاں جوشؔ نے آزادی کی ولو لہ انگیز یوں کو زندہ جا وید کر دیا ہے۔

کیا ان کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے
تھے جو روح ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مارِ سیہ برسیں
گی فلک سے شمشیریں
کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل
لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی
دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ
وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھی دیواریں ، دوڑو کہ وہ
ٹوٹی زنجیریں
(شعلہ و شبنم،
ص:۷۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی جو شؔ کی انسا ن دوستی کو ان الفا ظ میں بیان کرتے ہیں ۔

جو شؔ صاحب انسان اور انسا نیت کے شا عر تھے اور اسی لیے وہ تعصبات سے پاک تھے۔ ان کی شاعر ی اس لیے کسی ایک طبقے ، ایک علا قے یا ایک فر قے کو متا ثر نہیں کرتی بلکہ ساری انسانیت کے دلوں پر حکمرانی کر تی ہے ۔ جوشؔ کی شا عری نے بر عظیم کی جنگ آزادی میں وہ عظیم کردار ادا کیا کہ شا ہدہی بر عظم پا ک و ہند کی کسی بھی زبان کے کسی اور شاعر کے بارے میں یہ بات کی جا سکے ۔ جو شؔ آزادی کے رجزخوان تھے ۔ انقلاب کی وہ دو دھاری تلوار تھے ۔ جس نے استعمار و آمریت کے خلاف مقد س جہاد کر کے اُ سے لہو لہان کر دیا۔ ان سے بڑا انقلابی شاعر اردو زبان نے پید ا نہیں کیا ۔

ترقی پسند جو شؔ سا مراجی قو توں سے نبرد آزما ہونے کے لئے عزم حسین اور اطاعت حسین کی ضرورت پر زور دیتے ہیں ۔ اپنا مر ثیہ"آوازحق" میں آزادی کی جدوجہد ان کے سا منے ایک کر بلا کے روپ میں آئی ہے ۔ ان کے نزدیک عز م حسین با طل کی قو ت سے ٹکر انے اور حق کے لئے سینہ سپر ہو نے کانام ہے ۔ اور وہی جذبہ وہ عوام میں پید ا کرنا چا ہتے ہیں تا کہ وہ انگر یزوں کے خلاف نعرہ حق بلند کرسکیں ۔

اک روز ہوا شوق مرے دل میں یہ پیدا
اس راہ سے گزرتے ہیں جو نام آور و یکتا
حالات بھی کچھ ان کے میں دیکھوں کہ وہ تھے کیا
اس شوق میں تاریخ کے اوراق کو الٹا
فہرست میں اک نام تھا جو سب سے جلی تھا
مژدہ ہو کہ وہ نام حسین ابن علی تھا
(کلیات جوش ،مراثی، ص:١٤٢)

جوش کا مر ثیہ"حسین اور انقلا ب " بھی ان کی انسا ن دوستی کا غما ز ہے ۔ اس مر ثیے میں انہوں نے استحصالی طبقے سر مایہ دار

اور انگر یز حکام کو " عہد نو کا شمر " قرار دیا ہے ۔ اور ہند وستان کی ابتر ی ، زبوں حالی اور بر بادی کو "کربلائے نو"سے تعبیر کیا ہے۔ وہ اس دور میں ایسے عزم کے متمنی ہیں جو سر ما یہ داری کا خا تمہ کر سکے اور انگر یز کی حاکمیت کو پا مال کر سکے ۔

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار
اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائبِ یزید ہیں دنیا کے شہریار
پھر کربلائے نو سے ہے نوعِ بشر دوچار
اے زندگی! جلال شہ مشرقین دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزمِ حسین دے
(کلیا ت جوش ،مرا نی،ص:٦٨)

جو شؔ نے اپنے مر ثیہ " و حد ت انسا نی " میں انسا ن کے اندر پیدا ہو ئی نفرت کد ورت اورحقارت کاخا تمہ کرنے کے لئے وحد ت انسا نی کا درس دیا ہے ۔ انہیں انسان سے عقید ت اس حد تک ہے کہ اچھے اور برے دوست اور دشمن کا کو ئی امتیاز نہیں ۔ ان اشعار میں اپنی انسا ن دوستی کو یوں بیان کر تے ہیں ۔

اے دوست دل میں گرد کدورت نہ چاہیے
اچھا تو کیا بُروں سے بھی نفرت نہ چاہیے
کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیے
کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیے
کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے یہ بھی نسیمِ بہار کا
(کلیا ت جو ش، مرا ثی ،ص:٢٠٣)

بقول فرح جمال ملیح آبادی !

حضرت جوش ملیح آبادی نے اپنی شا عری میں " انسا نیت" کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اپنی زندگی میں بھی انہوں نے انسا ن سے محبت کی ہے ۔ وہ اپنے اچھے دوستوں کے ساتھ بہت اچھے دوست تھے لیکن وہ اپنے بد تر ین دشمن کے بھی بہتر ین دوست تھے ۔ ان کی شا عر ی کا اثا ثہ " انسا ن دوستی "ہے۔ وہ انسان کو انسا ن سے صر ف زبان وتہذیب یا مذ ہب کے حوالے سے محبت و انسیت نہیں رکھتے تھے ۔

جو ؔش طبعاََ انسان دوست ہیں اور اعلی اخلا قی اقدار کا شد ید احساس رکھتے ہیں ۔ حریت ، مسا وات اور اخوت کے اصول ان کو بے حد عز یز ہیں ۔ وہ انسانی سما ج سے ظلم و زیا دتی ، مفا د پر ستی اور بد عنوا نی کا خا تمہ کر نا چا ہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے بڑے سے بڑے فر عون سے ٹکر لینے کے لیے تیار ہیں ۔ وحدت انسانی کے اس مر ثیے میں وہ انسانی مسا وات ، اخوت اور بھا ئی چارے کا درس دیتے ہو ئے کہتے ہیں ۔

بے جان و جاندار کی بنیاد ایک ہے
ارض و سما کی علت و ایجاد ایک ہے
بت سینکڑوں ہیں حسن خداداد ایک ہے
سب دل الگ الگ ہیں مگر یاد ایک ہے
یکساں ہے مال گو ہیں دکانیں جدا جدا
معنی ہیں سب کے ایک زبانیں جدا جدا

(کلیا ت جو ش، مراثی ، ص:۲۰۷)

جو شؔ کو اس با ت کا شد ت سے احسا س ہے کہ ہم اپنے مفا د ات کی و جہ سے گر وہ بند یوں میں مصروف ہیں اور ایک دوسرے کو پہچا نتے تک نہیں ۔ وہ اس تفر قہ بندی اور گروہ بندی کے خلاف ہیں جو دلوں میں نفر ت کابیج بو دیتی ہے اورجس سے محبت کے پھول مر جھا جا تے ہیں ۔

اب بھائی ہے کہ بھائی کو پہچانتا نہیں
ہم بھائی بھائی ہیں یہ کوئی جانتا

نہیں
ایک دوسرے کو دوست بھی گردانتا
نہیں
سب ایک کوکھ سے ہیں کوئی مانتا
نہیں
ارباب آشتی ہمہ تن جنگ ہو گئے
ہم جس قدر وسیع ہوئے تنگ ہو
گئے
(کلیات جو ش، مرا
ثی، ص:۲۱۱)

دین اسلام نے انسان سے محبت کا جو لا فا نی درس دیا ہے حضرت جوشؔ اسکے سب سے بڑے داعی تھے۔ انہوں نے اپنی شا عری کی اسا س عظمت انسا نی پر رکھی۔ انسا نیت کی لا زوال آفا قی محبت اور یگا نگت کا جو درس اسلام نے دیا ہے ۔ جو شؔ نے اپنی ساری زند گی اسی پر صرف کر دی ۔ اور انسان دوستی کا پیغام عا م کرتے رہے ۔ عظمت انسان کا اعتر اف ان الفا ظ میں کر تے ہیں ۔اشعار دیکھیے۔

دوزخ دہر میں گلزار جناں ہے
انساں
حلقہ زلف و خم آب رواں ہے
انساں
جنبش نبض مکاں روح زماں ہے
انساں
خاک ہے تاج محل شاہجہاں ہے
انساں
حاکم کون و مکاں ناظم دوراں
انساں
خاک اک رحل سبک سیر ہے قرآں
انساں
(کلیا ت جو ش، مرا
ثی،ص: ۲۳۹)

غرض جوشؔ انسان دوستی کے چشموں سے سب کو سیراب ہونے کی تلقین کر تے ہیں ۔ اور انسان دوستی کا پیغام عام کرتے ہیں ۔ڈاکٹر اختر ہا شمی جو شؔ کی عظمت کا اعتراف ان الفا ظ میں کرتے ہیں ۔ ان کی شا عر ی اور شا عری میں نہاں پیغام کو عوام و خواص نے سنا بھی ، سمجھا بھی، اور پھیلا یا بھی ۔ ان کی شاعر ی میں انسان بو لتا ہوا

محسو س ہوتا ہے ۔ ان کی آواز کسی ایک علا قے ، خطے ، صوبے ، ملک ، یا نسل کے لیے نہیں تھی بلکہ ان کی آواز اس عہد کے انسان کی آواز تھی جو اسے اند ھیروں سے نکالنے کے لیے بلند ہو رہی تھی ۔ جس میں وہ ایک مد ت سے حیران و پر یشان سکتے کی حالت میں کھڑا تھا ۔ ان کی آواز نئے دور کی تر قی اور دانش کا اظہار کرتی تھی۔ وہ ایک شاعر کے روپ میں ایک رہبر و رہنما کی صورت میں سامنے آئے ہیں ۔ جس طرح ڈاکٹر علامہ محمداقبال اپنی مقصدی شا عری کا علم لے کر اٹھے اور سا رے عالم پر چھا گئے ، اسی طرح جوش بھی اپنی روشن فکر کے ذریعے آج تک انسا نوں کے اذیا ن پر چھائے ہوئے ہیں ۔

پر و فیسر انجم اعظمی جوشؔ کو یوں خرا ج تحسین پیش کرتے ہیں ۔

مشا ہد ے کی اتنی قو ت ، لطیف سے لطیف کیفیت تک پہنچنے کی صلا حیت ، الفا ظ کی جا دو گری، ہستی اور کھلا ڈلا پن ، قو ت اور جبر وت، انصا ف پر ستی ،عوام بلکہ مظلوم دوستی اور ہر قسم کے شکنجوں سے بغاوت کی آواز بلند کر نے کی جرات ، یہ سب با تیں جوشؔ کو عہد آفر یں بنائے کے لئے کا فی ہیں ۔ اور انکی یہ جگمگاتی، جا گتی شا عری ہمیشہ سکون ، نشاط اور بصیر ت کے ابد ی خز انے بکھیر تی رہے گی۔

فرا ق گور کھپوری اور انسان دوستی (۱۸۹۶۔۱۹۸۲)

فر اقؔ کو بچپن ہی سے ایسا ماحول میسر آیا جس کی فضا ئیں فا رسی و اردو شا عری کے قدیم و جدید اور دلکش نغموں کی مد ھر آوازوں سے گونج رہی تھیں ۔ ان کی تعلیم و تربیت کا ئستھ گھر انوں کے رسم ورواج کے عین مطابق ہو ئی ۔

> " کا ئستھ"صرف یہ نہیں ہے کہ ہند وستان میں سب سے زیادہ انٹلکچو ئل اور کلچرڈ طبقہ تھا بلکہ ۔۔۔ ہندوستان میں کا ئستھ لو گ وہ تھے جو سب سے زیادہ مسلمانوں کے قر یب آئے اور انہوں نے اسلامی کلچر کے اتنے اجزا کو قبول کر لیا کہ ایک طرح سے ان کو آدھا مسلمان کہا جاتا تھا ۔ یعنی یہ لوگ فا رسی بولتے تھے۔ فارسی لکھتے تھے ۔ مسلمانو ں کی طرح رہن سہن رکھتے تھے۔ گفتگو میں مسلمانو ں کے کلمات ماشا اللہ انشا اللہ استعما ل کرتے تھے اور گو یا مسلم کلچر کے بہت قر یب آگئے تھے۔

فراق ؔکی نجی زند گی اگر چہ غم و آلام کا پیکر رہی لیکن وہ تمام مشکلا ت و مصا ئب کو اپنی بلند ہمتی اور بلند حو صگی سے برداشت کر تے رہے ۔ جہاں تک فراقؔ کی شا عری کا تعلق ہے ا ن کی شاعر انہ عظمت کو ان کے ہمعصر تمام بڑے شعرا اور ادبا نے تسلیم کیا ہے ۔ جس وقت فراقؔ نظم نگاری کی طر ف متو جہ ہو ئے اس وقت دوبڑے شا عر اقبالؔ اور جوش ؔنظم کو کئی ایک بلندیوں سے روشنا س کر وا چکے تھے یا کروانے میں مصروف عمل تھے۔ فراقؔ کئی ایک مقا مات پر اپنے موضوعات کے اعتبار سے ان دونوں کے قر یب آتے دکھا ئی دیتے ہیں ۔ اس کے بعد جیسے جیسے کمیو نزم و اشتر اکیت سے وابستگی پیدا ہو ئی گئی۔ قومیت و عا لمیت کے در میان فا صلوں کی خلیج میں کمی وا قع ہوتی گئی ۔ اور انہیں پو ری دنیا اور اس کے رنگا رنگ لو گ ایک و حد ت کی لڑی میں مر بوط دکھا ئی دینے لگے ۔ انہوں نے "من آنم "کے خطوط میں جو فلسفیانہ با تیں زیر بحث لا ئی ہیں ۔ ان سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں مد د ملتی ہے اور ان کی انسان دوستی کا تصور واضح ہوتا ہے خطوط کا اقتباس ملا حظہ کیجئے ۔

> ہمارا ملک ہند ووں کی ملکیت نہیں ہے نہ مسلمانوں کی ۔ یہ ملک بنی نوع آدم کا مادر و طن ہے ۔ آج بھی ہمارے سینوں میں تہذ یب کی پہلی صبحیں سا نس لے رہی ہیں ۔ ہمارے شعورپر خلقت کی دا ئمی از لیت آج بھی منڈ لا رہی ہے ۔کائنات و انسا نیت کی و حدت کے تصور سے آج بھی ہماری پلکیں نم ہو جاتی ہیں ۔ زند گی ریا ستی یا سیا سی جھگڑوں سے بڑی حقیقت ہے اور ادب بھی دو قوموں کی تھیوری سے بڑی چیز ہے ۔ البتہ ہند و ستان یاپا کستان کے ادب کو ہم غلطی سے ہند و ادب یا اسلامی ادب بتا نے اور بنا نے کی کو شش نہ کریں ۔ بڑا ادب کسی قو م کے اپنے کمال میں مست رہنے کاادب نہیں ہوتا ۔اس میں آفاقیت و مقا میت کا سنگم ہوتا ہے ۔علیحدگی ، قوموں ، تہذ بیوں ،اور فنون کے لئے موت کا باعث بن جا تی ہے ۔ ہم ہندو ستانی ضرور ہیں لیکن کراہ ارض یا کا ئنا ت کے بھی شہری ہیں ۔

فراقؔ ایک شا عرہی نہیں ایک زیر ک نقاد بھی تھے اور زند گی کے معا ملے میں ان کے پاس اپنا جواز اپنی فکر اور اپنے ہی فیصلے تھے ۔ انہوں نے زند گی کی اصل حقیقت کو سمجھنے اور پر کھنے کی بھر پور کو شش کی ۔ اس کے نشیب فراز دیکھے۔ انسان کی بے بسی ،لاچاری ،مجبوری ، حیرانی ،کشمکش کو ایک انسا ن دوست شاعر کی

طرح محسو س کیا ۔ اور اپنی ذات کے حصار سے با ہر نکل کر کا ئنات کی و سیع تصویر کشی کی ۔

۱۹۲۲ میں جب تر قی پسند فراقؔ کو سول نا فرما نی کے جرم میں قید کر لیا گیا تو قیدِ فر نگ میں انہیں اپنے ۲۱۔۲۰ سالہ چھوٹے بھا ئی کی موت کی خبر ملی ۔ یہ خبر ان پر قیامت بن کر ٹوٹی ۔ فراقؔ نے اس مو قع پر جس درد و غم کے ساتھ اپنے بھا ئی کا نوحہ لکھا ۔ درد مندوں کے لئے اس صور تحات کا اند ازہ لگانا کو ئی مشکل نہ ہوگا ۔

اشعار دیکھئے۔

گھاٹ پر جلنے جلانے کے ہیں
ساماں ہائے ہائے
کس قدر خاموش ہے شہر خموشاں
ہائے ہائے
مرنے والے یاد آتی ہے جواں
مرگی تری
اٹھ گیا دل میں لیے تو دل کے
ارماں ہائے ہائے
یاد آئیں گی کسی شوریدہ سر کی
وحشتیں
دیکھ کر گلگاری دیوار زنداں ہائے
ہائے

(کلیات
فراق)

تر قی پسند فراقؔ کے ہاں زند گی کے گہرے تجر بات اور مشا ہدات پائے جا تے ہیں ۔ان کے مو ضو عات بھی زند گی سے جڑے ہو ئے ہیں ۔ نظم "جگنو" ان کی شا ہکار نظم ہے ۔ جس میں اک ایسے بچے کی داستانِ غمِ حیات رقم ہے۔ جسکی ماں اس کے پیدا ہو تے ہی داغ مفا رفت دے گئی ۔ فراقؔ کی اس ساری نظم میں درد ہی درد پھیلا ہوا دکھا ئی دیتا ہے ۔ فراقؔ نے انسا نی ہمدردی کے ساتھ اس نو جوان کے جذ بات بیان کیے ہیں جو ماں کے بغیر مکان کے صحن ، سن رسید ہ پیپل ، اس پر پڑے جھولوں ، پہلی جنگ عظیم کے خو ف اور اند یشوں میں اپنی صبح و شام گزارنے پر مجبور ہے ۔

ہمارے شہر میں آتی ہیں اب بھی
برساتیں
ہمارے شہر پر اب بھی گھٹائیں
چھاتی ہیں

ہنوز بھیگی ہوئی سرمئی فضاؤں میں
خطوط نور بناتی ہیں جگنوں کی صفیں
فضائے تیرہ میں اڑتی ہوئی یہ قندیلیں
مگر میں جان چکا ہوں اسے بڑا ہو کر
کسی کی روح کو جگنو نہیں دکھاتے راہ
کہا گیا تھا جو بچپن میں مجھ سے جھوٹ تھا
(کلیا ت فراق گو ر کھپوری ،ص:۲۰۳)

فراقؔ نے سیا سی و سما جی ، تر قی پسند انہ اور ما رکسی نظر یا ت کے حوالے سے کئی ایک نظمیں لکھی ہیں ۔ جن میں "تلا ش حیات" ، " داستان آدم "،"دھرتی کی کروٹ"،"کسانوں کی پکار "،" مزدوروں کا ریگرروں شلپی کاروں کی للکار "وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔اس دور کی نظم نگاری کا عمومی طور پر یہی مزاج بن گیا تھا۔فراق کے ہاں بھی ۱۹۳۶کے بعد یہی تر قی پسندانہ نظریا ت کا رنگ نظر آتا ہے ۔ ان کے ہاں سیا سی سمجھ بو جھ کے ساتھ ساتھ زند گی کے حقا ئق کا ادراک اور زند گی کے خارجی مسا ئل ومعاملات پر گہری نظر غالب دکھا ئی دیتی ہے نظم "دھرتی کی کروٹ" کے اشعار دیکھئے

سب کی قسمت چمک جائے گی
کاریگر ، مزدور ، کسان
بھارت کے بے چین جوان
دبے دبے بے نام و نشان
(کلیات فراق، ص:۲٤٤)

تر قی پسند فراقؔ کو معا شرے میں سسکیاں بھرتے آدمی، درد کی ماری زند گی ، سا ئیں سا ئیں کرتی بستیاں اور تہذیب کے نام پر ز بر دستی دکھا ئی دیتی ہے تو فراقؔ کی انسان دوستی اسے دوسروں کے دکھ ددر با نٹنے پر مجبور کرتی ہے ۔ اپنی نظم "کسانوں کی پکار" میں وہ کسانوں کے ہمد ر دبن کرا ن کے درد کا درما ں کر تے نظر آتے ہیں کہ آنے والا وقت ان کا وقت ہو گا۔ جب ظلمت کے بادل چھٹ جا ئیں گے

اور غریب کاحق اور انسان کی محنت کا پھل اسے مل کر رہے گا۔ کیو نکہ کسان اب پُر عز م ہے کہ وہ کسی چالا کی، دھو نس دھا نس ، دلا لوں کی پھوڑ پھا نس ، پھسلا نے ، بہکا نے، ڈروانے اور دھمکا نے میں نہیں آئے گا ۔

آئے دن کے کال کا رونا
ہر چیز اور ہر بات کا رونا
جگ جگ سے دن رات کا رونا
نہیں رہے گا نہیں رہے گا
(کلیات فراق
،ص:۲٤٦)

ما رکسی جد لیات اور نئی کر وٹ لیتے ہند وستان کی سو شلسٹ آگہی اور مینی فیسٹو ئیت فراقؔ کی نظموں میں واضح طور پر دکھا ئی دیتی ہے ۔ انہوں نے اپنے معا صر تر قی پسندوں کی طرح سما جی مسا ئل کو مد نظر رکھ کر اپنی انسا ن دوستی کا ثبوت پیش کیا ہے ۔ ان کی نظم "مز دوروں کا ریگر وں ،شلپی کا روں کی للکار "دیکھئے۔ جس میں انہوں نے دھرتی کے ان سپتوں کی عظمت کا اعتر اف کیا ہے کہ یہی وہ مز دور ہیں جنہوں نے دنیا کی اند ھی نگری کو جگ مگ کر تے دیپوں سے جلا یا ہے ۔ لیکن آج بے کاری کا چلتا پھر تا نمو نہ ہیں ۔ جا پان ، چین ،جرمنی ، روس اور امریکہ میں مز دوروں کی بیکاری کا ذکر جس انداز سے کیا ہے وہ قابل دید ہے ۔

ہم دنیا کو چلانے والے
اور ہمیں پامال ، یہ کیا ہے ؟
ہم دنیا کو بچانے والے
اور اتنے بد حال ، یہ کیا ہے ؟
(کلیات فراق
،ص:۲۷۵)

فراق ؔکی ایک اور نظم "داستان آدم " دیکھئے جس میں انہوں نے عوام دوستی کے ساتھ لینن کے ہا تھوں دنیاکی کا یا پلیٹ جا نے کی امید بھی ظا ہر کی ہے ۔ اور انسان کو تا ریخ کے مختلف مرحلوں سے ہو تے گز رتے ، کبھی جیتے اور کبھی شکست سے دو چار ہوتے ہو ئے دکھا یا ہے ۔اس کے ساتھ ساتھ انسان کا عز صمیم ہم زندہ تھے، زند ہ ہیں اور زند ہ رہیں گے کے نعروں سے مز ید جِلا پاتا ہے ۔

بازاروں کی خاطر وہ بڑی جنگ
چھڑے گی
دنیا کے کئی حصوں میں اک آگ

لگے گی
اس جنگ میں مزدوروں کی تقدیر
کھلے گی
سرمایہ پرست اک نئی آفت میں
پڑیں گے
ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ
رہیں گے
(ایضاً ،
ص:۲۳۷)
بقو ل ڈاکٹر اجمل اجملی !
"اس نظم میں فراقؔ صاحب تا ریخ ار تقاء کے ایک عالم او ر
ایک ایسے دانشور کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں
جو انسا نیت کی پوری تا ریخ کو ایک کھلی ہو ئی کتاب کی
طرح دیکھ رہا ہے اور وہ جس طرح دیکھ رہا ہے چا ہتا ہے
کہ دوسروں کو بھی اسی طرح دکھا وے "
فراقؔ غم دوراں کا زخم خوردہ ہے ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم
"شام عیادت" دیکھئے جس میں محبوب کی آمد پر بھی خو شی مستقبل
نہیں ہوتی کیو نکہ دوسری طرف جنگ عظیم کے باعث انسا نیت خون
میں نہا ئی ہو ئی تھی۔ آدمیت زخم زخم تھی۔ زند گی خون تھو ک رہی
تھی اور سا مراجی طا قتیں زند گی کو جہنم بنانے میں مصروف عمل
تھیں ۔ ایسی صورتحال میں انسان دوست فراقؔ ایسی تعمیری زند گی کے
خواب بنتاہے جہاں انسان کے سیا سی و سما جی و معا شی دکھ ختم ہو جا
ئیں گے۔ گو یا وہ نظام کو بدلنے اور زندگی میں انقلا ب لا نا کا پیغام دیتا
ہے ۔اور یہی ایک انسان دوست شا عر کی خو بی ہے ۔
ابھی کسان و کامگار راج ہونے
والے ہے
ابھی بہت جہاں میں کام جاج ہونے
والے ہے
مگر ابھی تو زندگی مصیبتوں کا
نام ہے
ابھی تو نیند موت کی مرے لیے
حرام ہے
یہ سب پیام اک نگاہ میں وہ آنکھ
دے گئی
بیک نظر کہاں کہاں مجھے وہ

آنکھ لے گئی
(کلیا تِ فراق، ص:
۳۳۶)

فراق کی نظم "آدھی رات کو" بھی قابل ذکر ہے جس میں ان کے ذہین میں ایک سوا ل گر دش کرتا ہے کہ روس کی فو ج اب بر لن سے کتنی دور ہے ۔ یعنی دوسری جنگ عظیم کا خیال دل کو اداس کر کے رکھ دیتا ہے۔ فراق کی انسان ہمدردی کے نمو نے جگہ جگہ دکھا ئی دیتے ہیں ۔ وہ دنیا کو مفلسی ، لا چا ری ، اور مجبوری سے پاک دیکھنا چا ہتے ہیں ۔ اشعار دیکھئے۔

کہ جیسے کھلتا چلا جائے اک سفید کنول
سپاہ روس ہیں اب کتنی دور برلن سے
چمکتی انگلیوں سے چھڑ کے ساز فطرت کے
ترانے جاگنے والے ہیں تم بھی جاگ اٹھو
نہ مفلسی ہو تو کتنی حسین ہے دنیا
یہ جھائیں جھائیں سی رہ رہ کے ایک جھنگر سی
(ایضاً،
ص:۲۱۵)

غر ض تر قی پسند فراقؔ کی انسان دوستی معا شر ے میں امن و آشتی اور پیار و محبت کے گیت عام کرنے کی متمنی ہے ۔

مخد وم محیی الدین اور انسان دوستی(۱۹۰۸۔ ۱۹۶۹)

۱۹۰۸ء ہند وستا نی محنت کشوں کے انقلا ب کی تا ریخ کا نقطہ آغا ز ہے۔ اور اسی سال محی الدین مخدوم کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک عظیم کمیو نسٹ قا ئد ، تر قی پسند تحریک کے نما یا ں شا عر ، صف اول کے ٹر یڈ یو نین لیڈ ر ، ایک مخلص دوست ، ایک محبت کر نے والے با پ ایک شفیق استاد اور اپنے چا ہنے والوں اور پر ستاروں کے ہمدرد اور رسب سے بڑھ کر انسان دوست شا عر تھے ۔

مخد وم نے ۱۹۳۳۔۳۴میں نغمہ نگاری سے اپنی شاعری کا آغا ز کیا ۔ وہ معقولیت پسندی ، مخا لف ملوکیت ، مخالف فاشزم رحجان کے ساتھ

تر قی پسندی کی جانب متو جہ ہو ئے ۔اس وقت ریا ست حید ر آباد حکو مت بر طانیہ کے تحت آمر یت کے زیر اقتد ار ہر طرح کی بیماریاں اور مسا ئل جیسے غر بت ، غلامی ، ظلم اورامراض خبیثہ سے دو چار تھی۔ اسی دور میں بر طا نیہ نے اس یقین کے ساتھ قدم آگے بڑھا ئے کہ وہ ہند وستان سے بر طا نوی تسلط کا خا تمہ کر یں گے۔ انہی میں مخدوم بھی شامل تھے ۔ ان کے ہاں زند گی کا تصور اور سما جی کشا کش کا شعور بہت تو انا تھا ۔ یہی و جہ ہے کہ جب فاشزم کی امن شکن اور تہذیب سوز آند ھیاں چلنے لگیں تو انہوں نے اس خطرے کو بھا نپ لیا ۔ انہوں نے اپنی نظم "جنگ " میں فا شزم کے خلاف صدائے احتجا ج بلند کی ۔ فا شزم کا بھو کا دیو انسا نیت کا خون پی پی کر مضبو ط اور توانا ہوتا جا رہا تھا۔ انہوں نے نوع انسانی کی تباہ و بر بادی، قتل و غا رت گر ی ، انسانیت کے خون کی ارزانی ، معصو مئہ حیات کی بیچا رگی اور زند گی کی پشیما نی کو دل کی گہر ائیوں سے محسو س کیا ہے۔ وہ ایک ایسی دنیا کے طلبگار نظر آتے ہیں جہاں امن وامان کا راج ہو اور انسان سکھ کا سانس لے سکے ۔نظم "جنگ " کے اشعار دیکھئے جس میں جنگ کا منظر داستانِ غمِ حیات کو عیاں کرتا ہے ۔

نکلے دہان توپ سے بربادیوں کے راگ
باغ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ
کیوں ٹمٹا رہی ہے یہ پھر شمعِ زندگی؟
پھر کیوں نگار حق پہ ہیں آثار بیوگی؟
امن و امان کی نبض چھٹی جارہی ہے کیوں ؟
بالینِ زیست آج اجل گا رہی ہے کیوں ؟

(سر خ سو یرا، ص: ٣٤،٣٥)

تر قی پسند مخد ومؔ بھی اقبا لؔ کی طرح مشر ق کے زوال و انحطاط پر مضطرب ہیں ۔ وہ مشر ق جو کبھی علم وآگہی کا مر کز تھا۔ جس سے دنیا نے جہاں با نی و جہا نگیر ی کا ہنر سیکھا ۔ جس نے مسا وات اور روا داری کا پیغا م عام کیا ۔ جو مذ ہبی رہنما وں کا مسکن رہا ہے ۔ وہی آج جہل ، فا قہ ، بھیک ، بیماری ،اور نجا ست کا مکاں بنا ہو ا ہے ۔ انہوں

نے مشر ق کو ایک نئے روپ میں پیش کیا ہے اور کہا دیکھو یہ تمہار ا مشر ق ہے جہاں درد و غم اور بھوک و افلا س اپنا ڈیرہ جما ئے ہو ئے ہے ۔ وہ انسان دوستی اور انسان ہمد ردی کے ساتھ اپنی نظم " مشر ق" میں مشر ق کا حالِ زاریوں بیان کرتے ہیں ۔

جہل ، فاقہ، بھیک ، بیماری
،نجاست کا مکان
زندگانی ، تازگی ، عقل و فراست کا
مسان
جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس
کے اُس مشرق کو دیکھ
دیکھ کھیلتی ہے سانس سینے میں
مریض دق کو دیکھ
ایک ننگی نعش بے گور و کفن
ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ ٔ خون میں
لتھری ہوئی
(سرخ سویرا ، بسا ط و
رقص(حصہ)،ص:۳۸،۳۷)

مخدومؔ کی ایک خصوصیت ا ن کی ر جا ئیت پسند ی ہے۔ وہ برے سے برے حالات میں بھی ما یوس نہیں ہوتے۔ ان کے پاس امید کی ایسی طا قت ہے جو کسی حالت میں انہیں کمز ور نہیں پڑنے دیتی ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس بھیا نک صورتحال کو بدلنے کے متمنی ہیں اور ایک صحت مند مشر ق کے آرزو مند ہیں ۔

اس زمین موتِ پرورده کو ڈھایا
جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

(ایضاً،ص:۳۸)

اور پھر جب نظم "لمحہ رخصت " میں مخدومؔ یہ کہتا ہے کہ

حیات لے کے چلو ، کائنات لے کے
چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے
کے چلو
(سرخ سو یرا،
ص: ۱۸)

دراصل اس قسم کے اشعار ان کے لا زوال خواب ہیں ، جو بحیثیت انسان دوست شا عر کے انہوں نے دیکھے ہیں اور انہی خوابوں کی تعبیر ان کا مقصد حیات تھا اور یہی اشعار درحقیقت ہمارے عہد کی آرزوں کا آئینہ ہیں ۔ مخدو مؔ کی زند گی ایک مثالی مارکسی ادیب کی تھی۔ ان کی شاعری حقیقت پسند شاعر ی ، تر قی پسند شاعری اور مارکسی شاعری ہے۔ ان کی کس کس تخلیق کا نام لیں ہر تخلیق کی رگ و پے میں مار کسیت کا آتش سیال دوڑتا ہے۔ نظم "حو یلی "۔ " زلف چلیپا"۔ " انقلاب "۔ "اندھیر ا "، " تلنگانہ"۔ " چپ نہ رہو "۔اور " جنگ آزادی" اسکی عمدہ مثا لیں ہیں ۔

مخدومؔ کی نظم " جنگ آزادی " نے انہیں وہ مقبو لیت دی کہ انہوں ہند وستان کے عوام کا ایک محبوب اور مقبول شا عر بنا دیا ۔ اگر چہ لا کھوں کسانوں اور مز دوروں کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ نظم کس کی ہے لیکن اس کے باوجود جلسے کی کاروائی " یہ جنگ ہے جنگ آزادی" سے شروع ہوتی ۔ ان کی نظم آج بھی ہند وستان کی فضا میں گونج رہی ہے ۔ اس کو صر ف ہند وستان کی تحریک آزادی نے نہیں بلکہ ساری دنیاکی جنگ آزادی نے متا ثر کیا ہے ۔ پھر بھی اس میں ہندوستان کے دل کی دھڑکن زیادہ تیز ہے ۔ اشعار دیکھئے جو ان کی " انسان دوستی " کے غماز ہیں ۔

سارا سنسار ہمارا ہے
پورپ ، پچھم ، اتر ، دکن
ہم افرنگی ، ہم امریکی
ہم چینی ، جاں بازان وطن
ہم سرخ سپاہی ظلم شکن
آہن پیکر فولاد بدن
آزادی کے پرچم کے تلے
(سر خ سو یرا، ص: ۹۹)

مخدو م کی نظم " جنگ آزادی " کی اہمیت کا اند ازہ سردار جعفری کے اس اقتبا س سے ہوتا ہے ملا حظ کیجئے۔

ٹیگو ر کے "جن گن من " میں پہا ڑی چشموں کی گنگنا ہٹ اورآبشاوں کا نغمہ تحلیل ہو گیا ہے۔ جیسے بلو ر کی طرح چمکتے ہو ئے صاف شفا ف پا نی کی مسلسل دھا ر پڑ رہی ہو ۔ اقبالؔ کے "ترانہ ہندی"میں ایک دریا کا سا بہا و ہے جس کا پانی ہچکو لے کھا کھا کر آگے بڑ ھ رہا ہو ۔ لیکن مخدومؔ کی " جنگ آزادی" میں آندھیوں کی سنسنا ہٹ، طو فانوں

کاخر وش اور تلو اروں کی جھنکار سنا ئی دیتی ہے ۔ اقبالؔ اور ٹیگو رؔ کے مقابلے میں مخدومؔ کی شاعرانہ حیثیت کچھ بھی نہیں ۔ وہ دونوں ہمالیہ پہاڑ کی طرح سر بلند ہیں جن کے سائے میں کھڑا ہو ا مخدومؔ اپنے ساز پر گا ر ہا ہے ۔ پھر بھی اقبالؔ اور ٹیگو رؔ کی نظم اور گیت کا ہند وستان چھوٹا اور محدود ہے ۔ وہ دنیا کے نقشے میں ایک الگ جغرافیا ئی و حد ت ہے ۔ لیکن مخدومؔ کی " جنگ آزادی" کا ہند وستان و سیع اور بے کنار ہے ۔اس کی سرحدیں کہیں ختم نہیں ہوتیں ۔ وہ ساری دنیا میں پھیلی ہو ئی ہیں ۔ اسکی آزادی کے سپا ہی صرف ہندوستانی نہیں بلکہ امر یکی ، افر نگی ، چینی ، روسی، سبھی ہیں ۔اور اسکی آزادی کے سرخ سو یرے کا گلنار پر چم مشر ق و مغر ب میں ایک ساتھ لہرا رہا ہے ۔ اقبالؔ اور ٹیگورؔ کی نظموں کی محرک ہند وستان کی قومی تحریک آزادی تھی۔مخدوم ؔکی نظم کی محرک ساری انسانیت کی بین الاقوامی جد و جہد ہے۔

مخدومؔ جہاں حیدر آبادکی غلامی، پستی اور بد حا لی کا ذکر کرتے ہیں ۔ وہاں استبد ادی حکومت کے مظالم کی بہت سی داستانیں بھی رقم کر تے ہیں ۔ آقا اور غلام کی کشمکش پر آنسو بہاتے ہیں تو دوسری طر ف کسان اور جا گیر دار کی کشمکش بھی انہیں پر یشان کر دیتی ہے ۔ اپنی نظم " دھواں " میں کسان کی تصویر کشی کرتے ہوئے اپنی انسان دوستی، ہمدردی اور محبت کا ثبوت پیش کر تے ہیں ۔

ہاں وہیں میرے دلِ زار نے یہ بھی دیکھا
ہاں میری چشم گنہگار نے یہ بھی دیکھا
خون دہقان میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں
(سرخ سویرا، ص:۴۲)

اسی طرح ا ن کی نظم " حو یلی " غلامی ، تنگد ستی اور ظلم و جور کی علامت ہے۔جسے انہوں نے فر سودہ نظام کے استعارے کے طور پر استعمال کیا۔ جو نظام نز ع کے عالم میں ہے۔ جس کے بام و در کرب میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جس میں ہر طر ف تا ریکی چھا ئی ہو

ئی ہے ۔ جبکہ مارو کڑ دم کا استعارہ اس سما ج اور انسانیت کو ڈسنے والوں لو گوں یا طبقے کا ہے جو ملک دشمن اور انسا نیت دشمن ہیں اور جنہوں نے اسے تباہ کر رکھا ہے اور اب جہاں نہ انصا ف ہے اور نہ ایمان۔

جس جگہ کٹتا ہے سر انصاف کا
ایمان کا
روز و شب نیلام ہوتا ہے جہاں
انسان کا
ایک جانب ہیں وہیں ان بے نواوں
کے گروہ
ہاں انہیں بے نان و بے پوشش
گداوں کے گروہ
جن کے دل کچلے ہوئے جن کی
تمنا پائمال
جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے
جہنم کا جلال
(سرخ سویرا
،ص:۴۰، ۴۱)

ترقی پسند مخدومؔ سا مراجی طا قتوں کی سا ز ش سے با خبر تھے ۔دوسری سامراجی عالمی جنگ کی ہو لنا کیوں کا ذکر بڑے دکھ اور درد کے ساتھ کر تے ہیں اور تکلیف کا احسا س بھی گہرا ہے نظم " سپا ہی " کے اشعار دیکھئے ۔

کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے
بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے
لاش جلنے کی بو آرہی ہے
زندگی ہے کہ چلا رہی ہے
جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے
(سرخ سویر
ا،ص:۹۰)

تر قی پسند مخدومؔ نے افر یقی رہنما لوممبا کے و حشیا نہ قتل پر نظم " چپ نہ رہو" لکھی ۔ انہوں نے اس سانحے پر اپنے اور انسانیت کے بے کراں دکھ کو انسان دوست شاعر کی حیثیت سے اشعار کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے ۔ لوممباکے قتل پر آدمیت کے ضمیر کا ایک تر شے ہو ئے ہیر ے کی طرح جگمگا اٹھنا ، رات کے سناٹے میں خنجر کا

چمکنا اور پھر خون کے بہتے ہو ئے دریا کی چمک اور پھر با د صبا بھی صبح دم جب جب ان کے درواز ے سے گز رتی ہے تو ان کا چہر ہ بھی خون سے لت پت دکھا ئی دیتا ہے ۔ یہ سارے لہو لہو امیج اس آفا ق گیرا لمیے کی شد ت کو سامنے لاتے ہیں جو اس عہد کی کچلی ہو ئی انسانیت کے ہیر و لو ممبا کے قتل کی صورت میں سامنے آیا تھا ۔جس نے حقیقی معنوں میں عالمی سطح پر انسانی ضمیر کو بیدار کر دیا تھا ۔ مخدوم ؔایسی کر ب ناک صورتحال میں چپ نہ رہنے کا درس دیتے ہیں اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی تلقین کرتے ہیں ۔

خیر ہو مجلس اقوام کی سلطانی کی
خیر ہو حق کی ، صداقت کی ،
جہاں بانی کی
اور اونچی ہوئی صحرا میں امیدوں
کی صلیب
اور اک قطرہ خوں چشم سحر سے
ٹپکا
جب تلک دہر میں قاتل کا نشاں
باقی ہے
تم مٹاتے ہی چلے جاؤ نشان قاتل
کے
روز ہو جشن شہیدانِ وفا چپ نہ
رہو
بار بار آتی ہے مقتل سے صدا چپ
نہ رہو ، چپ نہ رہو
(گل تر، ص:
۲۰۰)

مخدوم کے بارے میں ہند وستانی کمیو نسٹ پارٹی کے صدر نشین کامر یڈ ڈ انگے نے کہا ۔ مخدوم شیشے کے محل میں رہنے والا شاعر نہیں وہ انقلاب اوراسکے آدرش کی حمایت میں بڑی بے باکی سے لکھتا ہے اس لئے اسکی شاعر ی اتنی پرتا ثیر ہے کہ لاکھوں کے دل کی آواز بن گئی ہے۔ انسان دوست مخدومؔ پوری انسانیت کو اتفاق واتحاد کا درس دیتے ہیں وہ انہیں و حدت کی لڑی میں پر ونا چا ہتے ہیں ۔ آپس کے لڑائی جھگڑے اور اختلا ف کو ختم کرنا چاہتے ہیں ۔ اپنی نظم " بنگا ل" میں وہ اسی پیغام کو عام کرتے دکھا ئی دیتے ہیں ۔ وہ سار ے ہندوستان میں اتحاد کا علم بلند کر کے تمام سیاسی جما عتوں کو بجا ئے ایک دوسرے کی مخا لفت کے ایک دوسرے کے قریب لانا چاہتے ہیں ۔ اس

کے لئے بڑی بے تعصبی ، وسیع نظری اور بے لو ث ہمدردی کی ضرورت ہے اور وہ اسی انسان دوستی کی حرارت پید اکر نے کے خواہش مند ہیں ۔

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگریس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم
(سر خ سویرا، ص:۱۱۵)

مخد ومؔ کے کلام میں انسان دوستی کے نمو نے جگہ جگہ دکھا ئی دیتے ہیں ۔ وہ چا ہتے ہیں کہ مسموم ہواوں کا چلنا بند ہوجا ئے ۔ حیات بخش ترانے آزاد ہوں ۔ قحبا ئے سیم وزر سے آزادی ملے اور شمیم عدل سے کو چہ و بازار مہک اٹھیں ۔ نظم " انقلاب " کے اشعار دیکھئے ۔

ابھی دماغ پہ قحبائے سیم و زر ہے سوار
ابھی رکی ہی نہیں تیشہ زن کے خون کی دھار
شمیم عدل سے مہکیں یہ کوچہ و بازار
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے
(سرخ سویر ،ص :۹٤)

یہ بہت بڑی حقیقت ہے کہ آزادی حاصل کر نے کےلئے کےسے کےسے مظالم سے گز رنا پڑتا ہے ۔ آج بھی باربار انسانیت اس دکھ اور کرب سے گز ر رہی ہے ۔ کہیں عراق و فلسطین کی صورت ،کہیں بمو ں ، بنیادپر ستی ، اور سیا سی خود غرضی کی لا ئی تبا ہی کی صورت ، مخدومؔ ان حالات میں بھی پر امید تھےیہ امید یہ رجا ئیت ایسے خراب حالات میں بھی مایوس نہ ہو نا زند گی کے لیے بہت بڑی طا قت ہے ۔ یہی ایک انسان دوست شاعر کی خوبی ہے ۔ ان کی زند گی کی نئی کروٹ اس کے راستے کی نئی سمت کیطرف اشار ہ کر رہا ہے ۔ اس میں یہ

اعتماد جھلک رہا ہے کہ پرانی دنیا باقی نہیں رہ سکتی جس کے پاس اند ھیرے کے سوا کچھ نہیں اور نئے عہد کے سورج کو طلو ع ہو نے سے کو ئی نہیں روک سکتا ۔ نظم "اندھیرا" کے اشعار ملا حظہ ہوں ۔

باڑھ کے تاروں میں الجھے ہو ئے انسانوں کے جسم
اورا نسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہو ئے گد ھ
وہ تڑختے ہوئے سر
میتیں ہات کٹی پاوں کٹی
لا ش کے ڈھا نچے کے اس پار سے اس پار تلک
سرد ہوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں
شب کے سناٹے میں رونے کی صدا
کبھی بچوں کی کبھی ماؤں کی
چاند کے تاروں کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
(سرخ سو یرا ،ص: ۹۶،۹۷)

غرض مخدومؔ نے ساری زند گی انسان دوستی کے پیغام کو عام کرنے میں گز ار دی ۔ " سید محمد مہدی " مخدوم کی اس خوبی پر روشنی ڈالتے ہو ئے کہتے ہیں ۔

مخدومؔ کی زند گی دار بھی دلد ار بھی تھی ۔ پہلو دار شخصیت کے مالک تھے ۔ کبھی تلنگانہ کے جنگلوں میں بندوق کا ندھے پر رکھ کر چلے ۔کبھی قید میں جسما نی اذیتیں جھیلیں ۔ کبھی مزدوروں کی ہڑتالوں کی قیادت کی ، کبھی چاول کی قیمت کم کرانے کے لئے بھو ک ہڑتا ل پر

بیٹھے، کبھی رندان بلانو ش کی محفلوں میں خم کے خم لنڈ ھا ئے ۔ کبھی شہر یا روں سے ر قا بت کا جنوں طاری ہوا تو محلوں پر کمندیں ڈالیں ۔ کبھی شعلہ نواوں کی خلو توں میں رت جگا منا ئی ، کبھی سما ع کی محفل میں بیٹھ کر وجد کیا ، کبھی محرم کی مجلسوں میں آنسو بہا ئے ، کبھی ہو لی دھو میں مچا ئیں ، کبھی شعر وسخن کی محفلیں گرم کیں ۔ یہ سب تھا ،لیکن جب بھی میدان کا ر زار سے مبارز طلبی ہو ئی مخدومؔ اٹھے اور کوئے دلدا ر سے دار کیطرف روانہ ہو گئے کیو نکہ وہ ایک ایسے یا ر مسیحا نفس کے قتیل تھے ، جس کی صدا ئے کو ہ کنی کو وہ کبھی نظر اند از کر ہی نہ سکے تھے ۔ و ہ تھا ان کا نظر یہ حیات ، دنیا کو سنوا رنے کی آرزو ظلم و استحصال سے شدید نفر ت اور ایک خوش آئند مستقبل پر یقین راسخ ۔ اس نے اس کے کردار کو صلا بت بخشی تھی اور جا ذبیت بھی اور اس نے مخدومؔ کو مخدومؔ کی زند گی ہی میں ایک داستانی ہیرہ بنا دیا تھا۔

اسرار الحق مجازاور انسان دوستی (۱۹۱۱۔۱۹۵۵)

مجا زؔ اودھ کے ایک مشہور قصبہ ردولی کے ایک کھاتے پیتے خاندا ن میں پیدا ہو ئے ۔ یہ خاندان اور قصبہ جس میں مجازؔ نے جنم لیا دونوں ہی کچھ اپنی خصو صیا ت رکھتے تھے ۔ز میندار ی کے خاتمے سے پہلے ردو لی کی تما م تر آبادی زمیند اروں اور تعلقہ داروں پر مشتمل تھی۔ وہا ں کے ما حول میں جا گیر دار انہ نظام کی تمام خو بیا ں اور خا میاں سمٹی ہو ئی تھیں ۔ بظاہر وہا ں کا کلچر اور تہذ یب کی سطح بہت بلند تھی۔ وہا ں کی زند گی میں سلیقہ تھا خو ش مذ اقی تھی ۔ رکھ رکھا و ، وصنعداری اور خا طر تو اضع پر یقین رکھتے تھے۔ رسم و رواج کی پا بندی ان کا ایمان تھا ۔ مجاز ؔکو اپنے وطن سے بے حد محبت تھی ۔ اپنے بچپن کی ہر یاد انہیں عز یز تھی ۔ مجازؔ ردولی کے پہلے شخص تھے جنہوں نے زمیند اری کے با و جود تعلیم حاصل کرکے سر کاری ملا ز مت کی اور اپنے خاندا ن کا نام روشن کیا۔ جو ایک طر ف پرانی اقتدار کو سینے سے لگائے ہوئے تھے اور دوسری طرف نئی قد روں کو بھی اپنا رہے تھے ۔ اسی خصوصیت کی جھلک مجازؔ کی شخصیت اور کلام دونوں میں دکھائی دیتی ہے۔ مجاز ؔکی شخصیت میں ماں باپ دونوں کی خصوصیات کا ملا جلارنگ بھی تھا۔ باپ کی طر ف سے نیک نیتی ، کم سخنی، حقیقت پسندی اور طبیعت کی گہرا ئی اور ماں کی طرف سے طبیعت میں حسن پر ستی ، اثر پذ یر ی اور جذباتیت کی خصوصیات موجود تھیں ۔

کہا جاتا ہے کہ شا عر تودلوں کا رازداں ہوتا ہے ۔ وہ روح کا پیا مبر ہو تا ہے اس کی بولی میٹھی ہوتی ہے اور اس کا پیام سچا ہو تا ہے ۔ دیکھا جا ئے تو مجازؔ کے ہاں شمشیر کی صلابت اور سا زو جام کا گدا ز دونوں ہی ہیں ۔ ان کے دل میں با غی کی آگ، رگوں میں جو انی کا جو ش اور گلے میں نغمہ سنج کا وفور تھا ۔ انہوں نے انقلا ب کے نعر ے لگانے کے بجائے انقلا ب کے راگ گا ئے ہیں ۔ وہ انسانوں سے بے پنا ہ محبت کر تے تھے ۔ ان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے تھے ۔ ان کی آرزووں اور تمنا وں کے دیئے اپنے دل میں جلا تے تھے ۔ اور سب سے بڑ ھ کر یہ کہ خا مو ش آوازوں اور د ھڑکنوں کو اپنے میں جذ ب کر لینے کی کا وش اور صلا حیت ان میں مو جود تھی ۔ ان کی آواز ہمیشہ حق کی آواز ہو تی تھی ۔انہیں انسان اور اسکی انسانیت عز یز تھی ۔ انسا نیت کی بنیا دی قد ریں عز یز تھیں اور چو نکہ انسان کو بہت عظیم سمجھتے تھے ۔ اس لئے اسکی تو ہین ان سے برداشت نہ ہو تی تھی ۔ چنا نچہ جب بھی وہ انسا نیت کی قد روں کو گھا ئل ہو تا ہوا دیکھتے تو ان کی قو ت برداشت جواب دے جا تی تھی ۔ انہیں ایسے انسا نوں سے دلچسپی تھی جو صحیح معنو ں میں انسا ن ہو ں اور جنہیں انسانیت کی قد ریں عز یز ہوں ۔ دوسرے لفظوں میں یو ں کہا جا سکتا ہے کہ انہیں عوام سے دلچسپی اور ہمد رد ی تھی اور وہ انہیں ہی انسانیت اور انسا نی قد روں کا علم بر دار سمجھتے تھے ۔ اس لیے مزدوروں اور کسانوں کی تکلیف ان سے دیکھی نہیں جا تی تھی ۔

مجازؔ کو ان باتوں نے اشتر اکیت کے قریب کیا اور اس میں شک نہیں کہ وہ نظر یا تی طور پر سچے اشترا کی تھے ۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اشترا کی فکر و فلسفے کا گہرا مطا لعہ نہیں کیا تھا ۔ لیکن نظام اقد ار کی نا ہمواری کے شد ید احسا س نے انہیں ا شتراکی بنا دیا تھا ۔ اس احساس نے ان پر یہ حقیقت روشن کر دی تھی کہ انسا نیت کا مدا وا یہی اشترا کی نظام ہے ۔ اس کے مسا ئل اسی نظام کے سہا رے حل ہو سکتے ہیں ۔ چنا نچہ مجازؔ نے اشتراکی نظام کے قیام کوضروری سمجھا اور اس طرف تو جہ بھی دلا ئی ۔ وہ اشتراکی زوا یہ نظر سے سو چتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں سر ما یہ دار انہ اور جا گیر دارانہ نظام سے نفرت تھی ۔ امرا ء اور رو سا سے نفر ت تھی۔ مز دوروں سے وہ زیادہ قر یب تھے ۔ عوام سے انہیں زیا دہ لگا و اور محبت تھی۔مجازؔ کی یہ انسا ن دوستی ان کی نظم " مز دوروں کے گیت" میں واضح طور پر دکھا ئی دیتی ہے ۔ جس میں وہ مز دوروں کی عظمت اور شان کو خو بصورت اند ازمیں بیان کرتے ہیں کہ یہ مز دور جگ کے راج دلا رے ، محنت

کش ،سر کش ، دل کے کھرے ، با توں کے دھنی، اور پر عز م ہیں ۔ا شعار دیکھئے

ہم کیا ہیں ؟ کبھی دکھلا دیں گے
ہم نظمِ کہن کو ڈھا دیں گے
ہم ارض و سما کو ہلا دیں گے
مزدور ہیں ہم ! مزدور ہیں ہم
(آہنگ ،ص :۱۰٤)

عوام دوست مجازؔ سر مایہ داروں کے خلا ف بھی آواز بلند کرتے ہیں ۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر دنیا کے مالک سرمایہ داروں کے چلا ئے بنا کو ئی کام نہیں چلتا۔ اگر ایک طر ف جنگ ملو کیت میں شا مل ہو نا اور دوسری طر ف فا قہ، جہالت ، بے روزگاری ، غلا می کی زند گی ہی دنیا کے ان حکمرانوں کا عطیہ ہیں تو اس منحو س نظام کو جسے سر ما یہ داری کہتے ہیں یکسر ختم کیوں نہ کر دیا جا ئے ۔ یہ لو گ ظلم وبر بر یت کی جیتی جا گتی مورتیں ہیں ۔ ہمارے سر مایہ دار اہل علم و فن کو سماج کی بے انتہا دولت کا اتنا حصہ تک دینے سے قا صر ہیں جس سے ان کی بسر ا وقات ہو سکے ۔ آج سا ری دنیا میں لوگوں کی زند گی دو بھر ہو رہی ہے نظم " سرما یہ داری" میں ان کی ظلم و بر یریت کا پر دہ چاک ہو تا نظر آتا ہے ۔ اشعار دیکھئے۔

یہ وہ آندھی ہے جس کی رو میں مفلس کا نشیمن ہے
یہ وہ بجلی ہے جس کی زد میں ہر دہقاں کا خرمن ہے
یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے
یہ انسانی بلا خود خونِ انسانی کی گاہگ ہے
وبا سے بڑھ کے مہلک موت سے بڑھ کر بھیانک ہے

(آہنگ،ص:۹٤)

بقو ل سجا د ظہیر !

آج زندہ احسا س اور حسا س ادیب کے لئے کو ئی چا رہ سوا اس کے نہیں رہ جا تا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ترقی و انقلا ب کی نئی قو توں کے ساتھ پیو ست کر دیں ۔ ایک طر ف تو دولت والوں کی عظیم اور ہو لنا ک تخریبی قوت دوسری طر

ف محنت کش غریبوں کی مٹی اور خون میں لتھڑی ہو ئی نئی زند گی کی مو جودہ حالات کی درد نا کی کے سا تھ آسما ن کی " نو رسحر سے آئینہ پو شی " دیکھنا ، فنا کے آہنی و حشت اثر قد موں کی آہٹ ، کے ہمراہ قبیلہ انقلا ب کا اپنی منز ل کی طرف بڑھتے ہی جا نا اور سرما یہ داری کی گر ج اور گو نج میں اسکی بدمستی کا نقشہ بھی دیکھ لینا ۔ یہ ہے وہ اجرت جس کے بغیر عہدِ حاضر میں شا عر ی اور ادب میں حیات و نموپید ا ہوں گے۔

تر قی پسند مجازؔ کے دل میں انقلا ب اور بغا وت کی آگ جل رہی تھی ۔ اس کیفیت میں مجازؔ کی سب سے حسین اور اس عہد کی سب سے بھر پور نظم " آوارہ" تخلیق ہو ئی ۔جس میں مجاز کے ذاتی غم اس کے انقلا بی احساسات کے ساتھ مل کر ایک ہو گئے ہیں ۔ یہ نظم نو جوانوں کا اعلا ن نا مہ تھی۔ یہ اس بیکار نو جوان کی تصویر ہے۔ جو سرما یہ داری کے بنائے ہو ئے شہروں میں بیر وز گا ر پھر رہا ہے اور جس کی بیر وز گاری کو آوار گی کا نام دیا جا تا ہے ۔ اس کے دل میں نہ جانے کتنی ، امنگیں ، آرزوئیں اور حسرتیں ہیں ۔ لیکن یہ بستی جو اسکی اپنی بستی ہے اسے غیر کی معلوم ہو تی ہے ۔ اس کے علا وہ مفلسی کے اند ھیر ے ، سینکڑوں جا بر سلطا ن اور سینکڑوں چینگز و نا در اسکی نظروں کے سامنے ہیں ۔ اسے معلوم نہیں کہ کیا کر ئے پھر بھی کچھ کر گز رنے کا حو صلہ دل میں با قی ہے اور یہی حو صلہ مندی کا جذ بہ اس نظم میں جھلکتا ہے ۔ اور مجازؔ کی انسان دوستی اس صور ت میں سا منے آتی ہے ۔

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں بڑھ کر توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں
(آہنگ ،ص: ۹۳)

مجتبیٰ حسین مجازؔ کی نظم " آوارہ" پر یوں خیا لا ت کااظہا رکر تے ہیں ۔

یہ نظم (آوارہ) وہ راستہ ہے جس پر نیا ہند وستان چل رہا تھا ۔ اس راستے میں بے شمار نشیب وفراز ان گنت دشواریاں تھیں ۔ لیڈر ے تعاقب میں تھے اور چٹا نیں راہ میں حا ئل مگر سر پھرے نو جوانوں کا قافلہ آگے بڑھتا جا رہا تھا ۔ یہ نظم مجازؔ کی پوری شخصیت ہے اور اپنے طو فانی دور سے

گز ر جا نے کے بعد بھی طو فان کو باقی رکھنے کی صلا
حیت رکھتی ہے ۔ یہ جب بھی پڑھی جائے گی ادب کی اس
گر فت کی مثال رہے گی ، جس کے ذ ریعے وہ کسی دور کو
منضبط کرتا ہے اور زندہ رکھتا ہے۔

مجازؔ تر قی پسند تحریک کے رکن رکین تھے ۔ انہوں نے خالی خولی نعروں کو کبھی شاعری نہیں بنا یا ۔ تر قی پسندی ان کے کلام میں عقید ہ نہیں بلکہ حالات کا ایک ناگز یز اور ارتقائی تقاضا بن کر آئی ہے ۔ نظریات کو انہوں نے حقا ئق کا بدل کبھی نہیں بنا یا ۔ا ن کی شا عری کا مر کز جیتے جا گتے انسان ہیں ۔ جنہیں وہ کلچر کی نعمتوں سے محروم نہیں رکھنا چاہتے بلکہ ہر نعمت سے مالا مال کرنا چا ہتے ہیں ۔ اور اس بات کی خوا ہش رکھتے ہیں کہ ان کی زند گی عیش و عشرت میں گزرے۔ نظم " عشرت تنہا ئی " کے اشعار دیکھئے ۔

اب یہ ارماں کہ بدل جائے جہاں کا دستور
ایک اک آنکھ میں ہو عیش و فراغت کا سرور
ایک ایک جسم پہ ہو اطلس و کمخواب و سمور
اب یہ بات اور ہے خود چاک گریباں ہوں میں

(آہنگ ،ص:۱۱۹)

فیضؔ کے خیال میں !" مجاز انقلا ب کا ڈھنڈ و رچی نہیں انقلا ب کا مطر ب ہے ۔ اس کے نغمے میں برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی ہے اور بہار کی برسات کی سی گر م جو ش تا ثیر آفر ینی " مجا ز نے حکومت ، سرمایہ دار ، مولو ی اور یہاں تک کہ ہر صاحب امتیاز پر اپنے نقطہ نظر سے سخت سے سخت تنقید کی ہے۔ انگریزوں کے خلا ف آواز اٹھا کر ایسی حکومت کا مطالبہ کیا جو رعا یا کی پوری نما ئند گی کر ے اور ہر شے کی ذمہ دار ہو جائے ۔ ملک کی ساری دولت حکومت کی ہو اور حکومت رعا یا کی ۔ ملک کے تمام اخر جات کی ذمہ دار حکومت ہو جا ئے تا کہ کسی شخص کو زند گی بسر کر نے میں تکلیف نہ ہو ۔ یو ں محسو س ہوتا ہے کہ مجاز ؔنے روس کے کا رل مارکس کے نظر یے کو پیش نظر رکھ کر اشتر اکیت پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے ۔ ا ن کا مذ ہب خد مت خلق اور ایمان آزادی ہو گیا ہے ۔ وہ ہند و ستان کے عوام کو احساس کمتری اوربز دلی کے جذ بہ سے نجات دلا کر جد و جہد

کے میدان میں لا نا چا ہتے ہیں ۔نظم " انقلا ب " کے اشعا ر ان کی اسی انسان دوستی کے غما ز معلوم ہو تے ہیں ۔

سرکشی کی تند آندھی دم بدم چڑھتی ہوئی
ہر طرف یلغار کرتی ہر طرف بڑھتی ہوئی
بھوک کے مارے ہوئے انسان کی فریادوں کے ساتھ
فاقہ مستوں کے جلو میں خانہ بربادوں کے ساتھ
ختم ہو جائے گا یہ سرمایہ داری کا نظام
رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوش انتقام
(آہنگ ،ص :۵۹،۶۰)

مجا زؔ کے ہاں جد و جہد کا یہ عمل اس وقت تک جا ری و ساری ہے جب تک انقلاب بر پانہ ہو جا ئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ملک کے ہر فر د کو حر کت و عمل کی دعوت دیتے ہیں ۔ نظم" نوجوان خاتون سے" میں اپنی محبو بہ سے کہتے ہیں ۔

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے ایک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا
(آہنگ، ص: ۸۸)

کہیں مجا زؔ نو جو انوں کو انقلا ب بر پا کر نے کی تلقین کر تے ہیں ۔ نظم "نوجوان سے" کے اشعا ر قابل توجہ ہیں ۔

جلال آتش و برق و صحاب پیدا کر
اجل کبھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر
ترم خرام میں ہے زلزلوں کا راز نہاں
ہر ایک گام پر اک انقلاب پیدا کر
صدائے تیشہ مزدور ہے ترا نغمہ

تو سنگ و خشت سے چنگ ورباب
پیدا کر
(آہنگ ، ص
:۸۵)

مجاؔز شیلیؔ کی طرح سما ج کی بند شوں پر شکو ہ کناں نظر آتا ہے ۔وہ سما ج کے خلا ف اس وقت آواز اٹھا تا ہے جب اسکی مجبوریاں حد سے تجا وز کر جاتی ہیں ۔ مجازؔ کی انسان دوستی صنف نا زک کے معا ملے میں بہت بید ار ہے ۔ جب سما ج کی بند شیں اسکو اسکی محبو بہ تک سے نہیں ملنے دیتیں اور اسکی آزادی کو سلب کرلیا جا تا ہے اور محبوب تک کو ئی پیغام آزادی سے نہیں پہنچا سکتا تو وہ انتہا ئی کر ب کے عالم میں فر یاد کنا ں ہوتا ہے ۔ نظم " مجبوریاں " کے اشعار اسکی بھرپور عکا سی کر تے ہیں ۔

یہ مجبوری سی مجبوری یہ لاچاری
سی لاچاری
کہ اس کے گیت بھی دل کھول کر
میں گا نہیں سکتا
کہاں تک قصہء آلام فرقت !
مختصر یہ ہے
یہاں وہ آ نہیں سکتی وہاں میں
جا نہیں سکتا
حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم
کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا
نہیں سکتا
(آہنگ،
ص:۱۹،۲۰)

مجا زؔ دراصل اردو ادب کا شیلیؔ تھا جس نے سماج کی جھو ٹی بند شوں اور فر سودہ نظام کا قصر ڈھانے کی ہر ممکن کوشش کی ۔ کہیں اس نے سرما یہ داری کے اصل چہرے کو بے نقاب کیا ہے ۔ اور کہیں وہ خانہ بند وشوں کی زند گی اور انکے ساتھ سماج کے نا رو ا سلو ک کو برا بھلا کہتا نظر آتا ہے ۔ انسا نیت کے رشتے سے مجازؔ کو ان سے ہمد ردی اور پیار ہے ۔ جن کی نہ کہیں زمین ہے اور نہ کہیں مکان ہے۔ شام و سحر دھو پ اور ابرو باد کے مارے ہو ئے یہ غریب در بد ر بھٹکتے پھرتے ہیں ۔لیکن کو ئی سا ئے عا فیت ان کا مقدر نہیں ۔ نظم "

خا نہ بندو ش " کے اشعار مجاز ؔجیسے نوع انسانی کے پر ستار کی انسان دوستی کے عکاس ہیں ۔

ماتھے پہ سخت کوشی پہیم کی داستان
آنکھوں میں حزن و یاس کی گھنگھور بدلیاں
چہروں پہ تازیانہء افلاس کے نشاں
ہر ادا سے بھوک کی بے تابیاں عیاں
پیسہ اگر ملے تو حمیت بھی بیچ دیں
روٹی کا آسرا ہو تو عزت بھی پیچ دیں
(آہنگ، ص: ٦٦)

مجازؔ کے ہاں انسا نوں سے محبت کا جذ بہ اس میں ایک قو ت پیدا کر تا ہے اور مذ ہب کے غلط اثر اور مذ ہب کے جھوٹے ٹھیکیداروں کا مقا بلہ کر نے پر مجبور کردیتا ہے اپنی نظم " خواب سحر " میں اس نے مذ ہب کے غلط اثر کی مذ مت کی ہے ۔ اس نے مذ ہب کے ٹھیکید اروں کے اس خیا ل کی تر دید کی ہے کہ انسا ن پر مذ ہب کو تر جیح دی جا ئے ۔ اسکی نظر میں انسان مذہب سے زیا دہ اہم ہے ۔ وہ مذ ہب کو انسا ن کے لئے سمجھتا تھا نہ کہ انسان کو مذہب کے لیے ۔ اس کا مذہب انسانیت ہے اور ایمان خدمت خلق ۔

آدمی منت کش ارباب عرفاں ہی رہا
درد انسانی مگر محروم درماں ہی رہا
اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی
رہبری جاری رہی ،پیغمبری جارہی رہی
دین کے پردے میں جنگِ زرگری جاری رہی

(آہنگ، ص:
۱۰۸)
حنیف فو ق کے نز دیک" ایک طر ف مجا ز کی شا عری انسانیت دوستی کے جذ بے کو فرو غ دیتی ہے اور دوسری طر ف اس منز ل کی طرف بھی اشارہ کر تی ہے جس کے حصول کے لیے تا ریخی قو تیں بر سر بیکار ہیں"۔

فیض احمد فیض اور انسان دوستی(۱۹۱۱۔۱۹۸٤)

فیضؔ دکھتی ، بلکتی ، سسکتی ، اورزخموں سے چور انسانیت کے دوست تھے ۔ وہ ان کے لیے انصا ف چا ہتے تھے ۔ وہ اس دھر تی کو امن و آشتی کا گہوارہ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ایک نیا صحت مند معا شرہ قائم کر نے کے خوا ہش مند تھے۔ کبھی مفا د پر ست سیاستدا نوں ، کبھی اغیا ر کی چیر ہ دسیتوں سے نا لا ں تھے تو کبھی معا شی زبوں حالی سے دست وگریباں ۔ ظلم خواہ دنیا کے کسی گو شے میں ہو وہ اس کے خلاف تھے ۔وہ مظلو مو ں اور حق پر ستوں کی ڈھال تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی نظمو ں میں معا شرتی بے راہ روی اور سما جی عد م مسا وا ت کے خلاف آواز اٹھا ئی ۔

فیضؔ نے اپنے ذ اتی غم کی رو مانی دنیا سے نکل کر زند گی کے سنگین حقا ئق کی دنیا میں کس طرح قدم رکھا اور غم جانا ں کے بعد غم دوراں سے کس طرح گہرا لگا و پید ا ہوا ۔ فیضؔ اسے ملکی اور عالمی سیا سی حالات کے پس منظر میں یو ں بیا ن کرتا ہے ۔

یہ عالمی کساد بازاری اور اقتصا دی بحران کا زمانہ تھا ۔غلہ کو ڑیوں کے بھاؤبکنے لگا تھا اور بھو کے کسان دو وقت کی روٹی کی خا طر دھر تی ماتا سے نا تا توڑ کر شہروں میں در بدرہو رہے تھے ۔ بے روز گار ی کا انت نہ تھا اور ملا زمت کا نشان مفقو د ، شریف رذیل ہو رہے تھے اور عزت دار گھروں کی بہو بیٹیاں بازار میں آبیٹھی تھیں ۔صر ف سر مایہ داروں اور سا ہو کا روں کی چاندی تھی۔ جو دونوں ہا تھوں سے حا جت مندوں کے اثاثے کے ساتھ ان کی عزت اور غیرت بھی سمیٹ رہے تھے ۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ برصغیر کی سیا ست پر اس بحران کے اثرا ت کا تفصیلی مطالعہ ابھی نہیں ہوا ہے ۔اس مطا لعے سے بہت سی سیا سی تحر یکوں کے ابتد ائی محر کا ت اور عوامل پر رو شنی پڑ سکتی ہے ۔ اس بحران سے پہلے بد یسی سامراج اور قومی آزادی کا مسئلہ تو سب کی نظر میں

تھا ہی۔ اب نئے حالات نے قو می دولت کی تقسیم ، امیری
اور غریبی ، مزدور اور سر مایہ دار ، کسان ،اور زمیند ار ،
بند گی اور خوا جگی غر ض کہ جملہ معا شی اور معا شرتی
مسا ئل کا پہاڑ بھی لا کھڑا کیا اور ذی شعو ر لوگ اسے سر
کر نے کی فکر میں سر کھپا نے لگے۔کسان سبھا ئیں بنیں
، مز دور تحریک نے زور پکڑا اور قومی آزادی کے ساتھ
ساتھ سوشلزم اور سما جی عدم مسا وات کے تقاضے بھی عام
ہو نے لگے۔

ایسی صورتحال میں فیضؔ کو ہر طر ف تا ریکی کے مہیب سا ئے
منڈ لا تے دکھا ئی دیئے۔ کہیں سے امید یا نورکی کرن نظر نہیں آئی جس
سے ہمت بندھ سکے ۔ لیکن اس اند ھیرے میں بھی وہ سر گرم عمل رہے
۔ اور عظمت شب کو نور سحر کر نے کے درپے رہے ۔وطن اور اہل
وطن سے محبت کا یہی جذ بہ انہیں تر قی پسند تحر یک کا علمبردار بنا
دیتا ہے ۔۹ ما رچ ۱۹۵۱ کو انہیں حکومتِ وقت نے را و لپنڈی سا ز ش
کیس میں ملوث قرا ر دے کر قید کاحکم سنا دیا ۔ اسیر ی کے اس دور
میں کبھی انہیں سر گو دھا اور لا ئل پور جیلوں میں قید رکھا گیا تو
کبھی حید ر آباد و منٹگمری جیل میں چار برس تک زندا ں میں رکھا
اور آخر کا ر اپر یل ۱۹۵۵میں رہا ہوئے ۔جیل ایک طر ح کا طلسما تی
آئینہ خا نہ ہوتی ہے ۔ جہاں صورتوں کے نہیں سیرتوں کے عکس
عجیب و غر یب شکلیں بنا کر ظاہر ہو تے ہیں ۔ کسی کے مز اج کی قنو
طیت ابھر کر سا منے آتی ہے تو کسی کا ضبط دیو انگی کی حد کو چھو
جاتا ہے۔ قید ی کی عز ت نفس کو ٹھیس پہنچا ئی جا تی ہے ۔ ایسے حا
لات میں اپنی شخصیت اور وضع داری قا ئم رکھنا حیرت کی بات ہے
۔فیضؔ نے ایامِ اسیر ی میں اپنے دل کا غبا ر شا عری کے ذریعے نکا لا ۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

(دستِ صبا ،ص: ۱۱)

انسا نیت نوا زفیضؔ کی خو بی یہ ہے کہ ان میں خو د ضبطی ہے ۔ وہ دوسرے با غی شا عروں کی طرح اپنے نعروں سے آسمان کو نہیں ہلاتے۔ ان کے نزدیک ترقی پسندی کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ بیدار ہو بید ار ہو کا شور مچا یا جا ئے۔ انقلاب زند ہ باد کے نعر ے لگا ئیں ، تلو ار اٹھا ، مز دور ہیں ہم ، اور ایشیا چھوڑ دو کی صد ابلند کی جا ئے ان کی آواز دھیمی ہے ۔ وہ افکار و جذبا ت کی رو میں بہنے کی بجا ئے افکار و جذ بات پر ضبط کی مہر یں لگا تے ہیں ۔

شبیر محمد حمید نے شام شہر یاراں " میں فیضؔ کی شخصیت کے بارے میں لکھا ہے ۔

> فیضؔ ٹھنڈے مزاج کے بے حد صلح پسند آدمی ہیں ۔ بات کتنی ہی اشتعال انگیز ہو ، حالات کتنے ہی ناساز گارہوں وہ نہ بر ہم ہو تے ہیں ،نہ ما یو س۔ سب کچھ تحمل اور خا موشی سے برداشت کر لےتے ہیں ۔ نہ کو ئی شکوہ نہ کسی کا گلہ ، نہ چڑ چڑ اہٹ نہ بد گو ئی ۔ میں نے فیضؔ کو نہ کبھی طیش میں دیکھا ہے اور نہ کبھی کسی کا شکوہ شکایت کر تے سناہے۔ ان کے دل کی گہر ائےوں میں لاکھ ہیجا ن بر پا ہوں چہرے پر بر ہمی کی یا پریشانی کی کو ئی لکیر نظر نہ آئے گی ۔ فیضؔ کا ظر ف کتنا و سیع ہے ؟ سمند ر کی تہہ میں طو فا ن کی رستا خیز ہے ۔ سطح پر سکون ہے ۔ یہ عظمت ہر کسی کو کہاں نصیب۔

فیضؔ کی انسان دوستی ایسی ہے جو انہوں نے شعوری طور پر اختیارکی ہے ۔ان کی شا عر ی کے مطا لعے سے واضح ہے کہ انہوں نے وا قعی انسا نی فلاح کو اپنے فن کا تقا ضا سمجھا اور اسے ذاتی مفا دات کو با لا ئے طاق رکھ کر ایک فرض کی طرح نبھایا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی انسا نی دوستی کی پہلی نظم " مجھ سے پہلی سی محبت مر ے محبوب نہ ما نگ " تخلیق کی ۔ اب انہیں محبت کے دکھوں کے علا وہ زمانے کے دکھ درد کا بھی احسا س دامن گیر تھا ۔ان کی نظر ان گنت صدیوں کے بہیما نہ طلسم ، بہتی ہو ئی پیپ اور گلے ہو ئے نا سور وں پر بھی جا پڑ تی ہے اور وہ تڑ پ اٹھتا ہے ۔ خاک میں لتھڑسے ہو ئے اورخون میں نہلا ئے ہوئے جسموں کے خیال سے وہ کا نپ جاتا ہے ۔ اور تھوڑی دیر کے لئے وہ حسن کی دلکشی کو با لکل بھول جاتا ہے اور زمانے کے دکھ اور درد کو محبت پر تر جیح دینے لگتا ہے اور زمانے کی راحتوں کو وصل کی راحتوں سے زیادہ پسند کر نے لگتا ہے۔

اَن گنت صدیوں کے تاریک بیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بُنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
(نقش فر یادی، ص: ٥٤)

تر قی پسند فیضؔ نے مز دوروں ، کسانوں اور مظلوموں کے حق میں جو کچھ لکھا بہت زورو شور سے لکھا جوان کی انسا ن دوستی کا بین ثبو ت ہے ۔ وہ غر یبوں کے پر زور حا می تھے با زار میں مز دوروں کے گو شت کی خر ید و فروخت دیکھ کر ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا اور درد سے تڑ پ اٹھتا تھا ۔ نظم " رقیب " کے اشعا ر د یکھئے ۔

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے
نہ پوچھ اپنے دل پہ مجھے قابو بھی نہیں رہتا ہے
(نقش فر یادی، ص: ٦٢)

فیضؔ اپنی نظم "مو ضوع سخن" میں آدم و حوا کی اولا د کی زبوں حالی کا بہت عمد ہ خاکہ کھنچتے ہیں ۔ جہاں موت اور زیست کی صف آرائی ہے ۔ شہروں کی فراو اں مخلو ق کا مر نے کی حسرت میں جیئے جا نا ہے اور جہاں کھیتوں میں ا گتی ہوئی بھوک رقص کناں ہے ۔ ان سب کی بد حالی کو دل کی گہرا ئیوں سے محسو س کر تے ہیں۔نظم" چند روز اور مری جان " کے اشعا ر دیکھئے ۔

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں

جیا کرتی ہے
یہ حسیں کھیت ، پھٹا پڑتا ہے
جوبن جن کا
کس لئے ان میں فقط بھوک اگا
کرتی ہے
(نقش فریادی
،ص: ۸۲)

فیض ؔاپنے عہد کے بڑے نبا ض اور مز اج شنا ش ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ملک کے با شند وں کی زبوں حا لی کی نقش گر ی طرح طرح سے کرتے ہیں ۔نظم " چندروز اور مری جان " کے اشعار دیکھیئے

اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیئے
جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے
جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے
ہیں
(نقش فریادی،
ص:۷۵)

سید ابو الخیرکشفی کے خیال میں "فیضؔ کی شا عر ی کی سب سے نما یا ں خصوصیت ان کی انسان دوستی قرار دی جاتی ہے"۔

فیضؔ کی انسا نوں سے محبت کو احمد ند یم قا سمی نے یوں اپنے الفا ظ میں سمو دیا ہے ۔

> فیضؔ کو سامراج سے نفر ت ہے ، سر مایہ داری اور جا گیر داری سے نفرت ہے ۔ غلامی اور انسا نوں کے ہاتھوں کر وڑوں انسانوں کے سفاکا نہ استحصا ل سے نفرت ہے ۔ا تنی بہت سی نفرتیں جب اظہار پاتی ہیں تو شعروں ، چیخو ں ، فر یادوں سے کان پڑتی آواز سنا ئی نہیں دیتی۔ مگر فیضؔ کے ہاں ایسی کو ئی کیفیت ہے ہی نہیں ۔ دراصل ان سب نفر توں پر فیضؔ کی بنی نوع انسان سے محبت آسمان کی طرح چھا گئی ہے ۔ یہ ساری نفر تیں فیض ؔکی ہمہ گیر انسان دوستی کی لپیٹ میں آگئی ہیں ۔

انسا نیت نواز فیضؔ کی شاعری کا یہ کمال ہے کہ اس نے نہ صر ف مظلو موں کے بارے میں قلم اٹھا یا بلکہ کارخانوں کے مزدوروں ، کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں ، دما غی مز دوری کر تے کلرکوں ، دکا نداروں ، استادوں ، طالب علموں ، اور عورتوں کی تکا لیف کو

اپنامو ضو ع بنا یا اور سب سے بڑھ کر کسان کو " با دشاہ جہاں والی ما سوا نائب اللہ فی الارض دہقاں کے نام " کہہ کر پکار نا فیضؔ ہی کا کمال ہے ۔ اس سلسلے میں سر وادئ سینا کی انتسابی نظم ان کی انسا ن دوستی کی بہتر ین مثال ہے۔

کارخانوں کے بھوکے جیالوں کے نام
بادشاہ جہاں والی ماسوا نائب اللہ فی الارض
دہقاں کے نام جس کے ڈھوردں کو ظالم ہنکالے گئے
جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے
ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی ہے
دوسری مالئے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی ہے
جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے دھجیاں ہو گئی ہے
(سروادی سینا، ص: ۲۰)

بقول خالد سہیل! "فیضؔ نظر یاتی طور پر سو شلسٹ لیکن مز اجاً ہیو منسٹ (Humanist) تھا۔ اسکی شا عری میں ان دونوں نظریا ت کا خو بصورت امتز اج ملتا ہے جو اسے با قی شاعروں سے ممتا ز کرتا ہے"۔

فیضؔ کا دکھی انسا نیت سے درد مندی اور انسان دوستی کا ازلی رشتہ تھا۔ جس طرح وہ ارض وطن کے بید اد گروں کی دہشت خیزی سے بیزار تھے۔با لکل اسی طرح وہ فلسطین ، ایران، عراق، ہند ، چین ،اور امر یکہ کے نہتے اسیروں اور مجا ہد وں کے ساتھ تھے۔ جو وہاں کے زند انوں اور مقتلوں میں شہید ہو رہے تھے ۔ فیضؔ بیروت کی تبا ہی کے عینی شاید تھے۔ جہاں بچوں ، بوڑھوں اور عورتوں پر جدید ترین جنگی ٹیکنا لوجی کے تما م حر بے آزما ئے گئے ۔ ایسی قیامت خیز صورتحال میں ا نہوں نے مجاہدوں کا حو صلہ بڑ ھانے کے لئے ترا نہ لکھا ۔ تو کہیں پر دیس میں کام آنے والے فلسطینی شہید وں کے پر چم کی با ت کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم " فلسطینی شہدا جو پر دیس میں کام آئے" ۔ان کی انسان دوستی کی بہترین غما ز ہے ۔

دور پردیس کی بے مہر گزرگاہوں میں
اجنبی شہر کی بے نام و نشاں

راہوں میں
جس زمیں پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطین کا علم
تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطین برباد
میرے زخموں نے کئے کتنے فلسطین آباد
(مر ے دل مر ے مسا فر ،ص :٤٨)

مبا رک ہیں وہ قومیں جن میں فیضؔ جیسا انسان دوست جنم لیتا ہے اور جا وداں ہیں وہ تحر یکیں جن کے سا ئے میں یہ لو گ پھلتے پھو لتے ہیں ۔ فیضؔ کے درد مند دل نے دنیا بھر کے اسیروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ سمجھ لیاتھا ۔وہ ایرانی طلبہ جو امن اور آزادی کی جد و جہد میں کام آئے ۔ یہ سا نحہ بھی فیضؔ پر سخت گز را ۔ نظم " ایرا نی طلبہ کے نام" میں ان کی محبت ، انسا نیت اورامن و اخوت کے پا کیز ہ جذ بات واضح طور پر د کھا ئی دیتے ہیں ۔

یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ لکھ لٹ
جس کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے
اے ارضِ ِعجم ، اے ارضِ عجم !
(دست صبا، ص :٦٠)

"سید سبط حسن " فیضؔ کی انسان دوستی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں ۔

ان کی انسا ن دوستی ملک و ملت ، نسل و رنگ کے تعصبات سے پاک ہے ۔ا نسا نیت کا خون جہاں کہیں ہوتا ہے ۔ فیضؔ صاحب تڑپ اٹھتے ہیں ۔ وہ وطن کی آزادی پر قربان ہو تے ایرانی طلبہ سے پیار کر تے ہیں جن کے " میٹھے نور اور کڑوی آگ سے ظلم کی آند ھی رات میں پھو ٹا صبح بغا وت کا گلشن "۔ وہ افر یقی حریت پسندوں کا ترانہ گاتے ہیں ۔

جنہوں نے " دھول سے ماتھا اٹھا لیا ہے اور غم کی چھال
آنکھوں سے چھیل دی ہے او ربیکسی کے جال کو نوچ کر
پھینک دیا ہے اور امر یکی جلا د جب ایتھل اور جولیس روز
ن بر گ کو بے گنا ہی کے جرم میں سو لی چڑ ھا تے ہیں
تو فیضؔ صاحب ان شہیدان وفا کی یاد میں ایسا مر ثیہ نما انقلا
بی رجز لکھتے ہیں جس کی نظیر اردو کیا دنیا کی شاید ہی
کسی زبان میں ملے۔

فیضؔ جیسا انسا نیت نواز اور تر قی پسند شاعر ہر دل کی دھڑکن اورآنکھوں کا ستارہ تھا ۔ اپنے ہم وطنوں کی زبوں حالی اور شکستہ دل کی تر جما نی کے با و جود فیضؔ نے اپنی شاعری میں شکست خو ردہ ذہنیت کو کبھی راہ نہیں دی بلکہ رجائیت کا جذ بہ اپنی بھر پور تو انا ئی کے ساتھ ان کے ہاں دکھا ئی دیتا ہے ۔ ا ن کے خیال میں انسانی زند گی سر مایہ دار انہ نظام کی جن لعنتوں میں گرفتار ہے ان سے نجات کی واحد صورت عا لمگیر عوامی جد و جہد ہے۔ تر قی پسندوں کے عقا ئد کا اہم جز وعوام کی طاقت پر اعتماد ہے ۔ فیضؔ کے ہاں یہ عقیدہ بھر پور طور پر موجود ہے۔نظم "سوچ " کے اشعار دیکھئے ۔

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے
سر پھوٹیں گے خون بہے گا
خون میں غم بھی بہ جائیں گے
ہم نہ رہیں ، غم بھی نہ رہے گا
(نقش فریادی
،ص: ۵۸)

فیضؔ کے نز دیک وہ غم جس نے انسانوں کی اکثریت کو زند گی کی تما م حلا وتوں سے محروم کر رکھا ہے اس کا مداوانہ تو ہمدردوں کے حر ف تسلی میں پو شیدہ ہے نہ شاعر کے شیر یں نغموں میں بلکہ عوام اپنے مصا ئب کے مسیحا خود ہیں ۔ نظم " مرے ہمد م، مرے دوست " کے اشعار اس نکتے کی بھر پور وضاحت کر تے ہیں ۔

نغمہ جراح نہیں ، مونس و غم خوار سہی
گیت نشتر تو نہیں ، مرہم آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ ، نہیں نشتر کے سوا
اور یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے

قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا تیرے سوا
تیرے سوا
(دست صبا،ص:
۱۹)

فیضؔ کی نظم "شیشوں کا مسیحا کو ئی نہیں " اس طبقاتی جنگ کی طر ف اشارہ کرتی ہے جو ہرطر ف "لوٹنے والوں "اور"لٹے ہوں" کے درمیان جا ری ہے ، ۔ ان لو گوں کے نام دعوت شرکت ہے جن کے سا غر دل کو ناداری ، دفتر ، بھول ، اور غم کے چو مکھ پتھر او نے ٹکڑ ے ٹکڑ ئے کر دیا ہے ۔ انہوں نے یاس وحسرت میں ڈوبے لو گوں کو ان اٹھا ئی گیروں سے لڑنے کی تر غیب جس انداز میں دی ہے و ہ انہی کا کمال ہے ۔

سب ساغر شیشے ، لعل و گہر
اس بازی میں بد جاتے ہیں
اٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اس رن سے بلاوئے آتے ہیں
(دست صبا،
ص: ٤٦)

فیضؔ کی نظم " ہم جو تا ریک راہوں میں مارے گئے " اگر چہ ایتھل اور روز نبر ک کا المیہ ہے لیکن اس نظم میں مر ثیے کے سوز کی بجا ئے رجز کی ولو لہ انگیز ی ہے۔ یہاں فیضؔ کی رجا ئیت میں غضب کی توا نا ئی دکھا ئی دیتی ہے ۔ جوان کی انسان دوستی کی عکا س ہے ۔

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چکے درد کے فاصلے
(زند ان نا مہ،
ص: ٤٣)

بقول محمد یو سف!" محبت ، انصا ف امن و آزادی روشنی و راستی ، حسن و صداقت وہ حیات افز ا ثباتی قدریں ہیں جن کی سر بلندی کے لیے فیض کی نظمیں وقف ہیں "۔

تر قی پسند شا عروں کے یہاں عام طور پر ملکی مسا ئل اور مصا ئب کا بیان تو ملتا ہے لیکن ملک سے محبت کا اظہار نہیں ۔ مگر فیضؔ کے ہاں یہ بات نہیں ۔ انہیں ایک نئے اور بہتر نظام حیات کی طرح اپنا وطن بھی عز یز ہے اور اس سے وا لہانہ محبت ان کا امتیا زی وصف ہے

۔ اس سلسلے میں ان کی نظم " نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں " قابل تو جہ ہے ۔ جہاں قید خانے کے درو دیوار سے وطن کی محبت پاش پاش نہیں ہوتی ۔

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے ، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے
(دست صبا ، ص: ٦٤)

فیضؔ کی شاعری انبا ئے وطن سے محبت کی شاعری ہے انہوں نے اہل وطن کے دکھ درد کو بڑی مہارت سے بیان کیا ہے ۔ جہاں انہیں مصا ئب میں مبتلا دیکھ کر نجات کی نوید دی تو دوسری طرف ما یوسی میں گھرا پایا توان کی آنکھوں میں کو ئی صبح منور کر دی ۔

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو ، بڑھتے بھی چلو ، بازو بھی بہت ہیں ، سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے
اے ظلم کے مارو لب کھولو ، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اٹھے گا ، کچھ دور تو نالے جائیں گے
(دستِ صبا ،ص: ٤٢)

غر ض فیضؔ کی شاعری ہمیں ایک صبح امید کا پیغام دیتی ہے ،ا
ور ظلم و ستم کی سیا ہ رات کے ختم ہونے کامثردہ جانفزا سناتی ہے ۔سید
جعفر احمد عظیم انسان دوست فیض ؔکو خراج تحسین پیش کرتے ہو ئے
کہتے ہیں ۔
" فیضؔ تما م عمر انسانیت کی دشمن قوتوں کے خلا ف لڑتے رہے اور یہ
لڑا ئی انہوں نے اس ایقان کے ساتھ لڑی کہ بالآ خرانسا نیت کی حریف قو
تیں نامراد ہوں گی اور انسان جیت جا ئے گا ۔ وہ طبقا تی تقسیم ہو یا
رنگ و نسل کے امتیازات ، آمریتوں کے ہاتھوں ا نسانی شر ف و وقار
کی پا مالی ہو یا امن عالم کو لا حق جنگ وتبا ہی کے مستقبل خطرات ،
فیض ؔنے اپنے عہد کی ان تمام بے بضا عیتوں کی تصویریں کچھ اس
انداز سے پیش کی ہیں کہ ہر تصویر کے اندرپرامید مستقبل کے رنگ
بھی شامل کر دیئے ہیں اور یوں ان کی شاعری بجائے خود ایک فعال
قوت بن گئی ہے جو ہر آنے والے والی نسل کو عمل پر اکسا تی رہے
گی"۔

علی سردار جعفری اور انسان دوستی (۲۰۰۲۔۱۹۱۲)

سر دار جعفری اول تا آخر تر قی پسند ہیں ۔ اور کبھی کبھی یہ
تمیزکرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ سردار جعفری تر قی پسند تحریک ہیں یا
ترقی پسند تحریک سردار جعفری۔ بہر حال دونو ں ایک دوسرے کے لئے
لازم و ملز وم ہیں ۔ انور ظہیر خان " علی سردار جعفری کی شخصیت پر
روشنی ڈالتے ہو ئے کہتے ہیں ۔

وہ علی سردار جعفری جنھوں نے ز مبند اری کے عیش و
عشرت پر لات مار ی تھی۔ اپنے آدرشوں اور اصولوں کی
خاطر لکھنو ، بنارس ، بمبئی ،اور نا سک کی جیلوں ،میں
قید وبند کی صعو بتیں جھیلی تھیں ۔ انگر یزی سرکار کی ملا
زمت اور لندن میں اعلا تعلیم کے حصول کی پیش کش ٹھکر
اد ی تھی ۔ وہ علی سردار جعفری جو کبیر داس کے دوہوں
کو اردو کے ارتقا ئی تسلسل کی کڑی خیال کرتے ہیں ۔ میرا
با ئی کے بھجن گا تے ہیں ۔ میرؔ کے فرمائے ہو ئے کو
مستندما نتے ہیں۔ جو غالبؔ کے شید ائی ہیں ۔اقبالؔ کے پرستار
ہیں ۔کمیو نسٹ ہو نے کے با وجو د کسی مذ ہب کی نفی نہیں
کر تے اور نہ ہی تصو ف کی ۔۔۔میں نے انہیں جب جب
دیکھا تو ان کی جھر یاں پڑے ناک نقشے پر قو می اور
عالمی سطح پر ایک طویل معا شی اتار چڑھا و ، سیا سی پیچ

وخم ، تا ریخی تبدیلی ، جغرافیائی کتر بیو نت ، امن میں
جنگ کی ساز ش، جنگ میں امن کی کو شش کی کہانی
لکھی نظر آئی ۔

علی سردار جعفری کی ذات کا مطالعہ کیا جا ئے تو وہ شاعر سے زیادہ ایک سچے کھر ے ، ہمد رد اور انسان دوست نظر آتے ہیں ۔ وہ جد و جہد کے آدمی تھے ۔ انہوں نے اپنی سا ری زند گی انسانی فلا ح و بہبود کے لئے و قف کر رکھی تھی۔ انہوں نے ساری زند گی ظلم ، جبر و استحصال اور منا فقت کے خلا ف جنگ جاری رکھی ۔ وہ اپنے نظر یا ت میں چٹان کی طرح آخری وقت تک ثا بت قدم رہے اور انسان کی سر بلندی کے لیے ہمیشہ کو شاں رہے اور دنیا میں مساوات کے ناصر ف خواب دیکھے بلکہ انہیں عملی طور پر سچ ثا بت کر نے کےلئے مصروف عمل بھی رہے۔انہوں نے ہمیشہ عام عوام کے بار ے میں سوچا۔ یہ ہندو ستان سے غریبی ، بے کاری اور بے روز گاری کا خاتمہ چا ہتے تھے ۔

کبیر با ئی کے د یبا چے میں علی سردار جعفری انسان کی
بے بسی پر ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔
انسان ستاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے ۔ پھر بھی حقیر ہے
۔ مصیبت زدہ ہے ، درد مند ہے وہ رنگوں میں بٹا ہوا ہے۔
قو موں میں تقسیم ہے اس کے درمیان مذ ہب کی دیو اریں
گھڑی ہیں ۔ با دشا ہوں اور حکمرانوں کی جگہ بیو رو
کریسی لے رہی ہے ۔ اس لیے انسان کوایک نئے یقین ، نئے
ایمان اور نئی محبت کی ضر ورت ہے جو اتنی ہی پرانی ہو
جتنی کبیر کی آواز۔

اس میں کو ئی شک نہیں کہ علی سردار جعفری جتنے بڑے تر قی پسند شاعر ہیں انہیں زند گی سے اتنا پیار ہے۔ ایسے شاعر اپنی ذات کی نفی کر تے ہوئے دوسروں کے دکھ درد کو شد ت سے محسو س کرتے ہیں اورانہیں دور کر نے کی بھر پور کوشش کرتے ہیں ۔ اور یہی خو بی انہیں دوستوں کی دوست اور انسانی قدروں کی پاسبان بناتی ہے ۔ اس کے خیال میں معا شرہ طبقا ت کا شکار ہے ۔ اس میں کچھ طبقے ایسے ہیں جو ظالم سفاک اوراستحصال کرنے والے ہیں اور کچھ طبقے ہیں جو مظلوم ہیں اور تخلیق کر نے والے ہیں ۔ چو نکہ شاعر خود خلا ق ہے اس لیے اس کا رشتہ اور تمام ہمد ردی محنت کش اور خلاق مز دوروں ، کسانوں اور عام انسانوں کے سا تھ ہے ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم " اودھ کی خاک حسیں " کے چند اشعار دیکھئے جس میں ان کی انسان دوستی کا رنگ جھلکتا ہے ۔

میرے تصور میں ساقیوں کاخرام رنگیں نہ
جام و مینا کی گرد شیں ہیں
نہ میکدے ہیں نہ شورشیں ہیں
میں چھوٹے چھوٹے گھروں کی چھوٹی سی
زندگی میں گھرا ہوا ہوں
اندھیرے قصبوں کو یاد کر کے تڑپ رہا ہوں
وہ جن کی گلیوں میں میرے بچپن کی یادیں
اب تک بھٹک رہی ہیں
جہاں کے بچے پرانے کپڑے کی میلی گڑیوں
سے کھیلتے ہیں
گاوں جو سینکڑوں برس سے بسے ہوئے ہیں
کسانوں کے جونپڑوں پہ ترکاریوں کی بیلیں
چڑھی ہوئی ہیں
پرانے پیپل کی جڑ میں پتھر کے دیوتا بے خبر
پڑے ہیں
قدیم برگد کے پیڑ اپنی جٹائیں کھولے ہوئے
کھڑے ہیں
یہ سیدھے سادے غریب انسان نیکیوں کے
مجسم ہیں
یہ محنتوں کے خدا ، یہ تخلیق کے پیمبر
جو اپنے ہاتھوں کے کھردرے پن سے زندگی
کو سنوارتے ہیں
(کلیات علی سردار جعفری ، حصہ دوم ،ص:
۹۵،۹۶)

اس سلسلے میں ان کی ایک اورنظم "رومان سے انقلاب تک " قابل توجہ ہے جس میں وہ سرخ پرچم کے سائے میں آنے کی تلقین کرتے ہیں اور مزدوروں کو جمہور کے ساز پر گانے کا مشورہ دیتے ہیں ۔اشعار دیکھئے۔

شاعرو ، ساتھیو
کاکلوں کی گھنی چھاوں سے
سرخ پرچم کے سائے میں آو
اور نئے گیت گاو
گاو مزدور کے ساز پر
گاو جمہور کے ساز پر
آہنی کاروانوں کے قدموں کی آواز پر

گا و جس طرح میداں میں کو ئی مجاہد رجز
پڑھ رہا ہو
گاو جیسے سمندر میں طوفان کا دیوتا چڑھ رہا
ہو
گاو گاو گرجتے ہوئے بادلوں کی طرح
گاو گاو کڑکتی ہوئی بجلیوں کی طرح
آندھیوں کی طرح
زلزلوں کی طرح
گولیوں کی طرح اپنے الفاظ دشمن پہ برساو
سارے عالم پہ چھا جاؤ
(کلیات علی سردار جعفری،حصہ اول،
ص:۴۴۱)

اپنی عوامی شاعری پر تبصر ہ کر تے ہوئے علی سردار جعفری
کہتے ہیں ۔

میری شاعری میں ہا تھوں کا ترانہ میرے ما رکسی شعور کی دین
اور اقبالؔ کی رو ایت کی تو سیع اور تسلسل ہے۔ یہ محنت کش اور خلاق ہا
تھ ہیں ۔ جو تہذ یب و تمدن کی تعمیر کر تے ہیں اور انقلاب کی تلو ار بن
جا تے ہیں۔

علی سر دار جعفری نے ہمیشہ محبت کے پھو ل کھلا ئے اور انسان
دوستی کا پیغام عام کیا ۔ یہی و جہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان
کشید گی نے انہیں ہمیشہ پر یشان رکھا ۔ اور پھر جب ۱۹۶۵میں ہند
وستان اور پاکستان میں پہلی جنگ ہو ئی تو اسی حساس ہمد رد اور انسان
دوست شاعر نے نظم " صبح فردا " لکھی ۔

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو
ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی
یہ سرحد خون کی اشکوں کی آہوں کی
شراروں کی
جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اگائی تھیں
یہاں محبوب آنکھوں کے ستارے تلملائے تھے
یہاں معشوق چہرے آنسووں میں جھلملائے
تھے
یہاں بیٹوں سے ماں ، پیاری بہن ، بھائی سے
بچھڑی تھی
یہ سرحد لہو پیتی ہے شعلے اگلتی ہے

ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے
میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبحِ فردا کا

(کلیات علی سردار جعفری، حصہ دوم، ص:٣٥٤)

انسان دوست علی سردار جعفری کی یہ خاص خوبی تھی کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی انسا نیت تڑ پتی سسکتی نظر آتی یہ اسکی امداد کے لئے اٹھ کھڑ ے ہو تے۔ ١٩٤٤ میں جب بنگال قحط سالی کا شکار ہوا اور انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ زوروں پر تھی تو ان جیسے ہمدرد اور حساس آدمی نے لو گوں کی تکا لیف کو شد ت سے محسوس کیا اور انہوں نے ایک طویل ڈرا مائی نظم" نئی دنیا کو سلام " لکھی۔ اس نظم پر تبصر ہ کر تے ہو ئے عز یز احمد لکھتے ہیں ۔"سردار جعفری کی یہ نظم اس لحاظ سے بالکل نئی ہے کہ یہ اشتمالی نظر یہ حیات کا ہند وستان کی ما ضی قر یب کی حالت پر پہلا مکمل انطباق ہے اور اس کے لیے بڑ او سیع کینو س استعما ل کیا گیا ہے "۔

نظم " نئی دنیا کو سلام " میں مر یم اور جا و ید کے انقلا ب آفر یں پیغام کو ڈراما ئی اند از میں بیان کیا گیا ہے اور مستقبل کے انسان کو امید ، انقلاب اور بیداری کی نو ید سنا ئی گئی ہے ۔ اس کے علا وہ انسا نی عظمت کا ترانہ بھی خوبصورت اور دلنشین انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔ لیکن ساتھ ہی غلام قوم کی زبو ں حالی کا نقشہ کھنچ کر تصویرکا تا ریک پہلو بھی دکھا یا گیا ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

سوار دوش کہکشاں پہ ہو رہا ہے آدمی
توہمات کی سیاہی دھو رہا ہے آدمی
خوشی کی مے میں اپنے غم ڈبو رہا ہے آدمی
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے
مگر غلام قوم کی گھٹی ہوئی ہے زندگی
مثالِ شمع مفلسی بجھی ہوئی ہے زندگی
سپاہیوں کے درمیاں گھری ہوئی ہے زندگی
اگرچہ یہ جہانِ آب و گِل بہت حسین ہے
مگر غموں سے چور چور شیشہ زمین ہے

(کلیات علی سردار جعفری ،حصہ اول،ص:١٨٦،١٨٤)

اس نظم میں علی سردار جعفری نے عمدہ پیرا ئے میں بو ژ واطبقے کے حا کما نہ اخلا ق اور امن و تہذ یب کے نام پر فریب کاری کا پردہ چاک کیا ہے جب جا وید اپنی بیوی کو سر ما یہ داری کی بھیا نک تصویر دکھا تا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ سننے والوں کے دلوں میں سر مایہ داری کے خلاف نفرت کے جذ بات پید اہو تے جا تے ہیں ۔

آج " سرمایہ داری "
بوڑھی قحبہ ہے دلالی پیشہ ہے اس کا
اب وہ ایک سانس لیتی ہوئی لاش ہے
سالہا سال سے سڑ رہی ہے
قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوئی ہے
اس نے اپنی جوانی میں اپنی غلط کاریوں سے
کتنے بچے جنے ہیں
بھوک ، بیکاری ، افلاس ، قحط ، وبا ، جہل و ہم آتشک
زہر یلی گیس اور ایٹم کے بم اس کی گودوں کے پالے
ہوئے ہیں
اب یہ بچے جواں ہو گئے ہیں
زندگی کےلئے ایک بلا ہو گئے ہیں
اور سر ما یہ داری کی بوڑھی چھنال ان کی طاقت سے
انسا نیت کا لہو پی رہی ہے
(کلیات علی سردار جعفری (حصہ اوّل)،ص:۱۹۷)

اس نظم کی آخر ی تصویر جا وید کی بیوی مر یم کا پید اہو نے والا بچہ ہے جو نئی دنیا کی علا مت ہے ۔ اس حصے میں جا وید کا خط اپنے اسی پید اہو نے والے بچے کے نام ہے ۔جو دراصل انسان کے روشن اور تا بنا ک مستقبل کی طر ف ایک پیغام ہے جسے وہ اس طرح دیتا ہے ۔

کبھی جذبہ شوق گھٹنے نہ پائے
نظر آسمانوں سے ہٹنے نہ پائے
گزرنا مصائب سے منہ موڑ کر
حوادث کی زنجیر کو توڑ کر
یہ مانا کہ تاریک ہوتی ہے رات
ستاروں کے موتی پروتی ہے رات
جہانِ کہن کا یہ دستور ہے
سیاہی کے آغوش میں نور ہے

(کلیات علی سردار جعفری (حصہ اوّل
)،ص:۲٦۸،۲٦۹)

سردار جعفری نے خود اپنی اس نظم " نئی دنیا کو سلا م" کو انسانی مستقبل کی فتح قر ار دیا ہے وہ کہتے ہیں !

دنیا کی تا ریخ میں کو ئی دور ایسا نہیں آیا جس میں "انسا ن " کو شکست ہو ئی ہو ۔ افراد اور طبقا ت کو شکست ہو تی رہی ہے اور ہو گی لیکن " انسا ن " ناقا بل شکست ہے۔ کیو نکہ اسکی محنت ، عمل اور جد و جہد اس کے اپنے شعور ہی کی نہیں بلکہ بڑی حد تک اس کے ما حول کی بھی خالق ہے ۔ اس لیے وہ ہمیشہ فتح مند اور کامران رہے گا ۔

تر قی پسند علی سردار جعفری نے ہمیشہ اخوت ، محبت اور بھا ئی چارے کے پیغام کو عام کیا ۔اس سلسلے میں ان کی نظم "مشرق ومغرب" اہمیت کی حامل ہے۔ جس میں انہوں نے انسانی وحد ت اور انسا نی محبت کے اسی پیغام کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے ۔ جو تر قی پسند تحر یک کا بنیادی اصول تھا ۔ وہ چا ہتے تھے کہ رنگ ونسل اور ذات پات اور فر قے کے امتیازات کو ختم کیا جا ئے اور ساری دنیا میں محبت کا پیغام عام کیا جا ئے ۔ خواہ میں ہندوستان کی سر زمین ہو، خواہ یو رپ اورخواہ امر یکہ دراصل وہ مشر ق و مغرب کے درمیان حا ئل دیو اروں کو منہدم کر دینا چا ہتے ہیں ۔ کیو نکہ خواہ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ انسان ہی آبادہیں اور انسانوں سے محبت ہی اصل انسان دوستی ہے ۔ اشعار ملا حظہ ہوں

زندگی ایک زمین ایک انسان بھی ایک
فکر کا بحر بھی جذبات کا طوفان بھی ایک
شرق سے غرب تلک وقت کی پرواز ہے ایک
دل جو سینوں میں دھڑکتے ہیں تو آواز ہے ایک
باغ مشرق ہو کہ مغرب ہو ہوا ایک سی ہے
سرد یا گرم بہرحال فضا ایک سی ہے
بوئے گل ایک سی ہے بوئے وفا ایک سی ہے
میرے اور تیرے غزالوں کی ادا ایک سی ہے

(کلیا ت علی سردار جعفری (حصہ دوم)،ص:۲۰٤،۲۰۱)

سردار جعفری کے خیال میں انسانوں کے درمیان تفر یق پیدا کر نے والی چیز دولت کی ہو س اور مغر ب کی مادہ پر ستی ہے ۔ دوسرے مغرب نے قوم پر ستی کے نظر یہ کو ہوا دے کر انسانوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کا جرم بھی کیا ہے ۔

جس نے لوٹا ہے ہمیں جس نے ستم ڈھایا ہے
ارض مغرب نہیں مغرب کا وہ سرمایہ ہے
کچھ مظاہر کے طلسمات میں کھو جاتے ہیں
زہر سا نفرت و نخوت کا پیا کرتے ہیں
ہم حقیقت سے کبھی دور جو ہو جاتے ہیں
یونہی انسانوں کو تقسیم کیا کرتے ہیں
(کلیا ت علی سردار جعفری (حصہ دوم)،ص:۲۰۴،۲۰۱)

سردار علی جعفری کے ہاں و طن سے محبت کا رنگ بھی اپنے ایک خاص انداز میں دکھا ئی دیتاہے ۔ ۱۵ اگست۱۹٤۷کو جب ہند وستان آزاد ہو رہا تھا ۔تو انہوں نے دلی کے بارے میں کیا حسین خواب بنے تھے اور مستقبل کی ایک تا بنا ک تصویر کھینچی تھی ۔لیکن بعد میں جو تصویر ابھری ، ملک کی جو حالت سامنے آئی اس سے شاعر کا دل بہت مغمو م ہو ا۔ اشعار دیکھیے ۔

غریب سیتا کے گھر پر کب تک رہے گی راون کی حکمرانی
دروپدی کا لباس اس کے بدن سے کب تک چھنا رہے گا
شکنتلا کب تک اندھی تقدیر کے بھنور میں پھنسی رہے گی
یہ لکھنو کی شگفتگی مقبروں میں کب تک دبی رہے گی
سروں کے اوپر مصیتوں کے پہاڑ کب تک گرا کریں گے
(کلیات علی سردار جعفری)

علی سردار جعفری کے دو مجمو عے " امن کا ستارہ " اور " ایشیا جا گ اٹھا " تر قی پسند شاعری کے ایک الگ فکری آہنگ اور سما جی و تہذ یبی شعور کا پتہ دیتے ہیں ۔ان دونوں مجمو عوں میں عالم انسا نیت کی دبیز اور درد مند تا ریخ چھپی ہوئی ہے ۔ چو نکہ ان کی شاعری خواص کے لئے نہیں بلکہ عوام کے لئے ہے اس لئے انہوں نے عوامی بول چال کا انداز اختیار کر تے ہو ئے عوامی مسا ئل و مصا ئب کی عمد ہ تصو یر کشی کی ہے ۔ان اشعار میں ان کی انسان دوستی کا رنگ جھلکتا ہے۔ اشعار دیکھیے۔

بھوکے رہتے دھوبی موچی بنجارے اور لکڑرے
دھن کی ناگن روٹی پانی پر بیٹھی تھی کنڈلی
مارے
رین و نا محنت کرتے تھے سانجھ سکارے
روتے تھے
اندھوں آگے روتے تھے اپنی بھی آنکھیں
کھوتے تھے
(کلیات علی سردار جعفری(حصہ
اول)،ص:٤٥٣)

علی سردار جعفری کی نظم " ایشیا جاگ اٹھا " بیک وقت رز میہ اور غنا ئیہ انداز لئے ہو ئے ہے ۔ اس نظم میں چا ر ہزار سالہ تہذ یب کی تصویر پیش کی گئی ہے ۔ یہاں کی غریبی چیتھڑے پہنے دکھا ئی دے رہی ہے ۔ اس کے عوام کی بغاوت کابے پنا ہ جذ بہ قو می اور ملی احسا سات کو سمو تا ہوا ایک طوفا نی سمندر میں تبد یل ہو گیا ہے۔اشعار دیکھیے۔

ہم ایشیا کے عوام سورج کی طرح ڈوبے ہیں
اور ابھرے
دکھوں کی اگنی میں تپ کے نکھرے
ہماری آنکھوں کے آگے کتنی سیاہ صدیوں کی
سانس ٹوٹی
نہ جانے کتنے پرچم
ہماری نظروں کے سامنے سرنگوں ہوئے
الٹتے دیکھے ہیں تخت ہم نے
اجڑتے دیکھے ہیں تاج ہم نے
ہمارے سینے سے جانے کتنی رتھوں کے پہیے
گرز چکے ہیں
مگر ہم اس بھوک ، قتل ، افلاس ، کے اندھیرے
حوادثِ روزگار کے تند و تیز شعلوں میں ان
گنت جنم لے چکے ہیں
ہم اپنی دھرتی کی کوکھ میں بیج کی طرح دفن
ہوگئے ہیں
مگر نئی صبح کو ہوا میں
بہار کی کونپلوں میں تبدیل ہو کے باہر نکلے
پڑے ہیں

(کلیات علی سردار جعفری(حصہ دوم)، (ایشیا
جاگ اٹھا) ،ص: ۲۸)

علی سردار جعفری اپنی عوامی محبت اور انسان دوستی کے حوالے سے کسی قسم کا سمجھو تہ کرنے پر تیا ر نہیں ہوتے تھے۔ "امن کا ستارہ "کے دیبا چے میں خود تحریر کرتے ہیں ۔

میری شاعری خواص کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ عوام کے لئے ہے اور میری خو اہش اور کو شش ہے کہ زیادہ سے زیا دہ لوگ اسے سمجھ سکیں ۔ کا رخانوں میں کام کرنے والے مز دور اور کھیتوں میں ہل جو تنے والے کسان ۔ اس لئے میں نے بول چال کی زبان کو بنیاد بنایا ۔

بہر حال علی سردار جعفری کی شاعری کی امتیازی اقدار انسان دوستی ، حریت پسند ی اور وطن پر ستی ہیں ۔ ان کا ذہنی سفر سا مراج کے خلاف للکار سے شروع ہوا ۔ انہوں نے قید و بند کی صعو بتیں برداشت کیں ۔عوام کے دکھ درد کی ترجمانی ، کچلے انسا نوں کی حمایت اورسما جی انصا ف پسند ی کے لیے آواز بلند کی ۔ فر قہ واریت اور تشدد کی ہمیشہ مذ مت کی اور امن و آشتی کے لئے برابر آواز اٹھا تے رہے۔ ان کے ہاں امید کا دیا کبھی بجھتا نہیں بلکہ رجا ئیت کا دامن تھا مے نظر آتے ہیں ۔ نظم " میرا سفر" کے اشعار دیکھئے ۔

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے
اور برگ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اڑ جائے گی
لیکن میں یہاں پھر آوں گا
بچوں کے ذہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاوں گا
دھرتی کی سنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے میری بھر جائیں گی
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصہ میرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے

(کلیات علی سردار جعفری (حصہ،ص:
۲۴۰،۲۴۱،۲۴۲)

بقول علی احمد فا طمی!

سردار ایک خواب کی بات کر تے ہیں ۔ تر قی پسندی ،
روشن خیالی اور سب سے بڑھ کر انسا ن دوستی یا انسانی سا
لمیت اور و حد ت کی باربار بات کر تے ہیں ۔ جس میں با
دی النظر میں مار کسزم ضرور ہے ۔ لیکن بنیاد میں صوفی
ازم کے جذ بات و تصورات زیادہ جھلکتے ہیں ۔ سردار
بنیادی طور پر حق پر ستی اور انسان دوستی کے شاعر ہیں ۔
جو فی زمانہ تر قی یا فتہ شکل میں ما رکسزم اور پر و گر
یسو ازم میں بد ل جاتے ہیں ۔ لیکن ان کا ذہن و شعور ، تا
ریخ و تہذ یب کے انہیں معاملات میں رچا بسا ہے ۔

احسان دانش اور انسان دوست (۱۹۱٤۔۱۹۸۲)

کسی شا عر کا فن اور نظریہ حیات اس کے سما جی شعور کا عکا
س ہوتا ہے ۔اور سما جی شعور کو انسانی زندگی کی مادی بنیادوں سے
علیحٰدہ کر کے نہیں سو چا جا سکتا ۔ اس لئے احسان کے فن اور نظر یہ
حیات کو جا ننے کے لئے ان کی زند گی کا مکمل پنارما
(Panarama)ہمارے سامنے ہونا نہایت ضروری ہے ۔احسان دانش نے
ایک نہایت غریب اور مفلس گھر انے میں آنکھ کھو لی۔ ان کے والد قاضی
دانش علی محنت مز دوری کرکے بڑی مشکل سے اپنا اور اپنے بال بچوں
کا پیٹ پا لتے تھے ۔اسی تنگد ستی کے باعث وہ اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری
نہ رکھ سکے ۔ چوتھی جماعت پاس کر نے کے بعد کمسنی ہی سے زمانے
کے مصائب وآلام کا شکار ہو گئے ۔ سن شعور کا سارا زمانہ محنت مز
دور ی کی نذ ر ہو گیا ۔ معمولی سے معمولی کام کرنے میں بھی عا ر
محسوس نہ کی ۔مز دور، چپڑ اسی ، چو کیدار ، باغبا ن ، قلی، رنگ ساز،
قالین بان، اور باورچی ہر روپ اپنا یا لیکن مفلسی کا مداو انہ ہو سکا ۔لیکن
اس کے با وجود انہوں نے ہمت نہ ہاری اور بلند حو صلگی کا مظاہر ہ
کر تے ہوئے اپنے ان دنوں کو یاد کر کے خوشی اور فخر محسوس
کرتے ہیں ۔ اپنے ان روح فر سا حالات کا بیان انہوں نے " جہا ن دانش"
میں کیا ہے جو ان کی عظمت کی دلیل ہیں۔

ہر چند میں ابھی تک افلاس کے اونچے اونچے ٹیلوں میں بھٹک
رہا ہوں لیکن ما یو سی کا سا یہ تک مجھ پر نہیں پڑتا ۔ شا ید اس لیے کہ
میں نے مشکل سے مشکل وقت میں اپنی صداقت کو داغد ار نہیں کیا
اور میری پوری زند گی قرض کی ندامت سے پاک ہے ۔ ہاں حا فظے میں
فا قوں کے بے شمار نشان دھند لی دھند لی صورت میں مو جود ہیں ۔
جو مجھ پر شکر گز اری کا تقا ضہ کر تے رہتے ہیں ۔ زمانہ ہو گیا کہ
میں زمین پر سوتا ہوں اور ایک و قت کھا نے کا عادی ہوں جو میرے

افلا س کی مقد س یاد گار ہے اورمیں اس سے بے وفائی کو رو ا نہیں رکھتا ۔
احسآن کا زمانہ انتہا ئی کس مپر سی کا زمانہ تھا ۔ انگر یزی سامراج ہند وستان میں اپنا تسلط قا ئم کیے ہو ئے ہندوستان کا خون پی رہا تھا اور دوسری طرف پر انے جا گیر دار انہ نظام کے بو جھ تلے بھی سسک رہا تھا ۔ قحط ، فا قہ کشی ، بے روزگاری ، اور و با ئیں ہند وستان کے دیہات ، قصبات ،اور شہروں کی روز مرہ زند گی کی عام با تیں تھیں۔ مزدورں ، غر یبوں اور مفلو ک الحال انسانوں کے لئے تحصیل علم کے دروازے بند تھے ۔ ہند وستان کی معا شی زند گی میں دن بد ن بڑی ابتری پھیل رہی تھی۔ ایسی صورتحال میں احسان نے اپنا تعارف " شاعر مز دور ودہقاں " کی حیثیت سے کرایا ہے ۔ ان کی شاعری اپنے زمانہ کی سیا سی اور سما جی کشمکش کی بہترین اور مکمل تر ین تصویر ہے ۔
احسانؔ کی سا ری زند گی چو نکہ محنت و مشقت میں گزری۔ اس لیے وہ مز دوروں کی زند گی اور احسا سات سے بخو بی آگا ہ تھا ۔ ان کی شا عری میں مز دوروں اور کسا نوں کے لا متنا ہی دکھوں کی داستان محض خیالی یا تصوراتی نہیں بلکہ ان کے ذاتی تجر بات اور ذاتی داستان حیات پر مشتمل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس مخصو ص طبقے کی زند گی کی تصو یر یں جس کمال مہارت سے احسان نے پیش کی ہیں ۔دوسرا کو ئی شاعر اسکی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا ۔ اس اعتبار سے وہ نظیر اکبر آبادی کے بعد اردو کے سب سے بڑے عوامی شاعر ہیں ۔ احسانؔ کسا نوں اور مزدوروں سے شد ید ہمد ردی رکھتے ہیں ۔ ان کی مفلو ک الحالی پر کڑھتے ہیں ۔ اور ان کی آسودگی اور عا فیت کے دلی خو اہش مند ہیں ۔ انہوں نے اپنی نظموں "کسان " ، مز دور کی شام ،مز دور طالب علم ، مز دور کی لاش ، مز دور کی عید ، مزدورکی برسات، وغیرہ میں ۔محنت کش طبقہ کی زند گی اور مظلو می و بے بسی کی پھر پور عکاسی کی ہے۔ ان کی نظم،"مز دور کی شام " کے چند اشعار ملا حظہ کیجئے۔

روا ں ہے اس طرح مزدور گھر کی سمت جنگل سے
کھنچا جاتا ہے جیسے شمع کے جلووں میں پراونہ
تہی آنکھوں ، تہی سینہ ، تہی کیسہ ، تہی دامن
سلگتا آتش شب رنگ سے راحت کا کاشانہ
پھٹی دستار کا ہر تار ہے عنوان مجبوری
برہنہ پاوں کا ہر نقش ہے نکبت کا افسانہ

(چراغاں

،ص:۴۱،۴۲)

انسان دوست احسانؔ نے کمال مہارت سے مزدورں کی اقتصا دی بدحالی کا احسا س دلا نے کےلئے ان کی خانگی زند گیوں کے مر قعے پیش کیے ہیں ۔ کسی نظم میں مز دور کے اہل و عیال کی فا قہ کشی، کسی میں اس کے گھر میں عید کا دل سوز نظارہ کسی میں دیو الی کا منظر ، کسی میں مز دور کی آپس کی کشمکش ، کسی میں مزدور کی موت کا درد ناک نقشہ پیش کیا ہے۔ نظم " مز دور کی عید " کے اشعار دیکھئے ۔

عید کا دن ہے عذابِ زندگی اس کے لئے
ہر نفس ہے ایک نئی شرمندگی اس کے لئے
مہر خاموشی لبوں پر غمزدہ چہرے پہ یاس
درمیانہ قد مسیں بھیگی ہوئیں تیور اداس
غم کے دریا میں ہے سفینہ ہے لب و رخسار کا
سایہ پیشانی پہ اک ٹوٹی ہوئی دیوار کا
(آتش خا مو
ش،ص:۱۹،۲۰)

احسانؔ کی ایک نظم " طفیل بیمار" بھی ان کی انسانی ہمد ردی اور انسان دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہے ۔ جس میں انہوں نے ایک قلاش مز دورکی اپنے بچے کی بیماری پر بے چار گی کے تا ثرات جسے وہ گو دمیں اٹھا ئے کسی طبیب کے پاس جا رہا ہے ، اس طرح نظم کیے ہیں کہ اپنے جذ بات کی رو میں پڑھنے والوں کو بھی اپنے ساتھ بہاکر لے جاتا ہے ۔

گود میں ہے زرد رو بچہ شفا کی فکر ہے
جیب میں صرف ایک آنہ ہے دوا کی فکر ہے
اک طرف پیسے کی تنگی سے ہے سینہ داغ داغ
ایک طرف بچے کے رونے سے کلیجہ پاش پاش
دل ہی دل میں کہہ رہا ہے اے خداوندِ انام
بڑھ نہ جائیں ایک آنے سے کہیں نسخے کے
دام
(آتش خا موش
،ص : ۱۲۰)

انسا نیت نواز احسانؔ مز دور مردوں کے ساتھ ساتھ مز دور عورتوں کے ساتھ بھی ہمد ردی اور خلو ص کا جذ بہ رکھتے ہیں ۔ اگر چہ اس زما نے میں عورت جنسی بھو ک مٹانے یا محض جما لیاتی حظ

اٹھا نے کا ذریعہ بن کر سامنے آتی تھی۔ لیکن احسآن کے ہاں وہ اس ینم جا گیر دار انہ اور نیم سرمایہ دارانہ سما ج کی ایک مظلوم ہستی کی شکل میں نوحہ کناں نظر آتی ہے جسے تہذ یبی ، معاشرتی اور معا شی استحصا ل کی چکی میں سینکڑ وں بر سوں سے برابر پیسا جا رہا ہے ۔ اس افلاس زدہ اور ستم رسیدہ مز دور عورت کو دیکھ کر احسآن کے دل میں انسانی ہمد ردی ، خلو ص اور درد مندی کا جذ بہ بیدار ہو جاتا ہے ۔

پیشوایان تمدن کیوں نہیں دیتے جواب ؟
کس لیے پامال ہے اس رشک مریم کا شباب ؟
کیوں اسے فطرت نے اس ماحول میں رسوا کیا ؟
عالم ارواح میں تھی کون سی اس کی خطا ؟
ایک وہ عورت ہے جسے سیجوں پہ سونا ہے نصیب
ایک یہ عورت ہے جسے راتوں کو رونا ہے نصیب

احسآن کی ایک اورنظم " دراوڑ لڑکیاں " بھی قابل تو جہ ہے جس میں کر وند ے بیچنے والی غربت زدہ لڑکیوں کو دیکھ کر ان کے دل میں ہمد ردی اور خلوص کے جذبات پید ا ہوتے ہیں ۔

ارتقا کی خونفشانی وقت کی رفتار دیکھ
شکل انسانی میں جھلسی ہرینوں کی ڈار دیکھ
پڑ چکی جو زنگ سے کالی وہ تنویریں ہیں یہ
محنت و کاوش کی پختہ رنگ تصویریں ہیں یہ
جسم پر کرتہ نہ کوئی اوڑھنی سر کے لئے
اوچھی اوچھی دھوتیاں گھٹنوں سے اوپر کے لئے

"ڈاکٹر ابو اللیث صد یقی " تر قی پسند شاعری کی خصوصیت پررو شنی ڈالتے ہو ئے کہتے ہیں ۔

ان کے یہاں فر نگی استبد اد کے خلا ف جد و جہد کے جذ بات ملتے ہیں ۔ اس میں بھو کے اور مفلس ہندوستان کے ہنگا موں کی چیخ و پکار ، مز دوروں اور کسانوں کی سہمی اور کچلی ہو ئی زند گی، قلیو ں ، سڑک کوٹنے والوں اور مل کے مز دوروں کی محنت کشی اور فا قہ مستی ، سرمایہ دار کی عیاشی اور محنت کشوں کی ذلت اور رسوائی ، بنگا ل کے قحط ، بھوک اور مفلسی کی تصویر یں ملتی ہیں ۔

احسانؔ معا شر تی تفریق اور عدل کے فقد ان کے خلا ف بھی اپنی آواز بلند کر تے ہیں ۔ اس ظلم کا انہوں نے بہت باریک بینی سے مشا ہد ہ کیا ہے ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم " ہسپتال" قابل توجہ ہے جس میں انہوں نے طبقا تی تقسیم کے با عث امیرمر یضوں پر ڈاکٹر وں کی عنا یا ت اور تو جہ کا ذکر کیاہے اور دوسری طر ف جنرل وارڈ میں مفلس مریض کی قابل رحم حالت کا نقشہ بڑی درد مندی سے کھنچا ہے۔

دوائیں باسی ، خراب پو شش، نہ تازہ کھانا ، نہ صاف پانی
نہ خون میں زندگی کی گرمی ، نہ سانس میں جان فزا روانی
نہ کوئی آثار تندرستی ، نہ کوئی خدمت گزار ان کا
نہ ان پر نرسوں کی مہربانی ، نہ پاسباں غمگسار ان کا
وہ نوجواں خودپسند لڑکے ابھی جو تعلیم پا رہے تھے
غریب فاقہ کشوں کی جانوں کو تجربوں میں گنوار ہے تھے
(آتش خا مو ش ،ص :۳۳،۳٤)

پر وفیسر سجا د حا رث اس طبقاتی تقسیم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر تے ہوئے کہتے ہیں ۔

ارسطو کا فلسفہ اخلا قیات محض دولتمند انسانوں کا فلسفہ تھا ۔ اس کے فلسفے میں غریب اور محنت کش انسان بالخصوص غلام ، مقد س ، با کمال ، اور دانشور انسان نہیں بن سکتا تھا ۔ احسانؔ کی زندگی اور فن نے ارسطو کے اس نظر یہ کو سر کے بل اٹھا کر کھڑ ا کر دیا اور یہ ثا بت کر دیا ہے کہ غر یب اور محنت کش انسان بھی مقد س باکمال اور دانشور بن سکتا ہے ۔ یہ سماج میں انسا ن انسان کے مابین طبقا تی امتیا زات کی چھو ٹی دیو اریں ہیں ۔ جنہوں نے جسم اور دما غ میں تضاد پید ا کر رکھا ہے ۔ انسانوں کو اشرا فیہ اور عوامیہ میں بانٹ رکھا ہے ۔ طبقہ اشرا فیہ کے لئے علم و تہذ یب کی ساری نعمتیں بخش رکھی ہیں اور طبقہ عوا میہ کو غریب اور مفلو ک بنا کر ان کے لئے تعلیم و تمدن کے سارے دروازے بند کر دئیے ہیں ۔ یہ طبقہ

اشر افیہ کی و سیع انسا نیت کے خلا ف ایک مکر وہ سازش
اور خود غر ضا نہ کو شش رہی ہے ۔ احسانؔکی زندگی فن
اور جدوجہد اس مکروہ سازش کے خلا ف ایک اجتہاد ہے۔
ایک للکار اور ایک چیلنج ہے ۔

احساؔن ایک ایسے طبقا تی نظام کی پید اوار ہے جہاں انسان انسا ن پر ظلم و ستم روا رکھتا ہے ۔سر مایہ دار محنت کرنے والوں کاخون چو ستاہے۔ وہ اس نظام زند گی کے مکر وہ چہرہ کے خد وخال اچھی طرح پہنچا نتا ہے ۔ اس نے ذاتی تجر بات سے سر مایہ دارانہ نظام زند گی کی خبا ثتوں اور چیرہ د ستیوں کو سمجھا ہے ۔ اپنی نظم " ریاو ضیا" میں سرمایہ دار انہ نظام زند گی کے پر وردہ سیا ہ کار اور ستم کیش انسان کے چہرہ پر سے نقاب اٹھا تے ہو ئے کہتے ہیں۔

او ستم کیش ، سیہ کار ، ریا کے بندے
پھر اسی طرزِ دل افگار سے دیکھا مجھ کو
رینگتے ہیں ترے ماتھے پہ تصنع کے شکن
تو اور اس طینت ناپاک سے دھوکا مجھ کو
تیرے ہونٹوں پہ ہے باطل کے تعفن سے نمی
تیرا امروز ہے آئینہ فردا مجھ کو

(دردِ زندگی،ص:۲۷۵)

اسی طرح اپنی نظم " شکاری دوست سے" میں وہ جنگل کے خون خواروں کو بستی کے خو نخو اروں کے مقابل میں بہت غنیمت بناتے ہیں ۔ کیونکہ یہ بستی کے خون خواروں کی طرح دوسروں کاحق غصب نہیں کرتے۔

یہ کبھی آبادیوں میں آکے غرّاتے نہیں
یہ کسانوں اور مزدوروں کا حق کھاتے نہیں
ان سے بڑھ کر وہ درندے ہیں شیقی دل گرگ
خُو
چوس لیتے ہیں جو مزدوروں کی شہ رگ کا
لہو
ان سے بڑھ کر وہ درندے ہیں جو با صد احتشام
کالجوں میں نوجوانوں کو بناتے ہیں غلام
(آتش خا
موش،ص:۱۱۰۔۱۱۱)

احساؔن اس سر ما یہ داری کے خلاف علم بلند کر تا ہے اب وہ کا سئہ گد ائی کی منز ل سے گز ر کر خنجر آزما ئی پر آمادہ ہو جاتاہے ۔

کیو نکہ ہر فر د اس وقت اتنے جو ش میں ہے کہ کہ وہ مسمار کاری اورنعرہ انتقام سے پر ے کسی بات کے قابل معلوم نہیں ہوتا ۔ نظم " باغی کا خواب" کے اشعار دیکھئے ۔

ایک باغی خواب میں سویا جو کھا کے پیچ وتاب
صبح کے ہنگام سے کچھ بیشتر دیکھا یہ خواب
اک بڑا میداں ہے اور میداں میں انبوہ عوام
ہر بشر کہتا ہے آج آیا ہے وقت انتقام
آج مدت میں جلے ہیں قصرِ جرات میں چراغ
دے رہے ہیں آتشیں نعروں سے گو سینے کے داغ

(آتش خاموش،ص: ۸۱)

احسؔن کی شاعری رنگ و نسل ، ملک و قوم اور مذ ہب کے تمام امتیا زات سے بالا تر ہے ۔انہوں نے ہر فر قہ اور مذہب کے محنت کشوں کی زبوں حالی کا نقشہ پیش کیا ہے ا ور محنت کش انسان کی بد حالی پر آنسو بھی بہا ئے ہیں ۔ وہ ہر مذہب وملت کے مز دور کو اپنا ر فیق سمجھتے ہیں ۔ نظم " تلقین"میں سما جی بے انصا فیوں پر اس طرح آنسو بہا ئے ہیں ۔

انسان کا شکاری انسان ہے دن رات اسی کا رونا ہے
مزدور کی چربی چاندی ہے دہقان کی ہڈی سونا ہے
تہذیب کے گیلے دامن سے اس داغ کو جلدی دھونا ہے
ظاہر میں یہ پھوڑا سرخ سہی ، اندر کا مواد اب خام نہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں

غرض اس میں کو ئی شک نہیں کہ احسؔن کا دل انسا ن دوستی ، محبت ، اور انسانی ہمد ردی کے جذبات سے لبریز ہے۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی احسان کی انسان دوستی کی تعر یف ان الفا ظ میں کرتے ہیں ۔

احسؔن بھی بڑی حدتک اشتر اکی شاعر ہے ۔ لیکن اسکی اشتراکیت ڈرائنگ روم کی اشتراکیت نہیں اور نہ زمانے کے فیشن یا تر قی پسندی کے نشان کے طور پر ہے۔ وہ ایک مزدور تھا اور اگر چہ اپنی جد وجہد

سے اس نے اپنی زند گی کو ہموار بنا نے میں کچھ کا میابی حاصل کر لی ہے۔ تاہم اسکی کشمکش جماعت کی کشمکش کے ساتھ اب تک جا ری ہے ۔وہ صحیح معنوں میں مزدوروں کا کا مریڈ ہے۔اس نے مزدوروں کے ساتھ کام کیا ہے ۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوا ہے۔ اس لیے اس کے خیالات کا رل مارکس، لینن اوراسٹا لین کی بحثوں سے پیدا نہیں ہو ئے۔ بلکہ ان کا منبع خود اس کا تجر بہ ،احساس اور تجز یہ ہے۔ اس لئے خلوص کی جو بوُ با س اس کے یہاں ہے وہ اس کے معا صر ین میں سے کسی کو نصیب نہیں ۔ اس اعتبار سے میر ے خیال میں تر قی پسند شاعری کے اشتراکی پہلو کا سب سے اچھا ترجمان احسانؔ ہے ۔

احمد ندیم قاسمی اور انسان دوستی (۲۰۰۶۔۱۹۱۶)

احمد ند یم قا سمیؔ جدید اردوشاعری کے ایک اہم ستون ہیں ۔ ان کی پید ائش جنگ عظیم کے دوران ۱۹۱۶ءمیں ہو ئی۔ اس وقت پنجاب میں حالیؔ اور اقبالؔ جیسے شعراکی حکومت تھی۔ قاسمیؔ کی ذہنی تشکیل میں ان کا بھی نما یا ں ہاتھ ہے ۔ان شعرا کے علاوہ انہوں نے حسان بن ثا بت ، سعدیؔ ، حا فظؔ، غالبؔ، میرؔ ، سوداؔ، اور مصحفیؔ سے بھی بھر پوراستفا دہ کیا۔ قا سمیؔ اگر چہ ہشت پہلو شخصیت کے مالک ہیں ، لیکن ان کی شاعری کا جا ئز ہ لیا جا ئے تو بطور خاص ان کی نظموں میں انسان دوستی اوراولادِ آدم سے محبت کا رنگ واضح طور پر دکھا ئی دیتاہے ۔

وہ اپنی "انسان دوستی " کا پس منظر ان الفاظ میں بیان کر تے ہیں ۔

> میں پیروں کے خاندان میں پید ا ہوا تھا ۔پیر وں کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ۔ عز یزوں کو بھی اور غیروں کو بھی ۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہو تی تھی کہ ایک انسان بیٹھا ہے۔لوگ اس کے پاوں کو چوم رہے ہیں ۔ اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا رہے ہیں ۔ اورنذ رانہ بھی پیش کیا جا رہاہے بغیر کسی محنت کے۔

قا سمیؔ کے اس بیان کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے محرکات ہیں جو ان کی انسان دوستی کا سبب ہیں ۔ قاسمیؔ کا دور اردو ادب میں حقیقت نگاری کا دور تھا۔ اکثر شعرا نے انگریزی سا مراج کے خلا ف قلمی جد وجہد کا آغا ز کر دیا تھا ۔ دراصل ۱۹۱۷کا روس میں اشتراکی انقلا ب اس جد و جہد کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ انسان دوست قاسمیؔ نے تر قی پسند فیضؔ کے منشور کو اپنا کر زمین ، انسان اور خدا کے درمیان واضح ر شتہ تلا ش کر لیا تھا اور وہ انسا نیت کو اس تا بناک منز ل کی طرف لے جانے میں سرگر داں تھا۔ جہاں آقا و مز دور اور بلند و پست کا فر ق ختم ہو جاتا ہے ۔ وہ پید اواری رشتوں اوران کے با ہمی تعلق کو بھی خوب سمجھتا ہے ۔ اس کے ہاں بغاوت کی چنگاریاں سلگتی دکھا ئی دیتی

ہیں ۔ جو کسانوں اور مز دوروں کے دلوں میں یوں آگ لگا دیتی ہیں کہ وہ زمیند اروں کی عیش پسندی اور استحصال کے خلاف یوں صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں ۔قطعہ "محر ومی" کے اشعار دیکھئے ۔

ہے رقص طوائف کا زمیندار کے گھر پر
پردیس سے آئے ہیں کئی یار پرانے
وہ چند غریبوں کو گریباں سے پکڑ کر
بھیجا ہے زمیندار نے بیگار پر تھانے
(رم جھم ،ص:
(۱۳۲۱

انسانیت نواز ند یم کی نظر بڑھتی ہو ئی سرمایہ داری اور کا رخانہ داری پر بھی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران تھا کہ کس طرح کسانوں کے کھیتوں میں سے اگتا ہو اسونا زمیندار کے گھر پہنچ جاتا ہے ۔ جنگ کا خوف سروں پرمنڈ لا رہا ہے۔ مہنگا ئی آسمان سے با تیں کر تی نظر آتی ہے ۔کسان اپنی بیٹی کے بندے بیچنے کے با و جود بھی حکومتی لگان ادا کر نے سے قاصر ہے ۔ بیچارے کسان روز گار کی تلاش میں شہروں کا رخ کر نے پر مجبور ہیں ۔ جہاں سرمایہ دار اور کا رخانے دار ان کی مجبوری کا سودا کرنے کو تیار بیٹھے ہیں تاکہ ان کی محنت نچوڑ کر نئے نئے محل تعمیر اکر سکیں ۔ ندؔیم کا قطعہ "بھو کا دیہاتی" ملا حظ کیجئے جس میں وہ اپنی انسان دوستی کے جذبے سے سر شارہو کر اور عوامی نعروں سے مشینوں کی آواز پر چھا جانا چا ہتا ہے ۔

بلک رہی ہے دمادم مشین آٹے کی
گرج رہا ہے وہ پٹڑی پہ شعلہ بار انجن
وہ تنگ باڑوں سے بھیڑیں پکارتی ہیں مجھے
کہ آج پیٹ کے کہنے پہ تج رہا ہوں وطن
(رم جھم ،ص
(۱۳۰۷:

تر قی پسند ندیمؔ اس بات سے بخو بی و اقف تھا کہ سامراج اور صنعتی نظام آزادی اور جمہوریت کے کھوٹے سکے بھی اپنے ساتھ لا یا تھا ۔ اس کی نگاہ تیز کھر ے کھوٹے میں فر ق کر سکتی ہے۔ وہ ان عوامی نما ئندوں کے مکر و فریب کا پر دہ چاک کرتا ہے جو ووٹ کے بدلے غریب اورمجبور لوگوں کے ضمیر اوران کی روح کا سودا کرتے ہیں۔ ندیمؔ کی انسان دوستی اس بات کی متقاضی ہے کہ سامراج کی غلامی کی زنجیر یں کٹ جا ئیں اور کسان اپنی محنت کا پھل خود کھا سکے ۔ قطہ "ووٹ" کے اشعار دیکھئے ۔

وہ کسی بے خوف دیہاتی نے موٹر روک لی
اک رئیس اترا ہے برساتا ہوا نخوت کی بھاپ
"کیا شکایت ہے ؟ وہ غرایا وہ دیہاتی بڑھا
ووٹ لے لےتے ہیں اور روٹی نہیں دیتے ہیں
آپ!"

(رم جھم ،ص: ۱۳۳۳)

ایک اور قطعہ " دختر فر وش سے " دیکھئے جس میں انسان دوست ند یمؔ غریب کسان کو انا پر ستی اور خو دداری کا درس دیتے ہو ئے اپنی معصوم بیٹی کو نہ بیچنے کی تلقین کرتا نظر آتا ہے ۔

فاقے بے شک کھینچتا جا ، لیکن اے مفلس کسان
اپنی اس مغموم اور معصوم بیٹی کو نہ بیچ
اسکی آنکھوں میں ہیں وہ اندازِ محوِ خوابِ ناز
جن کے آگے لوگ شاہی کو سمجھ لیتے ہیں ہیچ

(رم جھم ،ص: ۱۳۳۳)

پر و فیسر قیصر نجفی !ندیمؔ کی انسان دوستی کو یوں بیان کرتے ہیں ۔

شعرہو یا افسانہ ان کا محبو ب مو ضو ع انسان ہے ، ہمارے نزدیک وہ " شا عر انسان " تھے اور ادبی زندگی میں ہی نہیں نجی زند گی میں بھی انسان کی عزت نفس کے تحفظ کے لیے کو شاں تھے ۔ شا ید یہی جذ بہ انسانیت ان کی تر قی پسندی کا بھی محرک تھا ۔

تر قی پسند ند یمؔ روح عصر کا نما ئندہ ہے ۔ان کی ربا عیوں میں مسا ئل حیات نئے نئے ز اویوں سے ابھر کر سامنے آتے ہیں اور عز ت نفس، انسان دوستی ،خودداری اورحرکت و عمل کا درس دیتے ہیں ۔ زند گی کے ان مسا ئل کی حد ود ، مروجہ غلط نظام اقدار ، معا شی تفا وت ، جمہو ریت پسندی، سامراج دشمنی، کسان مز دور انقلا ب اور بین الا قوامیت تک پھیلی ہو ئی ہیں ۔ ر با عی کے اشعار دیکھئے جس میں ند یمؔ انسا ن دوستی کی شمع فر و زاں کر تے نظر آتے ہیں ۔

شہروں کی طرف سے اک غبار اٹھے گا
طوفان نہیں محشر بہار اٹھے گا
کھلیان کی دھول چھانتے دہقانو!
دانہ دانہ کبھی پکار اٹھے گا

(رم جھم ، ص: ۱۳٦٧)

ندّیم کی ایک اور رباعی کے اشعار دیکھئے جس میں آثا ر سحر اور چلتے پھرتے سایوں کے پس منظر میں چند افراد اور اجتماع کی پیکر تراشی کے ذریعے طبقاتی تضاد اور معاشی تفاوت کو اس طور بیان کیا ہے کہ ان کی انسان دوستی ایک طبقے سے نفرت اور دوسرے طبقے سے ہمدردی اور درد مندی کے احساسات بیک وقت بیدارکرنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔

آثارِ سحر چمن کو چونکائے رہے
سائے سے مگر چار طرف چھائے رہے
دو چار نے بڑھ کر اپنی جھولی بھری
لاکھوں کے ہجوم ہاتھ پھیلائے رہے
(رم جھم ،ص:۱۳۶٦)

ترقی پسند ندیمؔ جب زمین کے تضادات پر نگاہ ڈالتا ہے جہاں ایک طرف گرانی، قحط ، مفلسی، لاچاری ، اور درماندگی کا کرب ہے اور دوسری طرف نفع اندوزی ، زرگری، خوشحالی ، عیش پسندی اور بے فکری کا راج ہے تو وہ انسانیت کی بقا اور انسان دوستی کےلئے زیردستوں اور محکوموں کا دوست بن کر سامنے آتا ہے ۔اسکی نگاہ خارجی سامراج پر بھی مرکوز ہے اورساتھ ہی ساتھ یزداں سے دست و گریباں ہونے اور تقدیر کو شکست دینے کی امنگ بھی اس کے سینے میں جاگ اٹھتی ہے ۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ جبر مشیت کو مات دیئے بغیر زمین کے تضادات کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ نظم "کروٹیں " کے اشعار دیکھئے ۔ جس میں فطرت کا یہ مجاہدلڑ کا کچھ دیر کے لئے جبر مشیت پر حاوی ہوکر تقدیر آدم کی سیاہی دھو ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اک طرف رقص کی بجلی چمکی
اک طرف آہ کا شعلہ بھڑکا
اک طرف تھاپ پڑی طبلے پر
اک طرف بھوک کا بادل کڑکا
بھاؤ کچھ اور چڑھے مے چھلکی
فصلیں تیار ہوئیں دل دھڑکا
سانس لیتا رہا پھر بھی انسان
اندھی فطرت کا مجاہد لڑکا
(جلال و جمال ،ص:۹۸۳)

ندیمؔ اپنی نظم " جبر و اختیار " میں موہوم ثقافت کے علمبرداروں اور خوابیدہ مشیت کے پرستاروں کو بے عمل اور بے جان قرار دے کر

ان سے اپنا ناطہ توڑ لیتا ہے ۔ اور اپنا ناطہ زند گی کی "بے رحم صداقت "اور" تا بند ہ حقیقت"سے اس لئے جوڑ لیتا ہے ۔کیو نکہ وہ حق وباطل کی آویز ش میں مو ہوم ثقا فت اور خوا بیدہ مشیت سے کسی طور سمجھوتے کے لیے تیار نہیں کیو نکہ وہ حق کا علمبر دار ہے وہ با طل کے خلا ف صف آرا ہو کر میدان عمل میں نکل آیا ہے ۔ چمن افر وزی شبنم سے اسے کو ئی سروکار نہیں بلکہ حد ت مہر سے جلنا اسکا مقدر ٹھہرا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ مو ہوم ثقا فت کے علمبرداروں پر طنز کے تیر برساتا ہے جو بھوک کی شدت کے عوض غریب اورلا چار عوام کے سامنے " عقیدوں کے غبارے "لا کر رکھتے ہیں اور "ملبوس کے پر حو ل شگافوں "کے بد لے انہیں فرمان حیا، دے کر نہ صرف اپنے فرائض سے غفلت بر تتے ہیں بلکہ عوامی قوتوں کو عوامی قو توں ہی کے مقا بل لا کر ظلم و استحصال کی مد ت کو بڑ ھاتے چلے جا تے ہیں ۔ انسان دوست ند یمؔ جبر کی ان علامتوں کے خلا ف آواز بلند کرتے ہیں اور مستقبل میں انہیں جمہور کی کامیابی وکامرانی یقینی نظر آتی ہے ۔ اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

تم کو اس وقت بھی معلوم نہیں ہے شاید
کہ زمانہ تو بہت دور نکل آیا ہے
آج سلجھائے گی جمہور کی آواز اسے
تم نے تاریخ میں جس بات کو الجھایا ہے
اب مرا ذوق کسی قید کا پابند نہیں
تم نے صدیوں مرے وجدان کو ترسایا ہے
(شعلہ گل
،ص:۲۳۳)

ند یؔم اپنی نظم " درانتی" اور "جر س کارواں "میں کسانوں اور مز دوروں کی محنت شا قہ اور حسن عمل کوخراج تحسین پیش کرتا ہے ۔جو ضمیر جہاں میں آفتاب بو رہاہے ۔اور انقلاب کی سنہری فصل کا ٹنے کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کر رہا ہے ۔ درانتی دراصل کسان کا وہ موثر ہتھیار ہے جس سے وہ زمین کی بار آوری کا کام لیتا ہے یہ اسکی محنت و مشقت کی علامت ہے تو دوسری طرف یہی ہتھیا ر جا گیر دارانہ نظام کی بیخ کنی کرنے کی قو ت بھی رکھتا ہے ۔

کوئی بتائے زمین کے اجارہ داروں کو
بلا رہے ہیں جو گزری ہوئی بہاروں کو
کہ آج بھی تو نشان بے نیازی سے
چمک رہے ہیں درانتی کے تیز دندانے
سنہری فصل تک اس کی چمک نہیں موقوف

کہ اب نظامِ کہن بھی اس کی زد میں ہے
ندیمؔ ازل سے ہے تخلیق کا یہی انداز
ستارے بوئے گئے آفتاب کاٹے گئے
(شعلہ گل ،ص: ۶۹۷)

ندیمؔ کی نظم " جرس کا رواں " بیداری کی ایسی علامت ہے جو ماضی سے اپنا سفر شروع کرتے ہوئے زمانہ حال میں جوش تخلیق کی علامت بن جاتی ہے ۔ ہو نکتا فولاد، کھیت ، کا نیں ، کٹے ہو ئے کہسار جس کے بکھر ے ہو ئے مظا ہر ہیں ۔ اگر ان تمام مظا ہر کو اکٹھا کر دیا جا ئے تو کسان و مز دور ایک ہی ہراول صف میں کھڑے نظرآتے ہیں ۔ یہ تمام ترقی پسند طا قتوں کے دوش بد وش ایک روشن مستقبل کی طر ف رواں دواں ہیں ۔ اشعار دیکھئے ۔

کارخانوں میں ہونکتا ہوا فولاد
جوش تخلیق سے ہے شعلہ فشاں
کھیت ، کانیں ، کٹے ہوئے کہسار
ہاں یہی تو ہیں کارواں کے نشاں
وہ اسی راستے سے گزرے ہیں
جن کی جانب ہے اک جہاں نگراں
ان کے دم سے زمیں کا ذوق نمو
ان کے دم سے حیات زمزمہ خواں
ان کا ماضی ہے ظلمت آلودہ
اور مستقبل ، آفتاب جواں
(شعلہ گل ،ص: ۶۸۰)

ندیمؔ کے ہاں اپنے عہد کے معاشی ،معا شرتی اور تہذیبی مسا ئل سے عہد ہ برا ہونے کا جذ بہ کا ر فر ما دکھا ئی دیتا ہے ۔ جو اسے فن کے اونچے سنگھا سن سے اتار کر تھوڑی دیر کے لئے جمہوری فہم و فراست اورعوامی تقا ضوں کے درمیان لا کھڑا کرتاہے ۔ اور یہی اسکی انسان دوستی کی سب سے بڑی مثال ہے ۔ نظم "ادب و سیاست" کے اشعار ملاحظ کیجئے ۔

مجھے محنت کشوں کو دہر کا آقا بناتا ہے
مجھے تخلیق کو خالق کے پہلو میں بٹھانا ہے
مجھے ماؤں کو فقر و فاقہ سے آزاد کرنا ہے
مجھے بچوں کے چہروں میں گلابی رنگ بھرنا ہے

محبت چاہیے مجھ کو، صباحت چاہیے مجھ کو
بغاوت ہے اگر یہ ، تو بغاوت چاہیے مجھ کو
یہی میرا ادب ہے اور یہی میری سیاست ہے
مرے جمہور ہی سے میری فن کاری عبارت ہے
(شعلہ گل ،ص
:٦٨٨)

دوسری طرف نظم " صحافیوں کے نام " کے اشعار دیکھئے جس میں سرمایہ داروں کااصل روپ دکھاتے ہیں ۔

تم ہو یا ہم ہوں یہ بات ہے مشترک ہم کریں گے
نہ ایماں کی سودا گری
بحر میں چاند بے شک نہاتا رہے چاندنی تو نہ
ہو گی سمندر میں ضم
ہم کو سرمایہ داروں سے کیا واسطہ آخر آگ
اورپانی کا رشتہ ہی کیا
اہل دولت ہیں وہ ، اہل بینش ہیں ہم ، ان کو خود
اپنا غم ہم کو دنیا کا غم
جو کہو حق کہو جو لکھو حق لکھو ، مشعل
آدمیت کو بجھنے نہ دو
اپنے جس ہا تھ میں تھامتے ہو قلم تم کو اس ہاتھ
کی آبرو کی قسم
(شعلہ گل
،ص:٦٥٣)

ندیمؔ کی نظم "نا گزیر "کے اشعار دیکھئے جس میں " جہا ند ید ہ کا ہن" وقت کی معین شا ہر اہوں سے گز رتا اور دہکتے ہوئے سرخ پہیوں کے نیچے سامراجیت کے عفر یت کو کچکتا ہو ا مستقبل انسان کے افق سے طلو ع ہونے کے لئے رواں دواں ، بیتاب اور سر گرداں ہے۔

یہ راہی قیامت میں سستا سکے گا، ازل اسکی
نگری ابد اسکی منزل
اگر وقت کی شاہراہیں معین ہیں یہ شام یہ شب
یہ پو یہ سویرا
تو دہکتے ہو ئے سرخ پہیوں کے چکر میں جل
جا ئے گا اجنبی کا پھریرا
نہیں ۔ وقت سورج کی زرکا ر بہلی کو پل بھر
کو بھی روک سکتا نہیں ہے
نہیں ، یہ جہاندیدہ کاہن کبھی انقلاب کو ٹوک

سکتا نہیں ہے
لپکنا ہے اس کے مقدر میں شامل ، پلٹنا بھی
دشوار تھمنا بھی مشکل
(جلال و جمال
،ص:۸۲۱)

ندیمؔ نے اپنی نظم" لمحہ بہ لمحہ"میں جنگ سے پہلے اور بعد کے اثرات کا احاطہ اس اندا زسے کیا ہے کہ ر قا صہ کی چھنن چھنن اور مچلتے راوی کی عقبی سر زمین سے جنگ کے ہو لناک مناظر ابھر کر پیش منظر میں آجاتے ہیں ۔ اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

یہ کس راجہ کا ایوان ہے ملبے کے انباروں میں
جیسے بلوائی کی بیٹھک لٹے ہوئے بازاروں میں
الٹی سانسیں ، اٹکی آہیں ، اے راہی یہ راز ہیں کیا
پچکے پیٹ، دریدہ رانیں ، زیست کے یہ انداز ہیں کیا
راجہ اٹھا ڈال کے اپنی بقچی میں فردا کا نظام
و قت کے اس لمحے کا ارادہ خون آشام ہے خون آشام
(شعلہ گل ،ص:۸۱۳)

تر قی پسند ند یمؔ کے ہاں سما جی مسا ئل کی ترجمانی بھی بھر پور انداز میں نظر آتی ہے ۔ نظم " فن" میں کیوں کی انگلی پکڑ کر نکلیں تو اس نظم کے مختلف امیجز کی تر تیب سے ایک ایسی تصویر وجو د میں آجاتی ہے جس کا عنوان فن کے علا وہ بھوک یا قحط بھی ہو سکتا ہے ۔ انسان دوست ندیمؔ کی بھوکے اور قحط زدہ انسان سے محبت دیکھئے۔

ایک رقاصہ تھی کس کس سے اشارے کرتی
آنکھیں پتھرائیں ، اداوں میں توازن نہ رہا
فرشِ مرمر پہ گری ، گرکے اٹھی ، اٹھ کے جھکی
خشک ہونٹوں پہ زباں پھیر کے پانی مانگا
ہاتھ پھیلے رہے ، سل سی گئی ہونٹوں سے زباں
ایک رقاص کسی سمت سے ناگاہ بڑھا
پردہ سرکا تو معاً فن کے بچاری گرجے

رقص کیوں ختم ہوا وقت ابھی باقی تھا
(جلا ل وجمال

،ص :۸٤۸)

انسان دوست ند یمؔ معاشرے میں مساوات اور برابری کا متمنی ہے۔ وہ کسی ایسے انقلاب کا خو اہشمند نظر آتا ہے جو تمام انسانوں کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کرے ۔ جس سے امیر و غریب اورآقا و غلام کا فر ق ختم ہو جا ئے ۔ اپنی اسی خواہش کو پا یہ تکمیل تک پہنچا نے کے لئے وہ عروسِ حیات کو خون کے سرخ رنگ سے مزین کرنا چا ہتا ہے ۔نظم "خون" کے اشعار دیکھئے ۔

سنور چکی ہے اسی رنگ سے عروس حیات
یہی سنگار اب اک اور رنگ لائے گا
پھٹے گا قلب زمین بلبلہ اٹھے گا لہو
زمانہ چاہے گا لیکن اماں نہ پائے گا
(جلا ل وجمال ،

ص:۸۲۳)

ندیمؔ جیسے انسان دوست کو اس بات کا احسا س ہے کہ صدیوں سے برصغیر پا ک وہند کا یہ المیہ رہا ہے کہ تاریخ کے ہر موڑ پر اس سرزمین پرخون کی ہو لی کھیلی جاتی رہی ہے ۔ اورپاک وہند کی تہذ یب ہر بار ایک نیا جنم لیتی رہی۔۱۹٤۷ میں سامراج نے پھر ایک چال چلی اور کروڑوں بے گناہ انسانوں کو خون کے سیلا ب میں جھونک کر خود صاف بچ نکلا ۔ درد مند ندیمؔ نے جس منز ل کا تعین کیا تھا وہ منزل قریب آکر پھر دور ہو گئی تھی اور جس طلوع فر دا کے خواب بنے تھے اس کی سب تعبیریں غلطاں ثابت ہوئیں ۔ نتیجہ انہوں نے از سر نو اپنی سمت کا تعین کیا اور ایک بار پھر ایک انسان دوست شاعر کی حیثیت سے اسی دھرتی پر طلو ع فرد ا اور آدمِ نو کی تخلیق کے خواب دیکھنے لگا ۔

زمین کو سنبھالنے کی مہم
کب مقدر کے اختیار میں ہے
یہ زمین یہ خلا کی رقاصہ
آدمِ نو کے انتظار میں ہے

بقول جمیل ملک !

ادب کی ترقی پسند تحریک بنیادی طور پر انسان دوستی سے عبارت تھی اوراسکی ساری جد و جہد زمین ہی سے وابستہ تھی۔ اس اعتبار سے یہ ندیمؔ کے مزاج کے عین مطابق تھی اور یہی بنیادی سبب تھا جس نے ندیمؔ کو اس تحریک کی پہلی صف میں لا کھڑا کیا۔ مگر تقسیم کے بعد ندیمؔ کو کچھ سیاسی اور ثقافتی مراحل ایک ہی حیثیت میں طے کرنا پڑے ۔اس

کا ایک فا ئد ہ تو یہ ہوا کہ ند یمؔ نے تضا دات کی ریل پیل میں بھی اپنے آپ کو پہچان لیا اور اپنی ذات کو انسان دوستی کے مسلک سے ہمیشہ کے لئے وابستہ کرلینے کی وجہ سے اُس کی نظموں میں ایک ایسے آدمِ نو کی نمود ہونے لگی جس نے مشر ق و مغر ب اور زمین وآسمان کی باگیں اپنے ہا تھ میں تھام لی ہیں ۔

ندیمؔ کے ہاں انسانی عظمت کا تصور اسکی انسان دوستی کا بین ثبوت ہے ۔ اس کے نز دیک انسان ایک ایسی ہستی ہے جسے اللہ نے رفعتوں سے ہمکنار کیا ۔اس کا ئنات کی بے کراں وسعتوں میں جو کچھ بھی ہے ، اسی پیکر گل کے لیے ہے ۔ انسان حسن ہے ، رنگ ہے، صدا ہے ، اور سب سے بڑھ کر مسلسل ارتقا ہے ۔ جس نے ہر شے کی کا یا پلٹ کر رکھ دی ہے ۔

احمد ندیم قاسمی " جلال وجمال " کے دیبا چے میں لکھتے ہیں ۔

یہ ہماری زمین ، یہ چاند کی محبو بہ یہ خلا کی ر قاصہ --- جسے مشر ق و مغر ب نے ماں کے مقد س لقب سے یاد گیا ۔ یہ ہمارا ازلیٰ و ابد ی وطن ۔آخر ہم اس سے دور رہ کر صرف کا رخانوں اور آمد و خرچ کے حسابوں اور مر دم شما ریوں وغیرہ میں کیوں کھو جا ئیں ۔ یہ زمین اور ہوا اور خلا سے پرے بے شمار دنیاوں کی بے کنارخلا ئیں یہ سب کچھ انسا ن کا ہے۔

ندیمؔ کے نز دیک انسان وہ ہے جس نے زمین پر مو جود عناصر جو خد ا سے بیگانہ اور نا آشنا تھے انہیں خدا سے شنا سا کیا اور وہ خد اجو عرش نشیں تھا اسے فر ش پہ لے آیا۔ ندیمؔ اپنی نظم " انسان عظیم ہے " میں یہی احساس خدا کو دلا تے ہیں ۔

تو عین حیات ہے مگر وہ
تزئین حیات کر رہا ہے
اس پر ہے غلط فنا کا الزام
سامان ثبات کر رہا ہے
اب جینے کا ڈھب سمجھ میں آیا
انسان عظیم ہے خدایا
(شعلہ گل ،ص
:۱۹٦)

ندیمؔ انسان کی اس قدر عظمت و رفعت کے باوجود جب اسے ذلت و رسوائی کے اند ھیروں میں بھٹکتے ہو ئے دیکھتا ہے تو ایک انسان دوست شاعر کی حیثیت سے اسکا سبب صرف " شا ئبہ خوبی تقدیر " ہی کو قرار نہیں دیتا بلکہ وہ سرمایہ دار طبقہ بھی ہے جو اپنے مفاد کی

خاطر زمین پر بسنے والوں کروڑوں انسانوں کی تقدیر سے کھیلنا جائز سمجھتا ہے جسکا ایمان ہوس زر ہے اوردوسرا طبقہ " پیران کلیسا" ہے۔

جمیل ملک ! ان سرمایہ داریوں کی اصلیت کا پردہ چاک کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔ "یہ لوگ کشف وکرامات کے ذریعے عر ش بریں کی خبر لا نے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن اس انسان کو بھول جاتے ہیں جس کی صورت گری خدانے اپنے جلال وجمال سے کی ہے اور جواس کا شہپارئہ تخلیق ہے"۔ ندیمؔ کو اس بات کا بھی احسا س ہے کہ اپنی پہچان کی خاطرمختلف حوالوں سے انسان تقسیم ہورہا ہے۔ اپنی نظم "آشوب " میں ندیمؔ خدا کو پکارتے ہیں ۔

خدا کو بلاو
کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے
میں مٹی کا انساں ہوں
میں آسماں کا فرشتہ نہیں
اس لیے معتبر بھی نہیں
خدا اپنی آنکھوں سے دیکھے
کہ وہ سر جو صدیوں کے سجدوں سے زخمی ہیں
اب آسماں کی طرف اٹھ رہے ہیں
وہ دیکھے کہ آنکھوں میں اب حسن دریا فت کرنے کی ساری چمک بجھ چکی ہے
کھنڈر کے دریچوں سے آخر کھنڈر کے سوا کیا نظر آسکے گا
خدا کو بلاو
کہ اس کا یہ شہکار فن
اپنے محور سے ہٹنے لگا ہے
وہ چھوٹوں ، بڑوں اورنیکوں بدوں کے قبیلوں میں بٹنے لگا ہے
وہ جو عرش تک پھیل جانے کے گرُ سوچتا تھا
سکڑنے لگا ہے ، سمٹنے لگا ہے
وہ آشوب ، جو اس نے اپنی ذکاوت سے پیدا کیا تھا
اسی سے نمٹنے لگا ہے

(دوام ،ص:۲۰۹،۲۱۰،۲۱۲)

ندیمؔ کی شخصیت محبت ، خلوص اورانسان دوستی کے خمیر میں گند ھی ہو ئی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ انسان دوست ندیم کے نز دیک اس

زمین پر انسان سے انسان کی دوری اورآپس کی نفرت صرف اسی صورت میں ختم ہو سکتی ہے کہ انسان انسان سے محبت کرے۔ پیار کی شمع روشن کر ے اورانسا ن دوستی کا پیغام پوری دنیا میں عام کرے ۔ کیو نکہ ایک انسان کے دل میں دوسرے کے لئے کد ورت اورنفرت کا جذبہ شدت اختیار کر چکا ہے ۔ اس لیے ندیم کے نز دیک انسان کا اصل سرمایہ اسکی انسانیت ہی ہے۔ جسکی کھوج اورحصول ہی حاصل حیاتِ انسان ہے۔ اس لیے وہ آزرو کرتے ہیں ۔

آج ہو جائے جو انسان کو انسان سے پیار
چار سو ایک تبسم کا ہو عالم طاری
صحن گلشن میں بدل جائے یہ دھرتی ساری
توپ ہو روئے زمین پر ، نہ فضا میں بمبار
(محیط،
ص:۱۲۳)

"شگفتہ حسین" ندیم کی انسان دوستی کی تعریف ان الفا ظ میں کرتی ہیں ۔

احمد ندیم قا سمی کی نظموں کے موضو عا ت فیضؔ سے زیادہ و سیع ہیں ۔ وہ انسان دوست شاعر ہیں جو انسانی مستقبل سے کبھی ما یوس نہیں ہوتے ۔ان کی انسان دوستی ان کے لہجے ، الفاظ اورخیالات سے چھوٹ کر نظم کی ساری فضا کو منور کر دیتی ہے۔

ندیمؔ کے اشعار دراصل معا شرے کی بے حسی کا مر ثیہ ہیں ۔ اس بے حسی نے ہمیں اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں اخلاقی اقدار کی کوئی و قعت نہیں رہی اور دوسری طرف لوگ ہر ظلم و نا انصافی کو اپنا مقدر سمجھنے لگے ہیں ۔ ندیمؔ کو اس بات کا شدید دکھ ہے کہ ہمارے ہاں لوگ تو بہت ہیں ۔ مگر ان میں سے کسی کا کو ئی نام نہیں ۔ لوگ ہلا ک ہوتے رہتے ہیں اوران کی تعد اد ز یر بحث آتی رہتی ہے ۔ دراصل ہمارے ہاں انسان نہیں نفری بستی ہے ۔ آدمی نہیں ہند سے پیدا ہوتے ہیں ۔

مگر خون کا تو فقط ایک ہی رنگ
ہے
چاہے ڈھاکے کا ہو
چاہے لاہور کا
آج کے دن کا
یا آنے والے دنوں کا
ہزاروں کا ہو یا کروڑوں کا
رنگ تو خون کا ایک ہے

الطاف گو ہرِ اندیمؔ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

تیسری دنیا کے صف اول کے شعرا میں قاسمی کو ایک ممتاز مقام حا صل ہے ۔اس کے دل میں انسان دوستی کی شمع فر وزاں ہے --- قا سمیؔ ایک بڑا ہی حسا س بڑا ہی صاحب دل اور صاحب درد شاعرہے۔ جس کا ہر شعر مضر اب کی طر ح ہے۔ جسکی زد میں آکر سنتے والے کی شخصیت کے تار جھنجھنا نے لگتے ہیں ۔

عارف عبد المتین اور انسان دوستی(۲۰۰۱-۱۹۲۳)

عا رف عبد المتین تر قی پسند تحریک کے روشن ضمیر شاعر تھے ۔ ان کی شاعر ی کو ہر عہد میں قبول عام کی سند حاصل رہی ہے ۔یہ اپنے اسا تذہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اورفیض احمد فیض سے متا ثر ہوکر تر قی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے ۔ عارفؔ کی ذات بے شمار خوبیوں کا مر قع تھی ۔ ان کی سب سے بڑی خوبی دوسروں کے ساتھ محبت اور ہمدرد ی تھی ۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دوسروں کی خوشی اور غم میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔وہ ایک ہمد رد اوردرد مند دل کے مالک تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے عارف عبدا لمتین کو ایک ایسا " آوٹ سا ئیڈ ز " قر ار دیا ہے جو اپنے ذاتی غم پر اجتما عی غم کو فو قیت دیتاہے ۔ عارفؔ کا بنیادی مذہب انسا نیت ہے اور انہوں نے اپنی ساری عمر انسانیت کا علمبرداربن کر گزاری ۔ انہوں نے ایک ایسے دور میں ہوش سنبھالا جب ہر طرف ظلم و جبر اوربر بریت کا دور دور ہ تھا ۔ استحصالی قوتیں ہند وستان پر اپنا تسلط قائم کر چکی تھیں ۔ مسلمان معا شی ، معا شرتی ، سیا سی اور اقتصا دی ہر میدان میں زوال اور پستی کا شکار ہو چکے تھے ۔پھر ۱۹٤۷ کے مو قع پر جس سفا کی کے ساتھ مسلمانوں کا خو ن بہا یا گیا ۔ عارفؔ اس کر ب کو شدت سے محسو س کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

> ۱۹٤۷میں تقسیم کے مو قع پر قتل وغارت گری نے مجھے بہت رلایا ہے جس میں بہمانہ اند از سے انسانی زندگیوں کو موت کے گھاٹ اتار گیا۔ اس نے میری روح کے نا قابل انداز گھاؤ پید اکر دیئے ہیں ۔

اسی طرح ۱۹٦٥میں جب بھارت نے پاکستان پر دھا وا بول دیا تو وہ دن بھی عارفؔ کے لئے انتہا ئی بے چینی اور اضطرا ب کا تھا ۔ یوں انہوں نے جب شعور کی آنکھ کھو لی تو ہر طرف اشتر اکیت کے نعر ے سنا ئی دے رہے تھے ۔ اشتراکیت چونکہ غر یبوں کی حامی ، کمزوروں

کی دستگیر اوراستحصالی قو توں کی مخا لف تھی۔ چنا نچہ ان انقلا بی نظریات نے ہمارے جن ادبا ء اور شعر ا ء کو متا ثر کیا ان میں عارف عبد المتین کانام بھی نمایا ں اہمیت کا حامل ہے ۔ عارفؔ وہ انسان دوست شاعر ہیں ۔ جو معاشرے میں موجود منفی قو توں کو دیکھ کر افسر دہ ہو جاتے ہیں۔ جو زند گی کی خو بصورتی کو بد صورتی میں بد لنے کی کو شش میں مصروف عمل ہیں ۔ وہ ان منفی قو توں کے پس پر دہ کارفر ما محرکات کو ختم کرنا چا ہتے ہیں اور ایک پرامن معا شرے کا قیام عمل میں لانا چاہتے ہیں ۔ ا ن کا تاریخی ، سیا سی، عصری اور طبقاتی شعور بہت بلند ہے ۔ انہوں نے عوام کی آزادی اوربہتری کے لیے آواز بلند کی ۔ اپنی نظموں میں سا مر اجیوں کی چیرہ دستیوں کو بے نقاب کیا۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں " اک صورت خرابی کی" ،" گھن گرج"،" خلیج" اہمیت کی حامل ہیں ۔ یہ نظمیں تر قی پسند انہ خیالات اورترقی پسندانہ منشور کی بھر پور عکاس ہیں ۔ جن میں انقلاب اور روشن مستقبل کی نوید سنا ئی گئی ہے ۔ مذہبی رہنماوں کے ہتھکنڈوں اور سیا سی جا بروں کی چیرہ دستیوں کا ذکر ہے اشتراکی نظریات کی کامرانیوں اورسامراجیوں کی شکست وریخت کی پیش گو ئی ہے ۔ نظم " خلیج" کے اشعار دیکھئے ۔

سپاہیوں کا وجود ہم کو نگل رہا ہے
ہماری حدت میں تن ہمارا پگھل رہا ہے
تمہاری جھوٹی عمل کی جھب سے تہی سہارے
ہمیں فروزاں نہ رکھ سکیں گے
ہماری تقدیر میں وہی مرگ ناگہاں ہے
کہ جسکی تکذیب میں تمہارے فروغ کی داستاں نہاں ہے
(سفر کی عطا
،ص :۱۰۸)

انسان دوست عارفؔ کا قوت مشا ہدہ بہت و سیع تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سامراجیوں ، سر ما یہ داروں اورآمروں کے ظلم و تشد د کے خلا ف آواز بلند کرتے تھے ۔ وہ معا شرے میں عدل و انصا ف ، امن و آشتی کے خواہشمندتھے ۔ ظلم وستم اور استحصال کا خاتمہ چاہتے تھے ۔ انصا ف ، مسا وات ، برابری اورانسان دوستی کے قا ئل تھے اور یہی پیغام اپنی نظموں کے ذریعے عام کرتے دکھا ئی دیتے تھے ۔اس سلسلے میں ان کی نظمیں " سمندر "، " لفظ " اور "چراغ کا گھا و" قابل تو جہ ہیں ۔ نظم " چراغ کا گھا و" کے اشعار دیکھئے ۔

مری روح کے سنگریزوں کو کس نے چنا ہے
ہر اک شخص میرے لہو سے ابھرتی ہوئی روشنی کے سہارے
تمناوں کے نارسا ، سنگدل فرش سے
خود اپنے ہی صد پارہ احساس کی کرچیاں چن رہا ہے
میں کسی سے کہوں ادا کیسے کہوں!
کہ میں اپنے قد موں سے لپٹے ہو ئے اس اند ھیرے سے تنگ آگیا ہوں
جو میرے ہی پیکر کی بے رحم تخلیق ہے!
(سفر کی عطا ،ص:۱۱۸)

عارفؔ اپنی نظم " شہر بے سماعت " میں عہد حاضر میں انسان کے آشوب و ابتلا اور اس کے شخصی زوال کی داستان بیان کرتاہے ۔ زند گی کے اس طویل سفر میں انسان نے کتنے مصا ئب اور پر یشانیوں کو جھیلا ہے ۔ اپنی دردمندی کے ہاتھوں وہ کیسی کیسی قیا متوں سے گزر ا ہے اسکی روداد نظم میں بڑی خو بصورتی سے بیان کی گئی ہے۔ چند اشعار ملا حظہ ہوں ۔

کٹے سر سے میں جنگل میں پڑا ہوں
میں اپنے قتل کا اک سانحہ ہوں !
مرے دکھ کی نہایت کون سمجھے
میں اپنی ناتمامی کا گلہ ہوں
میری افتاد مجھ سے پوچھتی ہے
میں کیوں اوجِ ثریا سے گرا ہوں
(شہر بے سماعت)

عارفؔ ایک نظریاتی شاعر ہیں ۔ ا ن کارحجان زیادہ تر انقلابیت اوراشتراکیت کی طرف ہے ۔ لیکن انکے ہاں عام انقلا بیوں کی طرح گھن گرج نہیں ہے ۔ لیکن اس کے باوجود ان کے جذبات اور حوصلے جواں ہیں ۔ وہ جذ بوں کی صداقت پر پورا یقین رکھتے ہیں ۔ انہیں اس بات کی امید ہے کہ وہ جس چیز کے لئے جد وجہد میں مصروف ہیں وہ ان کا فرض منصبی بھی ہے اور انسا نیت کی بقا کے لیے ضروری بھی۔

نہ رنگ و نسل سے کچھ برتری
ہے
نہ حرف و صورت سے بالیدگی ہے
فقط کردار سے ہے درجہ بندی
یہی پارکھ عروج آگہی ہے
(لا محد
ود،ص:۵۷)

عارفؔ ایک صحت مند معا شرے کی تشکیل و تعمیر کا داعی ہے ۔و ہ بنی نوع آدم کو آپس میں یگا نگت بڑھانے اورمحبت کا درس دیتاہے ۔ انہوں نے زند گی کے ہر دکھ درد کو بخو شی قبول کیا ہے لیکن سمجھو تے کا راستہ نہیں اپنا یا ۔ خیر و شر کے معر کوں میں وہ زخمی ہوتے ہیں ۔ لیکن ان کے یہاں ضمیر اپنی بھر پور توانا ئی کے ساتھ زندہ رہتا ہے ۔ زخمی ہونے کے با وجود انکے ہاں اجتماعی فلاح و بہبود کی آرزو اور امنگ کسی طور ماند نہیں پڑتی۔ وہ اب بھی اخوت کی جہا نگیری اورمحبت کی فر اوانی کے خواب دیکھتے ہیں اور خواہش مند ہیں کہ ان کے خواب حقیقت کا روپ دھار لیں ۔ان کی یک مصری نظم "جوابی سلوک" ملا حظہ ہو۔

سنگ برساتے ہو مجھ پر جب تو تم پر گل برسنے کی دعا کرتا ہوں
(دھوپ کی چادر ،ص :۴۵)

نظم " اپنے خلا ف ایک فتویٰ" دیکھئے
ظلم کے ماحول میں زندہ ہوں ، خود ظالم ہوں میں
(دھوپ کی چادر ،ص:۱۴۶)

عارفؔ اپنے عہد کے تمام کرب کو اپنی شاعری کے سا نچے میں ڈھلتے ہیں ۔ وہ دیکھتے ہیں کہ معا شرے میں منا فقت کا رویہ عام ہے ۔ اس معاشرے میں ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ کا اصول کافرما ہے۔ لیکن عارف کے نزدیک کردار کی بلند ی اورپختگی ہی بنیادی شرط ہے اور ایسے پختہ کردار کے حا مل افراد ہی معاشر ے کااصل سرمایہ ہیں ۔ نظم " پردہ " کا مصرعہ دیکھئے ۔

چل رہا ہے خیر کے پردے میں
شر کا کاروبار
(دھوپ کی چادر
،ص:۵۵)

دوسری طرف نظم "کاش" کا مصرعہ بھی قابل توجہ ہے
کاش انسانوں میں یہ اجلے کبوتر بانٹ سکتے اپنی کچھ معصویت

(دھوپ کی چادر،ص:۵۷)

ترقی پسند عارفؔ جب معاشرے میں دھو باز ، مکار اور سازشی لوگوں کی کثرت دیکھتا ہے جو اپنے اوپر عزت و شرافت کا لیبل لگائے ہوئے ہیں اور" معز زین شہر " بن بیٹھے ہیں تو وہ آرام سے نہیں بیٹھتا بلکہ ان کی شرافت کا پردہ چاک کر دیتا ہے ۔

دستار کے ہر تار کی تحقیق ہے لازم
ہر صاحب دستار معزز نہیں ہوتا
(موج در موج ،ص:۳۸۱)

عارفؔ اپنے عہدکی چالاکیوں ، منافقوں اور بے حمیتی کا بھی پردہ چاک کرتا ہے

یہ میرا عہد ہے عہد منافقاں عارفؔ
اگر میں زہر کو تریاق کہہ سکوں تو جیوں
(دریچے اورصحرا،ص :۳۰)

معاشرے کی بنیاد کو کھو کھلا کرنے میں معاشرتی ناہمواریوں ،ریاکاری ، چو ربازاری اور مکر وفریب کا بڑا ہاتھ ہے ۔ اس سے انسان کی انسانیت آہستہ آہستہ ختم ہوتی جاتی ہے۔ ایسی صورتحال میں شاعر بھی کرب کا اظہار کرتاہے ۔ اور اس بات کا احساس دلواتا ہے کہ وہ بھی عام افراد کی طرح معاشرے ہی کاحصہ ہے اوران کے ساتھ ہے ۔ یوں اپنی بھر پور انسان دوستی کا ثبوت پیش کرتاہے ۔"مسیح وقت" کا مصرعہ دیکھئے۔

"غم" اٹھائے پھرتا ہوں اپنصیلیب کاندھے پر
(دھوپ کی چادر،ص:۱۲۱)

یک مصری نظم " غم" کا مصرعہ دیکھئے۔

غم وہ دیمک ہے کہ صدیوں جس نے چاٹا ہے مجھے
(دھوپ کی چادر ،ص :۱۲۱)

عارفؔ صاحب کی شاعری کا ایک عنصر خود آگہی بھی ہے اور یہی خود آگہی ، حیات آگہی، کائنات آگہی اور خدا آگہی کا بنیادی ذریعہ ہے ۔ اس حوالے سے پروفیسر قمر انیس لکھتے ہیں ۔

" دھوپ کی چادر " سامان طما نیت اورسر ما یہ جان بنی ہے ۔ علم وآگہی ، عرفان و فیضان اورکیف ودوران کا ایک سیل رواں ہے ۔ بہر حال وحد ت کے بھر پور احساس نے انسا نی ذات کی تنظیم کا قابل قد ر منشور پیش کیا ہے ۔

عارفؔ نے اپنی انسان دوست شخصیت کے ذریعے بہت سی علامتوں کو نئی معنو یت کارنگ دیا ہے۔ تر قی پسند شاعروں میں یہ شرف صرف انہی کو حاصل ہے ۔"امر و نہی"کا مصر عہ دیکھئے ۔

ستارہ بن کے چمک اشک کی طرح نہ ٹپکے
(دھوپ کی چادر،ص:۵۷)

"یو سف اور برادران یو سفؑ "کا مصر عہ دیکھئے

غم میں بھی یوسف ہوں ، نوازا ہے مجھے بھی بھائیوں نے چاہ سے
(دھو پ کی چادر ،ص:۶۲)

" دھوپ کی چادر "کے دیبا چے میں ڈاکٹر غلام حسین اظہر لکھتے ہیں ۔

عارف نے اپنی انسان دوست شخصیت کے لمس سے بہت سی علامتوں کو نئی معنو یت عطا کی ۔ ستارے، آفتاب ،پھول ، ہوا ، خوشبو ، کنول ، گرد،غنچے ، سبزہ اور عود کی علامات اسکی شخصیت کے کئی تخیل اور دلا و یز پہلووں کی تر جمان ہیں ۔ تر قی پسند شاعروں میں ان علامتوں کو نئی معنو یت عطا کر نے کا شر ف انہیں اس وجہ سے نصیب ہو ا ہے کہ تر قی پسند ان کے یہاں ایک نعر ے کا نہیں بلکہ انسان دوست مزاج کا نام ہے ۔

عا رفؔ کی شاعری ان کے تر قی پسند انہ نظریات اور انسان دوستی کا پر چار کرتی ہے ۔ ان کی شاعر ی میں غم جاناں اور غم دوراں کا متوازی اظہار انہیں صحیح معنو ں میں ترقی پسند شاعر بنا تا تھا ۔ وہ معا شر ے کے کرب سے نظر یں چرا نہیں سکے۔

زلف و رخسار کی چاہت ہے مجھے بھی لیکن
دل الجھ پڑتا ہے جونہی رسن و دار کے ساتھ
(دریچے اور صحرا، ص:۳۸)

انسان دوست عارفؔ سچے محب وطن ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں وطن دوستی کا جذ بہ نما یا ں طور پر دکھا ئی دیتا ہے ۔ انہوں نے قومی تا ریخ کے ہر پر آشوب مر حلے کو اپنی نظموں کا مو ضوع بنا یا چا ہے۔ ۱۹٦۵کی جنگ ہو یا سقو ط ڈھا کہ کا ذکر ان کی نظمیں حب وطن سے سر شا ر دکھا ئی دیتی ہیں ۔ البتہ پا کستانی سیا ست کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ معا شرے میں عوام کو با لا دستی حاصل ہو نی چاہیے ۔ تبھی غیر منصفا نہ نظام کا خاتمہ ممکن ہے ۔ اس سلسلے میں جہاں بھی جمہوریت پر کاری ضر ب لگتی ہے تو یہ بلبلا اٹھتے ہیں ۔ وطن کی عظمت کے گیت ان الفا ظ میں گا تے ہیں ۔ نظم " مر ے وطن" کے اشعار ملا حظہ کیجئے ۔
میرے وطن ترا ہر ذرہ آفتاب مجھے

بھلا ڈرائے گا کہا رات کا عذاب مجھے
ترے سپوت خلوص و وفا کے پیکر ہیں
ہر اک چہرہ لگے اک کھلی کتاب مجھے
پہاڑ راہ میں آئیں تو یہ دھنک ڈالیں
سمندروں کا ملا ان میں اضطراب مجھے
(سفر کی عطا
،ص: ۹۷)

المختصر عارف عبد المتین کے ہاں انسان دوستی کا رحجان با لکل واضح ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ زند گی کی مثبت قدروں پر یقین رکھتے ہیں ۔ محبت و شفقت کا برتا و ان کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے ۔ ان کی نظموں میں جا بجا انسان دوستی کے جذ بات وخیا لات مو جزن ہیں ۔ انسان سے یہ پیا ر و محبت ، ہمدردی اور انسان دوستی ان کی نظمو ں کو انفرادیت عطا کرتی ہے ۔ حسرت کا سگنجوی عارف عبد المتین کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہو ئے کہتے ہیں ۔
عارف عبدا لمتین ایک نظریاتی شاعر ہیں ۔ان کارحجان زیادہ تر انقلا بیت اور اشتر اکیت کیطرف ہے ۔ لیکن ان کے ہاں عام انقلا بیوں کی طرح گھن گرج نہیں ہے ۔۔ جب وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو ان کی شاعری میں ایک ولولہ، جوش اور زمانے کو تسخیر کرنے کا رحجان ملتا ہے۔ اس کے لئے اگر وہ کچھ بہک جاتے تو یقینا ان کی شاعری گھن گرج والی بن جاتی اور وہ " زند انوں کی خیر نہیں " والی شاعری میں الجھ کر رہ جاتے ۔انہوں نے اپنی شعوری کو ششوں سے اپنی جد وجہدکی داستان کو جو زبان دی ہے اس میں ان کا عزم نمایاں ہے ۔ وہ ما یوسی اور بے بسی کی باتیں نہیں کر تے۔ اپنے جذ بوں پر کلی طور پر اعتماد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں جو یقین اور اعتماد کی فضا ہے

وہ ان کے فلسفیانہ ذہن کی روشنی میں معتبر ہے اور دیر پا جذ بات کی غماز بھی ۔

حبیب جالب اور انسان دوستی (۱۹۲۸۔۱۹۹۳)

حبیب جالب کی پیدا ئش اس زمانے میں ہو ئی جب ہند ومسلم اتحاد اپنے عروج پر تھا اور پورا ہند وستان انگریز کے خلا ف سیسہ پلا ئی دیوار بنا ہوا تھا اورآزادی کے نعروں سے فضا گو نج رہی تھی۔ حبیب جالب نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی۔ جہاں ان کے والدین غربت وافلا س کی چکی میں پس رہے تھے ۔ اپنے غربت وافلاس کے پیش نظر انہیں بچپن میں جن مشکلات کاسامنا کرناپڑا اس حالت زار کانقشہ وہ یوں کھنچتے ہیں ۔

میں نے جس غریب گھرانے میں آنکھ کھولی وہاں مسا ئل ہی مسا ئل تھے ۔مجھے یاد ہے کہ جنگل میں لکڑیاں چننے جا یاکر تے تھے ۔ مکئی کٹ جانے کے بعد کھیتوں میں ہل چلتا تھا تو مکئی کی جڑ یں (مڈ ھ) رہ جاتی تھیں ۔ انہیں ایک جگہ اکٹھا کر لیا جاتا تھا اور پھر وہ جلا نے کے کام آتی تھیں ۔ہر سال ایک جوڑا کپڑوں کا ملتا تھا اور بطور عید ایک آنہ ، عید پر ملنے والے جوڑے ہی میں پورا سال گزار دیتے اور غربت کی انتہا تھی ۔

حبیب جالب کا بچپن اپنی نانی کے پاس گز ر اجو شاعرانہ ذوق رکھتی تھیں ۔ اور نظیر اکبر آبادی کے بہت سے شعرا نہیں یاد تھے ۔ حبیب جالب انہی کی صحبت میں رہ کر نظیر اکبرآبادی سے متا ثر ہو ئے اوران کی شاعری میں عوامی رنگ درآیا ۔ان کی شاعری کی نہ صرف پاکستان بلکہ پاکستان سے باہر بھی خوب پذ یرائی ہوئی ۔ وہ ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے کہ جنہوں نے شعروادب ، سیا ست اور تاریخ میں اپنے ان مٹ نقو ش چھوڑے ۔۱۹٤۷میں وہ مشر قی پنجاب کے علا قے ہو شیار پور سے ہجرت کر کے آئے تو ان کی بھر پور جوانی کا دور تھا اور وہ پرامید بھی تھے۔ برطا نو ی سامراج کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ ظلم و جبر کی چکی میں بسنے والوں مسلمانوں نے اس امید پر پا کستان کی سرزمین پر قدم رکھا کہ اب اس شب کی سحر ہو نے والی ہے ۔مگر تقسیم کے بعد حکومتی طبقوں کی سازش عیاں ہو ئی کہ اب بھی بد دستور انسانی حقو ق کی پا مالی ہی پا مالی ہے ۔ انسان دوست اورحسا س دل حبیب جالب نے اس تضاد کا اپنی آنکھوں سے مشا ہد ہ کیاتو وہ ان ظالم و جا بر حکمرانوں کے خلا ف قلم بلند کر نے پر مجبور ہو گئے ۔ انہوں نے زنداں کی تنگ و تاریک کو ٹھڑ یوں میں اپنے شب و روز بسر کیے۔ لیکن کسی آمر کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا بلکہ ہمت اور حو صلے سے یہ جنگ لڑتے رہے۔ انہوں نے ذاتی غم پر اجتما عی غم کو تر

جیح دی اور اپنی انسان دوستی کا ثبوت ہر موقع پر پیش کر تے رہے۔ انہوں نے حکمرانوں کے قصیدے کہنے کی بجا ئے عوام کے جذبات کی بھر پور ترجمانی کی ۔ جا گیرداروں اور سرمایہ داروں کے مفا دات کے تحفظ کے بجا ئے عام عوام، کسانوں اور مز دوروں کے حق کے لیے آواز بلند کرتے رہے اور انسان دوستی کو پر وان چڑھا تے رہے ۔

" حامد میر" حبیب جالب کی انسان دوستی کو ان الفا ظ میں بیان کرتے ہیں ۔

جالب صر ف عوام کے لئے بولتا ہے اور عوام ہی کے لئے کھو لتا ہے ۔ حبیب نے ہر حکمران کو للکار ا اور ہر آمر کے دور میں جیل کی ہوا کھائی ۔ جالب کی زبان اور قلم سے نکلنے والے سچے لفظ عوام کے دلوں کی دھڑکن بنتے رہے ہیں ۔ اور آمروں کی نیندیں اڑاتے رہے ۔ جالب نے اپنے خون جگر سے لفظوں کے دیپ جلائے اور خوف کے گھپ اندھیر ے میں مظلوموں کو روشنی دکھا ئی ۔

جالبؔ نے ہمیشہ خلوص ، دیا نت ، شر افت ، صداقت ، استقامت ، حب الو طنی اور انسان دوستی کا مظاہر ہ کیا۔ اور ان کی ان خو بیوں کے دوست دشمن سب ہی معتر ف نظر آتے ہیں ۔ انہوں نے حق گو ئی و بے باکی کو اپنا شعار بنایا اوراسی کی تبلیغ وہ اپنے اشعار میں بھی کرتے نظر آتے ہیں ۔ نظم " سچ ہی لکھتے جانا"کے اشعار اسکا منہ بولتا ثبوت ہیں ۔

دینا پڑے کچھ ہی ہرجانہ سچ ہی لکھتے جانا
مت گھبرانا مت ڈر جانا سچ ہی لکھتے جانا
پل دو پل کے عیش کی خاطر کیا دبنا کیا جھکنا
آخر سب کو ہے مر جانا ، سچ ہی لکھتے جانا
لوح جہاں پر نام تمہارا لکھا رہے گا یونہی
جالب سچ کا دم بھر جانا ، سچ ہی لکھتے جانا
(کلیات حبیب جالب
،ص:۲٦٦)

جالبؔ ایک انسان دوست معا شرے کے علمبردار تھے ۔ ان کے ظاہر و باطن میں تضا د نہ تھا۔ کسی کی دانستہ دل آزادی نہ کرتے ۔کسی کو دکھی او رپر یشان نہ دیکھ سکتے تھے۔ انہیں حقوق العباد اور شخصی آزادیاں بے حد مر عوب تھیں اور ہر شہری کو بلا تفر یق اس دولت سے مالا مال کر نے کے آرزو مند تھے ۔ ان کا دین او ر مسلک انسانیت تھا اور اسی انسانیت کو وہ پوری دنیا میں عام کرنا چا ہتے تھے۔ وہ استحصال سے پاک معا شرے کے خو اہ شمند تھے جہاں ہر انسان آزادی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر سکے ۔

بقول ڈاکٹر عبادت بر یلوی !

حبیب جالب نظر یے کا شاعر ہے اس لئے کہ وہ نظر یے کاانسان ہے ۔ زند گی کی قدریں اسے بے حد عزیز ہیں ۔ وہ بے قا عد گی ، ظلم ، نا انصافی ، تعیش پسند ی ، اخلا قی پستی ،سما جی نا ہمواری کا دشمن ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زند گی کے سفر میں ہر اک شخص کے ساتھ ہو جاتا ہے جوان قدروں کو ساتھ لیکر چلتا ہے۔ لیکن جہاں قدروں سے اس کا دامن چھوٹتا ہے ۔ حبیب جالب اس سے علیحدگی اختیار کر لیتاہے اوراپنے فکر وفن کے نشتروں سے اس کو ادھیڑ دیتاہے ۔

قیام پاکستان کے بعد عوام کی بد قسمی اس صورت میں سامنے آئی کہ حکومت چند وڈیر وں اور جا گیر داروں تک محدودہو کر رہ گئی ، جو صر ف اقتد ار کے بھو کے اور دولت کے بچاری تھے ۔ ملک کو سیا سی استحکام بخشنا عوام کی حالت زار کو بہتر بنانے کا کوئی منصو بہ ان کے ذہن میں نہ تھا ۔ یہ صورتحال اس وقت مز ید سنگین ہو ئی جب جمہوریت کی جگہ فوجی آمریت کا قیام عمل میں آیا ۔جنرل ایوب خان نے مارشل لا نافذ کرکے صدارتی نظام پر مبنی ایک ایسے آئین کے نفاد کا اعلا ن کیاجو کسی صورت غریبوں ، بے بسوں ، لا چاروں اورمظلوموں کے حقو ق کا محا فظ نہیں ہو سکتا تھا تو انسان دوست جالب جو ملک میں جمہوریت ، آزادی ،خو شحالی اور سامراج کے ظلم و ستم سے نجا ت دلانے کے خواب دیکھتے تھے ۔ان کے خوابوں کا وہ چمن ایک دم خزاں رسید ہ ہوگیا اورانہوں نے اس دستور کے خلاف آواز بلند کی ۔ نظم " دستور " کے اشعار دیکھئے ۔

تم نے لوٹا ہے صدیوں ہمار سکوں
اب نہ ہم پر چلے گا تمہارا فسوں
چارہ گر میں تمہیں کس طرح سے کہوں
تم نہیں چارہ گر، کوئی مانے ، مگر
میں نہیں مانتا میں نہیں مانتا
(کلیات حبیب جالب ،ص:۱٤۱)

جنرل ایوب خان کا دور جمہوریت کے خاتمے کا دور ثابت ہوا ۔ پا رلیما نی حکومت کا خا تمہ، سیا ستدانوں اور سیا سی جما عتوں پر عا ئد پا بندیاں اس با ت کا ثبوت تھیں کہ جمہوریت کاراج ختم ہو چکا ہے ۔ایسے میں جالبؔ دستور کے نفاذ پر نوحہ کناں ہو نے کے بعد نہایت دکھ اور کر ب کے ساتھ جمہوریت کی حالت زار پر نظم " جمہوریت" لکھ کر حکومت کی مکاری کا پردہ چاک کرتے ہیں ۔ اورانہیں یہ احساس دلانے کی کو شش کرتے ہیں ۔ کہ کا ش! تم سمجھ سکو اورجان سکو ۔

یہ ملیں یہ جاگیریں
کس کا خون پیتی ہیں
بیرکوں میں یہ فوجیں
کس کے بل یہ جیتی ہیں
کسی کی محنتوں کا پھل
داشتائیں کھاتی ہیں
جھو نپڑوں سے رونے کی
کیوں صدائیں آتی ہیں
جب شباب پر آکر
کھیت لہلہاتا ہے
کس کے نین روتے ہیں
کون مسکراتا ہے
کاش تم کبھی سمجھو
کاش تم کبھی جانو
دس کروڑ انسانو!
(کلیات حبیب جالب
،ص :۱۴۳)

ملک پر جنرل ایوب خان کی آمریت اورنواب امیر محمد خاں آف کالا باغ کے ظلم و جبر کی سیا ہ رات چھا ئی ہوئی تھی کہ محتر مہ فا طمہ جنا ح اس سیاہ رات میں روشنی کی ایک کرن بن کر آئیں ۔ جالبؔ کا یہ خیال تھا کہ ۱۹۶٤ کے الیکشن میں محتر مہ فا طمہ جناح جنر ل ایوب خان کے مد مقا بل جیت جاتی ہیں تو آمر یت کا خا تمہ ہوجا ئے گا اور تا ریکی کے بادل چھٹ جا ئیں گے ۔ اور عوام کی فلاح و بہبود اور انسان دوستی کا خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے گا ۔ لہٰذا سیاسی پلیٹ فارم پر جالبؔ فا طمہ جنا ح کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے اور ان کی عظمت کا اعتراف نظم " مادرملت" میں اس انداز میں کیا۔ اشعار دیکھئے ۔

ماں کے قدموں ہی میں جنت ہے
ادھر آجاو
ایک بے لوث محبت ہے ادھر آجاو
وہ پھر آئی ہیں ہمیں ملک دلانے
کے لئے
ان کی یہ ہم پر عنایت ہے ادھر
آجاو
اس طرف ظلم ہے بیداد ہے حق
تلفی
ہے

اس طرف پیار ہے الفت ہے ادھر
آجاو
(کلیات حبیب
جالب(۲۰۵)

تر قی پسند جا لبؔ کوحق بات کہنے پر پا بند اسلا سل بھی کردیا گیا ۔لیکن ان کی حق گوئی اور بے با کی پر کو ئی ضر ب نہ لگی اوروہ مسلسل عوام کے حق کےلئے آواز بلند کرتے رہے ۔ زند اں کے در و دیوار میں بھی انہیں عوام کا دکھ اورکرب پریشان کرتا رہا اور وہ ان کی ہمدرد ی کے گیت گا تے رہے ۔ جب ملکی دولت اورپیداواری و سا ئل بیس یا با ئیس گھرانوں کے قبضے میں تھے اور وہ اس پر سانپ بن کر بیٹھے ہو ئے تھے اور غریب عوام سر ما یہ داروں کے ہاتھوں کٹ پتلی بنے ہو ئے تھے تو ایسی صورتحال میں جالب اپنی نظم " بیس گھرانے " میں اس بات کا گلہ کرتے ہیں کہ آج بھی کالی صدیوں کی بیداد جاری ہے اور غریب عوام اس کا نشانہ ہیں ۔

بیس روپیہ من آٹا
اس پر بھی ہے سناٹا
گوہر ، سہگل ، آدم جی
بنے ہیں برلا اور ٹاٹا
ملک کے دشمن کہلاتے ہیں
جب ہم کرتے ہیں فریاد
صدر ایوب زندہ باد
(کلیات حبیب جالب،
ص:۱۵۱)

حبیب جالب کی عوام سے محبت اورانسان دوستی کو دیکھ کر سبط حسن یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ کبھی کبھی سو چتا ہوں کہ اس درویش خاک نشیں میں یہ جرات انکار کہاں سے آئی ۔ وہ کون سی قوت ہے جو اس نیک دل اور نرم خوانسان کو با طل سے لڑنے اورحق کا اقرا ر کر نے پر آمادہ کرتی ہے۔ درحقیقت وہ قوت عوام کی محبت ہے اور وہ چشمہ حیواں جو حبیب جالب کو ولولہ اور جوش عطا کرتا ہے ۔ عوام کی طاقت ہے ۔ حبیب جالب نے اپنی شخصیت اور شاعری کو عوام کی خاطر وقف کر دیا ہے ۔

جالبؔ انسانی ہمدردی کے پیکر تھے ۔ عوام کی فلاح و بہبود ہی ان کا مقصد حیات تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۷میں آنے والے روسی انقلاب پر وہ خوشی کے ترانے گاتے ہیں کہ یہ انقلاب انسان کا بول بالا کر ے گا

۔ کٹیاوں میں اجالا ہوگااور محنت کشوں کا راج ہوگا اور ہر طرف انصاف ہی انصاف ہوگا نظم "ترانہ دوستی " کے اشعار دیکھیئے۔

نہ لٹ سکیں گی محنتیں نہ بک سکیں گی حسرتیں
امیر اس دیار کے نہ دے سکیں گے ذلتیں
نصیب میں یہ سنگدل نہ لکھ سکیں گے ظلمتیں
دیکھنا ستم زدہ غم کی رات اب ڈھلی
پاک روس دوستی زندگی زندگی
پاک روس دوستی روشنی روشنی

(کلیات حبیب جالب ،ص:٤٠٧،٤٠٦)

جالبؔنے امریکی سامراج کے خلاف بہت سی نظمیں لکھیں ۔ جن میں امر یکہ کی شا طرانہ چالوں کو بے نقاب کرنے کی کو شش کی گئی ہے۔ ان میں " امریکہ کے ایجنٹوں سے " ، " امریکہ یا ترا " ، " ہم لڑیں امریکہ کی جنگ کیوں " اور "صدر امریکہ نہ جا " قابل ذکر ہیں ۔ نظم "صدر امریکہ نہ جا" کے اشعار دیکھئے ۔

ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا
پتھر کو گہر ، دیوار کو در ، کرگس کو ہما کیا لکھنا
اک حشر بپا ہے گھر گھر میں دم گھٹتا ہے گنبد بے در میں
اک شخص کے ہاتھوں مدت سے رسوا ہے وطن دنیا بھر میں
اے دیدہ ورو اس ذلت کو قسمت کا لکھا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

(کلیات حبیب جالب،ص:١٩٧)

جیلانی کامران!جالبؔ کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔

اس نے ہر شخص اور ہر شے کو للکار ا اور وہ اپنے آزادانہ
کا موں سے اپنی شناخت بر قرار رکھنے کے قابل تھا۔ اس
کے عمر بھر قول و فعل یکساں رہے ۔ ایک اکا ئی اور اس
نے اپنی ساری زند گی اسی کے لیے کوشش کی۔ عموماً اسکا
یہ وصف مختلف فقرات میں بیان کیاجاتاہے کہ جالب منا فق
نہیں تھا۔ وہ ایک ایما ندار آدمی تھا۔ اصل انسان کا صحیح نما
ئند ہ ۔

جب ۱۹٦۸میں ذوالفقا ر علی بھٹو نے ملک میں اسلامی سو شلزم
کا نعرہ بلند کیا تو جماعت اسلا می نے یہ خطرہ ظاہر کیا کہ بھٹو کے سو
شلزم سے اسلام خطر ے میں پڑگیا ہے ۔ایسی صورتحا ل میں انسان
دوست جالب اس سیاسی لڑائی کے مقابل ملک میں بھوک ، ننگ، اور
افلاس کو دیکھئے ہو ئے " پاکستان کامطلب کیا " اور " خطرے میں
اسلام نہیں " جیسی نظمیں لکھتے ہیں ۔ نظم " پاکستان کا مطلب کیا " کے
اشعار دیکھئے ۔

کھیت وڈیروں سے لے لو
ملیں لیٹروں سے لے لو
ملک اندھیروں سے لے لو
رہے نہ کوئی عالی جاہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ۔۔۔
(کلیا ت حبیب جالب
،ص:٦٤١)

دوسری طر ف نظم " خطرے میں اسلام نہیں " کے اشعار دیکھئے
جس میں جالبؔ انسا ن دوستی کا پیغام عام کرتے نظر آتے ہیں ۔

خطرہ ہے بٹ ماروں کو
مغرب کے بازاروں کو
چوروں کو مکاروں کو
خطرے میں اسلام نہیں
امن کا پر چم لے کر اٹھو ہر انسان
سے پیار کرو
اپنا تو منشور ہے جالبؔ سارے
جہاں سے پیار کرو
(کلیات حبیب جالبؔ
،ص:٦٤٨)

جالبؔ جیسا عوام دوست شاعر فوجی آمریت کے خلا ف آواز بلند کرتا رہا ۔ جنرل ایوب کے زوال کے بعد جب ملکی اقتد ار جنرل یحیی کے ہاتھوں میں آگیا تو یہ چیز بھی جالبؔ کے لئے تکلیف کا باعث تھی ۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ صرف نام کی تبد یلی ہے جب کہ کردار وہی ہے۔ اپنی نظم " اپنی بات کرو" میں صدائے احتجاج بلند کر تے ہیں ۔

اس رعونت سے وہ جیتے ہیں کہ
مرنا ہی نہیں
تخت پر بیٹھے ہیں یوں جیسے
اترنا ہی نہیں
یوں ماہ و انجم کی وادی میں اڑے
پھرتے ہیں وہ
خاک کے ذروں پہ جیسے پاوں
دھرنا ہی نہیں
ان کا دعویٰ ہے کہ سورج بھی انہی
کا ہے غلام
شب جو ہم پر آئی ہے اس کو گزرنا
ہی نہیں
(کلیات حبیب جالب
،ص:۱۷۰)

آخر کار جالبؔ جمہوریت، آزادی ، خو شحالی، اورانسان دوستی کی فضا پیدا کرنے کی کو شش میں مصروف عمل رہے۔ نظم " اجرائے مسا وات " کے اشعار اسی کا وش کی بھر پور عکاسی کرتے ہیں ۔

دل تھا مرا پہلے ہی سے شیدائے
مساوات
پھر کیسے پسند آئے نہ اجرائے
مساوات
خونخوار لیڈروں سے ہو آزاد یہ
دھرتی
اس دیس میں اللہ کرئے آئے
مساوات
ہر آمر و فرعون کو آئینہ دکھائے
لوگوں کا ہو لوگوں سے نہ
شرمائے مساوات
(کلیات حبیب جالبؔ ،ص
:۳۹۷)

کہا جاتا ہے کہ مشر قی پاکستانی کی علیحد گی کے سانحہ نے عوام کے دلوں میں نفر ت کے جذ بات کو مز ید مستحکم کر دیا ۔ ایسی صورتحال میں جالبؔ یہ سو چنے پر مجبور ہو گئے کہ کیا ملکی آزادی کے گیت اسی لئے گا ئے گئے تھے کہ جب آزادی ملے تو اس میں غریبوں کا ہی خون چو سا جا ئے وہ ہی بھوکے اور ننگے پھر یں ۔ چند گھر انے عیش و عشرت میں رہیں اور ظلم و جا بر حکمران ان پر اپنا حکم مسلط کرتے پھر یں ۔ اس ساری صورتحال کا مشا ہدہ کرتے ہو ئے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس ملک کوحاصل کرنے کا غریب عوام کو کو ئی فا ئدہ نہیں ہوا جس نے اپنی بہترین زندگی کے نا جانے کیاکیا خواب بنے تھے ۔جالبؔ کی یہ خو بی ہے کہ وہ ہر برائی کے خلاف ہر آمر اور ہر جا بر کے سامنے ڈٹے رہے۔

بقول ڈاکٹر رشید احمد گو ریجہ!

تقر یباً ہر دور میں ان کو پابند سلا سل کیا گیا ۔لیکن ان کے قلم کو کو ئی حکومت پا بہ ز نجیر نہ کر سکی ۔ تشد د سے سر تو جھکا یا جاسکتا ہے لیکن دل و دماغ کو تشد د سے اپنا مطیع فرماں نہیں بنایا جا سکتا ۔ چنا نچہ ہر سزا کے بعد ان کے اندر شد ید رد عمل پیدا ہوا اور حبیب جالب کے قلم میں زیادہ شوخی اور بے باکی آتی چلی گئی۔

تر قی پسند جالبؔ نے ہر دور میں ظلم کے خلاف آواز اٹھا ئی۔ ذو الفقار علی بھٹو کے بعد جنرل ضیا الحق کا دور بھی عوام کے لئے پر یشانیاں لیکر آیا ۔ چا ہے وہ خواتین پر لاٹھی چارج کا واقعہ ہو یا راولپنڈی کے اوجڑی کمیپ میں اسلحہ ڈپو میں آتش زدگی کا واقعہ۔ جس میں ہز اروں قیمتی جانیں اور کروڑوں کی املا ک تباہ ہو گئی۔ انسان دوست جالبؔ اس افسوسناک واقعہ پر اپنے دکھ اور غم کا اظہار کرتے ہیں ۔ نظم " مر ثیہ خاک نشیناں " کے اشعار دیکھئے ۔

جو اوجڑی میں مارا گیا بس وہ مر گیا
خاکی تھا اور خاک کی صورت بکھر گیا
منشائے ایزدی کے مطابق گزر گیا
ہر بے گناہ کا خون مقدر کے سر گیا

(کلیات حبیب جالب،ص :۳۷۱)

غرض جالبؔ کسی سو شلسٹ ملک میں ہو تے تو بھی اپو زیشن ہی میں رہتے کیو نکہ وہ مراعا ت یا فتہ طبقات اورآمرانہ نظام حکومت برداشت ہی نہیں کرسکتے تھے۔ وہ ہمیشہ انسان دوستی کے گیت ہی الا پتے ہو ئے نظر آتے ۔احمد فراز نے ان کے بارے میں درست کہا ہے ۔
جالب کبھی مر نہیں سکتا ۔ بس یہ کہ خا مو ش ہو گیا ہے مگر اس کی باتیں زند ہ ہیں ۔ اس کاکلام زندہ ہے اسکی سوچ زند ہ ہے اس نے بڑے بڑے آمروں جا بروں کو للکار ا۔ اس کی آوازکی للکار کو دنیا بھر کا ستم نہ دبا سکا ۔ اسکی آواز فضا میں گو نج رہی ہے ۔ گو نجتی رہے گی۔
المختصر حبیب جالبؔ کی یہ خوبی ہے کہ انہوں نے صرف پاکستانی عوام کے دکھ درد محسو س نہیں کئے بلکہ انسان دوستی کا فرض نبھاتے ہو ئے اپنی ساری زندگی پوری انسانیت کے لیے و قف کر دی ۔ اس لیے دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمانوں پر ظلم وزیا دتی ہو ئی انہوں نے اس جبر اور زیادتی کے خلاف احتجا ج بلند کیا ۔ چاہے وہ ایران ہو یا عراق، ویت نام ہو یا فلسطین ، بنگلہ دیش ہو یالبنان ۔

Cd

باب چہارم

جدیدیت اور انسان دوستی

۱۔ جدیدیت ، نفسیاتی اور وجودی افکار ونظریات
۲۔ حلقہ ارباب ذوق اور انسان دوستی
۳۔ تصدق حسین خالد اور انسان دوستی
٤۔ ن۔ م۔ راشد اور انسان دوستی
۵۔ میراجی اور انسان دوستی
٦۔ یوسف ظفر اور انسان دوستی
۷۔ مجید امجد اور انسان دوستی
۸۔ قیوم نظر اور انسان دوستی
۹۔ اختر الایمان اور انسان دوستی
۱۰۔ مختار صدیقی اور انسان دوستی
۱۱۔ ضیا جالندھری اور انسان دوستی
۱۲۔ منیر نیازی اور انسان دوستی

fe

لسانی تشکیلات کا دور
۱۹۸۰۔۱۹٦۰

۱۔ لسانی تشکیلات
۲۔ جیلانی کامران اور انسان دوستی
۳۔ افتخار جالب اور انسان دوستی
٤۔ وزیر آغا اور انسان دوستی
٥۔ زاہد ڈار اور انسان دوستی
٦۔ ساقی فاروقی اور انسان دوستی
۷۔ آفتاب اقبال شمیم اور انسان دوستی
۸۔ انیس ناگی اور انسان دوستی
۹۔ تبسم کاشمیری اور انسان دوستی
۱۰۔ کشور ناہید اور انسان دوستی
۱۱۔ عبد الرشید اور انسان دوستی
۱۲۔ سرمدصہبائی اور انسان دوستی

معاصر شعرا اور انسان دوستی
(۱۹۸۰ سے تا حال)
(جدیدیت کی توسیع)

۱۔ معاصر شعرا اور انسان دوستی
۲۔ رفیق سندیلوی اور انسان دوستی
۳۔ جاوید انور اور انسان دوستی
۳۔ افضال احمد سید اور انسان دوستی
٤۔ نصیر احمد ناصر اور انسان دوستی
٥۔ روش ندیم اور انسان دوستی
٦۔ ذیشان ساحل اور انسان دوستی
۷۔ وحید احمد اور انسان دوستی
۸۔ اختر عثمان اور انسان دوستی
۹۔ سعید الدین اور انسان دوستی
۱۰۔ سلمان صدیق اور انسان دوستی
۱۱۔ ضیا الحسن اور انسان دوستی
۱۲۔ انوار فطرت اور انسان دوستی
۱۳۔ ناہید قمر اور انسان دوستی
۱٥۔ فرخ یار اور انسان دوستی
۱٦۔ سعید احمد اور انسان دوستی
۱۷۔ علی محمد فرشی اور انسان دوستی
۱۸۔ حوالہ جات

جدیدیت اور انسان دوستی

جدیدیت ، نفسیاتی اور وجودی افکار ونظریات

جدیدیت کو بطور ایک اصطلاح کے پہلی بار بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں یورپ میں استعمال کیا گیا۔ بعض شارحین جدیدیت کے اس رجحان کا آغاز پہلی جنگ عظیم یعنی ۱۹۱٤ء سے بتاتے ہیں اور یہ میلان بعض کے نزدیک ۱۹۳۰ء یا دوسری جنگ عظیم کے ساتھ ختم ہوگیا۔ ناقدین ادب جدیدیت کی متعین یا مخصوص تعریف کرنے سے قاصر رہے ہیں Dictionary of Literary Terms کے مولف نے بھی اسے ایک جامع مگر مبہم اصطلاح قرار دیا ہے۔

A Comprehensive but Vague term for amovement (or tendency) which began to get under way in the closing years of th19th Century........ As for as Literature is Concerned modernism reveals abrealing away from established rules, traditions&Convention, fresh ways oflooking at man's position & funtion in the universe&many (in someCases) experiments in form&style.

یعنی جدیدیت ایک جامع لیکن مبہم اصطلاح ہے۔ جس کا آغاز ۱۹ ویں صدی کے آخری سالوں میں ہوا۔ ممکنہ حد تک اس کے آغاز کو (AVANT-GARDE) یعنی فرانسیسی علامت نگار شعرا وغیرہ سے منسلک کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ شاعر وادیب تھے جو ادب میں غیر تقلیدی، اختراعی اور انقلابی تصورات رکھتے تھے۔ ۱۸۹۰ سے ایک تصور یہ پیدا ہوا کہ پرانے علوم کانئی تیکنیک کی مدد سے اعادہ کرنے کے بجائے پرانی رسوم وروایات کاجو ایکسر اتار پھینکا جائے۔ بعد کے سالوں میں بڑھتی صنعتی ترقی اور سائنس کے میدان میں آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت (Theory ofRelativity) کے متوازی جدیدیت کی تحریک بھی اپنے سفر پر گامزن رہی اور یہ دلیل دی جانے لگی کہ چونکہ روایتی صداقتیں خود تشکیک کا شکار ہیں اور انسانی اقدار کی شکست وریخت سے دو چار ہیں تو آرٹ کے لیے بھی ضروری ہے کہ اس میں انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں ۔ پس ۲۰ ویں صدی کے پہلے پندرہ سالوں میں بہت سے ادیبوں مفکروں اور فنکاروں نے روایتی راستوں کو خیر باد کہہ کر ادب،مصوری اور موسیقی میں نئی تخلیقات کا اضافہ کیا۔

اسی دور میں فرائد کے جنسیات اور تحلیل نفسی کے نظریات نے ادبی ذہنوں کو بے حد متاثر کیا اور انہیں انسانی شخصیت میں جنسی جبلت کے پیدا کردہ بے شمار اسرار و رموز بے نقاب نظر آئے۔ انسانی فطرت،لاشعوری محرکات، اخلاق اور فن کے بارے میں ان کے پرانے تصورات بدلنے لگے۔ اس نظریہ کے منظر عام پر آنے کے بعد ادیبوں اور شاعروں نے محسوس کیا کہ انسان کے تحت الشعور میں جو خوابیدہ

یا بے دار قوتیں کام کرتی ہیں وہ دراصل دبے ہوئے جنسی جذبے کی پیداوار ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں یا شبیہ میں وہ اظہاریت کے لیے جدوجہد کرتی ہیں ۔ فن، تخیلی شبیہ سازی یا خواب اس کی اظہاریت کے چند ذریعے ہیں ۔ فرائد کے اس نظریے کا شعر وادب پر گہرا اثر پڑا اور ادیبوں اور شعرا نے اپنی تخلیقات کا موضوع زیادہ تر جنسی گھٹن اعصابی امراض اور مایوسیوں کو بنایا۔

فرائد کے دو شاگردوں ایڈلر اور ژونگ نے نفسیات کے دوسرے چشموں کا سراغ لگانے میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔ ایڈلر نے آرٹ اور تہذیب کے بنیادی محرکات میں احساس کمتری کا سراغ لگایا اور ژونگ نے Archy type image کے نظریے کے مطابق یہ بتایا کہ انسانی لاشعور محض انفرادی طور پر دبی ہوئی خواہشات کا مرکز نہیں ہے بلکہ یہ اجتماعی تہذیبی وجمالیاتی قدروں ، تجربوں اور تصورات کا ایک غیر منقسم خزینہ بھی ہے۔ یوں ژونگ لاشعور کو نسلی اور اجتماعی کہہ کر اسے آفاق گیر حیثیت عطا کرتا ہے۔ یورپ میں ان تصورات سے متاثر ہونے والوں میں ڈی ایچ لارنس، ہکسلے، چیمز جوائس وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔
اسی زمانے میں حقیقت کے جامد نظریات کے مقابل ہنری برگساں کا "نظریہ جوش حیات" منظر عام پر آیا اور جدیدیت پسند ادیبوں کو عہد وکٹوریہ کے فلسفہ اثباتیت پر بد اعتمادی نے ایک مرکز پر لا کھڑا کیا۔ اسی اثنا میں جدیدیت کے اولین علمبردار فنکاروں کے فن پارے سامنے آئے۔ جن میں (ArnoldSchoenberg) کی کتاب ۱۹۰۸ میں (Second String Quartet) اور تجریدی تاثریت پسند مصور (۱۹۰۳) Wassily Kandinsky اور پکاسو کی مصوری (۱۹۰۸) (Cubism) کے نمونے شامل ہیں ۔ اس دور کی تمام جدید تخلیقات پر فرائد کے اثرات نمایاں ہیں ۔

جدیدیت کا نظریہ جو کہ ارتقا کے عمل سے گزر رہا تھا نے روایتی ہیئتوں اور سماجی اصولوں کو اپنے راستے کے لیے ایک رکاوٹ تصور کیا۔ پس ان کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ فنکار کو ایک ایسا انقلابی تصور کریں جو ماضی کے کسی بھی دریچے یا روزن سے آگاہی حاصل کرنے کے بجائے ہر ایک روایت اور قدر کو ملیا میٹ کرنے پر تلا ہو۔ "مستقبلیت" اس رجحان کی نمایاں مثال ہے۔ برگساں اور نیٹشے سے شدید متاثر فلسفہ مستقبلیت جدید تعقل پسندی کے رجحان کا ایک جزو تھا۔ اس وقت تک فلسفہ جدیدیت کو ایک بڑی سماجی تحریک کا ایک جزو ہی تصور کیا جاتا تھا اور جدید انداز کی تحریریں اور تصاویر معمولی نوعیت کے جریدوں ہی میں شائع ہوتی تھیں ۔ لیکن پہلی جنگ عظیم اور بعد ازاں ہونے والے واقعات نے تبدیلی کی ایک شدید لہر پیدا کی جس کے نتیجے میں جدیدیت کو فروغ ملا۔ اس کی وجوہات میں سے اولاً تو یہ تھاکہ ایک ایسی نسل جس نے اپنے سامنے لاکھوں لوگوں کو بلاوجہ مرتے ہوئے دیکھاتھاپر یہ بات عیاں تھی کہ اب پہلے جیسے سٹیٹس کا برقرار رہنا ممکن نہیں ۔ دوم یہ کہ جنگ کے فوری بعد یہ بحث چھڑ گئی

کہ آئندہ کوئی جنگ نہیں ہونی چاہیے جس کی ایسی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے۔ سوم یہ کہ مشینی عہدنے زندگی کی اقدار کو تبدیل کردیا تھا اور اب مشین ہی حقیقت مطلقہ کی کسوٹی قرار پائی۔ حقیقت پسندی کا دیوالیہ نکل چکا تھا اور یہ خیال کہ انسانیت بتدریج اخلاقی ارتقا کی طرف گامزن ہے تباہ کن جنگ کے مذبح خانے سے بچ نکلنے کے بعد احمقانہ محسوس ہوتا تھا۔ سو یوں ہوا کہ جدیدیت پسند جو کہ تعداد میں بہت ہی محدود تھے ۱۹۲۰ کے بعد اپنے عہد کی محبوب آواز بن گئے۔

یورپ میں جدیدیت کا اظہار دادا ازم اور سرئیلزم کی تحریکیوں کے ذریعے ہوا۔ ان ناموں تلے جدیدیت پسندوں نے جدید نتائج اخذ کرنے کے لیے نئے طریقوں کے استعمال پر زور دیا۔ اس کے بعد اگرچہ جدیدیت کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے خلاف شدید رد عمل بھی دیکھنے میں آیا۔ لیکن چوتھی صدی کے آغاز تک جدیدیت ایک مقبول عام کلچر بن چکا تھا۔ شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے رجحان کے ساتھ ہی جدیدیت نے اپنے عہد کے مسائل کا حل پیش کرنے کے لیے غور وفکر کا آغاز کیا۔ درسگاہوں تک جلدہی اس فلسفے نے رسائی حاصل کر لی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد تباہ شدہ یورپی شہروں میں ایک ہی بات کا شور تھا کہ ان شہروں کی تعمیراتی اور اقتصادی حالت کو جلد از جلد درست کیا جائے۔ پیرس جو کبھی یورپی ثقافت کا مرکز رہا تھا میں آرٹ کے لیے ماحول سخت ناساز گار تھا۔ بہت سے اہم جدید شاعر اور ادیب جنگ کی تباہ کاریوں سے بھاگ کر امریکہ جاچکے تھا۔ کچھ ہی فنکار جن میں پکاسو شامل تھا فرانس میں رکے رہے۔ جدیدیت پسندوں کی اکثریت کے امریکہ اکٹھے ہونے کی وجہ سے امریکی تجریدی تاثریت پسندی کی تحریک کو بڑی مدد ملی۔

جدیدیت کے بعض اہم پہلوؤں کی نشاندہی J. A. Cuddenنے یوں کی ہے۔

Constructivism, Dadaism, Decadence, Existentialism, Expressionism ,Free Verse, Futurism, Imagists ,New Humanism, Strem of Consciousness, Symbol&Symbolism, ultraism, Vorticism .

جدیدیت کے ان مختلف پہلوؤں میں سے جو جدید نظم میں نمایاں نظر آتے ہیں فنی وہیئتی سطح پر علامت نگاری، امیجز، نظم آزاد، شعور کی رو، انسان دوستی جبکہ فکری سطح پر نفسیاتی فکر اور وجودیت اہم ترین ہیں ۔ وجودیت جس نے چالیس کی دہائی اور اس کے بعد کی آدھی صدی تک کی نظم کو متاثر کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وجودیت ہمارے عہد کا فکری مرقع ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

خصوصاً مغرب میں اس عہد کی مخصوص بے چینی ، کشیدگی ا ور کھچاو عظیم جنگوں اور تباہ کن ہتھیاروں کے استعمال کے نتیجے میں شدید سماجی کایا پلٹ اور روحانیت کے زوال کے باعث وجودی فلسفے کو فروغ ملا ۔وجودی فلسفے کی بنیاد بننے والے اسباب میں ابتری ومایوسی، تسلیم شدہ روایات کے خلاف بغاوت مادہ پرستی، عدم تحفظ

کااحساس ، سماجی، سیاسی مذہبی، اخلاقی اور جمالیاتی قدروں وغیرہ کی پامالی شامل ہیں ۔ وجودہی فلسفے کے مفکرین کو دوگرہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ان میں سے پہلے گروہ میں کریکیکارڈ گبرئیل مارسل اور رچرڈ کرونر وغیرہ شامل ہیں ۔ جبکہ وجودیت کو بطور فلسفہ متعارف کرانے کا سہرا کرکیگارڈ (۱۹۱۳۔۱۹۵۵) ہی کے سر ہے۔ البتہ ان مفکرین کا نمایاں رجحان مذہب کی طرف تھا۔ جبکہ دوسرے گروہ کے نمایاں مفکروں میں ژین پال، سارتر اور مارٹن ہیڈیگر شامل ہیں ۔ انہیں مذہب مخالف سمجھا جاتا ہے اور انہوں نے اپنے نظام فلسفہ میں خدا کی موجودگی کو بے ضرورت قرار دیا ہے اور فقط فرد کے وجود کو اہمیت دی ہے۔ وجودیت کی بنیاد اس دعوے پر ہے کہ وجود جو ہر پر مقدم ہے۔ یہ ڈیکارٹ کے اس مفروضے "I thinktherefore I am" کے خلاف اس بات کا اعلان ہے کہ "I am therefore I think"یعنی میں ہوں اس لیے میں سوچتا ہوں ۔ کیونکہ سارتر کے نزدیک انسان پہلے وجود میں آتا ہے پھر اپنے جوہر کا انتخاب یا اپنے خواص کا اکتساب کرتا ہے۔ انسان کا انفرادی وجود ہی اہم ترین شے ہے۔ وجودیت کا اولین فریضہ انسانی زندگی کے اسرار کی عقدہ کشائی ہے۔ وجود ی معروضی دنیا کے بجائے صرف اپنے حقیقی تجربے ہی کو جانتا ہے۔ اس کے نزدیک موضوع ہی حقیقی ہے۔ وجودیت فرد کی انفرادیت پر اصرار کرتے ہوئے فطرت اور طبعی دنیا کی عمومی خصوصیات کے مقابلے میں وجود کو بنیادی حیثیت دیتی ہے۔ وہ انسان کے چند میلانات جیسے بوریت ، خوف، کراہت، بیگانگی اور تشویش وغیرہ پر خصوصی توجہ دیتی ہے۔

قاضی جاوید وجوود کو جوہر پر مقدم قرار دینے کا مطلب واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

ہمارا مطلب یہ ہے کہ انسان وجود پہلے رکھتا ہے۔ اپنے آپ کا سامنا کرتا ہے۔ دنیا میں ابھرتا ہے۔ اس کے بعد ہی اپنے تصور کی تشکیل کرتا ہے۔ وجودیوں کے نزدیک انسان کی تعریف اس لیے محال ہے کہ ابتدا میں وہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بعد ازاں وہ وہی کچھ ہوتا ہے جو خود کو بناتا ہے۔ انسانی فطرت نام کی کسی شے کا وجود نہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ خود خدا ہی موجود نہیں جو پہلے سے اس کا تصور کرسکے۔انسان تو بس ہے۔ وہ محض وہی کچھ نہیں جو خود کو سمجھتا ہے بلکہ وہ کچھ بھی ہے جو ارادہ کرتا ہے۔ وجود میں آنے کے بعد ہی وہ اپنے متعلق تصور قائم کرتا ہے اور وجود میں پھلانگنے کے بعد ہی ارادہ کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ انسان صرف وہی کچھ ہے جو کچھ کہ وہ اپنے آپ کو بناتا ہے۔

دیکھا جائے تو آج کے فرد کی زندگی تصنع، کھوکھلے پن ، بناوٹ اور خود فریبی کے ایک مسلسل عمل کے سوا اور کیا ہے۔ وہ ایک سطحی زندگی بسر کرتا ہے اور زندگی کی حقیقی گہرائیوں ، مسئلوں اور آدرشوں سے بیگانہ ہوتاہے۔ اپنی ذات سے آج کے انسانی کی بیگانگی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اس نے خود کو سماج کے وظائفی جزو کے طور

پر قبول کر رکھا ہے۔ وہ سماج میں اپنی ذات کو گم کر دینے کے بعد سمجھتا ہے کہ زندگی با معنی ہے اور وہ سماج کی مشین کا اہم جزو ہے۔ یہ طرزِ حیات انسانی ذات، انفرادیت اور زندگی کی حقیقتوں سے تہی اور محض سطحی ہے۔ وجودی دانشور انسان کو روائیتوں اور رواجوں کی زنجیروں سے نجات دلانا چاہتا ہے۔ اور یہی اس کی انسانی دوستی ہے۔

وجودیت کا عدمیت (Nihilism) کی طرف میلان اس کا ایک ثبوت ہے۔ کوئی وجودی جب اذیت، کرب، دہشت اور انسانی وجود کی ناگہانیت پر اصرار کرتا ہے تو اصل میں ہماری توجہ انسانی صورتحال کی صداقت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہے۔ وجود مصدقہ پر اس کا اصرار فرد کا اپنی تقدیر کا مالک ہونے کی تگ و دو ہے۔ یہی وہ آدرش ہے جس کے لیے وجودی مفکر پہیم کوشش کرتا ہے۔ کر کیگارڈ کا مذہبی فرد اور نیٹشے کا "فوق البشر" اپنے سامنے یہی نصب العین رکھتے ہیں ۔ مارسل کے ہاں بھی یہی رجحان غالب ہے۔

سارترے نے اپنے اس اصول کی وضاحت "وجودیت اور انسان دوستی " کے عنوان سے دیئے گئے اپنے خطبے میں یوں کی ہے۔

انسان کی بنائی ہوئی کسی شے کی مثال لیجیے مثلاً کتاب یا کاغذ تراش ۔اسے ایک کاریگرنے بنایا ہے جس کے ذہن میں اس کا پہلے سے ایک خاکہ موجود تھا۔ اس نے کاغذ تراش کے تصور اور پہلے سے موجود اس کے بنانے کی تیکنیک جو اس تصور ہی کا ایک حصہ ہے اور اصل میں ایک فارمولا ہے دونوں پر یکساں توجہ دی ہے۔ پس کاغذ تراش ایک طرف تو ایک شے ہے جسے ایک مخصوص انداز میں بنایا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ ایک ایسی چیز ہے جو ایک خاص مقصد پورا کرتی ہے۔ چونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی یہ سوچے بغیر کہ چاقو کس کام آتا ہے اسے بنا ڈالے تو آئیے اسے ہم یوں کہہ لیں کہ چاقو کا جوہر یعنی فارمولے اور خصوصیات کا وہ مجموعہ جو اس کی تخلیق اور تعریف کا باعث بنا اس کے وجود پر مقدم ہے۔ یوں کسی خاص قسم کے چاقو یا کتاب کے وجود کا تعین میری آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ یہاں ہم دنیا کو ایک تکنیکی نقطہ نظر سے دیکھ رہے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ اس کی تخلیق اس کے وجود پر مقدم ہے۔

یعنی چاقو کا وجود اس کے بنانے والے کے ذہن میں پہلے سے موجود ہوتا ہے اور بعد میں خام مواد کی مدد سے وہ اسے مادی تشکیل دیتا ہے۔ لیکن آدمی کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ وہ مادی شکل میں پہلے سے موجود ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کا جوہر تشکیل پاتا ہے۔ گویا وہ خود اپنے آپ کو بناتا ہے یعنی انسان ابتدا میں کچھ نہیں انسانی فطرت کوئی چیز نہیں بلکہ آدمی اپنے آپ کو اور اپنی زندگی کو خود بناتا ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ سارتر دہری وجودیت کا علمبردار ہے۔ دہری وجودیت میں دراصل انسان کی بے کراں آزادی کے جواز کی خواہش موجود ہے۔ کیونکہ لادینی صورتحال کو قبول کرنے کے ساتھ ہی کسی ماورائی طاقت سے اقدار اخذ کرنے کے امکانات بھی ختم ہو جاتے ہیں

اور انسان ہی تمام افعال کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسان جدوجہد کی تکلیف سے نجات پانے کے لیے بے شمار بہانے تراش لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ مختلف النوع عمرانی، معاشی اور اقتصادی مسائل نوشتہ تقدیر ہیں ۔ چونکہ وجودیت جبرو قدر کے مسئلے میں قدریت کی حامی ہے ۔اس لیے وہ یہ سمجھتی ہے کہ انسان کی آزادی کی بنا پر ہی اس پر اس کے اعمال کے نتائج وعواقب کی ذمہ داری ڈالی جاسکتی ہے ۔ بلکہ انسان اپنے اعمال وافعال کے علاوہ بنی نوع انسان کے ہر فعل کا بھی ذمہ دار ہے۔

حلقہ ارباب ذوق

بیسویں صدی کی ابتدا اردو شعرو ادب کو فرسودہ اور کہنہ روایات سے نجات دلا کر جدید قدروں کے فروغ میں اہم سنگ میل ثابت ہوئی۔ یہ اسی جدیدیت کے اثرات تھے کہ بیسویں صدی کے چوتھے عشرے کے اختتام پر حلقہ ارباب ذوق ایک تحریک کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ جس نے سماجی جمود کے بجائے ادبی انجماد کو توڑنے کی سعی کی اور نہ صرف زندگی کے خارج کو مناسب اہمیت دی بلکہ انسان کے داخل کی پر اسرار آواز کو بھی بگوش ہوش سنا۔ اس نے اجتماع میں گم ہو جانے کے بجائے ابن آدم کو اپنی شخصیت کے عرفان کی طرف متوجہ کیا۔ مادیت سے گریز اختیار کرکے روحانیت اور داخلیت کو فروغ دیا۔ مغربی فنون وادبیات میں نمایاں ہونے والی بیشتر تحریکیوں کے اثرات قبول کرکے اردو ادب میں تنوع، توانائی اور رعنائی پیدا کی ۔ تحریک تاثریت، علامت نگاری ، وجودیت سرئیلزم وغیرہ کو جن سے ترقی پسند تحریک گریزاں تھی حلقہ ارباب ذوق کے ادبانے ہی اردو ادب سے روشناس کرایا اور متعدد ایسی تخلیقات پیش کیں جن سے ان تحریکیوں کے اثمار اردو ادب کا بھی جزو بن گئے۔

حلقہ ارباب ذوق نے زندگی اور سماج کے مسائل کو براہِ راست ادب کا موضوع نہیں بنایا۔ تاہم اس تحریک نے ادب کا بنیادی سرچشمہ زندگی کو ہی قرار دیا۔ اور بہترین نظموں میں ان تخلیقات کو شامل کرکے جن سے اس عہد کی سیاسی وسماجی زندگی کا سراغ ملتا ہے یہ ظاہر کیا ہے کہ ادب میں ہر موضوع آسانی سے سما سکتا ہے۔ آیئے اب حلقے کے نظم گو شعرا کے ہاں انسان دوستی کے تصورات کا جائزہ لیں ۔

تصدق حسین خالداور انسان دوستی

ترقی پسند تحریک کے زور وشور کے زمانے میں ۱۹۳۹ میں حلقہ اربابِ ذوق کی ابتدا ہوئی۔ حلقہ نے ترقی پسند تحریک کے متوازی ایک ایسی بساط کی صورت اختیار کر لی جو ادب میں وسعت فکر ونظر اور ادب برائے حیات کے مخصوص نعرے کے بجائے ادب برائے ادب کا علمبردار ثابت ہوا۔ یہ دہائی خاص طور پراردو نظم کے سفر کے لیے اہم ثابت ہوئی اور اردو نظم کہنے والوں کا ایک ایسا گروہ سامنے آیا جس

نے اردو نظم کو نئے ذائقوں سے آشنا کیا۔ انہی میں ایک نام تصدق حسین خالد کا بھی ہے۔

تصدق حسین خالد نے اس وقت آزاد نظم کی داغ بیل ڈالی جب اردو ادب اس سے ناآشنا تھا۔ تصدق حسین خالد اس لحاظ سے جدید شاعری کے پیش رو بن جاتے ہیں اور انہیں میرا جی، ن۔ م۔ راشد اور فیض احمد فیض پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔ تصدق حسین خالد نے جدید یورپی شاعری کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ اپنی قدیم شاعری اور اس کے مسلمات سے بے زار تھے۔ طبیعت میں جدت پسندی کا جوہر تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے معاصر شعرا کے برعکس آزاد نظم کی صورت میں جادہ تراشی کی اور بلا مبالغہ ایسا راستہ بنانے میں کامیاب ہوئے جس پر گامزن ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔

خالدؔ نے اپنی شاعری کی بنیاد ہنگامی تقاضوں پر نہیں رکھی۔ وہ عام روش کے خلاف تھے۔ انہوں نے نہ تو انقلاب کے نعرے بلند کیے اور نہ ہی ترقی پسندی کا راستہ اختیار کیا۔ وہ حقیقی معنوں میں شاعر فردا تھے۔ اگرچہ وہ ترقی پسند نہیں تھے اور نہ ہی اشترا کی۔ لیکن اس کے باوجود ان کے فن پاروں میں ترقی پسندی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

تصدق حسین خالد طبقہ امرا کے ظلم وستم کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "یہ دیوار اونچی بنانی پڑے گی" قابل توجہ ہے۔ جس کا مرکزی کردار پتھیرو ہے۔ جسے ایک جیل خانہ تعمیر کرنے کا کام تفویض کیا گیا ہے۔ وہ جیل خانہ جو تنہائی، اذیت اور کرب کی علامت ہے۔ جس میں اس کے ہم طبقہ لوگوں ہی کو قید وبند کی صعوبتوں کو برداشت کرنا ہے۔ اس طرح پتھیرو کا کردار نچلے طبقے کی ایک عجیب مجبوری کی علامت بن جاتا ہے۔

دراصل شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ طبقہ امرا کا ظلم وستم اس قدر ہے کہ نچلے طبقے کے لوگ اپنے تحفظ کے لیے ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے سے بھی گریزاں نہیں ہوتے۔ پتھیرو سے اعلیٰ طبقہ کا ایک آدمی جب سوال کرتا ہے کہ

مگر کون ہیں جو یہاں قید ہوں گے

تو وہ جواب دیتا ہے

نہیں تم نہ ہو گے ، نہ بھائی تمہارے

امیروں کی دنیا میں مجرم نہیں ہیں

یہی ہم ، ہمارے ہی نادار ساتھی

ہمـــــــــارے ہـــــــــــی بیـــــــــــٹے
گـــــزاریں گـــــے رو رو کـــــے آنکھـــوں
مـــــــــــیں راتـــــــــــیں
(سرودِ نو، ص:۲۳۶،۲۳۷)

تصدق حسین خالد دوری کے دکھ اور کرب کو بھی شدت سے محسوس کرتے ہیں ۔ نظم "پیا پردیس اور سپاسی "اور "سپاہی کی دلہن"۔ اس کی بھر پور عکاس ہیں ۔ جس میں انہوں نے ایک دلہن کے جذبات واحساسات کوعمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جس کا شوہر دور کسی محاذ پر بارود کی گھن گرج میں اپنے نعمہئ شادی کو بھلا چکا ہے۔ دلہن اس دوری کے کرب میں مبتلا اپنے شوہر سے یوں مخاطب ہوتی ہے۔

آج راوی کا چڑھاو ہے وہی
ہے وہی اس کی تڑپتی ہوئی لہروں کا خروش
چاند کی سمت بڑھتی جاتی ہیں
نرم ریتوں میں دھنسی جاتی ہیں
اور تو ؟ میری امنگوں کا سنگار
کون سے دیس کی ریتوں میں چھپا
تیرا سیلاب محبت
تری موجوں کا ابھار

(سرودِ نو ،
ص:۲۱۰)

خالدؔکی بعض نظموں میں کچھ خلش، ناآسودگی اور احساس ناتمامی وتنہائی کا احساس بھی نمایاں ہے۔ اور اس میں اس فراق نے اور اضافہ کردیا ہے جو وطن سے دوری کے زیر اثر ناگزیر ہے۔اس سلسلے میں ان کی نظمیں "یادِ وطن اور نئی دنیا" اہمیت کی حامل ہیں ۔ "نئی دنیا" کے اشعار دیکھیے جس میں شاعر غریب الوطنی کے احساس میں ڈوب کر کہتا ہے۔

تمنا ہے کہیں باہر نکل جاؤں
اکیلا تجھ کو لے کر
اک نئی دنیا میں غیروں میں

(سرودِ نو، ص:
۱۸۰)

خالدؔ اگرچہ رومانوی شاعر تھے لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری میں اپنے زمانے کے سماجی وسیاسی نظریات وحالات کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے زمانے میں سب سے بڑا مسئلہ آزادیِ ملک کا تھا۔ جس کے ساتھ عالم اسلامی کی غلامی ومحکومی کی چبھن بھی شامل تھی۔ اس دوہری خلش کو انسان دوست شاعر خالدؔ محسوس کیے بغیر نہیں رہا۔ نظم "بھول جاؤ غم و اندوہ کے دن " کے اشعار دیکھیے۔ جس میں شاعر

ایک نئے دور کی صبح کا مژدہ جانفزا سناتا ہے اور ان طوفانی اور موت کے دنوں کو بھول جانے کی تلقین کرتا ہے کہ اب وہ بیت چکے ہیں :

آج پامال ہے باطل کا طلسم
آج آزاد فضاؤں میں ہے سرگرمِ خروش
روحِ بیباک کی آتش نفسی
اک نئے دور کی صبح
چیر کر سینہ مشرق کو اُبھر آئی ہے
آؤ اس صبح کی رنگینی کو
سرخیِ خونِ شہیداں دے کر
ابدی سوز کا جوہر بخشیں

(سرودِ نو، ص:۲۳۰،۲۳۱)

خالدؔ برطانوی استعمار کی مکارانہ چالوں سے خوب واقف تھے۔ ان کے نزدیک برطانوی استعمار کے خدمت گزار کرائے کے سپاہی مکروہ ترین مخلوق تھے۔ انہوں نے اپنی نظموں "بن غازی کا ایک مجروح" اور "ایک اشتہار" میں ان کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ نظم "ایک اشتہار" کے اشعار دیکھیے:

دنیا کی آزادی خطرے میں ہے
ننگے بھوکے کیوں مرتے ہو
آؤ
اچھے کھانے
اچھے کپڑے
اچھے پیسے
دیس دیس کی سیریں
ننگے بھوکے کیوں مرتے ہو؟
دنیاکی آزادی خطرے میں ہے
آؤ

(سرودِ نو ، ص: ۲۲۱)

تصدق حسین خالدؔ نے ہندوستان میں جنگ کی ہولناکیوں کو بہت دکھ اور کرب کے ساتھ اپنی نظموں میں بیان کیا ہے۔ ہندوستان کے وہ عوام جو ایک طرف سامراج کی غلامی کا دکھ برداشت کررہے تھے اور دوسری طرف دوعظیم جنگوں کے ظلم واستبداء کا نشانہ بھی بنے۔ ان کے ہاں نظم "ایک کتبہ " میں شیر دل دراصل ان بہادر ، توانا اور غیور ہندوستانیوں کے کردار کا عکاس ہے۔ جن کی تمام توانیاں محض غلامی کا دکھ برداشت کرنے میں صرف ہوئیں ۔

شیر دل خاں
میں نے دیکھے تیس (۳۰) سال
پے بہ پے فاقے
مسلسل ذلتیں

جنگ
روٹی
سامراجی بیڑیوں کو وسعتیں دینے کا فرض
ایک لمبی جانکنی
سورہا ہوں اس گڑھے کی گود میں
آفتاب مصر کے سائے تلے
میں کنوارا ہی رہا
کاش میرا باپ بھی

(سرودِ نو ، ص:۲۰۲)

احمد ندیم قاسمی خالدؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

خالد اردو شاعری کے مجتہدین میں شامل تھا۔ اس نے یکایک اردو شاعری کے آفاق کو اتنا پھیلادیا کہ اس کے موضوعات میں پوری کائنات سمیٹ لینے کا رجحان پیدا ہونے لگا۔ کسی بھی زبان کی شاعری کو اتنے بڑے مثبت انقلاب سے مستفید کرنا کوئی معمولی یا اتفاقی کارنامہ نہیں ہے۔

ن۔ م۔ راشد اور انسان دوستی(۱۹۱۰۔۱۹۷۵)

راشدؔ نے جب شعور کی آنکھ کھولی اس وقت ارضِ مشرق بیداری کے عمل سے دو چار تھی۔ اس بیداری کااہم ترین مظاہرہ وہ تھاجب ۱۹۰۵ میں جاپان کے بحری بیڑے نے روس کے بحری بیڑے کو شکست دے کر اہل مشرق کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ اگر ایک چھوٹا سا مشرقی ملک ایک طاقتور مغربی ملک کو ایک محاذ پر شکست دے سکتا ہے تو وہ خود آزادی کے علمبردار کیوں نہیں بن سکتے۔

پھر یہی زمانہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کی جدوجہد کا بھی زمانہ تھا۔ گانگریس اور مسلم لیگ کی تحریک آزادی ، سول نافرمانی کا ایک طویل دور، دو عظیم جنگیں اور اس کے نتیجے میں اقتصادی بحران سے پیدا شدہ سیاسی خلفشار اور بے چینی ، ہنگامہ وجنگ جذباتی وذہنی ابال یہ سب اسی عہد کے نمایاں اور اہم ترین واقعات ہیں ۔ چنانچہ ایک مصاحبہ میں راشدؔ خود کہتے ہیں ۔

جس زمانے میں میں نے پرورش پائی ہندوستان اجنبی حکومت کے پنجوں سے نکلنے کے لیے جدوجہد کررہا تھا۔ شروع ہی سے میرے نزدیک اس آزادی کی جدوجہد کی غایت فرد کی آزادی تھی۔ کیونکہ غلامی نے فرد کی اخلاقی اور نفسیاتی زندگی میں ایک خلاپیدا کر رکھا تھا۔ اور خلا زشتی اور شر سے بھر نے لگا تھا۔ غلامی فرد کی قیمت اور قامت دونوں کو کم کردیتی ہے۔ اس قسم کی زندگی میں عشق وفکر دونوں کو تاہ اورکم مایہ ہو کررہ جاتے ہیں ۔ فرد کو اپنے نشوونما کے لیے جس داخلی اور خارجی ہم آہنگی

کی ضرورت ہے، اسے غلامی درہم برہم کرکے رکھ دیتی ہے۔ چنانچہ میری نظموں کے تمام کردار ان میں عورتوں کے کردار بھی شامل ہیں ۔ اس اخلاقی اور نفسیاتی فساد کا شکار ہیں ۔ ان کی زندگی میں وہ ہم آہنگی مفقود ہے جو ان کی ذات کی تقویت اور تکمیل کی طرف رہنما ہو۔ اس طرح یہ نظمیں اس زمانے کے ہندوستان کا مربوط استعارہ ہیں ۔

جدید شاعری کے عظیم معمار ن۔ م۔ راشد اپنے فکری سفر میں جس سوال پر غور وفکر کرتے ہیں وہ حقیقتِ انسان سے متعلق ہے۔ ان کی شاعری میں انسان ایک مرکزی اور بنیادی حوالہ ہے۔ اور یہی سوچ انہیں انسان دوست شاعر بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ "ماورا" سے "گمان کا ممکن " تک راشد کے ذہنی ارتقا کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں انسان کی مختلف صورتیں دکھائی دیتی ہیں ۔ راشد کی شاعری میں تصور انسان کے حوالے سے سجاد باقر رضوی نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے :

راشدؔ کی شاعری کا بنیادی موضوع انسان ہے اور انسان کے حوالہ ہی سے وہ فطرت ، معاشرت، سیاست ، مذہب، کائنات سب کو دیکھتے ہیں ---- انسانی زندگی ان کے لیے سب سے بڑی حقیقت ہے۔

"ماورا " میں شا مل نظم "ا نسان ــ" اس خیا ل کی بھر پو ر تا ئید کر تی ہے۔ را شدؔ خدا سے انسان کی بے بسی کا گلہ کرتے ہیں ۔ان کے نزدیک یہ دنیا جس میں انسان رہتے ہیں بے سکو ں اور لا چا ر وں کی دنیا ہے۔یہ دنیا غریبوں ، جا ہلوں ،مردوں اور بیماروں کی دنیا نظر آتی ہے۔ایسی دنیا ایک نا توا نی کی داستا ں ہے۔جس کے کردار صر ف ہم نہیں بلکہ ہما را وہ خدا بھی ہے جس کے پاس مسا ئل انسا نی کا کو ئی حل نہیں ہے۔گو یا راشدؔ تقد یرا ور تد بیر ہر دو تصو رات کی نفی کر تے ہیں ۔

اسی غور و تجسس میں کئی راتیں گزاری ہیں
میں اکثر چیخ اٹھتا ہوں بنی آدم کی ذلت پر
جنوں سا ہو گیا ہے مجھ کو احساس بضاعت پر
ہماری ہی نہیں افسوس ، جو چیزیں "ہماری" ہیں
کسی سے دور یہ اندوہِ پنہاں ہو نہیں سکتا
خدا سے بھی علاجِ دردِ انسان ہو نہیں سکتا

(ما ورا ،ص :۲۵)

را شدؔ کے ہا ں اس قدر مجبو ر انسان کا تصور دراصل اس غلا می کی فضا سے ما خو ذ ہے جس میں اہل مشرق خصوصاً برصغیر کے باشند ے ایک بے بس اور لا چا ر زندگی گزارنے پر مجبو ر تھے۔معا شرے کا عام فرد خصو صاًنچلے طبقے کے لو گ عدم اطمینانی اور اضطرا ب کا شکا ر تھے ۔زندگی کی امنگ اور جینے کا ولولہ ان کے ہا

ں منجمد تھایہ مجبور انسان زند گی سے فرا ر کے لیے کوئی نہ کوئی بہا نہ ترا شتے رہتے ۔گو یا یہ اپنے اجما ع سے مطمئن نہیں تھے۔ زند گی سے فرا راور ماحول سے عدم اطمینا نی ان کی نظم " رقص" کا مر کز ی کردا ر یو ں کر تاہے۔

اے مری ہم رقص ! مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو
رقص گہ چور دروازے سے آکر زندگی
ڈ ھونڈے مجھ کو ، نشاں پا لے مرا
اور جرم عیش کرتے دیکھ لے

(ماورا،ص:۱۰۰)

اس رقص سے وہ محسو س کر رہا ہے گویا ایک مبہم سی چکی چل رہی ہے اور وہ اپنے غمو ں کو پاؤں تلے روند تا چلا جارہا ہے۔را شد کے ہا ں عام آدمی وجو دی کرب سے دو چا ردکھائی دیتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "خود کشی " قا بل تو جہ ہے۔جس کا مر کز ی کردا ر زندگی کی پیچیدگیو ں سے بیزا ر آچکا ہے۔وہ اپنے آپ کو یاجوج ما جوج مخلوق کا ایک فرد سمجھتا ہے۔ جو ساری رات دیوار چاٹتے ہیں مگر صبح وہ دیوا ردوبارہ بلندہو جاتی ہے۔گویا زندگی کا موجو دہ عمل ایک انجام بد حاصل کے سوا کچھ نہیں اور زندہ رہنا یا مر جانا ایک ہی معنی رکھتا ہے۔یہ کردار اس لحا ظ سے بیسویں صدی کے ایک عام آدمی کی علامت بن جاتا ہے جس کے دل ودماغ میں سو چ گر دش کر تی رہتی ہے کہ زندگی کا انجام صفر ہے۔وہ اس تلخ حقیقت کا اظہا ر ان اشعا ر میں یوں کرتے ہیں ۔

آج میں نے پا لیا ہے زندگی کو بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں
ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ کے پاس
اس کے تخت خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہُو
تازہ و درخشاں لہُو
بُوے مَے میں بوئے خوں الجھی ہوئی
وہ ابھی تک خواب گہ میں لوٹ کر آئی نہیں
اور میں کر بھی چکا ہوں اپنا عزم آخری
جی میں آئی ہے لگا دوں ایک بیباگانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے بام کو !

(ماورا ،ص:۱۱۲)

را شدؔکے ہا ں ' 'ما ورا " کے اکثر کردار زندگی سے نا لا ں و ما یو س ہیں اور ان کا سبب وہ غلا می اور غر بت ہے جسکا شکار معا شرے کا ہر نچلا طبقہ دکھا ئی دیتا ہے۔انہیں سما ج میں انسانی نا برابری

کا شدید احسا س ہے۔یہی وجہ ہے کہ انسان دوست راشدؔ اس ناہموا ر صورتحا ل کے اسباب اور علا ج کی تلاش میں نکلتے ہیں ۔نظم "وادی پنہاں " کے اشعا ر دیکھئے ۔

کاش بتلا دے کوئی
مجھ کو بھی اس وادی پنہاں کی راہ
مجھ کو اب تک جستجو ہے
زندگی کے تازہ جولانگاہ کی
کیسی بیزاری سی ہے
زندگی کے کہنہ آہنگ مسلسل سے مجھے
سر زمینِ زیست کی افسردہ محفل سے مجھے

(ماورا، ص:۶۰)

انسان دوست راشدؔ نے معا شرتی بد حا لی کا کرب انگیزتما شا صرف ہندوستان میں نہیں دیکھا بلکہ ایران میں قیام کے دورا ن بھی انہیں ہندوستا ن جیسی صورتحال سے واسطہ پڑا۔ایران میں ان کی فکر ملکی حدود سے نکل کر"مشرق اور مغرب"کی سیا سی اور تہذ یبی کش مکش کے روپ میں ڈھل جا تی ہے۔نظم "من وسلوی" کے اشعا ر دیکھیئے ۔

بس ایک زنجیر
ایک ہی آہنی کمندِ عظیم
پھیلی ہوئی ہے
مشرق کے اک کنارے سے دوسرے تک
مرے وطن سے ترے وطن تک
بس ایک ہی عنکبو ت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں
مغول کی صبح خوں فشاں سے
فرنگ کی شامِ جاں ستاں تک
تڑپ رہے ہیں

(ایرا ن میں اجنبی، ص:۱۹۱،۱۹۲)

را شدؔ کے ہا ں مغر ب کی غلا می سے نجا ت کا وا حد حل یہی ہے کہ پورے اشیا کے لو گ آپس میں اتحا داور اتفاق سے کا م لیں ۔اور متحدہ جدو جہد پر کامل یقین رکھیں ۔نظم " نا رسا ئی" میں وہ اسی اتحا د و اتفا ق کا درس دیتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

---اور اب عہدِ حاضر کے ضحّاک سے
رستگاری کا رستہ یہی ہے
کہ ہم ایک ہو جائیں ، ہم ایشیائی !
وہ زنجیر جس کے سرے سے بندھے تھے کبھی
ہم
وہ اب سست پڑنے لگی ہے
تو آو کہ ہے وقت کا یہ تقاضا

کہ ہم ایک ہوجائیں --- ہم ایشیائی

(ایران میں اجنبی،ص:۲۰۱)

را شد کے ہا ں جو ہمدردی اور انسان دوستی کا جذبہ دکھا ئی دیتا ہے۔وہ انہیں ہندو ستا ن کا نہیں بلکہ پورے ایشیا کا شاعر بناتا نظر آتا ہے۔ پطرس بخا ری نے صحیح لکھا ہے۔"ہما رے ہا ں وطنی شا عر بھی ہوئے ہیں اور قومی شا عر بھی ۔ اخلا قیہ بھی اور اشترا کی بھی ۔ لیکن جہا ں تک میر ی نگا ہ پہنچتی ہے۔ ایشیا ئی شا عر آپ (راشدؔ) کے سواکو ئی نظر نہیں آتا " راشدؔ نے بر طا نوی سا مرا جی آقاوں اور سرما یہ دارانہ نظام و فا شزم کے خلا ف بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں ۔ اس سلسلے میں "شا عر درما ندہ"'من وسلوی"،"دست ستمگر"،"پہلی کرن"،"زنجیر "اور "تیل کے سودا گر" قابل تو جہ ہیں ۔

زندگی تیرے لیے بستر سنجاب و سمور
اور مرے لیے افرنگ کی دریوزہ گری
عافیت کوشی آبا کے طفیل
میں ہوں درماندہ و بیچارہ ادیب
خستہ فکر معاش
پارہ نان جویں کے لیے محتاج ہیں ہم
میں مرے دوست مرے سینکڑوں اربابِ وطن

(کلیا ت راشدماورا،ص:۹۳)

ڈا کٹر نیرّصمدا نی لکھتے ہیں ۔" حقیقت یہ ہے را شد کی شا عری میں اس کا کر یہہ المنظر عہد اپنی پو ری جزئیا ت سے ابھر تا ہے خصو صاً وہ سفید فام آقا وں کی غلا می کے پُرآ شو ب عہد کا نو حہ گر معلو م ہوتا ہے۔"

راشدؔ جیسا انسان دوست اگرچہ غیر ملکی سامراجیت اور وقتی آقاؤں کی چیرہ دستیوں کے خلاف آواز بلند کرنا چاہتا ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ وہ اپنے لشکر کی بے ہمتی سے دل گرفتہ ہے۔

اجل ان سے مل
کہ یہ سادہ دل
نہ اہلِ صلوۃ اور نہ اہلِ شراب
نہ اہلِ ادب اور نہ اہلِ حساب
نہ اہلِ کتاب
نہ اہلِ کتاب اور نہ اہلِ مشین
نہ اہلِ خلا اور نہ اہلِ زمیں
فقط بے یقین

(لا= انسان، ص: ۲۹۵)

راشدؔ نے معاشرتی برائیوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راشدؔ نے مشرقی سیاست پر طنز اپنی نظم "شاخ آہو" میں وزیر معارف علی کیانی کے کردار کے ذریعے عمدہ پیرائے میں کیا ہے۔ یہ کردار

ایک طرف حکومتی بدعنوانیوں کا پردہ چاک کرتا ہے تو دوسری طرف بدعنوانیوں پر پردہ ڈالنے والے اہلِ قلم کی صورتِ اصلی کو بھی سامنے لاتا ہے۔ معارف علی کیانی اپنے مزین دیوان خانے میں بیٹھا روزنا مے دیکھ رہا ہے۔ جن میں اس کی بدعنوانیوں کی خبریں ہیں ۔ چنانچہ علی کیانی نے

اٹھایا قلم اور لکھا
جنابِ مدیر شہیر
آپ کی خدمتِ فائقہ کے عوض
دس ہزار اور چھے سو ریال
آپ کی صد ہزار احترامات کے ساتھ
تقدیم کرتا ہے بندہ

(ایران میں اجنبی، ص:۲٤۵)

یہ زندگی جو آس پاس اور گردوپیش دور دور تک بکھری ہوئی ہے اور انسان اور انسانیت اس زندگی میں جس طرح بے خانماں ہے۔ راشدؔ کے تخیل کی آنکھ اس کو کچھ اس روپ میں دیکھتی ہے۔

زندگی اک پیرہ زن
جمع کرتی ہے گلی کوچوں میں روز وشب پرانی دھجیاں
تیز ، غم انگیز ، دیوانہ ہنسی سے خندہ زن
بال بکھرے ، دانت میلے ، پیرہن
دھجیوں کا ایک سونا اور ناپیدا کراں تاریک بن

(لا= انسان، ص: ۲۹۹)

راشدؔ کے مجموعے لا= انسان کی نظمیں بھی "انسان" کی قیمت معلوم کرنے کی کوشش کا درجہ رکھتی ہیں ۔ دراصل راشدؔ گروپیش میں بسنے والے انسانوں سے ناآسودہ ہونے کے باعث آدمِ نو کے منتظر دکھائی دیتے ہیں ۔ اس مجموعے میں ان کی سوچ کا دائرہ آفاق "گیر ہوگیا ہے۔ اب راشدؔ صرف ہندوستان ایشیا یا مشرق ہی کی بات نہیں کرتے بلکہ عالمی انسان کے حدی خوان بن کر سامنے آتے ہیں ۔ اب ان کا مقصود نگاہ ایک ایسا آفاقی انسان ہے جو رنگ ونسل طبقات اور جغرافیائی حدود میں مقید نہ ہو۔ چنانچہ اس مجموعے میں راشدؔ انسان اور انسان کے درمیان حائل استعمار ، تمیز رنگ ونسل افتراق وانتشار کی جنگ، مذہب اور جغرفیائی سرحدوں جیسی دیواروں کو توڑنے والے اور انسان دوستی کے پیامبرین کر سامنے آتے ہیں ۔

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کے الفاظ میں

اب راشد کی شاعری کا مرکز ومحور وہ آفاقی انسان ہے جو قدروں کی شکست وریخت میں اپنے وجود کے معنی ومفہوم کھوبیٹھا ہے۔ گویا راشدؔ اب مشرق کی حدود سے نکل کر ایک

وسیع ترافق کی طرف گامزن ہیں اور ان کی نظموں میں
دانشوری کے جو نئے تیور نظر آرہے ہیں وہ انہیں وجودی
فکر سے قریب کردیتے ہیں ۔

انسان دوست راشدؔ کے ہاں انسان کے روشن مستقبل کے خوابوں کی بشارت موجود ہے۔ ان کا رویہ اس سلسلے میں رجائیت سے بھر پور ہے۔ یہ ان کا عام انسانی رویہ ہے اور اسی کے زیر اثر وہ نئے خوابوں کی بشارت دیتے ہیں ۔ جو انسان کے شاندار مستقبل کی ضمانت دیتی ہے۔ جدید شاعروں میں روشن مستقبل کی یہ تعبیر راشدؔ کے علاوہ اور کسی شاعر میں نہیں ہے۔ اب شاعر انسانی معاشرہ کے لیے عالمگیر امن کا طالب ہے اور انسانی حقوق کے لیے آواز بلند کرتا ہے۔ اس کے خواب ٹھوس سماجی حقیقتوں کی بنیادوں پر کھڑے ہیں اور خواب یہ ہیں ۔

اے عشقِ ازل گیر وابد تاب میرے بھی ہیں کچھ
خواب
وہ خواب ہیں آزادی کامل کے نئے خواب
ہر سعئ جگر دوز کے حاصل کے نئے خواب
آدم کی ولادت کے نئے جشن پہ لہراتے جلاجل
کے نئے خواب
اس خاک کی سطوت کی منازل کے نئے خواب
یا سینۂ گیتی میں نئے دل کے نئے خواب
اے عشق ازل گیر و ابد تاب
میرے بھی ہیں کچھ خواب
میرے بھی ہیں کچھ خواب

(لا=انسان، ص: ۲۹۱)

اپنی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے راشد خود کہتے ہیں :

بے شک میں نے کئی خارجی مسائل کی طرف توجہ دی ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر ایسے مسائل ہیں جن کا انسان کی تقدیر کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ جنگ ، استعمار، رنگ ونسل کی تمیز، آزادیِ فکرو اظہار وغیرہ اخباری حادثات نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق انسان کے اخلاق یا عدم اخلاق کے ساتھ ہے۔

غرض راشدؔ نے انسان کے ان بڑے مسائل پر اپنی شاعرانہ توجہ صرف کرکے غیر معمولی حقیقت پسندی دردمندی، اخلاقی جرأت اور سب سے بڑھ کر انسان دوستی کا ثبوت دیا ہے۔

میراؔجی اور انسان دوستی (۱۹۴۹-۱۹۱۲)

ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ اردو شاعری ، جدید شاعری کے حوالے سے ایک رجحان سے ہمکنار ہوئی جس میں روایت سے بغاوت کا پہلو نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اس رجحان کے علمبرداروں میں تصدق

حسین خالد۔ میراجی اور ن۔م۔ راشد قابلِ ذکر ہیں ۔ ان شاعروں نے مغرب کے سیاسی معاشی اور فلسفیانہ افکار کی روشنی میں برصغیر کے بدلتے ہوئے تہذیبی ماحول کا گہرا مطالعہ کیا اور نئے سماجی شعور کی عکاسی کے لیے نظم معری اور آزاد نظم کو اپنایا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی میرآجی کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

"میرّاجی کی پیدائش ۹۱۳ اور وفات ۱۹۴۹ کے درمیاں دنیا دو عالمگیر جنگوں کا شکار ہوئی۔ جس کے نتیجے میں سارا معاشرتی فکری ومعاشی نظام درہم برہم ہو گیا اور سارا روایتی اخلاقی نظام، سماجی اقدار اور انسانی رشتے ٹوٹ پھوٹ کر بے ربط و بے معنی ہوگئے۔ مغلوب قومیں آزادی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں ۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔ قدیم وجدید کی حدیں نمایاں ہونے لگیں ۔ روایتی وقدیم اقدار سے بغاوت ایک عام رجحان بن گیا۔ مارکس، فرائڈ اور آئن سٹائن کے نظریات نے نئے نئے معاشی ،انسانی ،ذہنی اور سائنسی علوم کے امکانات وا کردیئے۔ برصغیر بھی اس بدلے ہوئے تناظر سے متاثر ہوا اور یہاں بھی صورتحال تیزی سے بدلنے لگی۔ افلاس ، مایوسی، بیروزگاری اور بے یقینی نے نوجوان نسل کو گھیر لیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مستقبل گم ہوگیا ہے۔ میرّاجی بھی اسی نوجوان نسل سے تعلق رکھتے ہیں ۔ بے یقینی، بے روزگاری اور بے معنی رسمی اخلاقیات سے برگشتگی ان کے لیے ایک زندہ حقیقت بھی تھی اور احساس کا حصہ بھی۔ میرآجی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ دیکھا اور جو کچھ محسوس کیا اسے اپنے لفظوں اور روپ بہروپ سے دوسروں کو دکھا بھی دیا۔

میرآجی کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو وہ ماضی اورحال کے دائروں میں سفر کرتی دکھائی دیتی ہے ۔ ان کے نزدیک انسان جس موجودہ لمحہ میں زندگی گزار رہا ہے وہی لمحہ اس کا ہے یا ماضی کے وہ لمحات جو وہ گزار چکا ہے۔ مستقبل میں انسان کی نفی ہو جائے گی۔ کیونکہ جب وجود پرموت کا غلبہ طاری ہوگا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ میرا ّجی انسانی زندگی کو چل چلاو کا کھیل قرار دیتے ہوئے اپنی نظم "چل چلاؤ" میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔ اشعار دیکھیے:

ہم اس دنیا کے مسافر ہیں
اور قافلہ ہے ہر آن رواں
ہر بستی، ہر جنگل ، صحرا اور روپ منوہر پربت کا
اک لمحہ من کو بھائے گا، اک لمحہ نظر میں آئے گا

ہر منظر، ہر انساں کا دیا اور میٹھا جادو عورت کا
اک پل کو ہمارے بس میں ہے پل بیتا، سب مٹ جائے گا
ہے چاند فلک پر اک لمحہ
اور اک لمحہ یہ ستارے ہیں
اور عمر کا عرصہ بھی سوچو! اک لمحہ ہے
(کلیاتِ میرآجی ، ص:۴۲)

میرآجی "میرآجی کی نظمیں " کے دیباچے میں خود اس بات کا اعلان کرتے ہیں ۔"مستقبل سے میرا تعلق بے نام سا ہے۔ میں صرف دو زمانوں کا انسان ہوں ۔ماضی اور حال۔ یہی دو دائرے مجھے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں "۔ میراجی کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو کوئی شخص ہنستا مسکراتا اور فرحاں وشاداں دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ اس مختصر حیات میں بھی دکھ اور غم اس کے ساتھ ساتھ ہیں اور وہ ان سے چھٹکارا نہیں پاسکتا ۔گویا زندگی کے شب و روز دکھوں سے عبارت ہیں اور زندگی اذیت، مصیبت اور بلاؤں سے بھری پڑی ہے۔ عصری صورتحال میں انسان کا اصل دکھ وہ تنہائی ہے جس کا سبب محض معاصر انسان ہی سے دوری نہیں بلکہ اس نور ازل کا معدوم ہو جانا ہے جس کے باعث فرد اور اس کے خالق کے درمیان ایک رشتہ ئ نظر قائم تھا۔ میرآجی کی نظم "سلسلہ روز وشب" اس تنہائی کی عکاس ہے۔

خدا نے الاو جلایا ہوا ہے
اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے
ہر اک سمت اس کے خلا ہی خلا ہے
سمٹتے ہوئے دل میں وہ سوچتا ہے
تعجب کہ نورِ ازل مٹ چکا ہے
بہت دور انسان ٹھٹکا ہوا ہے
اسے ایک شعلہ نظر آرہا ہے
مگر اس کے ہر سمت بھی اک خلا ہے
تخیل نے یوں اس کو دھوکا دیا ہے
ازل ایک پل میں ابد بن گیا ہے
عدم اس تصور پہ جھنجھلا رہا ہے
نفس دو نفس کا بہانہ بنا ہے
حقیقت کا آئینہ ٹوٹا ہوا ہے
تو پھر کوئی کہہ دے یہ کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟
خلا ہی خلا ہے ، خلا ہی خلا ہے
(کلیاتِ میرآجی ، ص: ۲۷۵،۲۷۶)

میرؔاجی کے ہاں غم محض انفرادی یا ذاتی گریہ زاری کا نام نہیں بلکہ ایک تخلیقی رویہ ہے۔ غم زدہ شخص کی زندگی میں وہ تبدیلیاں

رونما ہوتی ہیں کہ اس کی زندگی خالق کی صفات کا عکس دکھائی دینے لگتی ہے۔ نظم "الم پرست" کے اشعار دیکھیے:

غم آثارِ حیاتِ خفتہ
غم آثارِ حیاتِ تازہ
غم احساس کی تبدیلی کا
مست بنانے والا نغمہ
غم سے دور ہو گمنامی
غم سے حاصل عمرِ دوامی
غم سے کام ہوئے سب ایسے
بن گئے انسان بھی رب جیسے
کیوں مرنے سے پہلے مرنا؟
غم سے کیا ڈرنا، کیوں ڈرنا
(کلیاتِ میراجی ، ص: ۳۳۱، ۳۳۲)

میرّاجی کے نزدیک دنیا کے دکھوں سے بھرے لوگ انسانیت کی معراج ہیں ۔ اس لیے انہیں وہ لوگ عزیز ہیں جو دکھوں کی دلدل میں ہمیشہ پھنسے رہتے ہیں ۔لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ دکھوں کے حامی ہیں۔ دراصل ان کے خیال میں انسان کا مقدر دکھوں سے عبارت ہے اور خوشیاں اس کے مقابلے میں ناپائیدار ہیں ۔ یہ ناپائیدار خوشیاں دکھوں میں اضافہ کرتی ہیں ان کوکم نہیں کرتی نظم "بیوپاری" کے اشعار اس کے بھر پور عکاس ہیں ۔

آؤ آؤ سکھ لائے ہو ؟ بولو ، مول بتاؤ تم
اپنے اپنے سکھ کے بدلے مجھ سے دکھ لے جاؤ تم
پل دو پل کا سکھ لائے ہو ؟ پل دو پل کا دکھ بھی ہے
جیسا دکھ لینے آئے ہو جیب میں ایسا سکھ بھی ہے ؟
سکھ کے بدلے دکھ تو کھرے ہیں پر یہ پرکھ تمہاری ہے
کون ہے پار پہنچنے والا کون نرا سنساری ہے
دنیا کے دکھ بیچ بیچ کر میرا جیون بتا ہے
ہار ہار کر اپنی بازی میں نے جگ کو جیتا ہے
(کلیاتِ میراجی، ص: ۴۵۹،۴۶۰)

میراؔ جی کے ہاں ہمیں بہت سے ایسے کردار بھی نظر آتے ہیں جو دور حاضر کے پیچیدہ معاشی اور معاشرتی مسائل کے نمائندہ ہیں ۔ اگرچہ میراؔجی ترقی پسند تحریک اور اس سے وابستہ ادیبوں کی اجتماعی منصوبہ بندی کے حق میں نہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے باطن

میں ایک ترقی پسند شاعر موجود تھا۔ ان کے ہاں انسانیت کی مظلومیت کا ماتم بیشتر نظموں میں دکھائی دیتا ہے۔ انسان کے معاشی استحصال کا بھر پور عکاس میرآجی کا کردار "نادار"ہے۔ جو دنیا میں بے بسی اور لا چارگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ وہ تہی جیب وتہی دست زمانے کے دکھ برداشت کرنے پر قانع ہے۔ لیکن اس بے چارگی کے دکھ کو وہ جمالِ فطرت کی پناہ گاہ میں سہارتا ہے ۔

اب کوئی نہیں ، کوئی بھی نہیں ، تنہائی ہے
دن بیت چکا ، اور شام گئی ، رات آئی ہے
اب نور مٹا اور خاک بجھی
سنسان سماں کیا سوگ منانے آیا ہے
اوپر آکاش کے جنگل میں
تاروں کا ساون چھایا ہے
اور چاند نے روپ دکھایا ہے
میں کیسے کہوں ، اب کوئی نہیں ، کوئی بھی نہیں

(کلیاتِ میراجی ، ص: ۳۸۷)

انسان دوست میراؔ جی نے نچلے طبقے کے مسائل ومصائب اور اذیتوں وتلخیوں کو اپنی متعدد نظموں میں بہت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ جن میں "دُھوبی کا گھاٹ" اور "کلرک کا نغمہ" قابل ذکر ہیں ۔ "کلرک کا نغمہ "میں کلرک کی زندگی میں آنے والی محرومیوں اور تلخیوں کو بھر پور انداز سے نمایاں کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ وہ اس سماجی نظام کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور اپنی شاعری کے ذریعے بوسیدہ اقدار کے خلاف نبرد آزما ہوتے دکھائی دیتے ہیں ۔

سب رات مری سپنوں میں گزر جاتی ہے اور میں سوتا ہوں
پھر صبح کی دیوی آتی ہے
اپنے بستر سے اٹھتا ہوں منہ دھوتا ہوں
لایا تھا کل جو ڈبل روٹی
اس میں سے آدھی کھائی تھی
باقی جو بچی وہ میرا آج کا ناشتہ تھی

(کلیاتِ میراجی ، ص: ۱۲٤)

بقول مظفر علی سید!"میرآجی کا فلسفہ ایسے مظلوم آدمی کا فلسفہ تھا جس نے جینے کا سکھ کبھی دیکھا ہی نہیں تھا"۔ میرآجی کے خیال میں اگرچہ انسان بہت ترقی کر چکا ہے۔ لیکن اس تمام ترقی کے باوجود اس کا ذہن فرسودگی کا شکار ہے۔اس کے اندر کی حیوانیت اس کے چہرے سے عیاں ہے۔ لہٰذا جب تک انسان اپنے ذہن سے فرسودہ خیالات کو جھنجھوڑ کر باہر نہیں پھینکتا اس کے ارتقا کا نعرہ محض ایک دھوکا

ہے۔ یہ فرسودہ خیالات جنازوں کی صورت میں ہر طرف دکھائی دیتے ہیں اور ان کی بدبو سے ذہن آلودہ ہوئے جارہے ہیں ۔میراجی اپنی نظم "ارتقا" میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔

چلو! جنازوں کو اب اٹھاؤ
یہ بہتے آنسو بہیں گے کب تک ؟ اٹھو اور اب ان کو پونچھ ڈالو
لحد کھلی ہے
لحد ہے ایسے کہ جیسے بھوکے کا لالچی منہ کھلا ہوا ہو
مگر کوئی تازہ اور تازہ نہ ہو میسر تو باسی لقمہ بھی اس کے اندر نہ جانے پائے
کھلا دہن یوں کھلا رہے جیسے اک خلا ہو
اٹھاؤ جلد اٹھاؤ آنکھوں کے سامنے کچھ جنازے رکھے ہوئے ہیں ان کو اٹھاؤ جاؤ
لحد میں ان کو ابد کی اک گہری نیند میں غرق کرکے آؤ
اگر یہ مردے لحد کے اندر گئے تو شاید
تمہاری مردہ حیات بھی آج جاگ اٹھے

(کلیاتِ میراجی، ص:۲۳۸،۲۳۷)

تہذیب جدید اور اس کے فروغ کے نتیجے میں کسری انسان پر طنز بھی میراؔجی کی نظموں میں ایک غالب موضوع کے طور پر دکھائی دیتا ہے۔ انسان نے تہذیب کے نام پر معاشرے کی تشکیل جس انداز سے کی ہے اس میں انسانی ذات کی نفی ہوگئی ہے۔ اس کی فطری خواہشات کا خون ہوجاتا ہے۔ انسانی خواہشات تشنہ کامی کا شکار رہتی ہیں یا پھر ان خواہشوں کو وہ خوابوں میں پورا کرتا ہے۔ لیکن خواہشات کویوں پورا کرنے کا طریقہ اس کو کسری انسان بنادیتا ہے۔ میراؔجی اپنے عہد کے کسری انسان کو نظم "اے ریا کارو" میں ملامت کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

اندازِ نظر کی الجھن کو تم شرم و حیا کیوں کہتے ہو؟
جنسی چاہت کی برکت کو ملعون خدا کیوں کہتے ہو؟
ذہنی رفعت پر بھولے ہو، ذہنی رفعت اک دھوکا ہے
ہے جسم کی ہر اک رگ میں خوں خوں میں حرکت یہ دھند ہے
تہذیب و تمدن کے جھوٹے رنگوں پر نہ جاؤ مت بھولو
نقصان بہانے میں لاکھوں پوشیدہ ہیں اتنا جانو

دو رنگی چھوڑ دو دو رنگی ، یک رنگ اصولوں پر چل کر
یہ دنیا جنت بن جائے گی سچی باتوں میں ڈھل کر
(کلیاتِ میراجی، ص:۵۲۹)

دراصل انسان کی تہذیب نے اسے "پورا آدمی" نہیں رہنے دیا۔ میراجی کی شاعری کا بنیادی مسئلہ بھی یہی ہے کہ انسان جو "مہذب" ہوگیا ہے اسے "فطری" کس طرح بنایا جائے۔ بقول سلیم احمد "اپنے زمانے کے مخصوص آدمی کی تمام شکلیں دیکھتے اور پھر انہیں اپنے پورے آدمی کے معیار پر پرکھنے کی صلاحیت جیسی میرا جی میں تھی ان کے زمانے کے کسی شاعر میں نہیں تھی"

یوسف ظفر اور انسان دوستی (۱۹۱۴۔ ۱۹۷۲)

یوسف ظفر حلقہ ارباب ذوق کے نمائندہ شاعر ہیں ۔ جنہوں نے نظم کی دنیا میں کئی تجربات کیے اور جدید علامتوں کے ذریعے نظم کے دامن کو مالا مال کردیا۔ اکثر وبیشتر جدید نظم نگاروں کی طرح یوسف ظفر کے ہاں بھی جدید زندگی اور ماحول کی بے کیفی اور ویرانی کا رنگ دکھائی دیتا ہے اور سماج کی چیرہ دستیوں نے بھی ان پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں جدید زندگی کی تلخیاں اور پریشانیاں بھری ہوئی ہیں ۔

"زہر خند" کے پیش لفظ میں یوسف ظفر خود لکھتے ہیں :

> مجھے تو ان منتشر اجزا کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرے سامنے ایک ہجوم ہے جس میں قہقہوں کے ساتھ ماتم کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں ۔ مسکراہٹیں ، آنسوؤں میں لتھڑی ہوئی ہیں۔ مسرتیں چیخوں سے ہمکنار ہیں ، کسی کو کسی کا غم نہیں ، ہر کوئی اپنی سی کیے جارہا ہے۔ میں نے زندگی میں یہی کچھ پایا ہے اور زندگی کے اس آئینے میں اسی کاعکس پیش کررہا ہوں۔

یوسف ظفر کی کئی ایسی نظمیں ہیں ۔ جن میں انہوں نے انسان کی بے بسی اور ویرانی کی عکاسی بہترین انداز میں کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں انتقام"، "مایوسی"، "آنسو" اور "سرراہے" قابلِ ذکر ہیں ۔نظم، "مایوسی" کے اشعار دیکھیے جس میں انہوں نے احساسِ غم کی ان الفاظ میں مصوری کی ہے۔

یہ کیا کہ سازِ کی مانند گونجتا ہوں میں
وہ ہانپتا ہوا کھمبا بلا رہا ہے مجھے
یہ کانپتی ہوئی دیوار گر رہی ہے ادھر
وہ اونگھتا ہوا چھجّا ڈرا رہا ہے مجھے

(کلیاتِ یوسف ظفر (زہر خند)، ص:۲۰۱)

یوسف ظفر کے ہاں زندگی کی ساری نفریتیں اور کدورتیں شعری نغمے کا روپ دھار لیتی ہیں ۔ یہ امتیاز ہی ان کی شاعری میں زندگی کی حرکت اور حرارت پیدا کرتا ہے۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔

یوسف ظفر کے ہاں روشنی کی خواہش بے حد نمایاں اور حرکت کی آرزو بے حد شدید ہے اور اس خواہش کا یقیناً اس کی ابتدائی زندگی سے کوئی گہرا تعلق ہے۔ روشنی کے لیے ایک تیز خواہش کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ تاریکی سے خوف زدہ ہے اور حرکت کے لیے شدید آرزو اس بات پر دال ہے کہ بے حسی، انجماد اور ٹھہراؤ میں اسے اپنی موت نظر آتی ہے۔

یوسف ظفر کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے توان کے ہاں حرکت اور حرارت کے عناصر مختلف شکلوں میں اور مختلف ذہنی کیفیات کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آتے ہیں ۔ روشنی ان کے ہاں دراصل زاد راہ اور منزل مقصود کا نام ہے۔ اور یہی روشنی آگ کی صورت میں لہو بن کر رگ وپے میں گردش کررہی ہے۔ جو انہیں آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے اور انہیں ماحول میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی کو دور کرنے کے لیے اکساتی ہے اور یوں انسان اپنی منزل کی طرف رواں دواں دکھائی دیتا ہے۔

اب مرا عزم ہے فولاد کی مضبوط چٹان
اب یہاں کانچ کی تلواریں نہیں رہ سکتیں
اب میں خود آگ ہوں ہر شے کو جلا سکتا ہوں
مجھ سے اب ہاتھ اٹھا لو کہ میں جا سکتا ہوں

(کلیاتِ یوسف ظفر، ص:٤٦)

یوسف ظفر کے ہاں حرکت، روانی اور دھڑکن زندگی کا مظہر ہیں ۔ جبکہ انجماد ، خاموشی اور سکون کو وہ موت کامترادف قرار دیتے ہیں ۔ دراصل ان کے ہاں آواز کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس آواز سے انہیں بے پناہ محبت ہے کیونکہ یہ آواز ان میں تنہائی کے احساس کو ختم کرتی ہے اور وہ اپنے آپ کو ایک جمِ غفیر کا حصہ سمجھتے ہیں ۔ یوسف ظفر انجماد ، بے حسی، سناٹے اور ٹھہر جانے کی ہر کیفیت سے خوف زد ہ ہیں ۔ اسی لیے اسے دیواروں زنجیروں اور گھڑی کی سوئیوں سے بھی نفرت ہے۔ جو اسے معاشرے اور وقت کے بندھنوں میں اسیر کرنے کے درپے ہیں ۔ چنانچہ تڑپتی اور دھڑکتی ہوئی زندگی کا مظہر ہونے کی حیثیت سے وہ ہر اس رکاوٹ سے برسر پیکار نظر آتا ہے جو اس کی روانی اور تحرک کو روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس سلسلے میں نظم "یاد" کے اشعار توجہ طلب ہیں ۔

میرے کمرے کی انگیٹھی میں بھڑکتے شعلے
اور باہر مری دیواروں سے لڑتی بوچھار
حسن و الفت کی ملاقات مگر دیواریں
ہاں یہ دیواریں تو ہر راہ میں اٹھ جاتی ہیں
(زندان ، ص:
٤٥)
دوسری طرف نظم "سہارا" کے اشعار دیکھیے
کھڑکیاں بند کرو سرد ہوا آتی ہے
کوہساروں کی سنکتی ہوئی بے مہر ہوا
کپکپا دیتی ہے اس ظلمت شب میں مجھ کو
منجمد کرتی چلی جاتی ہے میرے دل کو
(زندان، ص:
٣٣)

یوسف ظفر کے ہاں جدید انسان کا یہ المیہ ہے کہ وہ قدیم وجدید اقدار کی کشمکش کاشکار ہے۔ وہ قدیم وجدید اقدار کے بندھنوں میں جکڑا ہوا زندگی کے سفر پر رواں دواں نظر آتا ہے۔ وہ سیاسی، سماجی اوراخلاقی اقدار کے بنتے اور بگڑتے منظرنامے سے کٹ کر نہیں رہ سکتا بلکہ وہ اس کشاکش میں باقاعدہ شریک ہے۔ جدید اور روایتی انسان کی باہمی آوزش کا ایک منظر ملاحظہ کیجیے۔

کتنی اقدار کا انبار گراں ہے سر پر
راہِ ہموار بھی دشوار ہوتی جاتی ہے
پاسِ آداب و رہ و رسم روایاتِ قدیم
جاں اس زیست سے بیزار ہوئی جاتی ہے
اتنا محدود ہے انسان کہ دم گھٹتا ہے
گھر کی زنجیر جدا ، کوچہ و بازار الگ
مسجد شہر کے ملا کا حصار اپنی جگہ
خانہء دل کے در و بام کا پندار الگ
چل رہا ہوں کہ یہی حکم مشیت ٹھہرا
جانب کعبہ چلوں ، سوئے ضم خانہ چلوں
شیخ کہتا ہے راہ راست پہ چل ناک کی سیدھ
بزم کہتی ہے مگر صورتِ پیمانہ چلوں
(کلیاتِ یوسف ظفر،
ص: ٤١٤)

قدیم وجدید اقدار کی باہمی کشمکش کے بارے میں عارف عبد المتین ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔

> یوسف ظفر کے اندر کے جدید انسان کا ان کے اندر کے روایتی انسان سے بالعموم تصادم نہیں ہوا۔ان کی ذات میں دونوں انسان اکثر اوقات بانہوں میں بانہیں ڈالے آگے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ وہ

گھل مل کر ایک کبھی نہیں ہوسکے۔ بلکہ اس کے برعکس بالکل صاف الگ الگ پہچانے جاتے ہیں اور سچ پوچھئے تو کبھی کبھی ان کے درمیان وہ آویزش بھی ظہور پذیر ہوجاتی ہے جو انسانی فطرت کے پیش نظر کچھ ایسی تعجب خیز نہیں ۔

یوسف ظفر نے انسان کو رومی کے زاویہ نظر سے پرکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں انسان انسان نہیں بلکہ دام ودد دکھائی دیتے ہیں ۔ وہ ایسے انسان کی خواہش کرتے ہیں جو دکھی انسانیت کی خدمت کاجذبہ لے کر انسان دوستی کے جذبے سے سرشارہو کر شہر کی گلیوں میں گشت کرتا دکھائی دے۔ اپنی نظم "وراثت" میں انہوں نے انسان کے مختلف تخریبی رویوں اور ان کے نتائج کا تفصیل سے نقشہ کھینچا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

شب تارمیں ڈھونڈتی ہیں نگاہیں کہاں جارہے ہیں جئے جانے والے
تجسس کی آنکھوں میں مذہب کا سرمہ ہے لیکن یقین بصارت نہیں ہے
تجسس کے ہاتھوں میں ہے فلسفے کا عصا لیکن اس کا سہارا یقینی نہیں ہے
تجسس شبِ تیر و تار میں وقت کی ٹھوکریں کھاکے بھی نارسا ہے
ہوس ، بھونکتی ہے مگر اس کا چہرہ انساں کا چہرہ
ہوس کاٹتی ہے مگر اس کا جبڑا ہے انساں کا جبڑا
بد دستور شیروں کی دھاڑ اور فیلوں کی چنگھاڑ، انساں کی آواز سے پھوٹتی ہے
شب تار میں "پالیا" پالیا ، کی صداؤں سے ارض و سما کانپتے ہیں
مگر کیا ملا ہے ؟ فقط رازِ یک ذرد کائنات
کہ جس سے فنا کا طلسم دوامی ہوا پختہ تر
شب ِ تار میں آدمی کو ابھی تک وہی قطب تارہ نظر آرہا ہے
کہ جس سے سفید اور سیاہ کی ہے صورت نمایاں
کہاں ہیں وہ تہذیب ومذہب کہ جن کی حقیقت پہ ہیں علم وادراک نازاں
کہاں ہے؟ --- کہاں ہے؟ --- وہ انساں --- وہ انساں !!!

(کلیاتِ یوسف ظفر،صدا بہ
صحرا، ص: ۳۵۷)

انسان دوست یوسف ظفر کو اس بات کا احساس ہے کہ انسان ذہنی طور پر مختلف رسوم وقیود میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ ہوس، دولت اور شہرت کا پجاری ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ مذہب کی غلط تفہیم اور فلسفے کے پیچ وخم میں الجھ کر تو ہمات کا شکار ہوچکا ہے اور ان سب باتوں نے اسے شرفِ انسانیت سے محروم کردیا ہے۔

یوسف ظفر کا تعلق اگرچہ حلقہ ارباب ذوق کے شعراء سے ہے لیکن فکرِ سماج نے انہیں ترقی پسند خیالات کے قریب ترکر دیا ہے۔ ان کے ہاں طبقاتی شعور کا گہرا احساس بھی ہے۔ ان کے نزدیک انسانی کی غلامی کی وجوہ جہاں اس کی سماجی کشمکش اور برتر وکمتر کا احساس ہے وہاں اس کا اپنا تو ہم بھی ہے۔وہ مختلف تو ہمات میں گھیرا ہوا ہے۔ اس کا سیاسی ، سماجی، معاشی اور روحانی سطح پر استحصال ہورہا ہے۔ یوسف ظفر کی نظم "بت کدہ" میں انسانی توہمات، استحصال اور جبر کی مختلف صورتیں کچھ اس انداز سے دکھائی گئی ہیں ۔ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

مری نگاہ میں شامل ہے فطرتِ آدم
مگر یہ دیکھا ہے میں نے کہ ہر دریچے میں
کہیں خدا کا کہیں ناخدا کا ہے پرچم
ملے ہیں ورثے میں سجدے کہیں بتوں کے لیے
کہیں ستاروں میں روشن ہیں قسمتوں کے چراغ
کہیں مزاروں پہ تسکین قلب بکتی ہے
کہیں عقیدوں کے شعلوں سے جل بجھے ہیں دماغ
نہ سوچ ہے نہ تفکر سے کام لیتے ہیں
یہاں بتوں سے خدا کا پیام لیتے ہیں

(کلیاتِ یوسف ظفر، (زہر خند)ص:۲۲٤)

انسان دوست یوسف ظفر معاشرے سے دکھ ' درد اور کرب کا خاتمہ چاہتے ہیں ۔ اسی صورت میں ایک انسان دوست معاشرے کی تشکیل ممکن ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "تقلید ابراہیم" قابلِ توجہ ہے۔ جس میں ایک محنت کش باپ اپنے بیٹے کو زندگی کی جنگ میں اپنی ذلت وشکست کا حال بیان کرتاہے۔ شروع میں وہ اپنے آبا سے شکوہ کرتا ہے جنہوں نے اسے اس ماحول کی نذر کیا ہے۔ لیکن کیا خبر کہ اس کے آبا نے بھی فاقوں اور افلاس کی زندگی گزاری ہو۔ لیکن یہ شخص اب اس نسل در نسل دکھ اور کرب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کردینا چاہتا ہے۔

دراصل یوسف ظفر نے مذہبی تصور کو ایک نئے زاویے سے پیش کرکے مفلسی کے کرب کی تمثال تراشی کی ہے۔

مجھے منظور نہیں میری طرح تو بھی یہاں
عمر بھر مرتا رہے روتا رہے مرتا رہے
ذہن میری طرح پابندِ سلاسل ہو ترا
تری تخیئیل بھی مفلوج رہے عقل بھی خام
میرے گالوں پہ بھنور پڑتے رہیں میری طرح
تیری آنکھوں کے اجالے سے ستارے ٹپکیں
آ میرے لاڈلے آ آکر ترا مفلس باپ
تیرے اس ریشمی حلقوم پہ خنجر رکھ دے
مسکرا بیٹے ! میرے لاڈلے ! میرے پیارے
(صدا لبصحرا، ص:٦٣)

سماج، احساس کی مصوری اور بھوک اور افلاس کے مسائل کا ذکر ان کی ایک اور نظم "سائے" میں بھی ملتا ہے۔ نظم "طمانچہ" زندگی کے ایک معمولی واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ کسی کے چہرہ پر طمانچہ پڑتا ہے اور شاعر اس واقعہ سے بے حد متاثر ہوتا ہے اور فلسفیانہ انداز میں ایک تقدیر پرست کی طرح تاویل کرتا ہے۔

یہی ہوتا ہے یونہی ہوتا ہے
زندگی کے رخ آسودہ پر
حادثات ایک طمانچہ ہی تو ہیں
یاس کا ایک طمانچہ کھا کر
آرزو خاک میں مل جاتی ہے
(کلیاتِ یوسف ظفر، زہر خند ، ص: ١٦٩)

انسان دوست یوسف ظفر عہد حاضر کے انسان کے دکھ درد بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ آج کی صنعتی ترقی انسان کے لیے دکھوں اور پریشانیوں کا سامان لے کر آئی ہے۔ وہ محض ایک مشینی پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔ سائنس نے انسان کا پیٹ خوراک سے بھرنے کی بجائے دھوئیں اور آلودگی سے بھر دیا ہے۔ اس دکھ اور کرب کو یوسف ظفر اپنی نظم "قیامت" میں اس طرح بیان کرتے ہیں ۔

یہاں مشینوں میں آدمی پس رہا ہے اور ناچتا ہے لوہا
یہاں مشینوں میں راگ ڈھلتے ہیں اور انسان رو رہا ہے
یہاں مشنیں دھواں اگلتی ہیں اور ہم سانس لے رہے ہیں
یہاں کی ماؤں کی کوکھ میں پل رہا ہے لاوا
جو کارزاروں میں خون بن کر ابل پڑے گا

(کلیاتِ یوسف ظفر ،صد
البصحرا، ص:۱٦۸)

عالمی جوہری جنگوں نے انسان کو یاسیت اور قنوطیت میں مبتلا کردیا ہے۔انسان دوست یوسف ظفر جنگ کے خلاف ہیں ۔ وہ دنیا میں امن، محبت اور انسان دوستی کا پیغام عام کرنا چاہتے ہیں ۔ اس جنگ نے دنیا میں تباہی وبربادی نفرت اور کدورتوں کو فروغ دیا ہے۔اب اشرف المخلوقات اور مرکزِ کائنات کے تصورات مدت بعید کی بات معلوم ہوتے ہیں ۔ اس موجودہ دور میں انسان کی شناخت عقلِ سلیم یا دولتِ علم نہیں بلکہ اب زندگی میں اس کے کام آنے کے پیمانے تبدیل ہوچکے ہیں اب میعارات بدل چکے ہیں اور اب معیار آدمیت یہ شکل اختیار کر چکا ہے۔ نظم"معیارآدمیت"کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

جیسے چینی کے خام برتن کو
خوب اچھی طرح پرکھتے ہیں
ویسی ہی آدمی کی حالت ہے
توپ کی آنکھ جانچتی ہے اسے
رائفل اس کا ناپ لیتی ہے
اور بم اس کو آزماتے ہیں
(کلیاتِ یوسف ظفر، زہر
خند،ص:۲۲۸)

یوسف ظفر کے ہاں حبِ وطن کا جذہ بھی زور وشور سے دکھائی دیتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں "خوابِ پاکستان"، "ارضِ پاکستان"، "۱٤/اگست" اور "چھ ستمبر" اہمیت کی حامل ہیں ۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحے سے یوسف ظفر کو ایک زبردست چوٹ لگی اور وہ پکار اٹھے۔

جس آئینے میں جوانی کے خواب دیکھے تھے
وہ گر کر ٹوٹ گیا عمرِ رائیگاں کی طرح

یہ آئینہ ٹوٹ کر روایتی یوسف ظفر کوکئی دلدوز نظمیں دے گیا اور انہیں نے ایک نظم "غدار" لکھ کر خود کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کی اور اس عزم کا اظہار کیا کہ

ہم مسلماں ہیں ہزیمت نہیں کھانے والے
اپنی پیشانی سے یہ داغ مٹا ڈالیں گے
کہیں تاریخ میں رہ جائے نہ یہ روز سیاہ
اب ہم اس صبح درخشاں کی بنا ڈالیں گے
جو کبھی شام و شبِ تار سے محجوب نہ ہو
جو کبھی کفر کی یلغار سے منسوب نہ ہو
(کلیاتِ یوسف ظفر،عشق پیچاں
، ص: ۸٤۹)

یوسف ظفر کی شاعری کے مجموعی جائزہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ہاں انسان ہمدردی، مساوات، امن، آزادی جیسے عناصر ان کی انسان

دوستی کی اقدار ہیں ۔ وہ ایک سچے محبِ وطن اور درد مند انسان ہیں اور یہی خوبیاں انہیں ایک انسان دوست شاعر بناتی ہیں ۔
یوسف ظفر کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں :
یوسف ظفر کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے خام مواد زندگی سے حاصل کیا ہے اور اسے داخل کی ہلکی آنچ پر پکا کر تخلیق شعر کا فریضہ ادا کیا ہے۔ چنانچہ وہ صرف خارج کو ہی متحرک نہیں کرتے بلکہ داخل کی سلگتی ہوئی آنچ بھی قاری کے دل میں اتار دیتے ہیں ۔

مجید امجداور انسان دوستی (۱۹۱٤۔ ۱۹۷٤)

عبد المجید ۲۹ جون ۱۹۱٤ کو جھنگ صدر میں پیدا ہوئےیہ وہی دور ہے جب دنیا پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کا سامنا کررہی تھی اور جب مجید امجد کی فکری کی جولانیوں نے انہیں ارد گرد کے حالات وواقعات کو سمجھنے کے قابل بنایا تو انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک غلام قوم کے فرد ہیں اور چاروں طرف اضطراب وبے چینی اور عدم تحفظ کی فضا قائم ہے۔
ناصرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کساد بازاری اور اقتصادی دباؤ کا شکار تھی۔ ڈگریاں رکھنے کے باوجود ملازمتوں کا حصول ناممکن تھا۔ ایسی صورتحال میں ۱۹۳۹ میں دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوا۔ جو اپنے ساتھ ہولناکیوں کی ایک طویل داستان لے کر آئی۔ ہندوستان میں اشیا خوردونوش کی قلت کاسامنا سنگین صورتحال اختیار کر گیا۔ جس کے باعث بھوک اور افلاس نے سر اٹھایامحرومیوں اور مجبوریوں کے اس دور میں مجبور اور لاچار انسان سسک رہا تھا اور مجید امجد حیران وششدر۔
برطانوی سامراج نے جنگ کے لیے افرادی قوت کے لیے ملک میں جبری بھرتی کا ایک سلسلہ شروع کیا جس کے باعث ماؤں سے ان کے لختِ جگر اور بیویوں سے ان کے سہاگ چھن گئے۔ غلامی کی ذلت کا احساس دو چند ہوا۔ اسی جنگی صورتحال میں ہندوستان میں اشیائے خورد ونوش کی ترسیل کے لیے سول سپلائیز ڈیپارٹمنٹ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جو "بھوکے غلاموں "کو راشن مہیا کرتا تھا۔ ۱۹٤٤ میں مجید امجدکو اس محکمے میں بحیثیت انسپکٹر سول سپلائیرز ملازمت ملی۔ اوریوں ان کوجبر وزیادتی نکبت وہلاکت اورمحرومی و مجبوری کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔
۱۹٤۷ میں پاکستان کا قیام دنیا کی سب سے بڑی ہجرت کا پیا مبر ثابت ہوا۔ لاکھوں لوگ مذہبی تعصب کی بھینٹ چڑھ گئے۔ انسانیت نوحہ کناں تھی۔ فرد سے اس کی شناحت چھن چکی تھی۔ اگرچہ ظالموں کی چیرہ دستیوں میں کوئی کمی نہ آئی لیکن مظلوم کی برداشت نے دم نہ توڑا ۔ ۱۹٤۷ کے زخم ابھی ہرے تھے کہ ۱۹٦٥ ایک مرتبہ پھر جنگ کی خبر اپنے ساتھ لایا۔ سترہ روز میں وہ قیامت صغریٰ برپا ہوئی کہ ہر چیز خون میں نہا گئی۔ مگر حاکموں کی مکاری، غیاری، چالاکی اور شعبدہ

بازی میں کوئی فرق نہ آیا۔ مارشل لاء پھر مارشل لائ، احتجاج، نعرے اور پھر سقوط ڈھاکہ (۱۹۷۱ء)۔
انسانیت کی اس قدر تذلیل اور فرد کی بے توقیری پر ہر صاحب علم ودانش خون کے آنسو رویا۔معاشرے میں پھیلی ہوئی بے چینی بے قراری، حرص وہوار، منافقت ، خود غرضی اور مفاد پرستی نے مجید امجد کو سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے عہد کے فرد کی بے بسی اور محرومیوں کا ذکر اپنی نظم "یہی دنیا" میں اس انداز سے کرتے ہیں -

جس جگہ روٹی کے ٹکڑے کو ترستے ہیں مدام
سیم وزر کے دیوتاؤں کے سیہ قسمت غلام
جس جگہ اٹھتی ہے یوں مزدور کے دل سے فغاں
فیکٹری کی چمنیوں سے جس طرح نکلے دھواں
جس جگہ سرما کی ٹھنڈی شب میں ٹھٹھرے ہونٹ سے
چومتی ہے رو کے بیوہ گال سوتے لال کے
جس جگہ دہقاں کو رنج محنت و کوشش ملے
اور نوابوں کے کتوں کو حسیں پوشش ملے
(کلیاتِ مجید امجد، ص: ۵۹،۶۰)

انسانیت نواز مجید امجد دراصل فرد کو باہمت اور باحوصلہ دیکھنا چاہتاہے۔ اس کے نزدیک اپنے حق کے لیے لڑنا اور آواز بلند کرنا فرد کا بنیادی حق ہے۔ اس وقت جب ہر طرف اضطراب وبے چینی کادور دورہ تھا ۔سماج کی قدریں تلپٹ ہو رہی تھیں ۔ فرد کی ذات بے بضاعتی کاشکار تھی اور دوسرا یہ کہ کچھ ظالم وجابر لوگ وہ ہیں جو انسان کو اس کے حق سے محروم کر دینا چاہتے ہیں اور اسی وجہ سے ایک ایسے خیال کے دکھ مجید امجد کی آنکھوں میں پھر جاتے ہیں "جن کی ثقافت جانے کتنے عرصے سے اپنا مسکن ڈھونڈ رہی ہے۔ نظم "جلسہ" کے اشعار دیکھیے جس میں عزم وہمت کا پیغام چھپا ہوا ہے۔

ایک گزرتے جھونکے کی جھنکار ذخیرے میں لرزاں تھی
"آس پاس کی کالی رسموں کے سب کھیت ہرے ہیں ،
اور یہ پانی تمہاری باری کا تھا،
اب کے بادل دریاوں پر جا کر برسے،
ان سے تمہارا بھی تو عہدنامہ تھا
اب کیا ہوگا؟-----
چلتے آروں کے آگے چرتے گرتے جسموں ،

پاتالوں میں گڑ جاو ورنہ"
اس تیکھی حجت میں اتنی سچائی تھی
"جتنے ان پیڑوں کے سب اک ساتھ ہلے غصے
میں
اور میری آنکھوں میں پھر گئے دکھ اک ایسے
خیال کے جس کی ثقافت
جانے کب سے اپنا مسکن ڈھونڈھ رہی ہے۔
(کلیاتِ مجید امجد ، ص:
٥٦٤، ٥٦٥)

مجید امجد معاشرے میں معاشی عدم مساوات کے خلاف تھے۔ ان کی نظم "طلوع فرض" میں وہ سب کچھ ہے جو وہ اس طبقاتی معاشرے میں دیکھ رہے اور محسوس کررہے تھے۔ لوگوں کا ایک ہجوم لگا ہے جس میں حسین ودلکش لوگ بھی موجود ہیں اور محنت کش لوگ بھی جو اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں ۔ یہ درست ہے کہ جدوجہد پر سبھی کا یقین کامل ہے۔ مگر اس کا حاصل کیا ہے ملاحظہ کیجیے:

یہ کیا ہے مالکِ زندانِ تقدیر
جوان و پیر کے پاوں میں زنجیر

(کلیاتِ مجید امجد ،
ص: ١٦٩)

یا جیسے وہ آگے چل کر کہتا ہے

گلستان میں کہیں بھونرے نے چوسا
گلوں کا رس ، شرابوں سا نشیلا
کہیں پر گھونٹ اک کڑوا کسیلا
کسی سڑتے ہوئے جوہر کے اندر
پڑا اک رینگتے کیڑے کو پینا
مگر مقصد وہی دو سانس جینا

(ایضاً ،
ص: ١٥٠)

مجید امجد کے خیال میں اس بند میں دو قسم کے لوگ ہیں ۔جو بھونروں کی طرح عیش ونشاط کی زندگی بسر کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ جو رینگتے ہوئے کیڑوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں ۔ مگر دونوں کا مقصد محض زیست اور سانس کے رشتے کو برقرار رکھنا ہے۔ مجید امجد نے اس معاشرتی تفاوت کا نقشہ عمدہ پیرائے میں کھینچا ہے اور اس تفاوت کو ختم کرنا چاہے ہیں ۔ مجید امجدؔ کی ایک نظم "بس سٹینڈ پر " دیکھیے جس میں دو کردار ہیں ایک شاید شاعر خود ہے جبکہ ایک کردار ایک نیا عالم بسنے اور نئی دنیا آباد ہونے کا مژدہ سناتا ہے۔

ضرور اک روز بدلے گا نظامِ قسمت آدم
بسے گی اک نئی دنیا ، سجے گا اک نیا عالم

شبستاں میں نئی شمعیں ، گلستاں میں نیا موسم
(ایضاً، ص: ۲۷۰)

تو دوسرا فوراً کہتا ہے۔

وہ رت اے ہم نفس جانے کب آئے گی
وہ فصلِ دیر رس جانے کب آئے گی
یہ نو نمبر کی بس جانے کب آئے گی
(ایضاً ، ص: ۲۷۰)

گویا مجید امجد ؔکو فرد کی زندگی یا معاشرے میں انقلاب کی بات غیر اہم محسوس ہوتی ہے جبکہ نو نمبر کی بس کی آمد کی خبر اس کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔ دراصل انسان دوست مجید امجد اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ جب تک نئے نظام اور نئے انقلاب گلی میں سے گزرنے والے ایک عام آدمی کا مقدر نہیں بدلتے ہر نظام ایک ڈھکو سلا اور ہر انقلاب فریب ہے۔ یہی ایک انسان دوست شاعر کی پہچان ہے کہ وہ عام آدمی کی مجبوری ، لاچاری اور بے بسی کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مجید امجدؔ وقت کی ستم ظریفی کو بھی خوبصورت پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ انسان وقت کی رفتار، نوعیت اور انداز سے ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔ وقت انسان کی جھولی میں دکھوں اور عذابوں کی صورت میں جمع ہوتا ہے۔

گزرتا ہے کیاروں کے پیاسے کناروں کو یوں چیرتا تیز خوں رنگ پانی
کہ جس طرح زخموں کی دکھتی تپکتی تہوں میں کسی نیشتر کی روانی
(ایضاً، ص: ۱۱۵)

ان زخموں کے باوجود انسان وقت کی نفیری کی تال پر رقصاں قدم قدم آگے بڑھتا ہے۔ مگر اس کی منزلوں کا تعین غیر یقینی ہے اور اس کی ساری جدوجہد لغو ٹھہرتی ہے۔ دراصل مجید امجد یہ بتانے کی کوشش میں ہیں کہ نہ تو انسان زندگی بتائے بغیر رہ سکتے ہیں اور نہ ہی ان میں اب اتنی ہمت وطاقت بچی ہے کہ وہ مزید ستم برداشت کر سکیں اور مزید جدوجہد کر سکیں ۔ مگر زندگی کا چکر اسی رفتار سے ازل سے ابد تک قائم و دائم رہے گا اور اس میں تبدیلی ہوتی دکھائی نہیں دیتی ۔ نظم "کنواں " کے اشعار دیکھیے۔ جس میں اندھے تھکے ہارے بے جان بیلوں کا جوڑا" توجہ کا طالب ہے "جو گراں بار زنجیروں " میں بندھا ہے جن کا اختتام صرف موت پر ہورہا ہے۔ لیکن وہ جوڑا مسلسل چل رہا ہے۔ دراصل کنویں کا دائروی چکر زندگی کا چکر بن گیا ہے جس

سے انسان کی نجات ناممکن ہے۔ انسان دوست مجیدامجد اس کرب کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں :

ادھر دھیری دھیری
کنوئیں کی نفیری
ہے چھیڑے چلی جا رہی اک ترانہ
پُر اسرار گانا
جسے سن کر رقصاں ہے اندھے تھکے ہارے
بے جان بیلوں کا جوڑا بچارا
گراں بار زنجیریں ، بھاری سلاسل ، کڑکتے
ہوئے آتشیں تازیانے
طویل اور لامنتہی راستے پر بچھا رکھے ہیں
دام اپنے قضا نے
ادھر وہ مصیبت کے ساتھی ملائے ہوئے
سینگوں سے سینگ شانوں سے شانے
رواں ہیں نہ جانے
کدھر ؟ کس ٹھکانے؟
نہ رکنے کی تاب اور نہ چلنے کا یارا
مقدر نیارا

(کلیاتِ مجید امجد، ص: ۱۱۵)

مظہر فرید فریدی مجید امجد کی نظم "کنواں " کے بارے میں ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں :

یہ (کنواں) نظم پہلی نظر میں برصغیر میں مسلم قوم کا نوحہ بن جاتی ہے کہ حاکم ہیں حکومت ہے، لیکن خوشحالی نہیں ۔لوگ پریشان حال ہیں اور کنواں چلنے کی آواز بھی مسلسل آرہی ہے۔ یعنی یہ پروپیگنڈہ بھی کیا جارہا ہے کہ عوام کے جذبات واحساسات کا خیال رکھا جائے گا۔ جمہوری حکومت ہوگی۔ جمہوریت ہوگی۔ بے چارے عوام انہی وعدوں پر بھروسہ کرکے اچھے وقت کے انتظار میں بیلوں کی طرح جتے ہوئے کام میں مگن ہیں ۔ لیکن نہ ہی قفل ٹوٹنے کا کوئی راستہ بنتا ہے نہ بے نوائی ختم ہوتی ہے۔ نہ کوئی منزل نہ نشان منزل ۔ چلنے کی سکت ختم ہوچکی ہے۔ ظلم حد سے تجاویز کرچکا ہے۔عوام مجبور و بے بس ہیں ۔ جمہوریت کے نام پر ظلم ہو رہا ہے، یہ بات کسی حد تک پورے برصغیر کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔"کنواں چل رہا ہے"۔

انسانیت نواز مجید امجد نے اس دنیا کے سامنے اپنا سینہ کھول کر رکھ دیا ہے۔ وہ جس سماجی عذاب کا تجربہ کرتا ہے وہ اس کی تہذیبی تاریخ کا حصہ ہے۔ ہڑپے کا ایک کتبہ، اسی تہذیبی تاریخ کے تجربے کا اظہار ہے۔ جہاں ہزار ہا برس کا تہذیبی عمل اس کے شعور سے

جھانگنے لگتا ہے۔ راوی کے کنارے تین ہزار برس پہلے "ہالی" آگ میں جلتا اک پنجرہ تھا اور آج بھی اس آگ میں اس کا بدن جل رہا ہے۔ اس کے نزدیک یہ تہذیبی تاریخ تین ہزار برس سے انسانوں کو بیلوں میں متشکل ہوتا دیکھ رہی ہے۔ دراصل ہڑپہ کی تہذیب دو بیلوں کی تہذیب نہیں یہ تین بیلوں کی تہذیب ہے۔ ہڑپہ کی تہذیب مرگئی دفن ہوگئی مگر تین بیلوں کی یہ مسلسل تہذیب زندہ ہے اور امجد اسی تہذیبی تسلسل کے چہرے سے دکھوں کی ریکھاوں کے مٹنے کا منتظر ہے۔ نظم "ہڑپے کا ایک کتبہ" کے اشعار دیکھیے :

کوئی مٹائے اس کے ماتھے سے یہ دکھوں کی ریکھ
ہل کو کھینچنے والے جنوروں جیسے اس کے لیکھ
تپتی دھوپ میں تین بیل ہیں ، تین بیل ہیں دیکھ

(کلیاتِ مجد امجد، ص: ۳۲۱)

مجید امجد کے ہاں اسی تہذیبی عذاب کے تسلسل کو ان کی نظم "مسلخ' میں دیکھا جاسکتا ہے۔ دراصل "مسلخ" اسی تہذیبی عذاب کی مختلف شکلوں کا نام ہے۔ ڈھیروں انسانی گوشت ٹکڑوں کی صورت میں گلیوں اور بازاروں میں بٹتا ہے۔ جیالے لوگوں کی کھالیں ، بھیجے اور انتڑیاں گلتی جاتی ہیں ۔ انسان دوست مجید امجد تہذیبی استحصال، جبرو تشدد اور خوف کے مختلف روپ کی نشاندہی کرتا ہے۔ جہاں ہر شے دم توڑتی اور مٹتی دکھائی دیتی ہے۔ کسی شے کو دوام نہیں ۔ مگر جس چیز کو استحکام حاصل ہے وہ ہے انسانی وجود کا استحصال ۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ انسانی وجود بے حقیقت اور بے قدر وقیمت ہے۔ وہ انسان سے بیل بن جاتا ہے یا انسان نہیں رہتا گوشت کے ٹکڑوں میں بدل جاتا ہے۔

روز ، اس مسلخ میں کٹتا ہے ڈھیروں گوشت
دھرتی کے اس تھال میں ' ڈھیروں گوشت
اور پھر یہ سب ماس
چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں
بستی بستی گلیوں اور بازاروں میں
لمبی لمبی قطاروں میں
جدا جدا تقدیروں میں
مٹتا جاتا ہے-----
ہر ٹکڑے کی اپنی آنکھیں ، اپنا جسم اور اپنی روح
کہنے کو تو ہر ٹکڑے کا اپنا اپنا نام بھی ہے اور
اپنا اپنا دیس بھی ہے
اپنی اپنی امنگیں بھی
لیکن کچھ بھی ہو

آخر یہ سب کچھ کیا ہے
(کلیاتِ مجید امجد ، ص:٤٥٠)

انسانی شکست ور یخت کے اس منظر نامے میں لہو ایک بنیادی علامت ہے۔ تین بیلوں والی تہذیب کے ظلم واستبداد کی علامت ہے۔ امجد نے لہو سے آگے انسانی چہروں اور کھوپڑیوں کو بھی اس منظر نامے میں ابھارا ہے۔ شہر ازل کے اونچے پل کی ڈھلان سے انسانی چہروں اور کھوپڑیوں کے بہتے ہوئے دریا گلیوں اور دہلیزوں تک بہتے آرہے ہیں اور ان دریاؤں پر لہو کی مہریں لگی ہیں ۔ نظم "دن تو جیسے بھی ہوں "---- کے اشعار دیکھیے۔

پھر کیوں یہ سب دریا چہروں کھوپڑیوں کے
دریا ان گلیوں میں بہتے ہیں
شہرِ ازل کے اونچے بل کی کھڑی ڈھلان سے لے کر
ان گلیوں ، ان دہلیزوں تک بہتے آتے ، دریا
دریا جن پر بھنور ہیں ---- چھاپ لہو کی
لہریں جن پر بھنور ہیں ---- لہو کی مہریں
(کلیاتِ مجید امجد، ص:٤٨٢)

انسانی وجود پر اس مسلسل عذاب نے امجدؔ کی شاعری میں وجودی کرب پیدا کیا ہے۔ ان کے ہاں انسانی بے بسی اور بے چار گی کا احساس شدت سے ابھرتا ہے اور یہی ان کی انسان دوستی ہے۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ مجید امجد کی انسان دوستی کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

میں تو صرف یہ ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں کہ وہ (مجید امجد) اپنے معاصر شاعروں سے مختلف پرواز اور انداز کا شاعر ہے۔ اور اس کا تصورِ زندگی اور تصورِ شاعری اپنے معاصرو ں سے مختلف ہے۔ وہ اصلاً دکھ اور درد کا شاعر ہے۔ مگر اس کا یہ دکھ درد ذاتی ہونے کے باوجود زمانے کے کرب کا بھی ترجمان ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہ انسانی تقدیر کی محرومیوں کا بھی شارح اور مفسر ہے وہ زمانے سے اونچا ہونے کے باوجود زمانے کے اندر بھی ہے۔

مجید امجدؔ کے نزدیک سب انسان مٹی کے رشتے سے منسلک ہیں ۔ یہ رشتہ ان کو برابری کا درجہ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مٹی کا کوئی پیکر بھی طاقت کے اصل سرچشموں مثلاً اداروں پر قبضہ کرکے انسانی وجود کو خوشی کی روشنی دے سکتا ہے لیکن موجودہ سماجی ڈھانچے پر جن لوگوں نے پنجے گاڑے ہیں ۔ وہ عزم ستم سے انسانی وجود کو عدمِ تحفظ میں مبتلا کر رہے ہیں ۔ مجید امجدؔ نے انسان دوستی کا فریضہ

سرانجام دیتے ہوئے یہ سوال اٹھایا ہے کہ ہم اس دن کا انتظار کررہے ہیں جب قوت پر قبضہ رکھنے والے ہاتھوں کو یہ احساس ہو کہ انسان مٹی کے رشتہ سے وابستہ ہیں ۔

اپنی بابت تو ہم تم جانتے ہیں کہ ہماری منزلت اور ہمارے منصب مٹی کے رشتے ہیں
لیکن میں کہتا ہوں ، یہ جو سارے ادارے، یہ جو ساری تنظیمیں اور تملیکیں ہیں
یہ سب جگہیں کتنی تکریموں والی ہیں
جو بھی قوت کے سرچشموں پر قوت حاصل کرے
اس کے بس میں ہے اور دلوں میں وہ تقدیریں بھر دے
جن میں لاکھوں انسانوں کے ضمیروں کی خوشیاں مضمر ہیں
لیکن اب ان جگہوں پر جن لوگوں کے پنجے ہیں
کیسے ان کے ارادوں کے قبضے ان کی سانسوں پہ کسے ہوئے ہیں
اور کتنے آسودہ ہیں اپنے عزم ستم پر
بندے جانے وہ دن کب آئے گا
جب یہ لوگ بھی جانیں کہ سبھی یہ ان کے منصب مٹی کے رشتے ہیں
وہ دن جس کے تقدس کے آگے ہم نے ہمیشہ اپنے آب کو بے قوت پایا ہے
(کلیاتِ مجید امجد، ص:۶۰۵)

مجید امجدؔ کی شاعری میں اشیا سے جو رشتہ قائم ہوتا ہے وہ محض انسانوں کا درمیانی رشتہ نہیں ۔ اس میں دوسری مخلوقات کے ساتھ بھی مظہریاتی رابطہ استوار ہوتا ہے۔ جن میں فطرت کے مظاہر، پرندے اور جانور وغیرہ شامل ہیں ۔ مخلوقات اور مختلف طبقوں سے اس اشتراک نے ان کی شاعری کو انسان دوستی کا رنگ عطا کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "بارکش" کے اشعار دیکھیے۔

چیختے پہیے ، پتھ پتھریلا ، چلتے بجتے سم
تپتے لہو کی رو سے بندھی ہوئی اک لوہے کی چٹان
بوجھ کھینچتے چابک کھاتے جنور ، ترایہ جتن
کالی کھال کے نیچے کرم گھٹیلے ماس کا مان
(کلیاتِ مجید امجد ، ص:۳۸۱)

مجید امجدؔ کی نظموں میں "ضمیر" اور "قدر" کا لفظ بہت استعمال ہوا ہے۔ جس کا تعلق اخلاقیات کی نئی ترتیب سے ہے۔ وہ اپنی نظموں میں تبلغی نعرہ لگانے کی بجائے اس بات کو اس درد مندی سے محض

ایک اشارے سے بیان کرتا ہے کہ ایک چوٹ سی بھی لگتی ہے اور زندگی پر ایمان بھی مضبوط ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں میں ان کی نظمیں "مرے خدا! مرے دل"، "زینیا" "صاحب کا فروٹ فارم"، "بھکارن" اور کئی دوسری نظمیں اسی احساس کی غماز ہیں ۔نظم "پہاڑوں کے بیٹے" دیکھیے جس میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو کوہستانی علاقوں سے شہروں میں ملازمت کرنے آئے ہیں اور شہروں میں ہوٹلوں اور کارخانوں میں مزدوی کرتے ہیں ۔ مجید امجدؔ کی انسان دوستی ان اشعار میں جھلکتی ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

پہاڑوں کے بیٹے
چنبیلی کی نکھری ہوئی پنکھڑیاں ، سنگِ خارا کے ریزے
سجل، دودھیا، نرم جسم اور کڑکے کھردرے سانوے دل
شعاعوں ، ہواؤں کے زخمی
چٹانوں سے گرکر خود اپنے ہی قدموں کی مٹی میں اپنا وطن ڈھونڈے ہیں
وطن ڈھیران ان منجھے برتنوں کا
جسے زندگی کے پسینوں میں ڈوبی ہوئی محنتیں در بدرڈھونڈتی ہیں
وطن وہ مسافر اندھیرا
جو اونچے پہاڑوں سے گرتی ہوئی ندیوں کے کناروں پہ شاداب شہروں میں رک کر
کسی آہنی چھت سے اٹھتا دھواں بن گیا ہے
ندی بھی زر افشاں ، دھواں بھی زر افشاں
مگرپانیوں اور پسینوں کے انمول دھارے میں
جس درد کی موج ہے عمر پیما
ضمیروں کے قاتل اگر اس کو پرکھیں
تو سینوں میں کالی چٹانیں پگھل جائیں

(کلیاتِ مجید امجد، ص: ٤٠٠،٤٠١)

بقول مظہر فرید فریدی!

مجید امجد ایک مصور (خالق کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے جو زندگی کے مشک بار آنسوں کو آسیب حسن دینا چاہتا ہے۔ تڑپتی، تلملاتی اور بے حس ہوتی ہوئی امنگوں اور آرزووں کو زندگی کی ہما ہمی سے ہمکنار کرنے کے بعد کنج احساس میں بیٹھ کر خوشیاں بانٹنا چاہتا ہے۔ اس لیے دنیا کی چکی میں پسنے کے باوجود وہ بار بارہمکتی زندگی

کی طرف لوٹتا ہے۔ زخم خورد ہ ہونے کے بعد بھی مصائب
وآلام کے سامنے سینہ سپر نظر آتا ہے۔ یاسیت کو روح پر
طاری نہیں ہونے دیتا۔ غم کادائرہ بدن تک رہتا ہے۔ روح کو
آلودہ نہیں کرتا۔ مجید امجد ؔ نہ صرف اپنی بلکہ قاری کی
روح میں بھی یہ جذبہ اتارنے کا فن جانتا ہے۔

انسان دوست مجید امجد ؔ کی شاعری میں واقعہ کربلا کو حریت فکر کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ جس نے قیامت تک کے لیے استبداد کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کی راہ دکھائی ہے۔ انہوں نے بصرے ، شام اور کوفے کو علامتی انداز میں بیش کیا ہے۔ کارواں ِ حسین کو آج بھی صعوبتوں کا سامنا ہے۔ جبکہ وقت کے شمر اور یزید آج بھی چین سے بیٹھے ہیں ۔ آج اس دنیا کو پھر کسی حسین ؓ کا انتظار ہے۔ جو کانٹوں بھری دنیا کو گلزار بنا دے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں واقعہ ٔ کر بلا کو ہر دور میں لائق تقلید قرار دیا ہے۔ اشعار دیکھیے۔

بستے رہے سب تیرے بصرے کوفے
اور نیزے پر بازاروں بازاروں گزرا
سر------- سرور کا
قید میں منزلوں منزلوں روئی
بیٹی ماہ عرب کی
اور ان شاموں کے نخلستانوں میں گھر گھر
روشن رہے الاو
چھینٹے پہنچے تیری رضاکے ریاضوں تک
کون شہدا کے
اور تیری دنیا کے دمشقوں میں بے داغ پھریں
زر کار عبائیں !
چہرے فرشتوں پر !
اور ظلمتوں کے درباروں میں آہن پوش
ضمیروں کے دیدے بے نم تھے
مالک توہی اپنے ان شقی جہانوں کے غوغا میں
ہمیں عطا کر
زیر ِلب ترتیلیں ، ان ناموں کی، جن پر تیرے
لبوں کی مہریں ہیں

(کلیات ِ مجید
امجد)

مجید امجد کی ایک نظم "حضرت زینبؓ" ہے جسے پڑھ کر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ظلم کی معیار کے دن اب تھوڑے ہیں ۔ ظلمت کے بادل چھٹنے والے ہیں اور ہر طرف روشنی ہونے والی ہے۔

ستم کی رات کی کالی قنات کے پیچھے
بڑے ہی خیمہ دل میں تھے عشرتوں کے خیام
تری ہی برق ِ صدا کی کڑک سے کانپ گئے

یہ زیرِ چترِ مطّلا شہنشہوں کے خیام
جہاں یہ سایہ کناں ہے ترے شرف کی ردا
اکھڑ چکے ہیں ترے خیمہ افگنوں کے خیام
(کلیاتِ مجید امجد،
ص: ٤٤٧)

مجید امجدؔ وہ انسان دوست شاعر ہے جس نے تمام عمر دردوں ، کربوں ، ظلموں ، تنہائیوں اور ویرانیوں کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا۔ اور تمام عمر انسان کے دکھوں اور سوچوں کو زبان عطا کرتا رہا ۔ پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم مجید امجدؔ کی شخصیت کا خاکہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں ۔

وہ پردہ افلاک سے نکلنے والے روشن ستارے تھے۔ان کی ذات بے لوث محبتوں کی امین تھی۔ وہ بحیثیت انسان اپنے منصب کی ذمہ داریوں سے آگاہ تھے۔ نرم روی اور لہجے کا میٹھا پن ان کی گفتار کاخاصہ تھا ۔ نفرت ، حسد، بغض ، دوسروں کو نیچا دکھانا، کسی کی تحقیر کرنا، اونچی آواز میں بولنا، بے جا غصہ ، تفاخر ایسی التفات سے ان کی ذات محروم تھی ۔ جبکہ مروت، امن دوستی، اخوت اور عجز وایثار ان کی شخصیت کا حسن تھا۔

مجید امجد کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ عالمی حالات دگرگوں ہیں اور بے روزگاری افلاس ، بھوک اور اقدار کی پامالی اس عہد کا واضح نشان بن چکی ہے۔ ایسی صورتحال میں مجید امجد اپنے ذاتی تجربے کو عصری تجربے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اور اسکا پہلا اظہار ان کی نظم " شاعر" میں ہوتا ہے۔

یہ دنیا یہ بے ربط سی ایک زنجیر
یہ دنیا یہ اک نامکمل سی تصویر
یہ دنیا نہیں میرے خوابوں کی تعبیر
یہ محلوں ، یہ تختوں ، یہ تاجوں کی دنیا
گناہوں میں لتھڑے رواجوں کی دنیا
محبت کے دشمن سماجوں کی دنیا
(کلیات مجید امجد
،ص:٤٧)

اسی حوالے سے ان کی قابل ذکر نظم " قیصر یت " ہے ۔جو دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر ردِ عمل کے طور پر لکھی گئی تھی۔ اسی نظم کی اشاعت کے سبب انہیں اخبار " عروج "کی ادارت سے الگ ہونا پڑا ۔یہ نظم تین حصوں پر مشتمل ہے۔ جس کے پہلے حصے میں ایک سپاہی کو میدان جنگ کی طرف جاتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور بیوی بچوں سے جدائی کا نقشہ عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں اس سپاہی کی موت اور سپاہی کی بیوہ کا دوسری شادی کرنے کا ذکر ہے جبکہ تیسرے حصے میں دکھایا گیا ہے کہ اس مقتول سپاہی کا بیٹا کس

طرح زمانے کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے اور آخر بادشاہ کے گھوڑے تلے روندا جاتا ہے اور زندگی کی بازی ہار دیتا ہے۔اس دکھ اور کرب کو انسان دوست مجید امجد نے اپنی نظم "قیصریت میں اس انداز میں بیان کیا ہے۔

اس سپاہی کا وہ اکلوتا بیٹا
آنکھ گریاں ، روح لرزاں ، دل دونیم
بادشاہ کے محل کی چوکھٹ کے پاس
لے کے آیا بھیک کے ٹکڑے کی آس
اس کے ننگے تن پہ کوڑے مار کر
پہرے داروں نے کہا دھتکار کر
کیا ترے مرنے کی باری آگئی
دیکھ وہ شہ کی سواری آگئی
وہ مڑا ، چکرایا اور اوندھا گرا
گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روندا گیا

(کلیاتِ مجید امجد،
ص: ۸۹)

اسی پسِ منظر کی حامل دوسری نظموں میں ' 'راجا پرجا " اور" کلبہ وایواں " خاص اہمیت کی حامل ہیں ۔ ان نظموں میں بھی انہی طبقاتی تضادات کو دکھانے کی کوشش نظر آتی ہے جو تضادات ایک غلام معاشرے میں پائے جا سکتے ہیں ۔ نظم " راجا پرجا " کے اشعار دیکھیے ۔

پرجا کا آج نہ کل
شاخ ، نہ پھول نہ پھل
بھٹکے دل کا دل
بھوکا ، پیاسا ، شل
لاکھ برس کا پل
اور پھر اس کے بعد
مٹتے گورستاں

(کلیات مجید امجد ،
ص: ۱۲۷)

اس طبقاتی تضادات کی عکاس نظموں کے حوالے سے سعادت سعید لکھتے ہیں کہ

تیسری دنیا کا سماج ، تیسری دنیا کا فرد تیسری دنیا کا کرب مجید امجد کی شاعری کے بنیادی جوہر کا سر چشمہ ہے ۔ تیسری دنیا کا بطن ، طبقاتی رکاوٹوں ، فسطائی سنگینوں اور انسان کش جبر یہ اداروں کی بدولت متعفن زخموں سے چور چور ہے ۔ مجید امجد نے ان زخموں کو اپنے شعور کا حصہ قرار دے کر اپنی ذات کو جبر ، مصیبت ، غلامی اور فسطائیت کا ذمہ دار جانا ۔

مجید امجدؔ کے یہاں سماجی اور عمرانی شعور کا ایک پہلو ان کا گہرا طبقاتی شعور ہے۔ وہ اگرچہ عملی طور پر کسی تحریک یا پارٹی سے وابستہ نہ تھا۔ تاہم ان کے اندر امیرغریب ، ادنی اعلی ،حاکم محکوم ، استحصال اور سامراج کا شعور ان کی انسان دوستی کا غماز ہے۔ مجید امجد کی شاعری کا مجموعی جائزہ لیں تو اس میں لوئر مڈل کلاس کے فرد کے مسائل اور پریشانیاں نظر آئیں گی۔ وہ اپنے معاشرے کو قریب سے دیکھنے کے بعد جن کرداروں کا انتخاب کرتا ہے وہ کردار بھی نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ پنواڑی، بھکارن ، گداگر ، کلرک، بچہ ، تانگے بان اور اس طرح کے سینکڑوں کردار ان کی نظموں میں دکھائی دیتے ہیں ۔ ان کرداروں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ غیر اعلانیہ ترقی پسند ہو کر بھی ترقی پسند شعرا کی طرح طبقاتی شعور رکھتے تھے ۔ ان کی دو ایک نظمیں مثلاًَ " کہانی ایک ملک کی " اور " درسِ ایام " وغیرہ عام ترقی پسند شعرا کی طرح بلند آہنگ لہجے پر مشتمل ہیں ۔ تاہم عمومی سطح پر ان کا لہجہ نہ ہی سپاٹ ہوتا ہے۔نہ ہی یک رخا بلکہ نہایت دھیمے سروں میں اصل بات کہنے کا ہنر جا نتے ہیں ۔

مجید امجد ساری زندگی اپنے فن کے ساتھ پُر خلوص رہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے کے جبر ، استحصال، عدم توازن اور طبقاتی مسائل کو انہوں نے انسان دوست شاعر کی حیثیت سے بڑے قریب سے محسوس کیا ۔تاہم ان کے اظہار کا انداز جداگانہ ہے۔ نظم " درسِ ایام " کے اشعار دیکھیئے جو ترقی پسند شعرا کے بلند آہنگ لہجے کے حامل ہیں ۔

یہ بات ، گلبنِ غمِ ہستی کی ٹہنیاں
اے کاش ! انہیں بہار کا جھونکا نصیب ہو
ممکن نہیں کہ اسکی گرفتِ تپاں سے تم
تا دیر اپنی ساعدِ نازک بچا سکو
تم نے فصیل قصر کے رخنوں میں بھر تو لیں
ہم بے کسوں کی ہڈیاں لیکن یہ جان لو
اے وارثانِ طرہ ئطرف کلاہ کے
سیلِ زماں کے ایک تھپڑے کی دیر ہے

(کلیاتِ مجید امجد ، ص: ۲۲۷)

مجید امجدؔ کی ایک او ر نظم " کہانی ایک ملک کی " کے اشعار دیکھیئے ۔ یہ نظم پاکستان کے سیاسی و سماجی نظام اور طبقاتی تضاد کی عکاس ہے ۔ پاکستان میں جس طرح جاگیردارانہ نظام ، ملائیت اور اکہری سوچ کے حامل دانشوروں نے اپنا تسلط جمایا ہے۔ یہ نظم اس کے خلاف واضح اعلامیہ کا درجہ رکھتی ہے اور مجید امجد کی انسان دوستی کی غمار ہے ۔ مجید امجد نے اسمبلیوں کے اندر کی کارروئی کا نقشہ عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے کہ کس طرح کوڑھی ذہن غریبوں کی تقدیروں کو اپنے ہاتھوں میں تھامے ان کی تقدیروں کے مالک بن بیٹھے ہیں ۔

راج محل کے اندر اک اک رتناسن پر
کوڑھی جسم اور نوری جامے
ردگی ذہن اور گردوں پیچ عمامے
جہل بھرے علاّمے
ماجھے ، گامے
بیٹھے ہیں اپنی مٹھی میں تھامے
ہم مظلوموں کی تقدیروں کے ہنگامے
جیبھ پہ شہد اور جیب میں چاقو
نسل ہلا کو
(کلیاتِ مجید امجد،
ص:۲۸۵، ۲۸۶)

نظم کا تیسرا حصہ اس غریب طبقے کی نشاندہی کرتا ہے جو ان تمام ہنگاموں سے بے نیاز ہ ہو کر محنت و مشقت کیے جا رہا ہے۔ یہ لوگ تمام آسائشوں اور سہولتوں سے دور آگ پی کر بھی پھول کھلا رہے ہیں ۔

راج محل کے باہر ، سوچ میں ڈوبے شہر اور گاوں
ہل کی انی ، فولاد کے پنجے
گھومتے پہیے ، کڑیل باہیں
کتنے لوگ کہ جن کی روحوں کو سندیسے بھیجیں
سکھ کی سیجیں
لیکن جو ہر راحت کو ٹھکرائیں
آگ پئیں اور پھول کھلائیں
(کلیاتِ مجید امجد
۔ص ۲۸۶)

مجید امجد کے رویے کے حوالے سے یحییٰ امجد لکھتے ہیں ۔

ان کی زندگی کا نقطہ نظر کچھ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ موجودہ نظام میں کوئی سی بھی زندگی ہوامیر ، غریب ، شاہ گدا سب ہستی کی جبریت --- بے معنویت کے اسیر ہیں ۔ جبر کی رو میں مزدور بھی ہے، دانشور بھی مفکر اورمورخ بھی اور غالباَ کوئی سا بھی نظام سرمایہ داری یا اشتراکیت اور کوئی سی بھی اخلاقیات مادی یا روحانی ۔ جاگیردارانہ یابوژو اجمہوری ، اشتراکی یا فاشی انسان کو اس بنیادی جبریت سے نجات نہیں دلاسکتی ۔

مجید امجد کو جن دو واقعات نے شدید متاثر کیا وہ دو پاک بھارت جنگیں تھیں ۔ ۱۹٦۵ کی جنگ کے حوالے سے لکھی جانے والی نظموں میں " خطہ پاک " ، سپاہی " اور " چہرہ مسعود " اہمیت کی حامل ہیں ۔

ان نظموں میں ان کی اپنی زمین سے قربت ، وطن دوستی ، جوش ، جرات اور انسان دوستی کا رنگ نظر آتا ہے۔ ان کی خوبی ہے کہ انہوں نے دلی کیفیات کو لفظوں کا روپ دیا ہے ۔ نظم " چہرہ مسعود" کے اشعار دیکھیئے۔

کوئی اگر دیکھے تو آج اس دیس میں ، بانس کی باڑھ میں دھان کے کھیت میں ، ٹھنڈی ریت میں

جگہ جگہ پر ---- بکھری ہوئی نورانی قبریں ،
آنگن آنگن روشن قدریں
مائیں ____ جن کے لال ____ مقدس مٹی
بہنیں ____ جن کے ویر ____ منور یادیں
بالک ____ جن کی مایا ____ بے سدھ آنسو
مرنے والے کیسے لوگ تھے ان کا سوگ بھی
اک سنجوگ ہے، ان کا دکھ بھی ایک عبادت
کیسے لوگ تھے ، موت کی لہر پہ آگ کی پینگ
میں جھولے تجھ کو نہ بھولے ، ہم کو نہ بھولے
(کلیاتِ مجید امجد،ص: ٤٣٥)

١٩٦٥ کے بعد ١٩٧١ ء کی جنگ ، اس کے اثرات اور سقوط ڈھاکہ کو مجید امجد نے شدت سے محسوس کیا تھا۔ اس تناظر میں ان کا شاعرانہ شعور نہایت گہرا ہے ۔ اگرچہ اس حوالے سے لکھی جانے والی نظموں میں گہرا دکھ اور ہمدردی کے جذبات ہیں جو ان کی انسان دوستی کی اقدار ہیں ۔تاہم وہ اس واقعہ کے ذمہ دار عناصر کے بارے میں کچھ نہیں لکھتے۔ اس واقعہ کا ان کی شخصیت پر گہرا اثر مرتب ہوا تھا اور اسے انہوں نے داخلی طور پر اپنا ذاتی غم سمجھ کر محسوس کیا تھا۔

ناصر شہزاد اپنے مضمون " بیتے سمے یادوں کی رو میں " میں اس واقعہ کو بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں ۔

ڈھاکہ فتح ہو جانے کے بعد مجید امجد اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے اور انہیں ان لوگوں سے چڑ ہو گئی تھی۔ جنہوں نے ملک کو جنگی نیر نگوں کے سپرد کیا تھا، اسی طرح وہ قوم کے اکا برین سے بھی بد دل تھے کیونکہ وہ دھرتی جس پر نذالاسلام جیسے شبدکار اور کوی جسیم الدین جیسے فنکار ہوں اسے کھویا نہیں جا سکتا۔

مجید امجد نے اس حوالے سے جو نظمیں لکھی گئی ان میں " ٢١ دسمبر ١٩٧١" ، ریڈیو پر اک قیدی " چیونٹیوں کے ان قافلوں " سب کچھ ریت " اور ہم تو سدا " قابل ذکر ہیں ۔ نظم " ہم تو سدا " کے اشعار توجہ کے طالب ہیں ۔ اس نظم میں ایک بکھرے اور ٹوٹے ہوئے شخص کی ذات کا نوحہ ہے جو اپنے اندر گردو پیش کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر اپنے اندر جھانکتا ہے۔ یہ کرب انگیز نظم اس واقعہ سے متاثر ہونے والے ہر شخص کا نوحہ بننے کی اہلیت رکھتی ہے۔

" ہم تو سدا تمہاری پلکوں کے نزدیک رہے ہیں "--- آنسو ہم سے کہتے ہیں ۔

" تمہیں تو تھے جن کی آنکھوں پہ تمہارے بھرے بھرے
پھیپھڑوں کے
ٹھنڈے ٹھنڈے دخان تھے
اور تم ہم سے ہو گئے تھے کچھ ایسے بے نسبت
اتنے بے نسبت کہ تم اپنے لہو کو پانی نہیں سمجھتے
تھے-----"
آنسو سچ کہتے ہیں ہم اب سمجھے ہیں
اب ہم روئے ہیں تو آنسو ہم پر ہنستے ہیں
بہہ گئے نا ہم سب کے لہو پانی کی طرح اس اپنے دیس میں
اس اپنے گھر میں
آج ہم اپنے جیالے بیٹوں کو روتے ہیں تو
آنسو ہم پر ہنستے ہیں ۔

(کلیاتَ مجید امجد، ص: ٦١٦)

غرض یہ کہنا درست ہے کہ اس وقعہ کا اثر ہنگامی نہیں دور رس تھا۔ مجید امجد بعض ایسے اوصاف کے مالک تھے جو نہ صرف ان کی ظاہری بلکہ تخلیقی شخصیت اور رویوں کو سمجھنے میں ممدو معاون ثابت ہو سکتے ہیں ۔ مجید امجدؔ عجزو انکساری کا پیکر فخر و تکبر اور نمود و نمائش کو ناپسند کرنے والے دوسروں کو تکلیف نہ پہنچانے والے انسان تھے ۔ وہ انسانیت کے حوالے سے " عمل خیر کے تسلسل " پر یقین رکھتے تھے۔ یہ وصف ان کی شخصیت اور فن دونوں میں نظر آتا ہے۔ انسانی رویے ،قدریں روایات اور ان کااحترام کرنا وہ درس انسانیت سمجھتے تھے۔ یہی وہ صفات ہیں جن کے سبب وہ ایک حلیم اور نرم خو اور انسان دوست کے طور جانے جاتے تھے اور یہی رویہ ان کی شاعری میں بھی غالب مزاج کے طورپر سامنے آتا ہے۔ اسرار زیدی مجید احمد کی انسان دوستی کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔

مجید امجدؔ کو انسانیت سے عشق اور انسانوں سے پیار تھا ۔ منافقت اور منافقانہ رویوں سے انہیں شدید نفرت تھی ۔ تاہم اپنے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کی بنا پر وہ ان لوگوں سے لُٹ جاتے تھے جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے ان سے دوستی اور محبت کا دم بھرتے تھے۔

قیوم نظر اور انسان دوستی (١٩١٤-١٩٨٩)

قیوم نظر مارچ ١٩١٤ ء کو پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں پیدا ہوئے ۔ ن۔ م ۔ راشد ، سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں ۔ قیوم نظر خود اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کہتے ہیں ۔

میری پیدائش پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں ہوئی -----
میری پرورش پنجاب کے مختلف شہروں اور قصبوں میں
ہوئی ۔ میرا بچپن مختلف طبقوں اور محلوں میں بسر ہوا۔
اس کی وجہ میرے والد کی ملازمت تھی ۔ وہ جہاں تبدیل ہو
کر جاتے اپنے خاندان کو بھی ساتھ لے جاتے۔ اس لیے میں
نے ابتدائی تعلیم ملتان اور مالا کنڈے سے لے کر دھرم شالہ
تک کے سکولوں میں حاصل کی۔ جب والد صاحب کا تبادلہ
امر تسر سے دھرم شالہ ہوا تو وہ خود پہلے چلے گئے اور ہم
سے کہ گئے کہ تم لوگ بعد میں آنا ۔ اس زمانے میں
سیالکوٹ سے دھرم شالہ تک ٹانگے چلتے تھے۔ میں اپنی
والدہ اور جھوٹے بہن بھائیوں کو ساتھ لے کر دھرم شالہ
روانہ ہوا یہ سفر تکلیف دہ اور طویل تھا۔ لیکن دھرم شالہ
کے لوگ وہاں کے پہاڑ اور ندیاں دیکھ کر میری سب کوفت
دور ہو گئی ۔ پھر میرے والد کا تبادلہ لاہور ہو گیا ۔ اس طرح
میں مختلف اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتا رہا یوں مجھے
مختلف قوموں کے افراد اور ان کی تہذیب کو سمجھنے کا
موقع ملا۔ ان سب باتوں کا میری زندگی پر گہرا اثر ہوا۔ ایک
بات جس پر میں برسوں فخر کرتا رہا ۔ وہ انہی سفروں کی
عطا تھی۔ کھلی فضا ، اچھا ماحول اور آگے بڑھنے کی
تحریک لاہور کے قیام سے ملی۔

قیوم نظر ایک انسان دوست انسان تھے۔ وہ دوسروں کے دکھ درد اور پریشانیوں کو نظر انداز کرنے کے بجائے اپنے مخصوص انداز میں انھیں دور کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ اپنی زندگی میں انہوں نے بارہا عملی ہمدردی کا ثبوت دیا۔ اگرچہ وہ زبانی ہمدردی میں ہمیشہ بخل سے کام لیتے رہے۔ وہ ایک ذہین اور حاضر دماغ انسان تھے۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی بڑی سلیقہ شعاری سے گزاری ۔ اگرچہ بے شمار اقتصادی مسائل کا شکار بھی ہوئے ۔ مگر کبھی حرفِ شکایت زباں پر نہ لائے۔

قیوم نظر نے بھر پور لگن سے دوستی کے تقاضوں کو نبھایا۔ دوستوں کی رفاقت کو انہوں نے متاعِ زندگی جانا۔ ان کے غم میں برابر شریک رہے۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ دوستوں کے لیے پریشان ہوتے تو اس غم یا دکھ کا اظہارکھلے بندوں نہ کرتے بلکہ انہوں نے اپنے ہر دکھ کو قہقوں کے پردے میں چھپائے رکھا۔ ان کی پوری زندگی اس بات کی غماز ہے کہ انہوں نے اپنی ذاتی آسائش کو ہمیشہ ثانوی حیثیت دی۔ اس سلسلے میں ریاض احمد " رقم طراز ہیں ۔

دنیا دار کے ساتھ ساتھ وہ (قیوم نظر) کچھ راہب بھی واقع ہوا
ہے۔ راہب سے میری مراد یہ ہے کہ اپنی ذات کی حد تک وہ
بہت کچھ بے نیاز ہے اور ذاتی ضرورتوں کو اس نے بہت
کچھ گھٹا لیا ہے۔ ان کا غلام ہو کر نہیں رہ گیا۔ مثلاً وہ اپنی
شاعری کے زعم میں اپنا حلیہ نہیں بگاڑ لیتا اپنے دینوی

معاملات سے پوری سوچ بچار اور ذمہ داری کے ساتھ عہد بر آہونے کی کوشش کرتا ہے ۔

قیوم نظر کی ادبی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ حلقہ اربا بِ ذوق کے شاعروں میں میرا جی کے بعد جو تین شاعر سب سے زیادہ نمایاں ہوئے وہ قیوم نظر ، مختار صدیقی اور ضیا جالندھری ہیں ۔ ان شاعروں نے حلقہ ارباب ذوق کی نظم نگاری کی تحریک کوآگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ قیوم نظر حلقہ ارباب ذوق کے تنظیمی معاملات کے ساتھ ساتھ باقی شعراء سے کہیں زیادہ وابستہ رہے ۔ چنانچہ حلقہ کے حوالے سے نظم نگاری کی تحریک کو مستحکم کرنے میں ان کی عملی کوششیں دوسرے شعراء کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں ۔

قیوم نظر کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں معلومات کم ہیں ۔ چنانچہ ہم یہ نہیں کہ سکتے کہ شاعر کی افسردگی میں ان کے ذاتی حوادث کا عمل دخل کتنا ہے ۔ تاہم ان نظموں میں کارفرماسماجی ماحول کو فوراَ پہچانا جا سکتا ہے۔دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں رونما ہونے والی اقدار کی شکست و ریخت ، ماحول کی نا سازگاری اور بعض ادبی تصورات نے قیوم نظر کی شاعری کو ایک لہجہ عطا کیا ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار موضوعات ہیں جو ان کی شاعری میں بکھرے پڑے ہیں ۔ جن میں عصری صداقتوں کا اظہار ، دھرتی سے پیار کا رشتہ ، معاشرتی صورتحال اور سب سے بڑھ کر قوت مشاہدہ گہرا اور وسیع ہے۔ وہ انسانوں کی عادات و خصائل کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں اور پھر انسانی کیفیات کے اظہار کے لیے فطرت کے استعارے تلاش کرتے ہیں اور اس تلاش میں وہ ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں ۔ نظم " بنی آدم " میں انہوں نے ایک مکمل استعارہ پیش کیا ہے اور جنگل کی جزئیات انسانی تقدیر کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہیں ۔

یہ بھیانک ، سیہ ، گھنا جنگل
جس کی صورت سے خوف طاری ہے
کون جانے کھڑا ہے یوں کب سے
وقت پر اس کی عمر بھاری ہے
موٹے موٹے تنے درختوں کے
جھریاں چھال پر درشت و مہیب
سمٹے سمٹے سے زرد رو پتے
ساتھ موسم کے آتے جاتے ہوئے

(قلب و نظر کے سلسلے ۔ ص ۵۷۲)

قیوم نظر کے ہاں افسردگی اور اداسی کا تصور نہایت واضح طور پر دکھائی دیتا ہے ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا دل بجھا ہوا ہے ۔ شام کی تاریکی انہیں سکون دیتی ہے جبکہ روشنی انہیں بے سکون کر دیتی

ہے۔ یہ غم ان کے دل سے پھوٹتا ہے اور انہیں مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے ۔ان کی کئی نظمیں ایسی ہیں جن کی ابتدا تو فطرت کے حسین نظاروں سے ہوئی ہے لیکن اختتام غم ہی پر ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں سکھ اور خوشی کے لمحات عارضی اور دکھ اور غم کے لمحات دیر پا ہوتے ہیں ۔ دکھ کے ان طویل لمحات کا ذکر اپنی نظم " بے خوابی " میں کرتے ہیں ۔

وقت کا سیل رواں آیا وہ لمحات لیے
جو نہ گزریں گے نہ لائیں گے دلآویز سحر
مضمحل چاند رہے گا یونہی یہ رات لیے
(قلب و نظر کے سلسلے، ص: ۱۵۰)

اسی طرح غم کی کیفیت کا اظہار اپنی نظم " شام " میں اس انداز سے کرتے ہیں ۔

رات کی سرمگیں زلفوں کے اسیر
ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں ، تارے
نوحہ خوانی کو نکلے ہیں ، بارے
دن کی میت پہ بھرم کھل گیا عیاری کا
(قلب و نظر کے سلسلے ، ص: ۱٦۰)

قیوم نظر نے اپنے غم کو مظاہر فطرت تک پہنچادیا ہے ۔ چنانچہ تارے ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں بن گئے ہیں ۔ چاند اداس ہوگیا ہے اور کلی کلی کا دل چاک ہے ۔ نظم " برسات کی رات " کے اشعار ملاحظہ کیجیے۔

اب بندھ گیا تار آنسووں کا
روتی ہے عجیب سادگی سے
پر ہول و مہیب دلکشی سے
غمناک ہوئے ہیں خاروخاشاک
دل چاک ہوا کلی کلی کا
بڑھنے لگا درد زندگی کا
(قلب و نظر کے سلسلے ۔ ص :۵۸۰)

یہ اداسی جو قیوم نظر کی شاعری کی رگوں میں دوڑ رہی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں ۔

ان نظموں میں افسردہ دلی اورغم کی ایک برقی رو دوڑتی چلی گئی ہے۔ جو اس بات پر دال ہے کہ شاعر اپنے ماحول اور زندگی سے احساسی اور جذباتی طور پر منسلک ہے اور اس نے زمانے کے وار کو اپنے دل کی ڈھال پر روکا ہے۔ زمانے ، ماحول اور زندگی کے ان چرکوں میں کچھ تو ایسے ہیں جن کا تعلق شاعر کی شخصی زندگی سے ہے اور کچھ ایسے ہیں جو وقت کی ناسازگاری کی پیداوار ہیں ۔لیکن

جنہیں شاعر کی حساس طبیعت اور نازک طبع نے آن واحد میں محسوس کر لیا ہے ۔

قیوم نظر ایک حساس انسان ہیں ۔ وہ کسی واقعے یا سا نحے کو دیکھ کر آگے نہیں بڑھتے بلکہ اس پر غور و فکر کرتے ہیں ۔ اور یہی ایک انسان دوست شاعر کی پہچان ہے کہ وہ اس واقعہ یا سانحہ کو اپنے جذبات کی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرتا ہے ۔ وہ زندگی کی خستہ حالی پر بھی پریشان ہوتے ہیں ۔ کیونکہ ان کے نزدیک زندگی ایک جبر مسلسل ہے۔ اور انسان اسکو جینے پر مجبور ہے ، نظم " عشق گریزاں " کے اشعار دیکھیے ۔

ہمکنار غم ہو کر
لطف زندگی کھو کر
آج اور کل ، برسوں
بے بسی کے بل برسوں
زہر زیست پینا ہے
آدمی کو جینا ہے

(قلب و نظر کے سلسلے ، ص: ۷۷ھ)

اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں ۔

جدید اردو نظم میں ایک طویل تعمیری رجحان کا رد عمل کچھ اس طرح نمورار ہواہے کہ ہمارے بیشتر نظم گو شعرا سیاحت قلب کی طرف مائل ہوگئے ہیں اور ان کی نظموں میں غم ، کسک اور افسردہ دلی کی وہ کیفیات نمایاں طور سے ابھر آئی ہیں جو دروں بینی کے عمل کی رہین منت ہوتی ہیں اور جو جدید دور سے قبل کی نظم میں ایک بڑی حد تک مفقودتھیں ۔ اردو نظم میں افسردہ دلی اور کسک کی ایک نمایاں مثال قیوم نظر کی شاعری ہے۔

قیوم نظر کے نظریہ زندگی کا ایک پہلو تو وہی بے اطمینانی اور بد حالی ہے ۔ لیکن دوسری طرف وہ زندگی کو اہم سمجھتے ہوئے اس بات کی ترغیب دیتے ہیں کہ اس کو عزم و ہمت اور خوشی کے ساتھ بسر کیا جائے ۔ ان کی نظموں میں زندگی کا جوش و ولولہ دکھائی دیتا ہے ۔ انہیں اچھے دنوں کی امید ہے ۔ وہ خوشگوارصبح کے منتظر ہیں ۔ وہ قنوطیت کے سائے سے نکل کر رجائیت کی طرف قدم بڑھاتے ہیں ۔ وہ ہر طرف پھیلتے ہوئے اندھیرے اور تیرگی میں روشنی کے دیے منور کرنا چاہتے ہیں ۔ ان کی خواہش ہے کہ دنیا سے ظلمت کے بادل چھٹ جائیں اور یہ جنتِ ارضی بن جائے۔ محبت ، امن اور انسان دوستی کا یہی پیغام وہ سارے عالم میں عام کرنا چاہتے ہیں ۔

قیوم نظر جب دیکھتے ہیں کہ ہر طرف اندھیرا چھا چکا ہے اور تیرگی بڑھتی چلی جا رہی ہے تو وہ اس اندھیرے کو پاٹنے کے لیے درد کی قندیل جلاتے ہیں ۔ نظم " مآل " کے اشعار ملاحظہ کیجیئے ۔

جانے کیوں اب یہ گماں ہوتا ہے
اپنی سنگین خموشی کو لیے
اک نئے سانچے میں ڈھلنا ہے مجھے
اور اسی درد کی لے کر قندیل
جس کو تاریکی میں رکھا اب تک
اپنے ہی سائے پہ چلنا ہے مجھے
(قلب و نظر کے سلسلے ،
ص:٦٢٤)

قیوم نظر کا طبقاتی شعور بھی بہت گہرا تھا ،۔ وہ امیر اور غریب کے درمیان وسیع طبقاتی خلیج سے نا واقف نہ تھے ۔ جب وہ ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی بے بسی اور لاچاری کو دیکھتے ہیں تو ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے ۔ تب ان کے دل میں ظالم سے نفرت اور مظلوم سے ہمدردی کے جذبات شدت اختیار کر جاتے ہیں ۔ کیونکہ وہ ہر شخص کو خوش حال دیکھنے کے متمنی ہیں ۔ وہ دولت کی اس غیر مساویانہ تقسیم کے سخت مخا لف ہیں جو امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بنا دیتی ہے ۔ اس سلسلے میں " پروفیسر صدیق جاوید " قیوم نظر کی انسان دوستی کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔

قیوم نظر اپنی بیشتر نظموں میں ایک انسان دوست اور ہر نوع کے ظلم ، استحصال اور استبداد کا دشمن دکھائی دیتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اسے مختلف زمانوں کی جنگ کی المناک تباہ کاریوں سے متاثر ہونے والی معصوم اور بے گناہ لوگوں کی برباد اور ویراں زندگیوں کا دکھ ہے۔ اس کو ذاتی تجربات و حوادث سے مجبور حقیر اور بے بس مخلوق سے ایک جذباتی تعلق اور ہمدردی ہے۔ اس کے اس رویہ کا اظہار اس کی اکثر نظموں میں بلاواسطہ ہی سہی ، موجود ضرور ہے ۔

قیوم نظر نے طبقاتی شعور سے متعلق بہت سی نظمیں لکھی ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم " کلرک کا نغمہ " طبقاتی شعور کی بہترین آئینہ دار ہے۔ جس میں انہوں نے ایک کلرک کی مجبور، بے بس اور لاچار زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے ۔ اشعاردیکھیئے ۔

ہو صبح کی شام اور رات کا دن
یہ چکر کیا ہے قدرت کا
صدیوں کے کہنہ نظام میں یوں
کچھ دخل نہیں ہے ندرت کا
لوہے کی مشینوں کی صورت
انسان بھلا کیوں کام کرے
گھس پس کر جبر کی چکی میں
کیوں صبح زیست کی شام کرے

(قلب ونظر کے
سلسلے)

قیوم نظر کی نظموں میں گہرا معاشرتی شعور بھی موجود ہے ۔ انہوں نے سیاسی اور ملی موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں ۔ خصوصاً مسلمانوں کی جدوجہد آزادی اور ۱۹۴۷ کے فسادات کے حوالے سے ان کی نظمیں خاصی اہمیت کی حامل ہیں ۔ اس کے علاوہ جنگِ عظیم کی ہولناکیوں کا بھی انہیں شدید احساس تھا۔ ان کی نظمیں " جنگ " جوانی اور " شبخون " خاص طور پر دوسری جنگ کے تباہ کن اثرات کی عکاسی کرتی ہیں ۔ نظم " شبخون " میں وحشی درندوں کے گھوڑے کے قدموں کی چاپ صاف سنائی دیتی ہے ۔ تقسیم ہند کے بعد جس طرح ظلم وتشدد کا بازار گرم ہوا اور خون کی ہولی کھیلی گئی ، عورتوں کی عصمتوں کو تار تار کیا گیا اور مجبور اور کمزور انسان جس طر ح بے بسی کی علامت بنا رہا ۔ انسان دوست قیوم نظر نے ان تمام حالات کا نقشہ بڑی ہمدردی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نظم " شبخون " کے اشعار دیکھیئے ۔

وحشی گھوڑے مگر ہیں فسانے
وقت نے جن سے تراش لیے ہیں
الٹے سیدھے لاکھ بہانے
سکندر ، چنگیز ، ہلاکو
یکساں تھا ان سب کی نظر میں
چشمہ حیواں چشمہ باکو
اب بھی وہی ہے فطرت آدم
بربادی میں ہے عظمت آدم

(قلب و نظر کے سلسلے،
ص: ۶۰۷، ۶۰۸)

دوسری طرف نظم " جنگ " کے اشعار دیکھیئے ۔ جس میں عورتوں کی بے بسی عیاں ہے ۔

جمیل خاک کے ذروں پہ بیوگی کے نشاں
برہنہ گر سنگی بار زندگی سے چور
مہیب صبر کے دامن میں بے بس مستور

(قلب و نظر کے سلسلے ۔
ص ۵۹۱)

قیوم نظر کی ان نظموں کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا یوں رقم طراز ہیں۔

قندیل کی بیشتر نظمیں چونکہ دوسری جنگِ عظیم کی پیداوار ہیں ۔ لہٰذا شاعر کی فطری اداسی ، جنگ کی ہولناک اور کرب انگیز کیفیات سے بھی ہم آہنگ ہے۔ ان نظموں میں جنگ کی ہولناکیوں اور تباہیوں سے پیدا ہونے والی اجتماعی اداسی کسی شخصی نقصان کے احساس سے لبریز دکھائی

دیتی ہے اور یہی ان نظموں کی اہم ترین خصوصیت ہے۔
دوسرے لفظوں میں شاعر نے جنگ کے موضوع کا سہارا
لے کر کسی مخصوص نقطہ نظر کی ترویج اور اشاعت کی
کوشش نہیں کی بلکہ محض جنگ کو اپنے شخصی احساسات
کے آئینے میں سے دیکھنے پر اکتفا کیا ہے ۔نتیجتاً جوتا ثر
وجود میں آیا ہے جنگ اور انسانی تباہی کے مظاہر سے
نفرت کا تاثر ہے۔ کسی مخصوص مکتبہ فکر سے ہم آہنگی یا
انحراف کا تاثر نہیں ۔

قیوم نظر حبِ وطن کے جذبے سے بھی سر شار ہیں ۔ یہی وجہ ہے
کہ انہوں نے کئی ملی اور قومی ترانے لکھے ۔ ۱۹٦۵ اور ۱۹۷۱ کی
جنگ میں پاکستانیوں کے حوصلے بڑھانے اور جوش کوابھارنے کے
لیے بھی انہوں نے ترانے لکھے ۔ آزادی کشمیر کی تحریک سے بھی ان
کی گہری وابستگی تھی ۔ حب وطن کے موضوع پر لکھی جانے والی
نظموں میں " پرچم پاک " لاہور ہے پاکستان کا دل "، " ستارہ ہلال کے
محافظو " سری نگر کی بیٹیاں " " ہم وطن کے پاسباں " ، سقوط ڈھاکہ "
اور " جنگی قیدیوں کی آمد پر " قابلِ ذکر ہیں ۔ نظم "جنگی قیدیوں کی
آمد پر " کے اشعار دیکھیئے۔

گوشے گوشے میں گلشن کے خوشبوؤں کی
لہریں پہنچیں دھوم مچی ہے۔
پتی پتی ناچ رہی ہے کلیوں کے رنگیں ہونٹوں
پر تازہ ہنسی ہے ۔
بدلا ہوا ہے ایسا نقشہ برسوں دیکھی ہوئی
صورت ان دیکھی ہے ۔

(قلب و نظر کے
سلسلے،ص:۹۳۱)

نظم " وادی کشمیر " کے اشعار ملاحظہ کیجیئے ۔ جس میں قیوم
نظر کے دل میں وطن کی بے پناہ محبت بسی ہوئی ہے کیونکہ پاکستان
کی بقا کا مسئلہ کشمیر سے وابستہ ہے۔

وقت آیا ہے کہ اب تیرے پریشاں ذرے
تیری آغوش میں جینے کا سہارا لے کر
تیری آزادی کا ساماں بنیں تجھ سے ملیں
اور وہ بہتے ہوئے گیت وہ شیریں نغمے
جن کو خاموش کیا آ ہنی آوازوں نے
پھر تیرے خوں سے نہائے ہوئے کھیتوں سے
اٹھیں

(قلب و نظر کے
سلسلے،ص:٦۹۲)

قیوم نظر سماجی زندگی کے گھناونے پہلو کا بھی احساس اس
رکھتے ہیں ۔ اگر چہ وہ دھیمے لہجے کے شاعر ہیں اس لیے وہ جذباتی

کیفیات کاا ظہارسنجیدگی سے کرتے ہیں ۔ ان کی جذبات نگاری نعرہ بازی نہیں بلکہ جذبوں کا مہذب اظہار ہے اور ان جذبوں میں سوزوگداز اور انسان دوستی شامل ہے۔ وہ سماج کے ہاتھوں ستائے ہوئے اور ٹھکرائے ہوئے انسانوں سے گہری انسانی ہمدردی رکھتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں " مجبوری " اس بازار میں ایک شام " ، داشتہ " اور واپسی " قابلِ ذکر ہیں ۔ نظم " داشتہ" میں سماج کی ایک مظلوم عورت کاتصور ملتا ہے ۔ جسے انسان دوست قیوم نظر اشعار کے قالب میں یوں ڈھلتا ہے ۔

رات دھندلی تیرگی غمناک گھاس
ٹھہری ٹھہری مضمحل پھولوں کی باس
تنہا اداس

(قلب و نظر کے سلسلے
،ص:٦٤٤)

دوسری طرف نظم " جوانی " میں اس عورت کے جذبات اور دکھ کو بھرپور طور پر بیان کیا ہے جس کا خاوند جنگ کی نذر ہو گیا ہے، یہ عورت رحم کی طالب نظر آتی ہے۔ اشعار دیکھیئے ۔

تو نے روندا ہے اسے
جنگ لٹا میرا سہاگ
مادر گیتی میرے واسطے جاگ
وقت اڑا جاتا ہے

(قلب و نظر کے سلسلے،
ص: ٥٩٩)

قیوم نظر نے اپنے ماحول اور حسیات سے اثر پذیر ہونے کے بارے میں خود لکھا ہے۔

> میں اپنے گردو پیش سے بہت متاثر ہوتا ہوں اور بنی آدم کی بیشتر بو العجبیاں یا قدرت کے اکثر مظاہر مجھے اپنی دنیا میں گم کر کے مجھ پر داخلی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ گو اس سلسلہ میں ہر گوشہ کی عکاسی میرے بس کا روگ نہیں ۔ چنانچہ ہو سکتا ہے ان نظموں میں ملکی جھگڑے ، سیاسی نظریے ، سماجی الجھنیں اقتصادی مسائل اور وقت کے اوربیسوں جھمیلوں کے تارو پود بکھرتے ہوئے نظر نہ آئیں ۔ لیکن اسکا یہ مطلب نہ ہوگا کہ میں دنیائے رنگ بو میں کھو کر زندگی کی دوڑ میں ان باتوں سے بے خبر رہا ہوں ۔ میرے نزدیک ان نظموں کی جان دراصل یہی چیزیں ہیں اور ان نظموں کی رگ رگ میں اگر ان چیزوں کا خون رواں دواں نہیں تو کم از کم موجود ضرور ہے۔

قیوم نظر کا دور وہ تھا جب بر صغیر پر برطانوی سامراج کی حکمرانی تھی ۔ محکوم پر ظلم و تشدد کو روا سمجھا جاتا تھا ۔ چونکہ اس دور میں کسی شخص کو حکمرانوں کے خلاف لب کھولنے کی اجازت

نہ تھی ۔ اور جرم سرزد ہونے پر پابند سلاسل کر دیا جاتا تھا۔ ایسی صورتحال میں بھی انسان دوست قیوم نظر نے"بے بسی "،اپنی کہانی " اور حسن آوارہ " جیسی نظمیں لکھ کر ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور اپنی انسان دوستی کا ثبوت پیش کیا۔ نظم " اپنی کہانی " میں ہندوستان کی محکوم قوم کی صورتحال بیان کی ہے ۔ اس نظم میں انہوں نے ان کڑی یا بندیوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس قوم یعنی قیدی شیر پر لگائی گئی ہیں انہیں معاشی طور پر بدحال کیا گیا اور اسے ہر طرح سے مغلوب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ ان اقدامات سے شیر کو بے بس کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اب اس میں دوبارہ آزادی کی لگن پیدا ہو گئی ہے اور اس نے ان سلاخوں کو توڑ کر باہر نکلنے کی ٹھان لی ہے ۔ لہذا کچھ بعید نہیں کہ وہ بہت جلد آزادی کی نعمت سے مالا مال ہو جائے۔

ایسی دنیا میں کیا سیمگوں ہاتھوں سے اسے
دست و پا باندھ کے یوں فاقہ کشی پر مجبور
جام آزادی میں پیغام فنا ہو جیسے
تنگ و تاریک اب روزن زنداں کی طرح
تلخی جبر میں لیٹا ہوا پامال کچھار
جس میں وہ بھورا سا اک ڈھیر پڑا ہو جیسے
اس کی آنکھوں میں اتر آیا ہے احساس کا خوں
سرد لوہے کی سلاخیں ، یہ گراں دیواریں
توڑ ہی ڈالے گا اب ٹھان چکا ہو جیسے
(قلب و نظر کے سلسلے،
ص: ۵۹۶، ۵۹۷)

غرض جدید نظم کی تحریک میں قیوم نظر نے اپنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ جدید نظم کے بارے میں کوئی تحقیق ان کے ذکر کے بغیر نا مکمل ہے ۔ وہ ایک انسان دوست نظم گو کی حیثیت سے ہماری جدید اردو شاعری کا قیمتی اثاثہ ہیں ۔

اختر الایمان اور انسان دوستی (۱۹۱۵۔۱۹۹۶)

اختر الایمان کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب راشدؔ، میرا ؔجی اورفیضؔ جیسی طاقتوراور توانا آوازیں اُردو نظم کی دنیا میں گونج رہی تھیں ۔ اختر الایمان نے نہ صرف ان تینوں کی پیروی کی بلکہ اپنی انفرادیت کا سکہ بھی جمایا۔ انہوں نے اپنی نظموں میں اپنے عہد کے سیاسی ،سماجی ، معاشی اور معاشرتی ہر طرح کے مسائل وموضوعات کو جگہ دی ۔

اختر الایمان کی شخصیت کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنا بچپن والدہ سے دور ، بہن بھائیوں سے دور ، یتیم خانوں اور غیر محفوظ ٹھکانوں کی قباحتوں میں بسر کیا ۔ تنگدستی اور محتاجی کا منہ دیکھا ۔اخترالایمان کو جن تکالیف اور مصائب سے گزرنا پڑا اس کا ذکراپنی آپ بیتی "اس آباد خرابے"میں یوں بیان کرتے ہیں ۔

چلچلاتی دھوپ اور یخ بستہ سردیوں میں جب اس ندی کی
ریت پر سے ننگے پاوں گزرتاتھا تو میرے آنسو نکل آتے
تھے ۔تلووں کو دھوپ اتنا نہیں جلاتی تھی جتنا سردی
جلاتی تھی ۔مجھے اکثر احساس ہوتا ہے جیسے اس بستی میں
کئی جنم گزارے تھے ۔کتنا اتار چڑھاو دیکھا اور بھگتا جیسے
ہفت خواں طے کیا ہو۔

اگرچہ اختر الایمان نے زندگی میں کئی تکالیف دیکھیں ۔لیکن اس کے باوجود مایوس نہ ہوئے۔اس میں انکی قوت مدافعت اور محنت کے علاوہ بچپن کی اس مشق کا عمل دخل بھی ہے جب انہیں کھانے کے انتظار اور نا خوشگوار ماحول میں کنکریوں پر رزق کے حصول کے لیے ورد وظیفے کی راہ لگا دیا جاتا تھا۔

اخترالایمان اپنی آپ بیتی "اس آباد خرابے میں " اس کا ذکر
یوں کرتے ہیں ۔

سگھ مدرسہ چندے کے روپے پر کم چل رہا تھا اور اللہ کی
مرضی اور توکل پر زیادہ ۔یہاں کھانا کم اور کھانے کا
انتظارزیادہ رہتا تھا۔ راتوں کو افزائش رزق کے لیے چلہ
کشی اور قرآن خوانی ہوتی۔ جب کئی دن تک آس پاس کے
گاؤں سے کوئی دعوت یا کھانے کو نہیں آتا تھا ۔ لڑکوں کو
منہ اندھیرے اٹھایا جاتا تھا۔ انہیں کچھ کنکریاں دے دی
جاتیں جن پر وہ قرآن کی سورۃ کئی کئی بار پڑھ کر دم کیا
کرتے تھے۔

اختر الایمان ماحول کی اس تلخی کو اپنے طرزِ عمل سے ایثار،انصاف، اخلاق اور انسان دوستی سے چینلائز کرنے میں کامیاب رہے ہیں ۔ اختر الایمان ادب برائے ادب کے قائل نہیں تھے بلکہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے ۔ ان کی شاعری میں ایک مقصد دکھائی دیتا ہے۔ وہ معاشی ، سماجی ، سیاسی ، نفسیاتی، روحانی اور تاریخی وجوہ کی بنا پر شاعری کو"انسان کی روح کا کرب" قرار دیتے ہیں ۔ اسی کرب کے باعث انہیں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اب وسیع الخلق ،وسیع النظر،وسیع المشرب،وسیع الظرف اور وسیع الخیال لوگ کم ہو گئے ہیں ۔ ان کی شاعری محض ٹوٹے ہوئے آدمی کی شاعری نہیں بلکہ ٹوٹے ہوئے معاشرے کا نوحہ ہے۔ جس میں معاشرے کا ہر فرد ٹوٹ پھوٹ کا شکار نظر آتا ہے۔ نظم "کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام" کے اشعار دیکھیے۔

فرقت کی ماں نے شوہر کے مرنے پر کتنا کہرام مچایا تھا
لیکن عدت کے دن پورے ہونے سے اک ہفتہ پہلے
نیلم کے ماموں کے ساتھ بدایوں جا پہنچی تھی
بی بی کی صحنک ، کونڈے ، فاتحہ خوانی
جنگِ صفین ،جمل ، بدر کے قصوں

سیرت نبوی ، ترک دنیا اور مولوی صاحب کے حلوے مانڈے
میں کیا رشتہ ہے؟
(نیا آہنگ، ص: ۳۹۷)

اختر الایمان کی ایک نظم "میں تمہاری تخلیق" کے اشعار ملاحظہ کیجیئے جس میں آج کا ٹوٹا ہوا آدمی کل کے آدمی سے مختلف ہے۔آج کا آدمی تنگدل ،تنگ نظر ہے ۔دراصل اسکی عملی قدروں نے اسے ایسا بنا دیا ہے۔

میں ربڑ کا بنا ایسا ببوا ہوں جو
دیکھتا ، سننا محسوس کرتا ہے سب
پیٹ میں جس کے سب زہر ہی زہر ہے
پیٹ میرا کبھی گر دباو،گے تم جس قدر زہر ہے
اُلٹ دوں گا تم سب کے چہروں پہ میں
(نیا آہنگ، ص:۳۸٦)

اختر الایمان کی ذات ہندوستان کے ہر آدمی کی نمائندہ ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان کا کوئی آدمی بغاوت نہیں کرتا اور ظلم اور نامساعدحالات کے خلاف علم بلند نہیں کرتا اور چپ چاپ انہیں برداشت کرتا رہتا ہے تو ایسا نہیں یہ آدمی بزدل بھی نہیں اور نہ ہی کشت و خون اور قتل و غارت سے خوفزدہ ہوتا ہے بلکہ جو چیز اسے کمزور کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اسکی ساری شجاعت اور جوانمردی فرقہ ورانہ فسادات، صوبہ جاتی اور قومی تعصب تک محدود ہو چکی ہے۔ نظم "میرا دوست ابو الہول" کے اشعار دیکھیے۔

یہ دنیا تو ان شعلہ سامان لوگوں نے آپس میں تقسیم کرلی
جو ہتھیار کی شکل میں رنج و غم ڈھالتے ہیں
یا گولہ بارود کے کارخانوں کے مالک ہیں
یا پھر ثنا خواں ہیں ان کے
ہمارے لیے صرف نعرہ بچے ہیں
صنعتی دور کے کج کلاہوں کی دادودہش روح پرور ہو یا
جان لیوا
مگر زندہ باد ،آفریں ،مرحبا کے سوا کچھ نہیں پاس اپنے
یہ سب جانتا ہے ہماری شجاعت کی پرواز کیا ہے
ہماری جواں مردی اک صوبہ جاتی تعصب سے
یا فرقہ واری فسادات سے آگے کچھ بھی نہیں ہے
(نیا آہنگ ، ص: ۳۷۷)

اختر الایمان کے ہاں زندگی ایک سمجھوتے کا روپ دھار لیتی ہے جس میں ضمیر کو چھوڑ دیا جائے تو پیچھے صرف حیوانیت رہ جاتی ۔ اخترالایمان کی شاعری میں انسانیت اور حیوانیت کی یہ کشمکش مختلف روپ میں سامنے آئی ہے۔انہوں نے اپنی انسان دوستی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اپنی نظم " نقش پا" میں اپنے معاشرے کا وہ بھیانک روپ

دکھانے کی کوشش کی ہے۔ جس کا شکار معاشرے کا ہر غریب اور مفلس الحال انسان ہے۔

کوئی نیا افق نہیں جہاں نظر نہ آسکیں
یہ زرد زرد صورتیں یہ ہڈیوں کے جوڑ سے
(گرداب ،ص :۵۷)

نظم "پرانی فصیل " میں ان کے دل میں لوگوں کے لیے ہمدردی کا جذبہ اور شدت اختیار کر جاتا ہے اور معاشرے کا المناک روپ نا قابلِ برداشت ہوجاتا ہے۔ کسے معلوم تھا کہ انھوں نے اپنی نظم میں جن حقیقتوں سے پردہ اُٹھایا تھا وہ اس نظم کی تخلیق کے کچھ ہی دنوں بعد یعنی ۱۹٤۷ میں اپنی مکمل عریانی کے ساتھ شاہراہ عام پر ایک ایسے تماشے کے روپ میں نظر آئیں گی۔ جنہیں انسانی تاریخ صدیوں تک یاد رکھے گی ۔ اشعار ملاحظہ کیجیے

کہیں روتے بھٹکتے پھر رہے ہیں ہر طرف ہر سو
غلاظت آشنا جھلسے ہوئے انسان کے پلّے
یہ وہ ہیں جو نہ ہوتے تو کوکھ پھٹ جاتی مشیت کی
تمناوں میں ان کی رات دن کھینچے گئے چلّے
(گرداب، ص: ۸۱)

اختر الایمان معاشرے کے سماجی مسائل کو بیان کرنے میں خوب مہارت رکھتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مختلف علامتوں تمثالوں ، استعاروں اور تشبیہات سے کام لیتے ہوئے ہر ایک مسئلے کو بہت عمدگی سے بیان کیا ہے ۔ اپنی نظم "عمر گریزاں کے نام" میں وہ ایک عام شہری کے مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

صبح اُٹھ جاتا ہوں جب مرغ اذاں دیتے ہیں
اور روٹی کے تعاقب میں نکل جاتا ہوں میں
شام کو ڈھور پلٹتے ہیں چراگاہوں سے جب
شب گزاری کے لیے میں بھی پلٹ آتا ہوں
(آب جو ، ص:۲۸۵)

اختر الایمان کی شخصیت کے حوالے سے انور ظہیر خاں کے لکھے ہوئے خاکے میں کلیدی مواد ملتا ہے ۔ اختر الایمان کا یہ تجزیہ بصیرت افروز ہے کہ "دنیا کے سارے بکھیڑے اس بات کے ہیں کہ آدمی دوسروں کے حصے کی دھوپ بھی خود اوڑھ لینا چاہتا ہے ۔" اختر الایمان نے اپنی شاعری میں ماحول کی عکاسی کر کے انسانی ضمیر کو جگانے کی کوشش کی ہے ۔ اس سلسلے میں وہ طنز ، تنقید اور احتجاج سے کام لیتے ہوئے اصلاح معاشرت کا فریضہ سر انجام دینا چاہتے ہیں اور یہی ایک انسان دوست شاعر کی پہچان ہے ۔ انہوں نے اپنی نظم "سبزہ بیگانہ" میں انسانی ضمیر کی قید اور پکار کو موضوع سخن بنا کر معاشرے کے کئی المناک پہلو بے نقاب کیے ہیں ۔

مریض چیختا ہے درد سے کراہتا ہے
یہ ویت نام ، کبھی ڈومنیکن ، کبھی کشمیر

زرکثیر، سیہ قومیں ، خام معدنیات
کثیف تیل کے چشمے ، عوام ، استحصال
زمین کی موت بہائم ، فضائی جنگ ، ستم
اجارہ داری ، سبک گام دل رہا ، اطفال
(بنت لمحات ، ص: ۳٤۲)

اختر الایمان نے اپنے معاشرے کی بے ضمیری اور بے ایمانی کو اپنی کئی نظموں میں بیان کیا ہے ۔ جن میں "یادیں" "کتبہ "تبدیلی" ،"راستے کا سوال " بچھڑا ہوا آدمی " اور خاص طور پر نظم " ایک لڑکا " قابلِ ذکر ہے ۔ یہ نظم سماج کے پریشان حال طبقے کے ضمیر کی آواز ہے ۔ جسے آئے دن کسی نہ کسی مصلحت یا مجبوری کے تحت سماج سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے اور ضمیر کو چھوڑنا اس لیے بھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ اگر انسان محض حیوان ہو کر رہ گیا تو ہر اعلی قدر کی نفی ہو جائے گی ۔

وہ آشفتہ مزاج ، اندوہ پرور ، اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاکِ عالم پھونک ڈالے گا
(آب جُو، ص: ۲٦۱)

اختر الایمان کے ہاں معاشرے کے یہی برے بھلے لوگ ان کی توجہ کا مرکز ہیں ۔ عام لوگوں سے محبت ، ہمدردی اور انسان دوستی کا یہ جذبہ ان کی نظموں میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ نظم " کرم کتابی " میں ان کی انسان دوستی بھرپور انداز میں دکھائی دیتی ہے ۔

خدائے حاضر وغائب کی ہیں وہ بھیڑوں
جنھیں چراتے ہیں صدیوں سے رہبرانِ وطن
گزر رہے ہیں سبک گام تیری دنیا سے
جہاں تلاش معیشت ہے کربِ دارو رسن
کسی کا رزق ، کسی کے لیے پیالہء زہر
جہاں زمیں نہیں اب تک کسی کا بھی مامن
(بنت لمحات، ص: ۳۱۹)

اختر الایمان معاشرے میں مساوات ، انصاف اور انسان دوستی کی فضا پیدا کرنا چاہتے تھے ۔ اس اقتباس سے ا ن کی انسان دوستی جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

فطرت کی نعمتیں عام ہیں ۔ وہاں کوئی ترجیح و تخصیص نہیں ۔ ہم نے انسان اور انسان کے درمیان سماجی مرتبے اور پیشے کی بنیاد پر لکیریں کھینچ دی ہیں ۔ اہم چیز گھنے

ہوئے بانسوں کے ذریعے شہرت اور نام کا بنایا ہوا مچان
نہیں بلکہ اہم چیز ہے رحم ، انصاف ، انسان دوستی اورفیض
رسانی ۔

اختر الایمان اس بات پر بھی افسوس کرتے ہیں کہ لوگ مذہبی اقتدار سے بیگانہ ہو چکے ہیں اس سلسلے میں ان کی نظم " مسجد " ایک بہترین علامتی نظم ہے ۔ جس میں مذہب اور مٹتی ہوئی تہذیب کے لیے " مسجد " کی علامت استعمال کی گئی ہے ۔ اس میں مسجد مرثیہ خواں ہے کہ کوئی نمازی نہیں رہا ۔ " شکستہ کلس" مسجد کی ویرانی ، " ٹوٹی ہوئی دیوار " مذہب کے حفاظتی نظام میں آنے والی دراڑوں کی علامت جبکہ " چنڈول " ایک خوش الحان حفاظ کی علامت ہے۔ چونکہ وہ خود اور ان کے سننے والے دونوں مذہبی اقدار سے مخلص نہیں اس لیے یہ سب " پھیکا ساگیت " محسوس ہوتا ہے ۔ اشعار دیکھیے ۔

ایک ویران سی مسجد کا شکستہ ساکلس
پاس بہتی ہوئی ندی کو تکا کرتا ہے
اور ٹوٹی ہوئی دیوار پر چنڈول کبھی
گیت پھینکا سا کوئی چھیڑ دیا کرتا ہے

(گرداب، ص: ۸۷۰)

اختر الایمان معاشرے میں موجود دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف بھی آواز بلند کرتے ہیں ۔ جہاں دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ جاتی ہے اور غریب عوام مزید خستہ حالی کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ اپنی نظم " تنہائی میں " اس غیر منصفانہ تقسیم کی نشاندہی اور نا خوشگور ماحول کی عکاسی دو علامتوں کے ذریعے کرتے ہیں ۔ ان کے نزدیک " ببول " بے برگ وبار ، بے کیف اور بے رنگ زندگی کی علامت ہے جبکہ " تالاب " اس سرمایے کی علامت ہے جو چند ہاتھوں میں محدود ہو چکا ہے اور اب اس میں تازہ پانی یعنی کوئی حرکت نہیں ہے ۔ اس میں پانی باہر سے آکر ملتا تو ہے لیکن باہر نہیں جا سکتا ۔ ایک جگہ پڑے پڑے سڑنے کی وجہ سے اس میں ایسے جانور پیدا ہو گئے ہیں ۔ جنہوں نے سماج کو مختلف بیماریوں کا شکار کر دیا ہے ۔بقول جمیل جالبی ! " اختر الایمان میں صداقت بھی ہے اور خلوص بھی اور اسی لیے میں اسے شاعر الایمان کہتا ہوں "

ہاتھ پھیلائے ادھر دیکھ رہی ہے وہ ببول
سوچتی ہو گی کوئی مجھ سا ہے یہ بھی تنہا
آئینہ بن کے شب وروز تکا کرتا ہے
کیسا تالاب ہے جو اس کو ہرا کر نہ سکا ؟

(گرداب ، ص: ۹۱)

اختر الایمان کا کہنا یہ ہے کہ ۱۹٤۰ سے لیکر ۱۹٦۰ تک ان کی آنکھوں نے جو جو واقعات دیکھے۔ ان میں سول نافرمانی ،عدم تعاون کی تحریک ، دوسری جنگِ عظیم ، کانگریس میں ابتری ، اشتراکیت کا مقبول ہونا ، مسلم لیگ کا وجود میں آنا اور طاقتور جماعت بننا شامل ہے ۔ ان

تمام واقعات و سا نحات کو عام لوگوں نے بھی مشاہدہ کیا اور محسوس کیا اسی طرح میں نے بھی ایک حساس اور انسان دوست شاعر کی حیثیت سے محسوس کیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی مسائل کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ تاریخی واقعات کو بھی ایک ہمدرد اور انسان دوست شاعر کی حیثیت سے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ نظم " ایک سوال " میں قحطِ بنگال کی تصویر کشی ایک انسانیت نواز شاعر کے طور پر کی ہے۔

اسی لیے کیا اگا کریں گے
یہ نرم پودے یہ نرم شاخیں
کہ ان کو اک روز ہم اٹھا کر
خزاں کی آغوش میں سلادیں
میں سوچتا ہوں کہیں زندگی نہ بن جائے
خزاں بدوش بہار و خمارِ زہر آلود

(تاریک سیارہ،ص: ۱۸۳)

جنگ عظیم دوم کو بعض نظموں میں براہ راست موضوع بنایا گیا ہے ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم " قلو بطرہ " اہمیت کی حامل ہے۔ جس میں انہوں نے قلو بطرہ کو دوسری جنگِ عظیم کے سبب پیدا ہونے والی (قحبکی) کی علامت بنا کر پیش کیا ہے ۔ اسی طرح تقسیم ہندوستان کا موضوع بھی جہاں ایک عظیم فیصلے اور عظیم انسانی المیے کے طور پر اردو ادب میں متعدد شاعروں کا موضوع بنا ۔وہاں ان کے ہاں بھی یہ موضوع انسانی ہمدردی کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ اپنی نظم "پندرہ اگست " میں وہ اپنے رہنماوں اور حکمرانوں سے سوال کرتے ہیں ۔

وہی کسمپر سی وہی بے حسی آج بھی ہر طرف کیوں ہے طاری
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ میری محنت کا حاصل نہیں ہے
ابھی تو وہی رنگِ محفل جبر ہے ہر طرف زخم خوردہ ہے انساں
جہاں تم مجھے لے کے آئے ہو یہ وادیئ رنگ بھی میری منزل ہے
شہیدوں کا خوں اس حسینہ کے چہرے کا غازہ نہیں ہے
جسے تم اٹھائے لیے جا رہے ہو یہ شب کا جنازہ نہیں ہے ۔

(تاریک سیارہ ، ص: ۲۱۱)

بقول وارث علوی ! " اختر الایمان پتھرائی آنکھوں سے تاریخ کے ہولناک کھیل کو دیکھتے ہیں ۔ آنکھ سے آنسو نہیں گرتا مگر جگر خون ہو جاتا ہے جو ان کی شاعری کی حنا بندی کے کام آتا ہے ۔" دراصل اختر الایمان اپنی ارد گرد کی زندگی کو جیسا بے کیف پاتے ہیں اس کو ایسے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قاری کے دل میں اس

ماحول کے خلاف ایک طرح کی نفرت اور کراہت پیدا ہو جائے۔ اور یہی ایک انسان دوست شاعر کا کمال ہے ۔ نظم " یادیں " کے اشعار دیکھئے ۔

ساری ہے بے ربط کہانی دھندلے ہیں اوراق
کہاں ہیں وہ سب جن سے تھی پل بھر کی دوری بھی شاق
کہیں کوئی ناسور نہیں گوحائل ہے برسوں کا فراق
کرم فراموشی نے دیکھو چاٹ لیے کتنے میثاق
کھلی تو آخر بات اثر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں
(آب جُو، ص: ۲۷۰)

بقول خلیل الرحمن اعظمی !

انسان دوستی اور انسان پرستی کا عقیدہ ہماری شاعری میں پہلے بھی رہا ہے اور اب بھی ہے۔ لیکن اختر الایمان ان شاعروں میں سے ہیں جن کے ہاں یہ محض عقیدہ نہیں بلکہ ان کی اپنی زندگی کا مسئلہ ہے۔ انھوں نے انسان کو دیکھا اور برتا ہے ایک عام آدمی کی طرح زندگی کا دکھ درد جھیلا ہے اور اپنے طور پر حیات و کائنات کی سچائیوں کو دریافت کیا ہے ۔ اسی لیے ان کی شاعری کھری شاعری ہے وہ کسی منزل پہ رکے نہیں ۔

اختر الایمان کے ہاں سماج کی نا انصافی ، انسان پر انسان کا ظلم اور جبر و استحصال کا احساس شدید صورتحال میں ظاہر ہوتا ہے اوروہ اسکا علاج سوچنے لگتا ہے کہ اگر اس احساس کو ہی زائل کر دیا جائے تو شاید سکون کی دولت میسر آسکے۔ نظم" تنہائی میں " کا بند ملاحظہ کیجیے جس میں ان کے لہجے میں ایک خاص جوش اور ولولے کا اظہار ہوتا ہے۔

اب ارادہ ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا
تاکہ گھبراوں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں
ایسے انسانوں سے پتھرکے صنم اچھے ہیں
ان کے قدموں پر مچلتا ہے دمکتا ہوا خوں
میں بھی بے رنگ گناہوں کی شکایت نہ کروں
(گرداب، ص: ۹۰)

اپنے مجموعے کلام " زمین زمین" میں اختر الایمان اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں ۔

آخر میں صرف اتنا کہوں گا کہ بے دین آدمی اچھی شاعری کر ہی نہیں سکتا ۔ یہ اس کا کام ہے جو ایمان رکھتا ہو۔ خدا کی بنائی ہوئی تین چیزوں پر انسان اور اسکی انسانیت پر اسکی مجبوریوں اور لاچاریوں کو سمجھتا ہو ۔ جو مروجہ قدروں کو پہچانتا ہو اور ان میں اضافہ چاہتا ہو اور خدا کی بنائی ہوئی زمین سے محبت کرتا ہو اور اس بات پر کڑھتا

بھی ہو کہ انسان اسے خوب صورت بنانے کے بجائے بد
صورت بنا رہا ہے۔

مختار صدیقی اور انسان دوستی(۱۹۱۹ ۔ ۱۹۷۲)

مختار صدیقی کا شمار ان جدید شعر ا میں ہوتا ہے جنھوں نے شاعری کو نئے سیاسی و سماجی تناظر میں نئے موضوعات سے متعارف کرایا ۔ انہوں نے نظم کہی اور اپنے انداز سے کہی ۔اس نظم میں انہوں نے حیات و کائنات کے سر بستہ رازوں کو کھولنے کی سعی بھی کی اور قلبی کیفیات اور انسان دوستی کو بھی اپنا موضوع بنایا ۔ پنجابی سی حرفی کو اردو زبان میں متعارف کریا ۔ تصوف اور زندگی کے مختلف تجربات و مشاہدات کو اپنی شاعری کی زینت بنایا اور اپنی ایک الگ پہچان اور شناخت قائم کی ۔مختار صدیقی حلقہ ارباب ذوق کے سرگرم رکن تھے ۔ انہوں نے حلقے کے پلیٹ فارم پر رہتے ہوئے اپنی ناقدانہ صلاحیتوں اور شاعرانہ خصوصیات کو جلا بخشی ۔

بقول انور سدید !

حلقہ ارباب ذوق نے تاثرات ، علامت نگاری وجودیت ، سر ئیلزم کو اردو ادب میں روشناس کرایا اور تھوڑے عرصے میں یوسف ظفر ،قیوم ظفر، مختار صدیقی ، منیب الرحمان ، مجید امجد ، انجم رومانی اور ضیا جالندھری وغیرہ نے اتنی جاندار تخلیقات پیش کر دیں کہ زندگی کا کوئی زاویہ ان کے لمس سے محروم نہ رہ سکا۔

انسان دوست مختار صدیقی اپنا فکری مواد معاشرتی زندگی سے حاصل کرتے ہیں ۔اہم موضوع سے جب انہیں قریبی جذباتی لگاو پیدا ہوتا ہے تو اس پر غور و فکر کر کے اس کی مختلف تہوں کو کھول کر اسکی جزئیات میں ڈوب کر اس کے تلازمات کو ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں اور پھر داخلی طور پر اسے ایک مربوط شعری تجربے کی صورت میں منتقل کرتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی مختلف نظمیں " رسوائی " اور "بازیافتہ " " کیسے کیسے لوگ" اور " منزل شب " قابلِ ذکر ہیں ۔ " رسوائی " اور " بازیافتہ " میں سماج کے ہاتھوں ستائی ہوئی اور لٹی ہوئی عورت کی داستان غم کا بیان ہے " کیسے کیسے لوگ " میں ماحول کی بے اعتنائی کا نقشہ عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے ۔ " منزل شب " میں معاشرتی اونچ نیچ اور اس سے پیدا ہونے والی نا انصافیوں اور نا ہمواریوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے ۔ یہاں مختار صدیقی کی انسانی ہمدردی اور انسان دوستی کھل کر سامنے آتی ہے ۔ اشعار دیکھیے۔

اور اب دل کی تڑپ کہتی ہے یہ دنیا بھی کیا
کیسی بے نظمی سے ہوتی ہے یہاں جینے کی بات
سازوساماں چاہتا ہے موت کا سودا ہی کیا؟

بے گل و بے شمع کٹتی ہے یہاں ہستی کی رات
یہ سسکتی زندگی جیسے فنا کی ہو زکات
(منزل شب، ص: ۵٤)

انسان دوست مختار صدیقی دنیامیں امن و آشتی کے پیامبر ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ ہیرو شیما اور ناگاساکی جیسے زندگی سے بھر پور گہوارے درندگی اور انسانی پاگل پن کے ہاتھوں اک ذرے کے جوہر کی کرامت یعنی جوہری حملے سے فنا کا اندھا پاتال بنتے دیکھتے ہیں تو ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے ۔ وہ ناگاساکی جو حسین و جمیل آبادیوں کا مسکن تھا اور ہرو شیما جو صنعت کا گہوارہ تھا ۔ سب خاک کی نذر ہو چکا ہے ۔ عمارتیں کھنڈرات بن چکی ہیں ۔ ایسی صورتحال میں وہ اپنی نظم " آخری بات " میں تباہ شدہ شہروں کا ذکر بہت دکھ اور کرب کے ساتھ کرتے ہیں اور ان کی تمام ہمدردیاں ان دکھی لوگوں کے ساتھ دکھائی دیتی ہیں ۔

زلزلے آئے نہ آشوب ِقیامت سے مٹے
دونوں اک ذرے کے جوہر کی کرامت سے مٹے
کارکن ، محنتی ، مزدور ، ہمکتے بچے
بن گئی دوزخی آسیب کی پرہول مثال
یہ ہے قابیل کی تاریخ کا وہ باب فنا
جس پہ عبرت کو بھی ہوتی نہیں رونے کی مجال
تاب گریہ ہو تو پھر بھی نہ بہیں گے آنسو
کون "فاشست" ہے اس دین کا دنیا کا عدو
(منزلِ شب، ص: ٤٢)

مختار صدیقی " منزلِ شب " کے دیپاچے میں لکھتے ہیں
یہ زمانہ ، عالمگیر جنگوں اورا نقلابات کا زمانہ ہونے کی
وجہ سے منفرد حیثیت رکھتا ہے ۔ نظری اور علمی تاریخ میں
یہ زمانہ اپنی بو قلمونی ،اپنے تجربات اپنے اکتشافات و
انکشافات کی بدولت شاید اب تک بے نظیر ہے ۔ مجھے یہ
کہنا ہے کہ اس دور میں یا معاشرے میں میری حیثیت ایک
بہت ہی عام اور غیر اہم فرد کی رہی ہے۔

مختار صدیقی نے ہیرو شیما اور ناگا ساکی کی تباہی و بربادی پر نظمیں لکھنے کے علاوہ سر حدی جنگوں اور ہجرت کے عمل سے پیدا ہونے والے المیوں کو بھی اپنا موضوع سخن بنایا ہے ۔ ان المیوں کی داستان کو بھی انہوں نے اپنی مختلف نظموں "بازیافتہ " کیسے کیسے لوگ " ، آخری بات " " قریہ ویران " اور " لب ساحل " میں خاص دکھ اور کرب کے ساتھ بیان کیا ہے اور جنگوں سے پیدا ہونے والی تباہی و بربادی اور ویرانیوں کا عمدہ نقشہ کھینچا ہے ۔ نظم " پیشکش " بھی سرحدی جنگوں سے پیدا شدہ المیہ کی داستان سناتی ہے۔

دراصل انسانیت نواز مختار صدیقی کی آواز ہر اس لمحے سنائی دیتی ہے۔ جب انسان اور انسانیت پر ظلم ڈھایا جاتا ہے اور خونِ ناحق بہایا

جاتا ہے اور یہی ان کی انسان دوستی ہے کہ وہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں ۔مختار صدیقی نے نظم "منزلِ شب" میں ذہن انسانی کے بدلتے ہوئے میلانات کو بھرپور طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ بدلتی ہوئی اقدار اور تخریبی رویوں کی بالادستی نے انسان کو ایک بے مایہ سی چیز بنا دیا ہے ۔ اب ایٹمی طاقت کا حصول انسان کے ارتقاء کی علامت بن گیا ہے۔ ان کے نزدیک ان مکروہات نے انسان کو درندہ صفت بنا دیا ہے وہ حیوانیت کی جیتی جاگتی مثال بن چکا ہے اور وہ ہر وقت اپنے سے چھوٹے اور کمزور درندوں کو چیرنے پھاڑنے کی فکر میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے انسانیت کے مٹ جانے کا مر ثیہ اور آدمیت کی ذلت و رسوائی کا نقشہ دلسوز پیرائے میں بیان کیا ہے ۔

اور یہ سرگوشیاں کہتی ہیں وہ باتیں گئیں
شہر و صحرا، خونِ ناحق سے رہیں گے لالہ گوں
زندگی بے مایہ ہے، جیتیں گئیں ، ماتیں گئیں
آج اک عالم کو پاگل کر چکی ہے بوئے خوں
سروری کرتا ہے بے مقصد تباہی کا جنوں
نسل انسانی کی جیسے حسرتِ دل ہو یہی
علم و حکمت اس طرح ہیں اس کے آگے سرنگوں
جیسے ان صدیوں کی جانکاہی کا حاصل ہو یہی
آدمی کے ارتقا کی جیسے منزل ہو یہی

(منزلِ شب ،ص: ۵۳)

انسان دوست مختار صدیقی جب معاشرے کی یہ حالت دیکھتے ہیں تو افسوس اور دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کہاں ہیں وہ عقائدکی سیاست کرنے والے اصول جن کی بنیاد صلہ رحمی پر تھی اور جو بھائی چارے کا نعرہ لگانے والوں میں پیش پیش تھے۔بھائی چارے اور اخوت کے پرانے دیو تاوں کا کوئی وجود ہے بھی ؟ کیوں اتنی خاموشی چھا ئی ہوئی ہے ۔ اس نوع کا طنزنظم " آخری بات " میں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔

شاہ نشینوں کے تصور میں بھی اب کیا ہوں گے
ہر عقیدے کی سیاست کے وہ سیمیں معبود
بھائی چارے کے کپٹ راج کے فوقیت کے
دیوتا کل مگر ڈھونڈیئے آج ان کا وجود

(منزلِ شب، ص: ٤٢)

کرکیگارڈ نے معاشرتی بے حسی کا نقشہ عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے !

سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو اس کائنات میں گم کردے۔ ایک بے معنی دھوکے کی طرح اور بطور شخص اسکی گمشدہ ذات کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ جبکہ بازو، ٹانگ ، ڈالر ، بیوی وغیرہ جیسی چیزوں کا بہت نوٹس لیا جائے۔

مختار صدیقی جیسا انسان دوست فنا و موت کے استعارے کو جہاں انسانی اخلاق کی پستی ، خود غرضی اور ظلم وبربریت جیسی منفی خصوصیات کی عکاسی کے لیے استعمال کرتا ہے وہاں وہ آفت اور تباہی و بربادی کے مرقعے تخلیق کرکے انسان کو ان خصوصیات سے کراہت اور عبرت دلانے کی بھرپور کوشش بھی کرتا ہے۔ نظم " قریۂ ویران " اس کی بہترین مثال ہے۔

جھلسے پیڑ ، جلی آبادی ، کھیتی سوکھی ، خرمن راکھ
ہست وبود کا مدفن -------- راکھ
گرتے بام و در کے لیے ہے ، گلیوں کا آغوش
بار ہٹا تو آیا ہوش
پنگھٹ اور چوپال بھی سونے ، راہیں بھی سنسان
کلیاں اور کوچے ویران
جھونکے سوکھے پتے رو لیں ، بکھری راکھ اڑائیں
راکھ اور پتے بن کے بگولے ، اپنا ناچ دکھائیں
اور وہیں رہ جائیں

(منزلِ شب ،ص: ۴۹)

مختار صدیقی جس دورِ انتشار میں زندگی گزاررہے تھے اُس دور میں انسان بے یقینی کے خلا میں سرگرداں و بے چہرہ اپنی شناخت کے حوالے تلاش کرتا نظر آتا تھا۔ اس تلاش و جستجو نے جہاں تمام شعرا کو اپنے تاریخی ماضی کی طرف سفر کرنے پر مجبور کیا وہاں حلقے کے تمام شعرانے ماضی اور ماضی کے خزینوں کو اپنے اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے کامیابی سے برتا۔ مختارؔ صدیقی میں یہ خصوصی صلاحیت موجود ہے کہ وہ تباہ شدہ بستیوں اور ما منوں کے ملبے پر کھڑا ہو کر گمشدہ تہذیبوں کی عظمت کے مظاہر کو اپنے اظہار بیان سے زندہ و متحرک کر دے ۔ مختارؔ نے مد فون شہروں اور گم گشتہ تہذیبوں کے خستہ و خاموش کھنڈرات اور ویران منا ظر کی ایسی بصری اور حسی تصویریں بنائی ہیں کہ ماضی کی جیتی جاگتی تہذیب اپنی شوکتِ پارینہ اور عظمت سمیت مجسم ہو کر سامنے آگئی ہے۔ نظم " مو ہنجو ڈارو " کے اشعار دیکھیے۔

مگر یہ ویرانیوں کے مامن
یہ لہلہاتی ہوئی ہری کھیتوں کی گودی میں
اندھی بربادیوں کے مسکن
یہ پاستاں کے خلائے وحشی میں اوج تہذیب کے نشیمن
مرے وطن کی پرانی عظمت کے یہ ہیں اجڑے ہوئے مدائن

(منزلِ شب ، ص: ۱۰۷)

گویا مختار کے نزدیک ماضی زندہ و متحرک قوت کا سر چشمہ ہے جس سے روشنی اور حوصلہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

بقول انور سدید!

مختار نے ماضی کو کبھی مردہ تصور نہیں کیا بلکہ اسے
ذی روح سمجھ کر اس سے تخلیقی تحریک حاصل کی ۔
چنانچہ موہنجوڈارو سے مختار صدیقی رومانی اور جذباتی
طور پر وابستہ ہیں ۔ اور اس کی عظمت رفتہ کو حال کے
لمحہ موجود میں زندہ کر دیتے ہیں اور وہ اس کے تصور
اورجلوہ گر سحر کا خلوتی نظر آنے لگتے ہیں ۔

مختار صدیقی جب آثار قدیمہ کا کھلی آنکھوں سے نظارہ کرتا ہے تو سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ شہر و بستیاں جو پرانی عظمتوں کا نشاں ہیں اور جو مکمل طور پر اس صفحہ ہستی سے مٹ نہیں سکیں ان کی راہ و خاک سے نئی زندگی کی کوئی امید بھی باقی نہیں تو پھر یہ بستیاں اور شہر مکمل طور پر مٹ کیوں نہیں جاتے ۔ مختارؔ کے ہاں دراصل یہ حصی تصویر جس خستگی و خرابی کا اظہار ہے وہ صرف بام و در اور زمین و املاک کی ویرانی اور خستگی نہیں بلکہ معاشرتی تہذیبی انہدام کی کہانی ہے۔ وہ تہذیبی و اخلاقی انہدام جو بے جان اندھے سیاسی و سماجی ماحول میں انسان کا مقدر ہے اور مختارؔ ہراساں و ملول یہ سوال کرتے ہیں کہ یہ مسلسل خستگی اور شگستگی کی حالت کب تک رہے گی اور کب تکالیف اور پریشانیوں کا دور ختم ہو گا اور معاشرہ امن کا گہوارہ بنے گا۔ نظم " ٹھٹہ" کے یہ مصرعے اپنی طنزیہ سوالات کا مرقع ہیں کہ کب انجام ہوگا۔

نہ یہ فنا ہے نہ بقا ہے
میاں بود و عدم یہ کیسا طویل وقفہ ہے
جو نوشتہ ہماری قسمت کا بن گیا ہے؟
کنارِ دریا کبھی یہ بستی تھی
لیکن اب نیستی و ہستی کے درمیاں اک مقام برزخ ہے
ایسا برزخ کہ جس میں صدیوں سے کاخ و کو ، بام و در
مسلسل
شگستگی ، خستگی ، خرابی میں خیرہ سر ہیں
(منزلِ شب ،ص:۱۱۸)

مختارؔ صدیقی کی فکر کا ایک اہم موضوع شرفِ انسانی ، مقصدِ تخلیقِ انسان کو جاننا اور اس دنیا میں انسان کی حالتِ زار کا تجزیہ کرنا ہے اور یہی ان کی انسان دوستی ہے۔ مختارؔ کے خیال میں انسان کوا شرف اور جلیل القدر مخلوق اس لیے کہا گیا ہے کہ انہوں نے خدا کی ذات کی گواہی دینے کی بھاری ذمہ داری اپنے ناتواں کندھوں پر اُٹھائی ہے اور یہ بار کوئی اور مخلوق ا ٹھانے کی جسارت نہ کر سکی ۔ وہ انسان کو شاہد حق سمجھتا ہے۔ اس لیے انسان اس کے ہاں بر ترو اعلی ہے۔ نظم " میری راہوں پر " کے اشعار دیکھیے۔

اب میں اس لہجے کو اس نور کی آواز کو پہچانتا ہوں
اس نے کب مجھ سے کیا کہا تھا..... میں اب جانتا ہوں
اس نے اک روز ازل

جو کہ مرا روز ازل تھا----- یہ کہا تھا
" تمھیں ہم زندگی دیتے ہیں "
ذرا ----یہ تو شہادت دو
کہ ہم کون ہیں ---- تم جانتے ہو
اور تم کون ہو ، تم جانتے ہو
(آثار ،ص: ۱٦٠)

مختارؔ کے نزدیک انسان ترقی پذیر مخلوق ہے۔ جو مسلسل محنت ، جدوجہد اور ارتقا کی منازل طے کر کے شرف وفضیلت کے مقام و مرتبے تک پہنچ جاتی ہے۔ یہاں مختار ؔ، اقبالؔ کے نظریے کے ہم خیال نظر آتے ہیں جس طرح اقبالؔ کے ہاں انسان مسلسل جدوجہد اور تربیت خودی کے بعد انسان کامل کے درجے کو پہنچ جاتا ہے ۔ بالکل اسی طرح مختارؔ کا خاک لقا بھی سخت کوشی کے بعد جنم لیتا ہے ۔ وہ انسان کو الُوہیت کے درجے پر فائز نہیں کرتا بلکہ انسان کو انسان سمجھتے ہوئے اسکی عظمت کا بھی قائل ہے اور اس کی ذات کی لاچاری اور کمزوری کا بھی اعتراف کرتا ہے ۔

خاک کی پتلیاں ، پرواز کے افسوں میں
کبھی گنگ
تو بے طرح ہراساں ہیں کبھی
کبھی رہ رہ کے عجب بولیاں بول اٹھتی ہیں
قہقہوں کی کئی نقلیں بھی ہیں
اور ان کا تبسم ---کئی اقسام کے غازوں کی طرح
ہر عمل ، ان کا دکھاوے کی نمازوں کی طرح
منزلیں ان پر کبھی ہیں بڑی بھاری
تو یہ پرواز کے فاصلے آساں ہیں کبھی
یہ" چنے لوگ " کبھی پیکر خاکی ہیں
تو انسان ہیں کبھی
وقت آئے تو گراں جاں ہیں کبھی
اور تن آسان ہیں کبھی
(آثار، ص: ۱٦٠)

انسان دوست مختار کے ہاں صرف وہ انسان انسان کہلانے کا حقدار ہے جو دلِ درد مند رکھتا ہو۔ جس کے دل میں دوسروں کے لیے پیار و محبت ، ہمدردی اور انسان دوستی کا جذبہ موجود ہو اور وہ دل دریا میں غوطہ لگا کر حکمت و دانش کے موتی نکال لانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

پیار کے گاہک ایسے دیکھے ہاتھ اُن کے بک جانا پڑا
جنسِ وفا کم یاب سہی پر ایسی تو نایاب نہیں
دل دریا ہیں بحر سے گہرے، جو ڈوبے سو موتی لائے
قعرکے غوطہ زن ہی شناور ،یہ پانی پایاب نہیں
(سی حرفی ۔ ص ٥٦)

انسان دوست مختارؔ صدیقی معاشرتی تضادات بیان کرنے کے ساتھ انسانی رویوں کے تضادات کو بھی بڑی خوبصورتی سے اپنی " سی حرفی" میں بیان کرتے ہیں ۔ انسان چونکہ معاشرتی حیوان ہے اس لیے مل جل کر زندگی گزارنا اسکی جبلت کا حصہ ہے۔ اک خاص سماج میں رہ کر انسان اپنے ہم جنسوں سے بہت سی توقعات اور امیدیں لگا بیٹھا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کے ذاتی دکھ درد میں دوسرے برابر کے شریک ہوں گے مگر حقیقت اس کے بر عکس ہے۔دراصل انسان مل جل کر رہنے کے باوجود بنیادی طور پر خود غرض و خود ستا ہے۔ اس لیے ممکن نہیں کہ ہر روتی آنکھ کے ساتھ دوسرے بھی روئیں اور دکھ درد میں شریک ہوں ۔ لیکن لاکھوں کی اس بستی میں کوئی ہمدرد، غمگسار اور انسان دوست ہستی ایسی مل جائے تو اس کی قدر کرنی چاہیے۔ کیونکہ ایسی ہستیاں روز روز پیدا نہیں ہو تیں بلکہ صدیوں کے بعد ایسی محبت کرنے والی ہستی کا دنیا میں ظہور ہوتا ہے۔

جب سے دل نے دھڑکنا سیکھا ایک ہی کام کی بات سنی
آج غم جاں ، کل غم جاناں ، ایک پہ ایک اپنانا ہو گا
پیار مروت کے سب گاہک ، ساتھ نہ روئیں روتوں کے
کوئی شریک حال ملے تو آنکھوں پر بٹھلانا ہوگا

(سی حرفی، ص: ٦٤)

بقول ضیا جالندھری ! "مختار نے انسان کی حیثیت کو کا ئنات کے وسیع تر پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے"۔ نظم " میرے شب وروز " ،میں وہ انسان دوست اور محافظ کے روپ میں ابھرتے ہیں ۔

میری دنیا کے شب و روز
مہاجن کی ہر اک چال کی
سرکوبی کے لمحات ہیں اور کچھ بھی نہیں
میرے شب و روز

(آثار)

غرض مختارؔ صدیقی کی شاعری آنے والے وقت میں انسان دوستی کے پیغام کے ساتھ ساتھ نشانِ منزل اور رستے کی روشنی ثابت ہو گی ۔

بقول انتظار حسین!

مختارؔ کی شاعری اس اعتبار سے اپنی ہم عصر نئی شاعری سے الگ رنگ رکھتی ہے کہ اس میں عہددرعہد صدیوں کی گونج بھی سنائی دیتی ہے اور اپنے عہد کا دکھ درد بھی اظہار پاتا نظر آتا ہے ۔ قدیم وجدید یہاں یک جان نظر آتے ہیں ۔ روایت کا گہرا شعور اور اس کے ساتھ نیا طرز احساس اس صورت میں ایسی شاعری جنم لیتی ہے جو ایک سطح پر روایت کی تو سیع کا فریضہ انجام دیتی نظر آتی ہے ۔ مثلاَ مختارؔ کی سی حرفی کو ہم کیاکہیں گے یہاں اردو شاعری کی روایت میں فکرو احساس کا ایک نیا اسلوب ایک نیا علاقہ شامل ہوتا نظر آتا ہے۔

ضیا جالندھری اور انسان دوستی (۱۹۲۳)

نظم نگاری میں ضیاؔ جالندھری کی اہمیت و افادیت مسلمہ ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے انسان دوستی کا پیغام عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ ضیاؔ زندگی کے صحرا کو ایک برف زار کے روپ میں دیکھتے ہیں ۔ جہاں زندگی کی روئیدگی پر برف کی تہوں نے اپنا تسلط قائم کر رکھا ہے۔ ضرورت ہے تو احساس کی آنچ کی تاکہ یہ برف زار پگھل سکے اور زندگی کا چشمہ رواں دواں ہو۔

ضیاؔ جالندھری کا یہ برف زار ویرانی ، بے حسی اورتصنع کی خصوصیات سے مالا مال دکھائی دیتا ہے ۔ دراصل میکانکی معاشرے کا ہر فرد یہ خصوصیات اپنے اندر سمیٹے ہوئے نظر آتا ہے۔ جس کے باعث معاشرہ روحانی اقدار سے عاری بے سمت اور بے نشاں ہو کر رہ گیا ہے۔ اس معاشرے کی تصنع آمیز زندگی کو ضیا نے"ہنسی" یا " قہقہہ " سے معنون کیا ہے۔ جس میں موت ، تصنع اور انجماد کی صدائے باز گشت سنائی دیتی ہے۔ ضیا جالندھری کے اس برف زار کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں ۔

" ضیا جالندھری کا ویسٹ لینڈ ایک برف زار ہے جس میں زندگی ناپید ہے ۔ درختوں پر کبھی شگوفے کھلے تھے مگر جب خزاں آئی تو ان کی پتیاں خشک ہو کر زمین پر گر پڑیں اور اب برف کی ایک دبیز چادر نے ان پتیوں کو پوری طرح ڈھانپ لیا ہے اور ہر طرف مردنی اور بے حسی کا پورا تسلط قائم ہوگیا ہے---- برف زار ضیا جالندھری کا جہنم ہے ۔ زمان و مکاں کی تبدیلیوں کے باعث یہ جہنم (بعض امور میں) ڈانتے کے (Inferno)اور ایلیٹ کے ویسٹ لینڈ سے مختلف ہے۔ لیکن اس اعتبار سے یہ ان دونوں سے مشابہ ہے کہ یہاں بھی زندگی موت کی زد میں آچکی ہے اور ایک کرب ناک کیفیت چاہے یہ آگ ہویا ریت ہو یا برف باقی تمام کیفیات پر حاوی ہے"۔

ضیا جالندھری کی نظم " زمستاں کی شام " کے اشعار دیکھیئے جس میں برف کی چادر نے پتیوں کو مکمل طور پر ڈھانپ لیا ہے اور ہر طرف ویرانی ، اداسی اور بے حسی اپنا ڈیرہ جمائے ہوئے ہے۔ انسان دوست ضیاؔ نے اس بے حسی کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔

خزاں اگر سنگدل بھی تھی تو وہ اس قدر سنگ دل نہیں تھی
کبھی زمستاں کی شام جس کی نظر سے گذری ہو جانتاہے
کبھی کسی کوہسار کی برف پوش وادی پہ کوئی تنہا اگر رہا ہو
تو وہ یقیناًَ یہ جانتا ہے
کہ موت کس طرح زندگی کے فسردہ پیکر سے کھیلتی ہے

(سر شام سے پس حرف تک ، سرِ شام (مجموعہ)،ص :۱۰۹)،

ڈانٹے کا جہنم ایک مستقل کرب ہے جس سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔ دوسری طرف ایلیٹ کے ویسٹ لینڈ کا کرب "پیاس " کی صورت میں ظاہر ہوا ہے اور اس کرب سے نجات کے لیے وہ پانی کی آرزو کرتا ہے۔ مگر ضیا جالندھری کے برف زار کا کرب انجماد اور ٹھہراو سے عبارت ہے ۔ جس نے فرد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور جس سے نجات پانے کی یہی صورت ہے کہ کہیں سے پانی نمودار ہو جو ویرانے کی پیاس بجھا دے یا آگ اور پانی نمودار ہو کر برف کو پگھلا دیں نظم " زمستاں کی شام " کے اشعار دیکھیے ۔

وہ آسماں بوس چوٹیاں برف کی تہوں میں دبی ہوئی ہیں
یہیں کہیں اب بھی برف کی تہہ میں کوئی ندی سی بہہ رہی ہے
وہ کوئی ندی ہے یا سراب خیال تسکین دے رہا ہے
مگر مجھے اس قدر یقیں ہے کہ برف کی تہ میں زندگی ہے
شفق کی سرخی وسیع میدان برف پر تھر تھرا رہی ہے
مگر یہ تاب و تواں نہیں ہے کہ اب بھڑک اٹھے آگ بن کر
تپش سے جس کی پگھل کے بہہ جائے برف کا یہ وسیع میدان
مہکتے سبزے کی نیلی موجوں میں سر خوشی پھر سے لہلہائے

(سرِ شام سے پس حرف تک، سرِ شام (مجموعہ)،ص: ۱۱۲)

ضیاؔ جالندھری نے اپنی بہت سی نظموں میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ برف کے نیچے انسان کی زندگی بے حس و حرکت اور دبکی پڑی ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس کا یہ احساس شدید گہرا ہو جاتاہے کہ برف دراصل خود زندگی ہے ۔ نظم " زمہریر" کے اشعار دیکھیئے ۔

زمین زمہر یر آج خورشید کی سرد مہری سے ہے
وہ خورشید وہ حدت آرزو
کبھی جس کا قرب
کھلاتا ہے اس کے لب و رخ پر دہکتے شراروں کے پھول
اسی حدتِ آرزو سے یہ برف
کبھی آبشاروں کا پیراہن مرمریں
کبھی ابرپاروں میں ساون کا گیت
کبھی ایک سیلاب سیماب ہے
یہی برف ہے لہلہاتے درختوں کی شاخوں کا رس
اور اس کے بغیر
گل و لالہ خاشاک وخس

(نارسا، ص:۱٤۸،۱٤۷)

انسان دوست ضیاؔ جالندھری کی نظمیں جدید شہری زندگی کے المیہ و آشوب کی داستان سناتی نظر آتی ہیں ۔ اس عہد میں مشینوں کی

حکومت نے انسانی زندگی کو جبر کی مانند بنا دیا ہے۔ جس سے چھٹکارے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی ۔ ہرطرف خوف ودہشت کی فضا طاری ہے۔ جس کے باعث یا تو لوگوں نے چپ سادھ لی ہے یا ایک دوسرے سے دست وگریباں نظر آتے ہیں ۔ آپس کا پیار و محبت ختم ہو چکا ہے۔ ہر طرف عجیب نفسانفی کا عالم دکھائی دیتا ہے۔انسان دوستی کے جذبات ماند پڑچکے ہیں ۔ ضیاؔ جالندھری نے اس نفسانفسی کی تصویر کشی بہت عمدہ پیرائے میں کی ہے۔ نظم "شہر آشوب " کے اشعار دیکھیئے۔

وہی صدا جو مرے خوں میں سرسراتی تھی
وہ سایہ سایہ ہے اب ہر کسی کی آنکھوں میں
یہ سرسراہٹیں ساپنوں کی سیٹیوں کی طرح
سیاہیوں کے سمندر کی تہ سے موج بہ موج
ہماری بکھری صفوں کی طرف لپکتی ہیں
بدن ہیں برف ، رگیں رہگزار ریگ رواں
گئی تو سہم کے چپ ہوگئے ہیں صورت سنگ
جو بچ گئے ہیں وہ اک دوسرے کی گردن پر
جھپٹ پڑے ہیں مثال سگان آوارہ
ہوا گزرتی ہے سنسان سسکیوں کی طرح

(خواب سراب ، ص: ۲٦۳ ، ۲٦٤)

جہاں تک استحصال زدہ طبقات کی حمایت اور مظلوم انسانیت کی ، شکنجہ ظلم سے نجات کا معاملہ ہے ۔ انسان دوست شعرا نے ہمیشہ ہر طرح کے استحصال کی مذمت کی ہے ۔ وہ شاعر انسا ن دوست ہی نہیں جو آدمیت اور انسانیت کا ساتھی نہیں ۔ ضیا جالندھری جیسے شاعر نے ہر موقع پر آدمیت اور انسانیت کا ساتھ دیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "ٹائپسٹ " قابلِ توجہ ہے جس میں ایک استحصالی سماج میں فرد کی حالت زاد کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ یہ فرد ایک ایسی پیش پا افتادہ مشقت میں مبتلا کر دیا گیا ہے جس میں حروف تو بدلتے ہیں لیکن معانی نہیں ۔ اس کے ٹا ئپ شدہ لفظ آرزو اور احساس سے عاری ہیں ۔ اس کے دل میں بسنے والی آرزوئیں بھی اسے ماحول میں آسیب بن کر خوف زدہ کرتی ہیں کیونکہ ان کی تکمیل نا ممکنات میں سے ہے ۔ ضیاؔ نے سماجی جبر اور طبقاتی استحصال کے شکار اس فرد کے جذبات و احساسات کی عکاسی نہایت ہمدردانہ انداز میں کی ہے اور اس بات کا افسوس کیا ہے کہ یہ ایسا معاشرہ ہے جہاں محنت کش طبقہ مسلسل اپنی محنت کے ثمر سے محروم کیا جاتا رہا ہے۔ نظم ٹائپسٹ کے اشعار دیکھیے ۔

پاس ہی پیڑ پہ ہُدہُد کی کھٹا کھٹ کھٹ کھٹ
اور نڈھال انگلیاں کہتی ہیں تھکا تھک تھک تھک
محض ابجد کی بدلتی ہوئی بے حس ترتیب

لفظ ہی لفظ پہ احساس نہ ارماں کوئی
اور ارماں وہ بھٹکے ہوئے راہی جن کے
ساتھ ساتھ آتے ہوئے بھوت کی صورت خدشے
سرد ہاتھوں سے کبھی پاوں جکڑ لیتے ہیں
اور کبھی آ ہنی دیوار اٹھا دیتے ہیں
(نارسا ، ص: ۱۶۰،
۱۶۱)

بقول علی محمد فرشی !
یہ بات سوچ کو مہمیز لگاتی ہے کہ " ٹائپسٹ " اور " بسنتی " کے کردار تو فنا پذیر تھے اور اس دلالہ کا منفی کردار استحکام پذیر ہے۔ کیا خیر فطری طور پر کمزور ہے اور بدی طاقتور ؟ کیا استحصالی قوتیں اسی طرح مظلوم انسانیت پر مسلط رہیں گی ۔ کیا انسان اپنے یو ٹو پیا کے خواب دیکھتا رہ جائے گا ۔ ایسے سوالات ہیں جو ضیا جالندھری کی شاعری میں سر اٹھاتے ہیں ۔ تو ادب کے آفاقی کنکروں کو چھوئے بغیر نہیں رہتے۔ چنانچہ ایسی تنقید جو ترقی پسند شاعری کے راست اظہار کی عادی ہو، ضیا جالندھری کی نظموں سے حظ کشید نہیں کر سکی۔

ضیاؔ جالندھری نے اپنی نظم " بڑا شہر " میں کراچی جیسے بڑے شہر کے وجود کو ایک حساس اورانسان دوست شاعر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اس شہر کامنظر شاید دنیا کے ہر بڑے شہر کا منظر نامہ ہے۔ یہاں رات پر بھی دن کا گمان ہوتا ہے۔ بڑے بڑے اداروں کے اشتہاری بورڈ ساری رات رنگا رنگ روشنیاں بکھیرتے ہیں ۔ ٹریفک رواں رہتی ہے۔ دفاتر میں کام جاری رہتا ہے۔ کارخانے اور ملیں چلتی رہتی ہیں ۔ لیکن ضیا جالندھری کو یہاں اپنائیت اور محبت کے فطری جذبات معدوم دکھائی دیتے ہیں ۔ معاشرتی بے رخی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ کوئی کسی کے درد کا درماں نہیں ہے ۔ یہاں تک کہ ہوا جو زندگی کی ضامن ہے وہ بھی اس پر مہربان نہیں ہے۔ گویا تمام شہر بے مروتی کی تصویر بن چکا ہے۔

کراچی کسی دیو قد کیکڑے کی طرح
سمندر کے ساحل پہ پاوں پسارے پڑا ہے
نسیں اسکی فولاد و آہن
بدن ---- ریت سیمنٹ پتھر
بسیں ، ٹیکسیاں ، کاریں ، رکشا، رگوں میں لہو کی
بجائے رواں
جسم پر جابہ جا داغ دلدل نما
جہاں عنکبوت اپنے تاروں سے بُنتے ہیں بنکوں کے جال
کہ ان میں شمال اور مشرق سے آئے ہوئے
اشتہا اور خوابوں کے مارے مگس

پھڑپھڑاتے رہیں
مستقل عالم جانکنی میں رہیں
(خواب سراب ،ص ۲٤٠۔
(۲٤۱)
ہوسِ دولت نے کراچی اور دوسرے بڑے شہروں میں فرد سے فرد کی دوری اور بے گانگی کے احساس کو بڑھا دیا ہے ۔ نظم "بڑا شہر" پر رائے دیتے ہوئے رشید نثار کہتے ہیں ۔

وہاں ایک ایسی سو سائٹی وجود میں آگئی ہے جس کا سارا
نظام احساس ملکیت کے تابع ہے اس لیے وہاں آدمی اپنی
ذات میں مقید نہیں اور نہ ہی وہ انسانی رشتوں کے ساتھ
بندھا ہوا ہے۔ ایک ہی رشتہ ہے اور وہ ہے رشتہ زر ۔

ضیاؔ جالندھری کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے طویل نظم کو جدید شاعری کے نئے قالب میں ڈھالا اور اس میں ایک نئی روح پھونکی ۔ ان کے پہلے مجموعے " سر شام" میں ان کی دو طویل نظمیں " زمستان کی شام " اور "ساملی " منظر عام پر آئیں ان نظموں کو جدید طویل نظم کی روایت سازی کے اعزاز کے ساتھ ساتھ فنی و فکری محاسن میں کمال حاصل ہے ۔ شاعر کے نزدیک " زمستاں " سرد مہری ، بے حسی ، جمود ، یخ بستگی ، عمر رسیدگی ، تنہائی اور بالآخر موت کی علامت ہے ۔ انسان کے لیے آنے والا ہر لمحہ مزید دکھوں ، پریشانیوں اور ابتری کا پیامبر ثابت ہوتا ہے ۔دکھ کے ایک دریا کو عبور کرتے ہوئے انسان آنسو بہاتا ہے۔لیکن اس سے آگے دکھ کا ٹھا ٹھیں مارتا سمندر اسکا منتظر ہوتا ہے۔ یعنی خزاں کے بعد زمستاں ۔

مگر تہی دامنی میں ارماں مچل رہے تھے
بہار تو پھر بہار ہی تھی ، خزاں میں بھی ایک زندگی تھی
مگر زمستاں
تمام عالم میں ایک یخ بستہ بے حسی ہے
میں اب تہی دامنی کے غم کو ترس رہا ہوں
اب آرزو ہی نہیں کہ کوئی اچک کے اوجِ فلک کو چھولے
جو دل میں ہو بھی کوئی تمنا
تو اس کے اظہار کا کسی کو نہ حوصلہ ہے نہ آرزو ہے
کہ اب زمستاں کی شام عالم پہ چھا چکی ہے
(سرِ شام، ص: ۱۱۰)

"ساملی " ضیاجالندھری کی ایک اور طویل نمائندہ نظم ہے۔ ساملی مری کے قریب پہاڑی علاقے پر واقعی ناقابلِ علاج تپِ دق کے مریضوں کا سینی ٹو ریم ہے ۔ جہاں تنہائیاں سلگ رہی ہیں اور عوام کی زندگی کو بڑے دکھ اور کرب کے ساتھ بے نقاب کیا ہے ۔ ضیاؔ نے بھی اپنی انسان دوستی کا حق ادا کیا ہے ۔ یہ نظم ایک بڑے دکھ کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوئی ہے ۔ بڑے دکھ کا تجربہ ہی انسان کو بڑا بناتا ہے اور اسکی ایک نشانی یہ ہے کہ دکھ کی دریافت کے بعد آنکھوں میں نمی

ہوتی ہے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ۔یہی وہ مقام ہے جہاں زندگی نا خوش اور غم سے ماورا ہو کر اپنی ارفع سطح کو پا لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے ۔ اس نظم کے حوالے سے حمید نسیم لکھتے ہیں ۔

اب شاعر آگہی کے اس سنگ میل تک پہنچ گیا ہے جہاں اس پر یہ حقیقت آشکار ہ گئی ہے کہ زندگی اور موت توام ہیں ۔ ہمیشہ اکٹھی رہی ہیں اور حیات کے لمحہ آخر تک ایک ساتھ رہیں گی۔اس نے اس حقیقت کو اب قبول بھی کر لیا ہے۔ اب وہ جان گیا ہے کہ کوئی موسم ابدی نہیں ۔ ہر بہار کے بعد خزاں اور ہر خزاں کے بعد بہار ہے۔ موسموں کا دائرہ حقیقت ابدی ہے ۔ خشک پتے اختتام زندگی کا پتہ دیتے ہیں لیکن پھر اپنی شاخوں سے جن سے یہ پتے اپنی زندگی پوری کر کے جدا ہو گئے تھے نئے شگوفے پھوٹیں گے ، نئی کو نپلیں پھر نکلیں گی اور پھر بہار آجائے گی ۔ سانولی کا آخری بند اس حقیقت کا جو تسلسل حیات کی ضامن ہے ترجمان ہے۔

" سانولی " کا یہ بند اس صورتحال کا مکمل عکاس ہے۔

تمہاری آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے مسکراہٹیں بھی

تم اپنی تقدیر کی سیا ہی پہ ہنس رہی ہو

کہ انتہائے طرب سے آنسو بہا رہی ہو

خوشی ہو یا غم ہو ایک احساس ہے ، ہر احساس زندگی ہے

یہ زندگی آتے جاتے لمحوں کا غیر ہموار سلسلہ ہے

ابھی جو ایک لمحہ روئے گل پرچمک رہا کہاں تھا وہ اب کہاں ہے

ابھی جو اس لمحہ درد بن کر دھڑک رہا تھا وہ کہاں ہے

عجیب آمیزش بہار و خزاں یہاں ہے

عجیب آمیزش نشاط و الم ہے یہ زندگی ہماری

چلیں یہاں سے کہاں چلیں ہم؟

(سرِ شام،ص: ۱۲۱،۱۲۲)

انسان دوست ضیاؔ جالندھری کی فکر کا الاو معاشرے کی غلاظتوں کو یوں اپنے حصار میں لیتا ہے کہ اس سے تہذیبی اقدار کے سوتے پھوٹتے ہیں جہاں بیٹھ کر وہ تخلیقی لمحات میں ذہنی و فکری تھکان دور کرتے ہیں ۔ بقول حمید نسیم ! " ضیاؔ میں ایک خاص بات ہے کہ ماضی کی یادوں ، بیتے دکھوں اور خوشیوں کے لمحوں کے عالم کرب وکیف میں بھی وہ ان بے کراں ممکنات سے غا فل نہیں ہوتا جو آنے والی کل اپنے ساتھ لاسکتی ہے "۔

ضیاؔ جالندھری کی نظموں کے مطالعے سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے ایک انسان دوست شاعر کی حیثیت سے معاشرے کی درندگی اور وحشیانہ پن کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کے ہاتھوں انسان کے قتل کی بہیمانہ رسم صدیاں سے چلی آرہی ہے۔ کبھی اس رسم ادائیگی کا فریضہ نمرود نے ادا کیا اور کبھی فرعون نے، کبھی اس روایت کا بھینٹ سقراط چڑھا تو کبھی عیسی علیہ السلام کو سولی پر لٹکایا گیا ۔ کبھی شمر کے ہاتھوں حسین قتل ہوا ،تو کبھی چنگیز کی ظلم و بربریت نے فضا کو سوگوار کردیا ۔ ضیاؔ جالندھری کے ہاں " ہابیل " کا کردار زمین پر ظلم وبربریت اور کشت و خون کی علامت بن کر سامنے آیا ہے۔ ہا بیل کے ہاتھوں قابیل کا قتل دراصل اس ظلم و استبداد کا نقطہ آغاز تھا کہ بیسیویں صدی میں جس کی انتہا دو عالمی جنگوں کی صورت میں سامنے آئی ۔

نسل در نسل یو نہی میرے لہو کا پیاسا
نار نمرود بھی وہ ، نخوتِ فرعون بھی وہ
جامِ زہر اب بھی وہ ، تیشہ بھی وہ ، دار بھی وہ
خنجر شمر بھی وہ ،ترکش چنگیز بھی وہ
ایشیا میں ، کبھی افریقہ میں خوں ریز بھی وہ
کیا ترے اذن سے قابیل کی خو قائم ہے
کیا یہ خو تابہ ابد میرا مقدر ہو گی

(خواب سراب،
ص:۲٤٦)

ضیاؔ جالندھری نے اپنی نظم " عر ض داشت " میں ابیس کے کردار کو پیش کیا۔ جس کا کام دنیا میں فتنہ و فساد برپا کرنا اور لوگوں کو غلط راستہ پر چلانا ہے۔ وہ خدا کے حضور یہ التماس کرتا ہے کہ فتنہ و فساد کا جو کام مجھے سونپا گیا تھا اب وہ انسان کے ہاتھوں ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کیو نکہ جوہری ہتھیاروں نے دنیا کے امن و سکون کو تہ بالا کر دیا ہے اور انسانیت کی قدریں دم توڑتی محسوس ہو رہی ہے۔ ابلیس کی اس عر ضداشت میں طنز کا نشانہ خدا اور انسان دونوں بنتے ہیں ۔ ضیا جالندھری اس دکھ اور کرب کوشدت سے محسوس کرتے ہیں کہ وہ انسان جس کا کام دنیا میں پیار و محبت اور انسان دوستی کا پیغام عام کرنا تھا۔اب نفرتوں کے بیج بو رہا ہے۔

تو اب میری درخواست ہے
پھر کوئی ایسی تخلیق ، پیشِ مشیت اگر ہو
تو اس جنس ِنو کو
کوئی ایسا جوہر ملے
جو مجھے بھی فنا کر سکے

(پسِ حرف ،ص
:۳۵۹)

ضیا جالندھری کو اس بات کا بخوبی ادراک ہے کہ ہر عہد میں کسی نہ کسی شکل میں قا بیل کا ظلم قائم رہا ہے۔ نظم "تسلسل " میں بھی شاعر اسی روایت قابیل کے تسلسل کو بیان کرتا ہے۔ اس نظم میں وہ اس انقلابی نوجوان سے مخاطب ہے جو دنیا کو گل و گلزاربنانے کے خواب بنتا ہے۔ شاعر اس نوجوان کو دنیا میں پیار و محبت ، امن و بھائی چارہ ، ہمدردی ، انسان دوستی اور دل کی دولت ایک دوسرے پر نچھاور کرنے کی تلقین کرتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس طرح دنیا کا نظام بدل جائے اور دنیا امن کا گہوارہ بن جائے۔

ہم کہاں سے کہاں آگئے ہیں مگر
اب بھی دستور دنیا وہی ہے جو تھا
جنگ کا ، جھوٹ کا ، جبر کا ، جور کا
اب عالم میں چرچا وہی ہے جو تھا
اے جہاں کو بدلنے کے خواہاں جوانو!
وقت کے چاک پر گیلی مٹی کے مانند ہے آدمی
ہم بدلتے دنیا بدلتی نہیں
ہم بدلتے ہیں لیکن یہ دنیا جو ہر دم نئی ہے بدلتی نہیں
(پسِ حرف ،ص :۳۵۲،۳۵۳)

ضیاؔ جالندھری کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے ارد گرد وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو ایک انسان دوست شاعر کی حیثیت سے بھانپ لیتے ہیں ۔ ان کی فکربظاہر معمولی سے واقعات کے پس پردہ پوشیدہ آتش فشانی مناظر کو دیکھ لیتی ہے۔ وہ منظر جسے دیکھ کر عام لوگ قہقہے لگا رہے ہیں ۔ ضیاؔ کے لیے دکھ اور افسوس کا باعث بن جاتے ہیں ۔

وہ شام ہوٹل میں اس طرح آئی
جیسے دشمن کی فوج اترے
جگہ جگہ جست اور کانسی کے چہرے
جھم جھم کھنک رہے تھے
تمام ہوٹل جگر جگر جگمگا رہا تھا
میں کنج تنہائی میں تحیر سے دیکھتا تھا
کہ کیسے خوش باش ہیں جنہیں یہ خبر نہیں ہے
کہ انکی بنیاد اکھڑ چکی ہے
ہوائیں مسموم ہو چکی ہیں
شجر پھلوں سے لدے ہیں لیکن
جڑوں کا زہر ان پھلوں کے ریشوں تک آگیا ہے
جو حال اب ہے کبھی نہیں تھا
حیات خار و زبوں تو تھی لیکن اتنی خار و زبوں نہیں تھی
(پسِ حرف،ص :
۳۲۵، ۳۲۶)

ضیاؔ جالندھری کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد علی صدیقی ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔

ضیاؔ ہمارے درمیان ایک جاندار آواز ہے۔ جسکی پذیرائی جدید مذاق شعری کی ضرورت ہے۔ ضیاؔ کے یہاں جس طرح ارد گرد وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو جمالی تجربہ بنایا جاتا ہے۔ وہ ہماری جدید شاعری کی تاریخ میں ایک اہم باب ہے۔ ضیاؔ کے یہاں روایت اور تجربہ اس طرح بانہوں میں بانہیں ڈالے نظر آتے ہیں کہ ضیاؔ اگر کسی ایک سے روگردانی بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کافی پر اعتماد طریقے سے ۔ ضیاؔ جدید اردو شاعری کے اس طبقہ شعرا سے تعلق رکھتے ہیں جس نے انسانی محسوسات کو مختلف معنوں میں بانٹنے کے بجائے اعلی وارفع سچائیوں کو بڑے سلیقہ سے ادبی سچائیوں کی صورت دی ہے۔

منیر نیازی اور انسان دوستی (۱۹۲۸۔۲۰۰۶)

بچپن اورنوجونی کے الم ناک حوادث میں منیر نیازی کی شاعری کا ابتدائی منظر نامہ تیار ہوتا ہے۔ جب ہر طرف لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ اور جب عام آدمی کی سوچ صرف الاٹمنٹس تک محدود ہو کر رہ گئی تھی ۔ ایسی صورتحال میں منیر نیازی کی فکر کو ایک نیا زاویہ مل گیا۔ انہوں نے دولت اور ہوس زر کے باعث چہروں اور رشتوں کا لہو سفید ہوتے دیکھا ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دولتمند خاندان کا چشم وچراغ ہونے کے باوجود ہمیشہ ہوسِ زر کی نفی کرتے نظر آتے ہیں ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب منیر نیازی کی ڈاکٹر مہدی حسن کے بڑے بھائی " سید اظہر حسن " سے میل ملاقات کا سلسلہ جاری تھا۔ پروگریسو خیالات کے باعث دونوں کی ذہنی ہم آہنگی تھی ۔

ڈاکٹر مہدی حسن کے چھوٹے بھائی "خواجہ حسن عسکری منیر نیازی" کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔

> منیر نیازی کے ہاں نعرے کی گونج تو اتنی بلند نہیں لیکن انہوں نے ہمیشہ سیدھی اور سچی بات کی، جھوٹ کبھی نہیں بولا،یہی وجہ ہے کہ ان کی بات میں ایک اثر تھا۔ وہ ہمارے ہاں آتے تو بڑے بھائی (اظہر حسن) سے پوچھتے کیا تو صرف نوکری پہ راضی ہو گیا ؟ یہ وہ مشکل اور صبر آزما دور تھا جب مار کسی نظریات کے حامی ہونے کی سزا کم از کم موت ہوتی تھی۔ لیکن منیر نیازی بڑے نڈر اور بے باک تھے ۔ مار کسی اور پروگریسو نظریات کے حوالے سے ان دنوں ان کے بعض اجلا س ساہیوال (منٹگمری) سے قریب ہی واقع "ستلج کا ٹن ملز " اوکاڑہ میں ہوتے تھے۔ جس میں وہ مزدوروں اور پسے ہوئے طبقات کی بھرپور حمایت کرتے۔

منیر نیازی کا مزاج تحریکوں اور سیاسی ہنگاموں کے باکل برعکس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ذات کی انفرادیت اور انانیت نے ان کی آوازکو کبھی کسی ہجوم کی آواز میں گم نہیں ہونے دیا۔ منیر نیازی

اگرچہ ایک متمول خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن اپنے ادبی سفر کا ابتدائی زمانہ بڑے مشکل حالات میں گزارا۔ لیکن اس کے باوجود خودداری اور وقار کا بھرم ہمیشہ قائم رکھا۔ منیر نیازی کے ایک دوست " عزیز میرٹھی " اس سلسلے میں لکھتے ہیں ۔

وہ دور منیرؔ پربڑا ہی صبر آزما تھا۔ خوشی کی ان ملاقاتوں میں زہرِ غم اس وقت شامل ہو کر دل دکھاتا جب منیرؔ کی کسمپرسی اور دربدری کاخیال آتا ، کوئی معقول اور مستقل ذریعہ آمدنی نہ تھا ۔ سر چھپانے کو نیلے فلک کی چادر کے سوا کوئی چھت میسر نہ تھی ۔ رائل پارک میں واقع شریف متین کے ہفتہ وار فلمی اخبار " انجم " کے دفاتر میں موسم سرما کی یخ بستہ راتیں ٹانگیں پیٹ سے چپکائے ایک پھٹی پرانی بوسیدہ رضائی میں گزار دیتا۔ مگر اپنا دکھ کسی پر ظاہر نہ کرتا ،نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتا،نہ کسی سے مدد کا طلب گار ہوتا۔ آخر کار بڑی دوڑ دھوپ کے بعد فلمی رسالہ " ڈائر یکٹر " کی ادارت مل گئی ۔۔۔۔منیر نیازی نہایت نفیس اور اعلی ذوق کا مالک تھا۔ تنگدستی کے باوجود میلے اور معمولی لباس ، گھٹیا سگریٹ ، تھڑے کی چائے اور بے مزہ کھانے سے بھوکا رہنا پسند کرتا تھا۔

منیرؔ نیازی سادہ، صاف گو، بے حد حساس، نرم دل اور انسان دوست شخصیت کے مالک تھے۔ جن باطنی سچائیوں کی تلاش میں سرگرداں تھے وہ ان کی ذات میں مضمر تھیں ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کو اگر تکلیف میں مبتلا دیکھتے تو ان کوبے حد دکھ ہوتا۔ اپنے گرد وپیش سبھی انسانوں سے ذاتی طور پر متعارف نہ ہونے کے باوجود ایک گہرا انسانی ربط محسوس کرتے اور یہی ایک انسان دوست شاعر کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو جو ان کی انسان دوستی کا بین ثبوت ہے۔

بقول ابرار احمد!

ہم منیر نیازی کے ساتھ ان کے گھر جارہے تھے ٹیکسی جب میانی صاحب کے پاس پہنچی تو ایک جنازہ گزرا۔ نیازی صاحب نے ٹیکسی رکوا دی۔ تھوڑی دیرمیں دیکھا تو وہ چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپے سسکیاں لے کر رو رہے تھے۔ تادیر اسی حالت میں رہے۔ سنبھل چکنے کے بعد کہنے لگے۔ یار ، یہ میرا جاننے والا نہیں تھا۔ لیکن اسی شہر کے گلی کوچوں میں یہ کہیں ہمارے ساتھ ہی زندہ رہا ، ہنستا گاتا رہا۔ اب یہ ہم سب کو چھوڑ کر جارہا ہے تو اتنے آنسو تو اس کا حق ہے نا !" یہ ایک واقعہ اس محبت کرنے والے بے پناہ شاعر کے باطن کی خوبصورتی دکھانے کے لیے کافی ہے۔ ہم تادیر اس کیفیت کے زیر اثر سخت دل گرفتہ رہے۔

ایک فنکار جب اپنے گردو پیش کی دنیا میں نیکی اور خیر جیسی خوبیوں کی کمی کو دیکھتا ہے تو اسکے مزاج میں ایک تخلیقی جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی جھنجھلاہٹ انسان دوست منیرؔ کی شخصیت میں بھی تھی۔ وہ معاشرے میں نیکی اور خیر کا خواہاں تھا۔ کیونکہ عالمی جنگوں اور جغرافیائی تبدیلیوں نے انسانی معاشروں کو جس انتشار میں مبتلا کیا تھا اسے مادہ پرستی کے عذاب نے دو چند کر دیا ۔ استعماری طاقتوں کے ہاتھوں نو آبادیاتی نظام کے پروردہ معاشروں میں بیک وقت محرومی اور ظلم کے احساسات پیدا ہوئے۔ جو حاکم اور محکوم کے رشتے کی پیچیدہ نفسیات کو سامنے لاتے ہیں ۔ فاتح اقوام نے اپنی فتح یابی کے نشے میں مفتوح علاقوں میں ہر ظلم روا رکھا۔ لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے خود کو پھر بھی انسانی ہمدردی کا علمبردار سمجھا۔ اسی منافقت اور بربریت نے مظلوموں کو اکسا یا کہ وہ بھی جرائم پسند بن جائیں ۔ زر پرستی اور بد اعتمادی نے انسان دوستی کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ۔ خاندانی نظام ٹوٹ گیا اور سماجی اقدار بکھرنے لگیں ۔ سرمایہ دارانہ نظام اب صورت بدل کر معاشرے پر مسلط تھا۔

افکار و نظریات اور تحریکات و تعصبات کی دھند چھٹی تو فرد براہ راست خود سے متعارف ہوا۔ اپنے آپ کو کھوجنے کی خواہش نے اس کے دل میں شہر کی مصنوعی زندگی سے بیزاری کا احساس پیدا کیا۔ جدید شعری طرزِ احساس کی یہ پیشکش منیرؔ نیازی کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہے۔ بلاشبہ منیرؔ نیازی ہی نئی شاعری کے وہ سرخیل ہیں جنہوں نے اپنے عہد کے کرب واضطراب کو اپنی نظموں کا حصہ بنا دیا ہے۔ وہ اپنے ظاہر کی دنیا سے ایک حساس انسان کی طرح باخبر ہے اور ساتھ ہی باطن کی گہرائیوں میں چھپے دکھوں سے بھی فرار نہیں چاہتا ۔ وہ زندگی کی تمام مخالف طاقتوں سے بنرد آزما ہونے کا عزم رکھتا ہے۔ اس شک اور خوف کے باوجود کہ کہیں شکست ہی اس کا مقدر نہ ٹھہرے۔ وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا ۔ یہی نئی شاعری کی اصل روح ہے۔ جسے منیرؔ نے ہم سے متعارف کروایا ہے۔

منیرؔ کے ہاں خوف ، اسرار اور مافوق الفطرت عناصر کی پر چھائیاں دشمنی کے اس احساس کی پیدا کردہ ہیں جس نے رشتوں اورروابطوں سے اعتماد ختم کرکے فرد کو بدگمانی اور شک کے عذاب میں مبتلا کر دیا ہے ۔ نظم " دشمنوں کے درمیان شام"کے اشعار دیکھیے ۔

پھیلتی ہے شام دیکھو ڈوبتا ہے دن عجب
آسمان پر رنگ دیکھو ہوگیا کیسا غضب
کھیت ہیں اور ان میں اک روپوش سے دشمن کا شک
سرسراہٹ سانپ کی گندم کی وحشی گر مہک
اک طرف دیوار و در اور جلتی بجھتی بتیاں
اک طرف سر پر کھڑا یہ موت جیسا آسماں

(دشمنوں کے درمیان شام ،
ص:۲۲)

ظاہر ہے ایسی صورت حال میں زندگی کرنا کسی کڑی آزمائش سے کم نہیں جہاں قدم قدم پر عدم تحفظ تنہائی اور موت آپ کے راستے میں کھڑی ہو۔ یہاں ہر انسان دوسرے کے لیے خوف اور خطرے کی علامت بن گیا ہے ۔ ہمدردی ، خلوص اور انسان دوستی کے جذبات مفقود ہو گئے ہیں ۔ایک انجانا خوف ہر وقت دامن گیر رہتا ہے۔ کوئی ماورائی طاقت انسان کے ذہنی اور روحانی سکون کو غارت کر رہی ہے ۔ یہاں شہر، گھر ، گلیاں ، دروازے ، دالان ، چھتیں اور دریچے ایک طلسم کے زیرِ اثر ہیں ۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے کوئی سحر پھونک دیا ہے جس کے باعث پورا ماحول جامدو ساکت ہو گیا ہے۔ اپنا شہر اور اپنا علاقہ جغرافیائی اعتبار سے اپنی تحویل میں ہونے کے باوجود اپنا محسوس نہیں ہوتا ۔ یہ بیک وقت ہماری پہچان بھی ہے اور ہماری قتل گاہ بھی ۔ نظم " جنگل میں زندگی " کے اشعار ملاحظہ کیجیے ۔

پُر اسرار بلاؤں والا
سارا جنگل دشمن ہے
شام کی بارش کی ٹپ ٹپ
اور میرے گھر کا آنگن ہے
ہاتھ میں اک ہتھیار نہیں ہے
باہر جاتے ڈرتا ہوں
رات کے بھوکے شہروں سے
بچنے کی کوشش کرتا ہوں

(جنگل میں دھنک ،
ص:٦٤)

منیرؔ کے ہاں بیرونی یا افرنگی حملہ آوروں کے خوف سے زیادہ مقامی اور قبائلی دشمن کا احساس زیادہ توانا شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ ویراں مسجد کے عقب میں تھوہر کی سبز قطار تو ہری بھری ہے جو ظلم و ستم کے پھلنے پھولنے کی علامت ہے۔ لیکن اونچے اونچے لمبے مردوں جیسے قد آور درخت اور رنگ برنگے پھولوں کے انبار جو زندگی کے حسن کے استعارے ہیں سورج کی تلوار کی زد پر ہیں ۔ منیرؔ اپنی نظم " موسم بہار کی دوپہر " میں اس کا اظہار یوں کرتے ہیں ۔

ہلکی ہلکی گرم ہوا میں ہلکی ہلکی گرد
ویراں مسجد کے پیچھے تھوہر کی سبز قطار
اس کے عقب میں لال اور نیلے پھولوں کے انبار
اونچے اونچے پیڑ ہیں جیسے لمبے لمبے مرد
یاسنسان قلعے کی خاکی ، اجڑی سی دیوار
جس کے نیچے چھپے ہوئے کچھ دشمن کے سردار

(جنگل میں دھنگ، ص:
۲۵)

منیرؔ کی نظمیں انسانی بے بسی اور کرب کا اظہار نہیں بلکہ اس خوف کو اجاگر کرتی ہیں جس سے عصری انسان دوچار ہے ۔ اس نے اپنی نظموں میں انسان کے باطن میں تاریک ماحول کے خوف کو خوبصورت انداز میں نظم کیا ہے۔ اسی سلسلے میں ان کی نظم "جنگل کا جادو " قابلِ توجہ ہے ۔ جس میں انہوں نے دوانتہائی منفرد امیجز تخلیق کیے ہیں ۔ ایک " وحشی چیتوں کی آبادی " اور دوسرا " سادھووں کا نعش کے پاس جھومنا اور اسکی گردن چومنا ہے"۔ " وحشی چیتوں کی آبادی " ہماری بسائی گئی وہ آبادی ہے جہاں اخلاقیات نام کی کوئی چیز نہیں ۔ کیو نکہ " چیتے " اگر آبادیوں میں آبھی بسیں " تو تب بھی وہ تمدنی زندگی کے آداب سے ناواقف ہی رہتے ہیں اور ان کی خونخواری کی جبلت انہیں غاررت گری پر اکساتی رہتی ہے۔ دوسری طرف سادھو جو " صوفی کی مانند جنگلوں میں مراقبے کرتا ہے ۔ حیرت اور افسوس ہے کہ وہ بھی اس " جشن عیش " میں شامل ہے ۔ دور بربریت میں اسکی درویشی سے بھی ایمان اٹھنے لگا ہے۔

جس کے کالے سایوں میں ہے وحشی چیتوں کی آبادی
اس جنگل میں دیکھی میں نے لہو میں لتھڑی اک شہزادی
اس کے پاس ہی ننگے جسموں والے سادھو جھوم رہے تھے
پیلے پیلے دانت نکالے نعش کی گردن چوم رہے تھے
ایک بڑے سے پیڑ کے اوپر کچھ گدھ بیٹھے اونگھ رہے تھے
سانپوں جیسی آنکھیں نیچے خون کی خوشبو سونگھ رہے
تھے

(جنگل میں دھنک،
ص:٦٥)

منیرؔ اپنی نظم " بھوتوں کی بستی " میں چند ایسے کرداروں سے متعارف ہوتے ہیں جوزندگی میں نا مرادی اور ناآسودگی کی انتہا کے باعث متشدد اور خوفناک ہو گئے ہیں ۔ ان کے منہ موت کی مانند زرد ہیں اور آنکھیں وحشت ناک ہو گئی ہیں ۔

پیلے منہ اور وحشی آنکھیں
گلے میں زہری ناگ
لب پر سرخ لہو کے دھبے
سر پر جلتی آگ
دل ہے ان بھوتوں کا یا کوئی
بے آباد مکان
چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا
اک لمبا قبرستان

(جنگل میں دھنک،
ص: ٤١)

منیرؔ کے ہاں وحشی جانور، بھوت ، چڑیلیں اس کے خوف کی اٹھتی ہوئی لہریں وہ انسان ہیں کہ مکروہ وخبیث اعمال کی وجہ سے جن

کے چہرے خوفناک بلاوں کی مانند ہو گئے ہیں ۔ انسان نے زمین پر ظلم و ستم کی وہ داستان رقم کی ہے کہ الحفیظ ، الایمان اور کشت وخون کے وہ دریا بہائے ہیں کہ اب شرف انسانیت کی بلندیاں کہیں دکھائی نہیں دیتیں ۔ ایسی صورتحال میں انسان دوست منیرؔ اس درندہ صفت ماحول میں انسان کی آرزو کرتے ہیں۔ جو اپنی انسانیت سے اس وحشی ماحول کو بدل دے۔ وہ سوچتے ہیں کہ ایسے انسان کو کہاں ڈھونڈا جائے۔ ایسی صورت حال میں ایک ویران درگاہ میں کوئی آواز سنائی دیتی ہے ۔ نظم " ویران درگاہ میں آواز " کے اشعار دیکھیے ۔

کون ہے----؟ کون ہے؟ ----کون ہے ؟
یوں جواب آتا رہا جیسے کوئی بے چین ہے
"کیا یہاں کوئی نہیں ہے"
میں نے پھر ڈر کر کہا
کوئی ہے --------کوئی نہیں ہے
کوئی ہے --------کوئی نہیں ہے

(جنگل میں دھنک
،ص:۴۰)

منیر نیازی کی نظموں میں خوف و اسرار کے حوالے سے پائی جانے والی معنویت کی جتنی جہتیں سامنے آتی ہیں ان میں تنہائی ، روحانی نا آسودگی اور اپنے گرد و پیش بسے اجنبی معاشرے کی بے حسی اور ظلم خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں ۔ انسان دوستی ، خلوص ، محبت اور اعتبار جیسی اقدار معاشرے میں اس قدر نا پید ہیں کہ بسے بسائے شہروں پر جنگلوں کا گماں ہوتا ہے ۔ منیرؔ نے انتظار حسین کے ساتھ ایک مکالمے میں ظلم کرنے والی ان طاقتورکو زمین پر خبیث قوتیں قرار دیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں ۔

میں چنگیز خان کی طرح کا آدمی نہیں چاہتا۔ ایسے خدا پرست لوگ دیکھنا چا ہتا ہوں جن کے یہاں احساس جمال اتنا ہو کہ خبیث قوتیں اُس کے رُعب میں آجائیں ------ میں بھی اپنی شاعری سے ایسے ہی آدمی تیار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ۔

منیرؔ کو بھی اس بات کا یقین ہو چلا ہے کہ وہ انسان جس کی اس نے خواہش کی تھی اس ماحول میں کہیں دکھائی نہیں دیتا ۔وہ ان دیکھی دنیا کا راہی بن چکا ہے اور اب شہروں کا مقدر صرف وہم ، خوف اور سناٹا ہی ہے ۔ نظم " شہرِ اوہام " کے ا شعار دیکھیئے ۔

بت کدے میں بت بہت ہیں مسندوں پر ، تخت پر
وہم کی تجسیم سنگیں اب ہے اوجِ بخت پر
سینکڑوں سالوں کا پہرا مستقل اُس در پر ہے
دیر کے کچھ خوف ہیں دیوارِ شہرِ سخت پر

(آغازِ زمستاں میں دوبارہ
،ص :۳۵)

انسان دوست منیرؔ اپنے شہروں کی بے حسی اور سپاٹ زندگی کو آسیب زدہ کہتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس فضا میں سجے سجائے مکان اچانک ظاہر ہو گئے ہیں جیسے انہیں کسی نے باہر سے لاکر کھڑا کر دیا ہو۔ یہ جادوئی اثر ہی تو ہے کہ کوئی کسی سے آشنا نہیں نہ ہی کسی آواز پر کوئی مڑ کے پیچھے دیکھتا ہے ۔ جدید طرز زندگی نے شوقِ جدت میں ایک پوری تہذیب کو کھو دیا ہے ۔ منیرؔ جب یہ کہتے ہیں کہ " نئی تعمیر میں گلیاں نہیں ہیں " تو ایک پورا عہد گم ہوتا نظر آتا ہے ۔ وہ ان مکانوں کو آسیب زر سے چھٹکارہ دلانے کے مثالی خواب نہیں دیکھتے کیونکہ ان کے نزدیک تو یہ شہر " حد سے گزر" چکے ہیں ۔ اور ان کی معنوی بربادی نے ان کے لہجے کو غم کی شدت سے ساکت کر دیا ہے۔

سن بستیوں کا حال جو حد سے گزر گئیں
ان امتوں کا ذکر جو رستوں میں مر گئیں
کر یاد ان دنوں کو کہ آباد تھیں یہاں
گلیاں جو خاک و خون کی دہشت سے بھر گئیں
صرصر کی زد میں آئے ہوئے بام و در کو دیکھ
کیسی ہوائیں کیسا نگر سرد کر گئیں

منیرؔ کی نظم " میں اور شیر " دیکھیے جس میں بسے بسائے شہروں کا یوں کھنڈر میں تبدیل ہو جانا اور پیڑوں کی ڈالیوں سے برگ و ثمر کا یوں عجیب و غریب انداز میں ٹوٹ گرنا پورے ماحول کو تماشا بنا رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ افتادبڑی اچانک پڑی اتنی اچانک کہ سجے سجائے اور ہستے بستے گھر اجڑ گئے ۔ اور اب ان آراستہ مگر سنسان اور ویران گھروں کے نہ ہی در کھلے ہیں اور نہ ہی ان تک پہنچے کا کوئی راستہ باقی بچا ہے۔ جبکہ دوسرا حوالہ معنوی بربادی اور غارت گری کا بھی ہے۔ جس میں شاعر کو شہر ویران اور اجاڑ بیابان نظر آتا ہے۔ شہر میں موجود زندگی کی ہر علامت کسی طلسم کے زیرِ اثر ہے ۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زندگی نا پید ہو چکی ہے ۔ انسانیت نواز منیرؔ کا کہنا یہ ہے کہ اس شہر خراب میں زیاں کاا حساس کرنے والا کوئی نہیں رہا اور اگر کوئی جسمانی طور پر موجود بھی ہے تو وہ سننے اور دیکھنے سے معذور ہے۔ رنج والم اور حادثوں کے تسلسل نے شہر کو بے حس اور پتھر بنا دیا ہے۔

سڑکوں پہ بے شمار گلِ خوں پڑے ہوئے
پیڑوں کی ڈالیوں سے تماشے جھڑے ہوئے
کوٹھیوں کی ممٹیوں پر حسین بت کھڑے ہوئے
سنسان ہیں مکان کہیں در کھلا نہیں
کمرے سجے ہوئے ہیں مگر راستہ نہیں
ویران ہے پورا شہر کوئی دیکھتا نہیں
آواز دے رہا ہوں کوئی بولتا نہیں

(جنگل میں دھنک
،ص:٤٤)

نظم "ساحلی شہر میں ایک رات " زندگی کی چکا چوند میں دم توڑتے ہوئے معیارات کی طرف بڑا بلیغ اشارہ ہے۔ دراصل روشنوں کے ہجوم میں تھکے ہوئے جہازوں کی آواز شاعر کو اس تہذیب کا نوحہ محسوس ہوتی ہے۔ تمام شہر پتھر جیسا بے حس ہے مگر دل ہے کہ اس دلکشی کا اسیر ہوا جاتا ہے۔

روشنیاں ہی روشنیاں اور نوحے تھکے جہازوں کے
بارش میں جادو کے منظر کھلے ہوئے دروازوں کے
لاکھ جتن سے بھی نہیں مانا
دل کو دکھایا بیتے دن کے ہنگاموں کا تماشا بھی
شہر ہے سارا پتھر جیسا
میرا بھی دشمن ہے یہ اور اس کے لہو کا پیاسا بھی
میں بھی اپنی سوچ میں گم ہوں
پاگل ہو کر ناچ رہی وہ ہوٹل کی رقاصہ

(دشمنوں کے درمیان شام،
ص: ١٩)

منیرؔ کے ہاں صرف شہری زندگی کے مسائل کی جھلک ہی دکھائی نہیں دیتی بلکہ چھوٹے چھوٹے گاؤں بھی ان کی توجہ کا مرکز ہیں ۔ ان کی نظم " سپنا آگے جاتا کیسے " کے اشعار دیکھیئے جس میں گاؤں کی بودوباش اور سارا ماحول نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ ایسا گاوں جس میں درختوں کے ذخیرے میں پناہ گزین کچھ انسان زندگی سے دوری کا دکھ اور کرب جھیل رہے ہوں ۔ منیرؔ نے اس دکھ اور کرب کو ایک انسان دوست شاعر کی طرح محسوس کیا ہے۔

چھوٹا سا ایک گاوں تھا جس میں
دیئے تھے کم اور بہت اندھیرا
بہت شجر تھے تھوڑے گھر تھے
جن کو تھا دوری نے گھیرا
اتنی بڑی تنہائی تھی جس میں
جاگتا رہتا تھا دل میرا

(پہلی بات ہی آخری تھی،
ص:٢٣)

نظم " برا وقت ہے ہم پر" اپنے عنوان کی نسبت سے ہی ایک خرابے کا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ زندہ ہونے کے باوجود زندگی کی روح مفقود ہے۔ یوں جیسے سارا ماحول کسی طلسم کے زیرِ اثر اچانک زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہو۔

دن چٹیل میدان
شامیں ہیں سنسان

شب بے رونق خواب
اک تاریک نشان
دل کے سب ارمان
پھیکے اور بے جان
گھر ہیں بے پہچان
خالی اور ویران
چپ ہیں اور انجان
حاکم اور دربان

(ایک مسلسل)

دراصل انسان دوست منیرؔ نیازی بے روح انسانوں کا دکھ درد رکھتے ہیں اور ساتھ ساتھ ان باہمی رویوں میں تبدیلی کی خواہش بھی رکھتے ہیں جو ان دکھوں کا موجب ہیں ۔ وہ برائی کے خلاف تبلیغ کے بجائے عمل خیر کے تسلسل پر توجہ دیتے ہیں ۔ مجموعی طور پر وہ صالح ماحول کے آرزو مند ہیں جہاں انسان دوستی کی اقدار پروان چڑھیں اور انسان دوست ماحول کی تشکیل میں مصروفِ عمل لوگوں کے لیے دعا ئیہ اندازاختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔ نظم "ایک نیا شہر دیکھنے کی آرزو" کے اشعار دیکھیے۔

ایک نگر ایسا بس جائے جس میں نفرت کہیں نہ ہو
آپس میں دھوکا کرنے کی، ظلم کی طاقت کہیں نہ ہو
اس کے مکیں ہوں اور طرح کے، مسکن اور طرح کے ہوں
اس کی ہوائیں اور طرح کی گلشن اور طرح کے ہوں

(ماہِ منیر،ص: ۲۹)

" فاطمہ حسن " منیرؔ نیازی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں ۔

منیر نیازی کی شاعری کو ان کی نسل اوربعد کی نسل دونوں نے محسوس کیا ہے۔ ان کے لہجے میں ایک معصوم بچے کی حیرت ہے۔ یہ حیرت بہت سے سولات ، آئندہ کے اندیشے ، گزرے دنوں کے افشا ہوتے راز، جو ہو رہا ہے وہ، جو ہو نہ سکا وہ بھی ، غم و غصہ ، پیار و نفرت لا حاصلی کا احساس اور کچھ حاصل ہونے کی مسرت یہ تمام کیفیات ہمیں منیرؔ نیازی کی شاعری میں خوبصورتی سے سمٹی نظر آتی ہیں ۔ جبھی انہیں پڑھ کر ایک سر خوشی کا حساس ہوتا ہے ۔ وہ سر خوشی جو بہت کم نصیب ہوتی ہے۔

لسانی تشکیلات کا دور
۱۹۸۰۔۱۹۶۰

پاکستان میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کا بنظر عمیق جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ پاکستان بننے سے لیکر تا حال کوئی بھی اسمبلی درست طریق سے اپنی مطلوبہ میعاد پوری کرنے سے قاصرہی ہے ۔ اس کے علاوہ یہاں کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی صورتحال نے جہاں یہاں کے عوام کو غیر یقینی صورتحال سے دو چار کیا ہے۔ وہیں اس کا اثر ادب پر بھی ہوا ہے۔ شعرا و ادبا نے سیدھی سادی تحریر کی بجائے علامات، استعارات اور تجرید یت کی راہ اختیار کر لی۔ ہیئت کے نت نئے تجربات سامنے آنے شروع ہو گئے۔ اور یہ سب یہاں کے سیاسی حالات اور مارشل لاء کے مرہونِ منت ہے۔

قیام پاکستان کے بعد کے حالات کا اثر اسکی شاعری میں بھی نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ معاشرہ سماجی، تہذیبی اور اخلاقی انحطاط کا شکار ہوا۔ جس کے باعث نئے شاعر کو عدم معاشی مساوت اور سیاسی جبریت ورثہ میں ملے۔ اس نے یہ تمام صورتحال محسوس کی اور مختلف وسیلوں سے اسکا اظہار بھی کرتا رہا۔ ۱۹۵۰کے انقلاب ۱۹۶۸کی عوامی تحریک اور ۱۹۷۱کے المیہ مشرقی پاکستان نے عدم تحفظ کو جنم دیا۔ جبر و تشدد اور خوف و ہر اس کی فضا نے تجریدی اور علامتی رویوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اس رویے نے نظم کو زوال کا مرثیہ بنے سے تو بچا لیا لیکن بہت سے نئے مسائل پیدا کر دیے۔ نظم لکھنے والوں نے اسلوب کے تجربوں کی شکل میں نئے نئے تماشے دکھائے۔ جن میں مصر عوں کی توڑ پھوڑ، علامتوں کی بازی گری ، دھیمے لہجے کو معتوب سمجھنے کا رویہ شامل ہے۔ نئی نظم موضوع اور فکری جہتوں سے بے نیاز اسلوب اور ہیئت کے تجربے کرتی نظر آتی ہے۔ اُردو شاعری کے معتبر ناموں میں فیض احمد فیض، جیلانی کامران، شکیب جلالی، ضیا جالندھری، سر شار صدیقی، سلیم احمد، سحر انصاری ، حمایت علی شاعر ،احمد ندیم قاسمی، مجید امجد، ن۔م۔ راشد، منیر نیازی ،شہزاد احمد، قتیل شفائی، کشور ناہید اور ڈاکٹر وزیر آغا شامل ہیں ۔

۱۹۶۰۔۷۰کے عشرہ کی شاعری پر مغرب کی علامتی شاعری کے اثرات بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اس لیے تقریباً ہر شاعر کے ہاں علامتی انداز دکھائی دیتا ہے ۔ مثلاً مجید امجد کے ہاں علامات میں انسان کا شکنجے میں جکڑا ہونے کا احساس نمایاں ہے۔ مصطفیٰ زیدی کی علامات اپنے عہد کی گھٹن کا احساس ہیں ۔ شہزاد احمد کی علامتوں میں نفیساتی بصیر ت اور انسانی استطاعت کے اُدھورے پن کا احساس گہرا ہے۔ جیلانی کا مران کی شاعری میں سفر، مسافر اور حرکت کے اشارات اپنی جھلک دکھاتے نظر آتے ہیں ۔

لسانی تشکیلات ہر زبان کا حصہ ہیں ۔ زندہ زبانیں مسلسل شکست و ریخت کے عمل سے دور چار رہتی ہیں ۔ اس کے برعکس جامد زبانیں

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماضی کا قصہ بن کر رہ جاتی ہیں ۔ زبان کوئی مشینی عمل نہیں کہ ادھر مشین میں الفاظ ڈالے ادھر کھٹاکھٹ زبان تشکیل پا کر باہر نکل آئے گی۔ یہ صدیوں کے عمل پر محیط ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زبان میں ترمیم و اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ بعض الفاظ اپنی قدرو قیمت کھو کر متروک ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے الفاظ لے لیتے ہیں ۔ اردو میں لسانی تشکیلات کی کہانی صدیوں پر محیط ہے۔

ابتدا میں دکنی ادب کے ذریعے سے اردو زبان میں شامل ہونے والے الفاظ کو خارج کیا گیا ۔ بعد ازاں ایہام گوئی کی تحریک اور اس کے رد عمل کے ذریعے نئے الفاظ ، نئی علامات ادب کا حصہ بنیں اور کبھی نئے الفاظ متروک قرار دیے گئے۔ اسی طرح انشاؔاور ناسخؔ کی لسانی مساعی بھی قابل ذکر ہے۔ اسی طرح سر سید اور ان کے رفقا نے اردو میں انگریزی الفاظ کا استعمال کیا۔ اس کے بعد لسانی اختراعات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مختلف تحاریک نے اپنے مقاصد کی بازیابی کے لیے لسانی تشکیلات سے بھی کام لیا۔ علامات کے جا مے تبدیل ہو گئے۔ معنیٰ میں وسعت پیدا ہو گئی۔ شعر کے موضوعی امکانات اور ہیئتی مسائل پر غور و فکر کا موقع ملا۔

اردو شاعری میں جدیدیت کا تصور حالیؔ اور آزادؔ کے بعد اقبالؔ سے وا بستہ ہے۔ حالیؔ اور آزادؔ نے شاعری کو تنگنائے غزل سے آزاد کرانے اور جدید نظم کا تصور عام کرنے میں جو اصلاحی کوشش کیں ان کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اقبالؔ نئے دور کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے جدید شاعری کے خدوخال نمایاں کیے ہیں ۔ انہوں نے روایتی موضوعات سے ہٹ کر نئے خیالات اور نئے موضوعات پر اظہار خیال کیا اور نئے الفاظ و تراکیب، نئے اسلوب اور نئی اشاریت کا استعمال کیا۔ انہوں نے تمام کلاسیکی پیرائے اظہار کے کامیاب اور فنکارانہ استعمال سے ان کے فنی امکانات میں مزید و سعت پیدا کی۔ ڈاکٹر سلیم اختر اقبال ؔکے اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

> تراکیب تراشی اسلوب کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ غالبؔکے بعد اردو کے دوسرے بڑے شاعر ہیں ۔ جنہوں نے نت نئی تراکیب سے زبان کے حسن میں اضافہ کیا۔ اسی طرح عربی اور فارسی کے بے شمار ایسے الفاظ بھی خوبصورت اور شاعرانہ طریقہ سے استعمال کیے۔ جو بالعموم شاعرانہ لغت سے خارج تصور کیے جاتے ہیں ۔ اگر مشرقی اور قدیم تنقید کے معیار پر کلام اقبالؔ کا جائزہ لیا جائے تو صنائع بدائع کی جملہ اقسام مل جاتی ہیں اور سید عابد علی (شعر اقبال) کے بقول"جن صنائع لفظی و معنوی کا ذکر بلاغت کی کتابوں میں کیا گیا ہے۔ وہ تمام کی تمام اقبالؔ کے کلام میں موجود ہیں ۔ چنانچہ نذیر احمد نے اسی نقطہ

نظر سے اقبالؔ کے صنائع بدائع لکھی۔ جس کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ کے کلام میں صنائع بدائع کی کل ستر اقسام ملتی ہیں ۔

یہ حقیقت ہے کہ شاعری کو بے حس اور مردہ ہونے سے بچانے کے لیے اس میں نئی نئی علامات، اشاریت اور نئی نئی باتیں پیدا کرنا ازحد ضروری ہے۔ دیکھا جائے تو بیشتر شعرا روایات سے بالکل ہٹ گئے تھے۔ انہوں نے شاعری میں موضوعات کے تجربوں کے ساتھ ساتھ ہیئت میں بھی تبدیلیاں کیں اور اسلوب کی جمالیات کی اقدار کو بھی تغیر آشنا کیا۔

اس سلسلے میں محمد اسلم کھوکھر اپنے مضمون اردو زبان پر مقامی اثرات میں لکھتے ہیں ۔
جب ہم کراچی کے بعض ڈائجسٹوں مثلاََ سب رنگ الف لیلیٰ، ابن صفی میگزین و غیرہ کی طرف دیکھتے ہیں تو وہاں شعوری طور پر ہندی الفاظ کہانیوں کے ذریعے شامل کرنے کی کوشش ضرور کی گئی۔ لیکن ستر کی دہائی کے بعد یہ کوشش اسی طرح دم توڑ گئی۔ جس طرح اردو شاعری میں ظفر اقبال، جلیل عالی اور شیر افضل جعفری کی بعض کو شیش انہی سے شروع ہو کر انہی پر ختم ہو گئیں ۔شیر افضل جعفری نے بعض پنجابی الفاظ دیے ا ور ان کے معنی حاشیوں میں لکھ دیے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اشفاق احمد بانو قدسیہ اور مشتاق یوسفی جیسے ا دیب جب ایسے رحجانات سامنے لاتے ہیں تو انہیں قبول عام حاصل ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستانی ادب میں تبدیلی کا رحجان ضرور موجود ہ ہے۔

۱۹۶۰کی دہائی میں ایک ایسا گروہ نمودار ہوا جس نے تحقیق و تنقید کے سابق سانچوں سے عدم طمانیت کا اظہار کیا اور "نئی لسانی تشکیلات" کی طرح ڈالنے کی سعی کی۔ اس گروہ کے سر براہ افتخار جالب تھے۔ نئی شاعری نے ترقی پسند شاعری کے CLICHES کے خلاف اس شہر میں اعلان جنگ کیا تھا۔ اس کے علم بر دار شعرا نے موضوع اور معروفیت کے جہانِ تازہ کی نمود کی۔ اور نئے ادراک کے اظہار کے لیے نئے باطن کی تلاش کا آغاز کیا۔ نئی شعری لغت تخلیق کی جو معاشرتی صورتحال کو ظاہر کر سکے۔ اس کے لیے علامتی طریق اظہار کی بنیاد رکھی۔

دیکھا جائے تو لسانی تشکیلات کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ کلاسیکی اور روایتی زبان، فقروں کی ساخت، استعارے اور علامتیں نئے عہد کے موضوعات اور خیالات کو بھر پور انداز میں بیان نہیں کر سکتے۔ اس لیے نئی اجنبی، نادر اور منفرد سوچوں کے اظہار کے لیے زبان کے ڈھانچے میں توڑ پھوڑ ضروری ہے۔ اس تحریک کے متعلق ڈاکٹر سعادت سعید ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔

اس دور (لسانی تشکیلات)کے شاعروں نے ٹکڑوں میں بٹے اور منتشر شہری انسان اور شخصیت کے معاملات کو تلخ نوائیوں کے وسیلے سے قارئین تک پہنچایا ہے۔ منطقی اثباتیت، وجودیت، انسان دوستی، آزاد خیالی امپر یشنزم، اظہاریت، علامتیت اور دیگر کئی فن و ادب کے حوالے سے سامنے والی مغربی تحریکوں کے اثرات، نئے شاعروں کی نظموں میں گہرائی اور وسعت پیدا کرتے ہیں ۔ نئے فلسفوں کے ساتھ نمو پانے ولی نئی ما بعد الطبیعات ابلاغ اور عدم ابلاغ کے مسائل و مباحث، نئے موضوعات کا ادراک و شعور، آزاد خیالی کی روایت کا فروغ اور نئے ہیئتی تجربے اس دور میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں ۔ نئے شاعروں نے نظم کو بطور تخلیقی اکائی اہمیت دی۔ بیشتر شاعروں نے ا زاد تلازمات اور شعور کی رو کے تحت نظمیں تخلیق کی ہیں ۔ شعر المانی ا ور شعرا لصوت کے نئے نئے وتیرے دیکھتے کو ملے ہیں ۔ تازہ اور جدید تمثالوں استعاروں اور علامتوں کا استعمال ان شاعروں کے ہاں عمومی ہے۔

اس گروہ نے ولیم ایمپسن کی تقلید میں سیاق و سباق سے حقیقی معنی کی بجائے امکانی معنی کے استعمال کی راہیں کھولنے کی کوشش کی۔ تو اجتماعیت اور ابلاغ کی حدود کو بھی توڑ پھوڑ دیا۔ اس تحریک کا نقطہ آغاز اور روح رواں افتخار جالب اور جیلانی کامران کو قرار دیا جاتا ہے۔ افتخار جالب کی تقلید میں ایسے نوجوان منظر عام پر آئے جو ادب کی پرانی اور روایتی روش سے نالاں تھے۔ شاعروں ، ادیبوں اور نقادوں کا یہ گروہ ایسے نوجوانوں پر مشتمل تھاجو ضبط و احتساب سے گریزاں تھے۔ ان میں انیس ناگی، تبسم کا شمیری ، زاہد ڈار، عباس اطہر، اور اختر احسن کو اس لیے شہرت حاصل ہے کہ یہ لسانی حرمت کو پا مال کرنے میں پیش پیش تھے۔

لسانی تشکیلات کے روح روں افتخار جالب نے نہ صرف لغوی معانی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا بلکہ اس کا دائرہ وسیع کر کے شعر و ادب میں مربوط جملے کے تصور کو خیر باد کہہ دیا۔ اور ایسی تکنیک کا استعمال شروع کیا جس سے نحوی ترکیب کے اجزا درہم برہم ہو جائیں ۔

ڈاکٹر انیس ناگی افتخار جالب کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔

افتخار جالب بیک وقت اعلی تنقیدی شعور اور ہنر مندانہ شعری صلاحیتوں کا حامل ہے۔ اس دعویٰ کی تائید اس کا شعری مجموعہ مآخذ اور اس کے پرانے تنقیدی مضامین کرتے ہیں ۔ نئی شاعری کے موقف میں افتخار جالب کا جھگڑا صرف غیروں سے ہی نہیں اپنے آ پ سے بھی ہے۔اس کی شخصیت کا تصادم نظریہ ساز اور شاعر کا

اختلاف ہے۔ یہی کشمکش اس کی نثری اور شعری تحریروں میں ایک دوسرے سے متحارب نظر آتی ہے۔
اس کا اندازہ اس کے مجموعہ کلام مآخذ کی نظموں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مآخذ چھتیس نظموں پر مشتمل شعری مجموعہ ہے ۔ اس مجموعے کے دیپاچے میں وہ شاعری کی بو طیقا کو نئے انداز سے بیان کرتے ہیں ۔

١۔ روایتی اسلوب زیست کی بنیادیں وقت نے چھین لی ہیں ۔ سیاسی، سماجی اور علمی مسائل نے ہمارے اعتقادات بدل دیے ہیں ۔ کیا ہماری محبت اور نفرت کے رشتے اور مفاہیم آج بعینہ وہی ہیں جو پہلے تھے۔ ہرگز نہیں ۔
٢۔ لسانی حرمتیں ایک اسلوب زیست سے جنم لیتی ہیں اور اسلوبِ زیست سماجی مفاہمتوں ، لسانی تعینات اور لسانی عادات کو ایک وحدت دیتا ہے۔ چونکہ یہ تمام عناصر ایک بحران کا شکار ہیں۔ اس لیے اس کے پس پردہ اسلوب زیست اور اس کے حوالے سے لسانی حرمتیں اکھڑچکی ہیں ۔ انہیں چیلنج کرنے کی بجائے رد کرنا چاہیے۔
٣۔ شعری مواد کے ابلاغ کے وسائل تجزیاتی ہیں ۔ تجزیہ اپنی حقیقت میں چند اصولوں اور مفروضوں کو صحیح مان کر ان کے مطابق کسی مواد کے حصے بخرے کرنا ہے۔
٤۔ مواد کو خارجی دنیا کا پر تو قرار دینا غلط اور خارجی دنیا کی عکاسی کو ادب کا مقصد بنانا بے معنی ہے کہ شعری مواد قائم بالذات شعبہ ہے۔
٥۔ روز مرہ کی زندگی نئے مفاہیم کو جنم دیتی ہے ۔نئی نئی دقتیں اور صورتیں پیدا کرتی ہیں ۔ بنے بنائے لسانی رابطے بے کار ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے لسانی رابطے لے لیتے ہیں۔ ہر تازہ لسانی رابطہ لامحدودیت کا حاصل ہوتا ہے۔ ان گنت کرنیں اور لہریں اس میں مجتمع ہوتی ہیں ۔ یہ بے قابو تازہ لسانی روزہ مرہ کی ابلاغ اور ترسیل کی دنیا میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ کم و بیش یہی عمل ادب میں بھی ہوتا ہے۔
٦۔ ----- تخلیقی، تازہ، ہزار شیوہ لسانی رابطوں کے خلاف ابہام کے نعرے لگانے والے انہیں یک جہتی سطحی افادیت کی سطح پر لا کر بچوں کی طرح خوش ہوتے ہیں ۔ اس صورتوحال سے عہدہ بر آ ہونے کی دو راہیں ہیں ۔ اولاََ یہ کہ سکہ بند زبان سے اجتناب کیا جائے۔ زبان کے سکہ بند ہونے کے معنی ایک وقت میں دریافت شدہ لسانی رابطوں پر قناعت کرتے اور بڑھتی پھلتی، پھولتی زندگی سے تعلق منقطع کرنے کے ہیں ۔ ثانیاََ یہ کہ سکہ زبان پر تشدد کیا جائے اور یک جہت الفاظ کی جگہ تخلیقی، تازہ ، ہزرا شیوہ

گجلک لسانی رابطے کام میں لائے جائیں ۔ یعنی لسانی حرمتوں کو چیلنج کیا جائے۔

۷۔ شعر و ادب پر کب تک گرامر والے حکمران رہیں گے۔ ان سے نجات حاصل کرنا ہی چاہیے۔ وہ زبان جو ادبی وراثت میں مختلف ادوار کی ٹھو کروں ترقیوں ، پابندیوں اور زیبائش و آرائش سے مختلف طبائع کی ہنگامہ پروری، کور ذوقی یا کوش مذاقی سے ، تخریب، تعمیر، محنت، دسترس، نارسائی، کم فہمی اور ہیجدانی سے اور سننے والوں کی اجتماعی تلازمتوں کیفیتوں گردو پیش کی رنگارنگیوں ، طوائف الملوکیوں ، پریشانیوں اور مختلف مقامی اور غیر ملکیوں ، وسیلوں ، امنگوں ، سانچوں ، حکایتوں ، داستانوں اور ضربِ المثل سے ہم تک پہنچی ہے۔ اسے بعینہ بر قرار نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کھٹڑی دیورا کے نیچے سے سلیمان کو سنبھا لنے والی دیمک خوردہ لاٹھی نکالی جائے تو مختلف النوع فوائد کی اشیا بکھرجائیں گی۔ چنانچہ لسانی طور پر جذب شدہ تمام مواد جب نئے سر سے سے منظم ہو گا اور آ ج کی معنویت قبول کرے گا تو نئی راہیں کھلیں گی۔

افتخار جالب کے یہ خیالات ان کی شاعری میں بھی جھلکتے دکھائی دیتے ہیں ۔ وہ ماضی سے انکار کرتے ہوئے ایک نئے مستقبل کے متلاشی دکھائی دیتے ہیں ۔ جس کی بنیادیں اقدار کے فکری آشوب میں پھیلی ہوئی ہیں ۔ ان کی شعری زبان عموماََ استعاراتی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔"افتخار جالب کے نزدیک لسانی تشکیلات میں الفاظ اشیا کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں "۔ دراصل زبان کی اس وسعت کو شعور اور کام میں لانا لسانی تشکیلات کا سر چشمہ ہے۔افتخار جالب لفظوں میں مصرعوں کی رسمی تفہیم کے برعکس پیرا گراف کے ذریعے تجربے کے اندرونی اجزا کو ایک دوسرے سے ملاتے ہیں ۔ ان کی بیشتر نظموں کا انداز بیانیہ ہے۔ نظم پڑھتے ہوئے محسوس ہوتاہے جیسے کوئی قصہ گو قصہ بیان کر رہا ہو۔ ان کی نظم "دھند "کے اشعار دیکھیے۔

اور سمندر کے پربت پر ٹھہرا جنگل
بیتے گیتوں سے پر جنگل
ازلی خاموشی کے ہالے میں تھر تھر کانپ رہا ہے صدیاں ، سائے
سوچ، فصلیں ، آمنّا صدقنّا، ایلو! سورج، چاند
ستارے دھرتی کے سینے پر اترے۔ میری راہگزر پر بکھرے
ہلکی ، مدہم اور مسلسل حرکت۔ منزل ، پھول، کنول
کا پھول عدم کے بحربے پایاں میں تنہا تنہا جھولے
باہر پر مرکوز نگاہوں سے مخفی لفظ مطلق، تنہا
اور اداس کنول پر جھلمل جھلمل پھوٹ بہا
موہوم ردائے کوہ و دشت و دمن، دنیائے

من و تو پر چھائی پھیکی پھیکی ہو کر پھیل گئی
دھول بنی اپنا گاوں ، گوری کے پاوں تک
دھندلائے پھیلی روشن اور نرالی
دھند اور دھند اور دھند

(ماخذ، ص:٤١)

نئی شاعری کے علمبر داروں میں جیلانی کامران کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اپنی کتاب "استانزے" میں انہوں نے نئی شاعری کے بارے میں ان خیا لات کا اظہار کیا ہے۔

ہم اپنی نظم میں جو زبان استعمال کرتے ہیں ۔ اسکا ایک مخصوص طرز بیان ہے۔ یہ طرز بیان مختلف ترکیبوں ، استعاروں ، محاوروں ، الفاظ کی بندشوں اور دوسری لسانی جزئیات سے پیدا ہوتا ہے ۔ جسے ایک لمبے عرصے سے پڑ ھ پڑھ کر نہ صرف کان جھنجھلا چکے ہیں بلکہ اب تو آنکھیں بھی آنکھوں کے ساتھ ہاتھ بھی دیکھ دیکھ اور لکھ لکھ کر تھک چکے ہیں ۔ یہی زبان شاعر لکھتا ہے۔ یہی زبان ہمارے ادبی ماحول میں بکھری رہتی ہے ۔ لہٰذا شاعر اور شاعری دونوں مردہ لفظوں کا تابوت اٹھائے کبھی دائیں اور کبھی بائیں گزرتے ہیں ۔ لیکن نہ تو مردہ لفظوں میں زندگی جا گتی ہے۔ اور نہ ہی شاعروں کے راستا بدلنے سے کوئی خوشگوار صورت پیدا ہوتی ہے۔

جیلانی کامران ان مردہ لفظوں کی بجائے نت نئے الفاظ اور نئی لغت کا متقاضی ہے۔ وہ نئے اسلوب کا سوال کرتا ہے۔ اپنی کتاب "استانزے "میں موجود نظموں کی بھر پور حمایت کرتا ہے۔ ان کے حق میں مدلل دلائل دیتے ہوئے کہتا ہے۔

میں نے ان (استانزے)نظموں میں روز مرہ کی زبان استعمال کی ہے۔ وہ زبان جسے سمجھنے والوں کی تعداد پرانی شعری زبان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے ۔ یہ زبان کسی جغرافیائی منطقے سے تعلق نہیں رکھتی۔ ------یہ زبان استعمال کرتے وقت میں نے کوشش کی ہے کہ پرانی شعری زبان کا استعمال نہ کیا جائے اس کے علاوہ میں نے اس شعری زبان سے کچھ الفاظ کا انتخاب بھی کیا ہے۔ جن کے بارے میں میرا خیال ہے کہ وہ الفاظ ابھی اپنے معانی دے سکتے ہیں ۔

جیلانی کامران کے ہاں الفاظ محدود پیمانے میں رہتے ہوئے بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مروجہ شعری لغت کو تبدیل کرنا ممکن ہے۔

اوس نے مجھ سے کہا ۔ اشک ! جہاں چلایا
نا سمجھ شخص ! کسے آتی ہوں صبح ملی
اے خدا ! مجھ کو نیا روز دکھا!

اے خدا مجھ کو دکھا راہ ، کہ گم راہ ہوں میں
روشنی میری طرف لوٹ ! میں تاریکی ہوں
(استانزے)

دراصل جیلانی کامران نے جدید نظم کی تازہ کاری کے لیے جو حل تجویز کیا وہ زبان میں تبدیلی سے عبارت ہے۔ان کے خیال میں راشدؔ کی نسل تک کے شاعر اور ترقی پسند شاعر جو زبان اور طرزِ اظہار اختیار کرتے رہے اسکی تربیت پرانی شریعت کے اصولوں پر ہوئی تھی۔ جسکا مزاج "شعراًَ لعجم" نے متعین کیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ شاعر اس قابل نہ تھے کہ شعری زبان کو عجمی حدود اربعے سے الگ کر کے اور خود روایت سے باہر رہ کر دیکھ سکتے۔ جیلانی کامران کے خیال میں اس شعریت کے اصولوں کی ایک مخصوص منطق ہے جو کچھ یوں ہے۔

> یہ منطق الفاظ کی بندشوں ، اسم، فعل ، حرف کی مناسبتوں ، مختلف ترکیبوں اور محاوروں کے جوڑ توڑ میں کام کرتی ہے۔ مثلاًَ اضافت صرف فارسی، عربی کے لفظوں کو جوڑ سکتی ہے۔ آریائی لفظوں اور عجمی الفاظ کے درمیان اضافت کا استعمال جائز نہیں ہے۔ یہ منطق چونکہ ایک خاص لسانی حدود اربعے میں کام کر سکتی تھی (عجمی الفاظ کی دنیا میں) اس لیے اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ جن الفاظ کو فصیح کہا گیا وہ عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ تھے۔ ایسا کرتے وقت الفاظ کی ایک بہت بڑی تعداد فصیح کہلانے کی اہل نہ بن سکی۔ اس عمل اکا ایک نقصان یہ ہوا کہ فصیح الفاظ کے مسلسل استعمال سے ان الفاظ کی فصاحت نہ صرف ختم ہو گئی بلکہ جس بھی نئے شاعر نے ایسے الفاظ کے ذخیرے میں سے جو کچھ بھی استعمال کیا اسکی موجودگی کے باعث اسکی اپنی شاعری بھی لسانی بے حسی کا شکارہو گئی۔ یہ صورتحال آج بھی ویسی ہے۔

جیلانی کامران کے خیال میں پرانی شریعت شاعر کے تخیل کو آزاد بنانے کی بجائے پا بند بنا دیتی ہے۔ اس لیے وہ ایسی زبان استعمال کرنے پر زور دیتے ہیں ۔جسکا تعلق دبستان دہلی یا لکھنو سے نہیں بلکہ عوام سے ہے۔ بہرحال نئی نظم کے شاعروں کی ذمہ داری پہلے شاعروں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے کیونکہ وہ زمین پر جسم کے بچاو کی ذمہ داری لیتا ہے۔ سائنسی عقل پرستی اختیار کرنے کی بنا پر ہمارا فکری ماحول بدل چکا ہے اور ہم ایک سیکولر دنیا میں جی رہے ہیں ۔ جس کی تمام مشکلات اکیلے پن کے باعث ہیں ۔ نئی نظم معاشرے کی غیر صحت مند کیفیت کو اقدار کی فرسودگی سے منسوب نہیں کرتی وہ اقدار کو یک منفرد مقام دیتی ہے۔ نیز یہ کہ نئی نظم کی اساس تجربے پر ہے اور اسی لحاظ سے منفرد ہے۔ کیونکہ اسکا تجربہ اپنی پیدائش کے اعتبار سے وسیع فکری منطقوں سے تعلق رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ جب تک جسم پرانی تعلیمات کو مانتا تھا موت سے خائف نہ تھا۔ چونکہ موت جسم کو ختم کرتی

تھی لیکن روح کو ختم کرنے سے عاجز تھی۔ پرانی تعلیمات کے غیر مستند ہو جانے سے جہاں جسم کی مر کزی حیثیت قائم ہوئی ہے وہیں موت کا خدشہ بڑھ گیا ہے۔ اس صورتحال میں نئی نظم کے شاعر کو موت کے خدشے اور تقدیر مرگ کا شاعر کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔

جیلانی کامران اور انسان دوستی(۱۹۲۶۔۲۰۰٤)

جیلانی کامران کا شمار نئی نظم کے منفرد اور معتبر شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ روایت اور تجربے کی اہمیت کا گہرا شعور رکھتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں تصور شعر کے مغربی حوالوں کے ساتھ ساتھ عجمی اور مشرقی طرز فکر کی نمائندگی کا حساس بھی نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ان کی یہی خوبی انہیں نئی نظم کے شاعروں میں منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ ان کی اس قبیل کی نظموں میں "پنجسورے والا" خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس طرح" ابی نمبر" اور" نقش کف پا کی" صورت میں دراصل وہ پرانی قدروں اور عربی عجمی روایت کو دریافت کرتے ہیں ۔ بقول شمیم حنفی! "جیلانی کامران کی شاعری میں ارضی بنیاد یں جتنی نمایاں ہیں ۔اتنی ہی نمایاں اس شاعری کی ماورائی جہتیں بھی ہیں "۔

جیلانی کامران حقیقت میں نئے انسان کی تشکیل کے خواہاں نظر آتے ہیں ۔ اس سلسلے میں انہوں نے اسلام اور تصوف کی آمیز ش سے بھر پور استفادہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں شاعری من کی موج کا نام نہیں بلکہ ایک مقصد اور ایک محور کا درجہ رکھتی ہے۔

جیلانی کامران نے شاعری کی ماہیت کے بارے میں "استانزے "کے دیباچہ میں ان خیا لات کا اظہار کیا ہے۔

وہ علم جو شاعری رہتی ہے نہ تو کوئی پیغام ہے اور نہ ہی
کسی قسم کا اصلاحی پروگرام۔ وہ اصل میں انسانی دل کے
کرب کی کیفیت ہے۔ سوائے اس حقیقتِ کرب کے شاعری
کسی قسم کا دوسرا علم پیش نہیں کر سکتی۔

جیلانی کامران کے ہاں اس کرب کی عکاس ان کی متعدد نظمیں ہیں ۔ خصوصاََ "نقش کف پا کی" صورت میں انہوں نے مختلف کرداروں کی داخلی کشمکش کے ذریعے اس کرب کو قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ جسکا مبع زوال پذیر تہذیبی و معاشرتی اقدار اور صنعتی تہذیب کی جبریت ہے۔ اشعار ملا حظہ ہوں ۔

فائلیں افسر و ماتحت کی تلخی، سن کے
کام اور کاج کے اوقات ، قیامت آفس
بیویاں ، خاک کی تقدیر ، گھرانے ، بچے
تیس دن موت، کبھی خاک کبھی آگ، کبھی
اونچ اور نیچ کے بخشے ہوئے صدقے پنشن
بینک اور سود کی تفصیل، مصیبت، نقشے

آمد اور خرچ کے آداب، روپے اور پیسے
عمر کے اتنے کئی ایک سے تحفے، اندھے!
قیمی چیزیں ہیں
(جیلانی کامران کی
نظمیں(کلیات)،ص:۴۸)

ساٹھ کی دہائی کے بعد جدید نظم میں جس طرح شہروں کو صنعتی و میکانکی تہذیب کے ہاتھوں بڑی بڑی عفریتوں کا روپ دھارتے دکھایا گیا اسکے نقوش جیلانی کامران کی نظموں میں واضح دکھائی دیتے ہیں ۔ ایک نظم" شہر کا راستہ "دیکھئے جس میں بجلی کا کھمبا اس مخصوص سرد مہری اور بیگانکی کا استعارہ بن کر ابھرا ہے۔ جو صنعتی و میکانکی تہذیب کی دین ہے۔

بجلی کے کھمبے سے میں نے کہا
وہ چمکتا ہوا شہر کس راستے پر بسا ہے؟
ہوا سگرٹوں کا دھواں بن کے آئی
دکانوں کے باہر
دہکتے ہوئے دن کی دھول اورمٹی
گھٹا بن کے پھیلی تو دھول اور مٹی کی چادر پہ
میں نے کئی ایک سائے، کئی لاو لشکر
کئی داستانیں ، کئی ملک دیکھے
(جیلانی کامران کی نظمیں
(کلیات)۔ص:۱۵٤)

جیلانی کامران کی ایک نظم "باغ دنیا "بھی اس حوالے سے اہمیت کی حامل ہے کہ جس میں ہمارے عصر کی تلخ اور برہنہ حقیقتیں اپنا ادراک بڑی خوبصورتی سے کر ا رہی ہیں ۔ اشعار دیکھیئے۔

روح کو اپنی میشنوں کی بنا راکھ غذا
روغنی دہر کی خوراک بنا
روح کے ساتھ کہاں چلتی ہے دنیا کی ہوا
تو ہمیں کسریٰ و شداد بنا
دودھ کی نہر کا فریاد بنا
ہم کو شیریں کے عوض صاحب ایجاد بنا
(جیلانی کامران کی
نظمیں)

ڈاکٹر سہیل احمد جہاں "باغ دنیا" کو جدید اردو نظم کا ایک نیا موڑ قرار دیتے ہیں ۔ وہاں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔

جیلانی کامران کے کشف کی بنیاد ہمارے تہذیبی تجربے پر ہے ۔مگر ان کا کشف اب جمالیاتی کشف نہیں رہا۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر سیاسی کشف بن گیا ہے اور ا س حوالے سے سوچنا پڑے گا کہ (احیاء کی) پریاں اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر آئیں گی یا میز ائلوں کے ساتھ اتریں گی۔

جیلانی کامران کا حسی اور ادراکی شعور کافی گہرا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "الجیر یا کے لیے ایک گیت" خصوصیت کی حامل ہے۔ اس نظم میں شاعر نے ایک طرف تو حسی اور ادراکی شعور سے کام لیتے ہوئے اس مخصوص نوآبادیاتی صورت حال کو نشان زد کیا ہے جو محکوم قوم کو درپیش ہے اور دوسری طرف شعور کی رو کے ذریعے اپنا رشتہ الجیریا کے ان استعمار زدہ عوام سے بھی استوار کر لیا ہے جو استعمار کاروں کے ہاتھوں ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے ہیں ۔

سہمے سہمے دورا ہے پر، ہلکے ہلکے سست قدم
دبکی دبکی رات کا پہلو تھام کے پہلے ، زرد ہلال
بیٹوں ، بچوں ، دامادوں کی لاش اٹھائے باپ اداس
آنے والد دوزخ بہتر، اس دوزخ سے جلد نکال
کہتے ہیں

(جیلانی کامران کی نظمیں
ص:٥٤)

انیس ناگی اس نظم کے بارے میں کہتے ہیں ۔ "استانزے" کی سب سے موثر نظم "الجیریا کے لیے ایک گیت"ہے۔ یہ نظم اپنے مواد اور ہیئت کے اعتبار سے ساری نظموں سے منفرد ہے۔" انسان دوست جیلانی کامران نے زندگی کے اس کرب کو مختلف صورتوں میں ایک روحانی اور اخلاقی کرب کی صورت میں دکھانے کی کوشش کی ہے وہ "اندھے مردوں کے کورس" میں انسان کو روحانی اور اخلاقی قدروں کی کھوج میں سر گرداں اور مغموم دکھاتے ہیں ۔ یہ روحانی جستجو ملاحظہ ہو۔

ہم آنکھ کے اندھے کب کے
راستہ ڈھونڈ رہے ہیں ؟ کب کے
زندگی ڈھونڈ رہے ہیں ؟
امن کا شہر ہمیں دیکھ رہا ہے، اُس کی
منزلیں ڈھونڈ رہی ہیں ، راہی
سب ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں

(نقش کف پا، ص:٠٩)

لیکن ساتھ ہی تقدیر ، علائق زمانہ اور مادی رشتے اُن کے راستے میں دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں ، جہاں وہ جسم و روح کی کشمکش سے دو چار ہو کر اس عالم گیر انسانی کرب کا شکار ہوتے ہیں جو انسانی مقدر کا جزوِ لاینفک ہے ۔ وہ کہتے ہیں ۔

بھوک کے ظلم ہمیں چھوڑ،
گوشت اور خون کی دیوار ہمیں قید نہ دے،
خاک اور وقت کی تقدیر ہمارا راستہ
اور مت کاٹ!

(نقش کفِ پا، ص:١٠)

انسان دوست جیلانی کامران نئی شاعری میں موجود احساس مرگ، اذیت، تنہائی اور انتشار کا علاج مذہب اور اخلاقیات میں تلاش کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نشاۃ الثانیہ کی صورت میں "احیا "جیسا عظیم کردار تلاش کرتے ہیں اور "امام خمینی" (مرشد قم) کو موجودہ مسائل ا ور مصائب کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں ۔ وہ "مرشد قم کا شہر کی نسلوں سے گفتگو" کے زیر عنوان ان کے خیالات کی اخلاقی جہتوں کو یوں واضح کرتے ہیں ۔

احیا...

وقت ِسحر!

وقتِ مناجات و دعا

غفلتِ شب سے رہا کرتی ہے خلوت کی دعا!

آلِ ابلیس کے چکمے سے بچو

دوردِ جال کے چکمے سے بچو

وقت ہے وقتِ سحر

کیسا روشن ہے قمر

کیسی خوشبو سے معطر ہے سحر!

(جیلانی کامران کی نظمیں ، ص:٤٦٦)

انسان دوست جیلانی کامران اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں کہ انسان زندگی کے ہر محاذ پر دکھوں ، مصیبتوں اور کرب سے نبرد آزما ہے۔ چونکہ مرنا اس کے بس میں نہیں اس لیے وہ زندگی کے جبر کو سہنے کا حوصلہ کر لیتا ہے۔ لہٰذاتسخیر کا ایسا عمل تاریکی کے مقابلے میں روشن اور موت کے مقابلے میں زندگی اور احساس فنا کے مقابلے میں ہمیشگی کا احساس دیتاہے۔ اور جہاں تسخیر کا یہ عمل موجود ہو وہاں یا سیت کے بجائے امید اور حوصلے کا احساس دکھائی دیتا ہے۔ یہی وہ احساس ہے جو انسانیت نواز جیلانی کامران کی شاعری کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔ نظم "ابی نمبر" کے اشعار دیکھیئے۔

آو اے دوستو! کہ زمانے کی سرگزشت

اس سے کہیں جو زندگی دیتا ہے غم کے ساتھ

اس سے کہیں کہ عمر تو فانی ہے پھر بتا

صدموں کی کیا غرض ہے شب و روز دم کے ساتھ

آؤ اے دوستو! کہ زمانے سے یہ کہیں

دل چھین، زخم سونپ ، مگر زندگی نہ چھین

دن کو خزاں کی شکل دے یا موت کا لباس

رنگت کو ، بو کو چھین، مگر تازگی نہ چھین

دنیا بھی اک عذاب ہے مردہ بدن کے ساتھ

(استانزے ،ص: ٥٦-٥٥)

انسان دوستجیلانی کامران امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں پرندے ، ستارے ، پھول، کبوتر،چراگاہ اور باغ وغیرہ ایسے استعارے ہیں جو مشینی عہد میں انسانی زندگی کی امید بن کر سامنے آتے ہیں ۔ وہ اس بات کے آرزو مند ہیں کہ اس بنجر ماحول میں کہیں سے کسی پرندے کے چہچہانے کی آواز کانوں میں پڑے تا کہ سخت دلوں میں جذبات کی لہر موجزن ہو۔ ان کی نظم"پرندے پرندے"کے اشعار دیکھیے۔

پرندے پرندے ذرا چہچہا دے
مری نبض پر جست اور اجلے تانبے کی چادر پڑی ہے
جہاں دل پرانے زمانے میں جیتا تھا
سیسے کا ٹکڑا پڑا ہے
سمجھ نا سمجھ کی کہاں سرحدیں ہیں ، مگر جانتا ہوں
اگر تو نہ ہوتا، تو مری لڑکپن کی دنیا نہ ہوتی
درختوں کی شاخوں میں میری جوانی کا قصہ نہ ہوتا
بدلتے ہوئے موسموں کی کہانی نہ ہوتی
پرندے پرندے! کلس سے اتر کر
جہاں میں کھڑا ہوں وہاں چہچہا دے
میری زندگی سے زمانہ خفا ہے
مجھے آسرا دے

(جیلانی کامران کی نظمیں)

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جیلانی کامران انسان کے نہ ختم ہونے والے مسائل کا حل مذہب اور اخلاقیات ہی میں تلاش کرتے ہیں ۔ اس لیے ڈاکٹرانیس ناگی کا یہ کہنا بجا ہے "وہ نئے مورال ایشوز کی طرف لے جانے کی بجائے لوگوں کو مسلمہ اور متفقہ نظام اخلاق کی طرف واپس آنے کی تلقین کرتے ہیں "۔

افتخار جالب اور انسان دوستی (۱۹۳۶۔۲۰۰۳)

ساٹھ کی دہائی کے بعد جن اہم نقادوں نے جدید اردو نظم میں جدید نظریہ سازی کی اور جن کی لسانی تشکیلات نے جدید اردو نظم کو ایک نئے لمس اور آہنگ سے آشنا کیا۔ ان میں افتخار جالب کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ نئی شاعری کے تحت لکھی جانے والی نظموں پر افتخار جالب کے نظریات کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ وہ بیک وقت اعلیٰ تنقیدی شعور اور ہنر مند انہ شعری صلاحیتوں کے حامل ہیں ۔ اس دعوی کی تائید اس کا شعری مجموعہ "ماخذ" اور اس کے پرانے تنقیدی مضامین کرتے ہیں ۔

انیس ناگی افتخار جالب کے شعری مجموعے "ماخذ" پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں ۔

" ماخذ" کل چھتیس نظموں پر مشتمل شعری مجموعہ ہے۔
اس مجموعے میں اردو شاعری کے روایتی اسلوب شعر سے

انحراف، تصادم اور نئے شعری اسلوب کے لیے تجربے کا
اجتہاد افتخار جالب کے دو نمایاں رحجان ہیں ۔ وہ مروجہ
جذباتی اور لسانی اسالیب کو مسمار کرنے کے لیے بڑی
شدت سے روایت اور عدم روایت سے دست و گریباں نظر
آتا ہے۔

انسان دوست افتخار جالب موجودہ عہد کی پیچیدگیوں کا شعور رکھنے والے ایک ایسے شاعر ہیں جو اپنے عصر کی پیچیدگیوں کو پیچیدہ اسلوب میں بیان کرتے ہیں جسکی وجہ سے ان کی نظمیں شدید ابہام کا شکار دکھائی دیتی ہیں ۔ چونکہ ان کا یہ پیچیدہ بیان آزاد تلازمہ کاری کی بنا پر ہے اس لیے ان نظموں کی تفہیم ایک مشکل امر ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر طویل خود کلامی میں مصروف ہے جس میں "میں " کاصیغہ بے حد اہم ہے۔ وہ اپنے تجربات و مشاہدات صیغہ" میں " میں بیان کرتا چلا جاتا ہے اور یون ان کی انسان دوستی "وجودی " صورت اختیار کر لیتی ہے۔وہ کہتے ہیں ۔

خود نگر ہوکے رہوں یا جہاں بینی کروں ، میری حقیقت ہے
حقیقت میں ہوں ! میں ہوں ! میں ہوں اور سیلِ حوادث
مرے ابرو کے اشارے سے بڑھے
بڑھ کے تھمے، تھم کے بڑھے
میری خبر میں ہے شب قدر کا ہنگام
تمہیں کوئی خطر ہو تو کہوں ! آتی ہواوں میں ہوس کی
ترغیب ہے
معلوم ہے، سب راہیں مرے عکس میں ہیں
اورہبوطِ آدم مرے عکس میں ہیں

دوسری طرف افتخار جالب کا" میں " جدید دور کے فرد کی کہانی بھی بڑے عمدہ پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا انسان ہے جسکی زندگی تضادات اور سوالات سے عبارت ہے۔ لیکن اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔

میں اوہام پرست نہیں ہوں
ہفت سماوات اور زمین گردش میں قید ہوئے
سارے تعلق ٹوٹ گئے
مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو؟
میں ہر راز بیان کرنے سے عاجز ہوں
میرے پاس کسی کا نام نہیں ہے
میرے کان حقیقت کی آواز نہیں سنتے
شک سرگوشیوں کے نقارے مین استفسار ہی استفسارجواب
نہیں

افتخار جالب کے "میں " کے حوالے سے انیس ناگی لکھتے
ہیں ۔

افتخار جالب کی نظموں کے افہام میں لفظ "میں " کا صیغہ بے حد اہم ہے۔ اس نے اپنے تجربات کا ادراک اور اظہار صیغہ متکلم کے توسط سے کیا ہے۔ بعض دفعہ یہ شائبہ ہوتا ہے کہ شاعرخود مرکز یت کا شکار ہے اور ساری نظمیں اس کے احساس سے پیدا ہوئی ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ افتخار جالب نے لفظ "میں "کو مختلف معانی میں استعمال کیا ہے۔ یہ انا، روشنی، حرکت، حقیقت، وجود، احساس ذات اور ایک مخصوص زمانی شعور کے متنوع معانی میں اپنی وضاحت کرتا ہے۔ افتخار جالب کی "میں " میں تو کا صیغہ بھی شامل ہے۔ "میں " اور "تو" کا اشتمال بیک وقت وجود انسانی کے شعور اور معروضی حقائق کی موجودگی کو ظاہر کرتا ہے۔ اپنی مکمل اور جامع تر شکل میں لفظ "میں " افتخار جالب کی نظموں میں بدلتا ہوازمانی شعور ہے۔۔۔ اس کی نظموں میں "میں " کا تصور شخصی اور انفرادی انا کا مظاہرہونے کے بجائے تجربات کے ادراک کا ایک واسطہ ہے۔

افتخار جالب کی نظمیں عصری شعور سے ہم آہنگ دکھائی دیتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے صنعتی اور میکانکی تہذیب کے ہاتھوں اضمحلال اور اضطراب کا شکار ہونے والے فرد کی المیہ داستان کو پوری شدت کے ساتھ منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ جس میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں ۔ ایک نظم "پھر تو کس کے لیے" کے اشعار دیکھیئے

آتے جاتے کرشموں کی تحصیل کشکولِ شوق برہنہ کامسلک نہیں
کوئی دریا کی لہروں پر رکتا نہیں
سنگریزوں کے پہلو چھلے جار ہے ہیں
ٹریفک کا ہنگامہ بڑھنے لگا ہے، تمہیں ٹیڑھی سیدھی اتر جائیں گی
سخت، پتھر کا دل، ہرتغیر سے محفوظ دریا کے چھلنی بدن سے ابھر آئے گا
کول تار اور بجری سے چھلنی ٹریفک پھر سے پردہ کرے گی

(ماخذ، ص:۳۷)

انسان دوست افتخار جالب کی ایک نظم "قدیم بنجر" کے اشعار دیکھیے۔ جس میں انہوں نے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے در بدر کی ٹھو کریں کھاتے انسان کی بے بسی، لاچاری اور کرب کو بیان کیا ہے۔ جن کی زندگیاں اجنبی دریاوں کی مشینوں کا ایندھن بن جاتی ہیں اور وہ دکھ کی مجسم تصویر دکھائی دیتے ہیں ۔

قدیم بنجر سیاہ ذروں میں بٹ گیا ہے
شہر کی خرابہ گزرگاہ کے ساتھ ناچتے اجنبی دریاوں کی

دھول
قدیمی معاونت کا عذاب، شکنوں کی گرد، بہتے ہوئے جہنم
کی راکھ سینے پر منتشر، سب شبیہیں ہیں انجام ریزہ، محال
کی مشتبہ حرارت
بدن دکھن تر مرے دھماکے تضاد راہوں میں گرتی بہتی
ارادتیں میرے
پاؤں بالکل ہی اٹ گئے ہیں مرے ارادے کی سیڑھیوں پر
نزار صدموں
کے عید تہوار آبلوں کی شکستگی ہے چلو مسافت مزار
دیوار ہو گئے ہیں
بیکار کا مزا شور تند تائید کے لیے بے طلب شکستہ نصیب
اعصاب پر ابھی سے محیط
گردوں ، زمانہ رگ رگ رواں دواں ہے۔ سوال بے چارگی
کا موقع گزر گیا
کچھ تو مل گیا مرمریں بغاوت اداس راہوں کے سرد چہرے
پر جم گئی ہے
افتخار جالب مختلف سامراجی طاقتوں کے توسیع پسند عزائم
کا بھی پردہ جاک کرتے ہیں اور ساتھ ہی نیوورلڈ آرڈر کے
تحت اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کی خاطر مغربی
اقوام کا ترقی پذیر ممالک میں بڑھتا ہوا اثر و رسوخ بھی
انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اس سلسلے میں ان کی نظم
"زیست کا کوڑا ملبہ "کے اشعار قابل توجہ ہیں ۔
شیر بکری کے نئے گھات کے دروازے، آرے
ورلڈ آرڈر کے بہیمانہ طلسمات نے ڈیرے ڈالے
ہم تہی دست تو پہلے ہی سے تھے، دیکھیئے مشروم فشن
شیر و شکر ہوتی زبانوں کا بطن، قربت و لاچاری کا لنگوا
کلچر
ٹاکسک ویسٹ میں تبدیل کیے دیتی ہے ۔ تاحد نگہ زیست کا
کوڑا ملبہ
ہیروشیما کے دم عیسیٰ کا ہر لحظہ نیا کن فیکون
افتخار جالب نے اپنی نظموں میں اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھا یا
ہے کہ نائن الیون کے بعد مختلف اقوام نے کس طرح اپنے اجتماعی ضمیر
کو پس پست ڈال کر مختلف سامراجی قوتوں کے بہیمانہ اقدامات کی
حمایت کی ہے۔ اور اپنی خود مختار یت اور عزت نفس کو ڈالروں اور
قرضوں کے عوض فروخت کیا ہے۔ یہ اشعار قوم کے سامنے آئینے کی
حیثیت رکھتے ہیں ۔ ملاحظہ ہوں ۔
انہوں نے اعضائے مردی کاٹ کر عدوات خوشی سے کتوں
کے آگے ڈالے
سنو، اگر بخش دو تو ہر دم غلام ! منظور ہے؟

نہیں تو جتنا خراج چاہو، ادا کریں گے ! قبول کرتے ہو؟
آو ممکن جو ہو سکے تو مصافحہ کر لیں ٹھیک ہے؟
تمام تجویزیں رد کرتے ہو، کیا لڑائی ہی شرط ٹھہری ہے ؟
خوب!
افتخار جالب "مآخذ "کے دیپاچے میں رقم طراز ہیں ۔
میں چیزوں کو انتشار اور پھیلا و کے بغیر قبول نہیں کر سکتا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کرتا رہوں گا۔ چیزیں متغیر ہوتی نظر آتی ہیں تو آئیں ۔ ترتیب گم ہوتی ہے تو ہو جائے۔ رشتے درہم برہم ہوتے ہیں تو کیا ہوا۔ اس الٹ پلٹ، انتشار، پیچیدگی اور پھیلاو میں میری روحانی آبرو ہے۔
افتخارؔ جالب کے ہاں ہمیں آزادی اور انسان دوستی کا غالب رنگ دکھائی دیتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر انسانی آزادی اور حق خودا رادیت پر زور دیتے ہیں ۔ وہ سرمائے کے ارتکاز کے بجائے اس کی مساوی تقسیم کے حق میں ہیں ۔ وہ معاشرے میں مساوات کا قیام عمل میں لانا چاہتے ہیں ۔ جہاں ہر ایک کو اسکا مساوی حق ملے۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں خصوصاً کشمیر کے حوالے سے ، بنگال کی خوں ناک مہک اور یوم مئی کا جلوس قابلِ توجہ ہیں ۔
یہ اذازلزلۃ الارض کا ہنگام نہیں
دو خداوں کے ولی نعمتو! سرمائے کی شمشیرو! سنو
محض گھیراو کی تحریک تھی، تنظیم کے افلاک پر کوندے کی لکیر
اپنے اجلال میں لاثانی، توانائی کا اِک مشعلہ مستعجل و محدود!
یہی تھا کہ نہیں ، تمہی کہو
دم کی مہلت ہے، ملے یا نہ ملے کچھ تو کہو
اور کچھ کہنے کا یارا نہیں ، اتنا تو کہو! اس میں حقیقت ہی نہیں
حوصلہ رکھتے ہو تو یہ موقع غنیمت ہے کہو، کچھ ہی کہو یا کوئی تو بہتان دھرو
دھمکیاں دیتے ہو، للکارتے ہو، لرزہ براندام بھی ہو
یہ تو کچھ بات نہیں
ایک معمولی تموّج سے پیشاب خطا ہونے لگا
حوصلہ کیوں ہارتے ہو ؟ صبر کرو
وقت کی یلغار شقی قلب درندوں کو تہ و بالا کیے دینے کو ہے
جبر کی عیاشی سے مخمور شیاطین دھتے جانے کو ہیں
قہر کا آغاز ہے

افتخار جالب نے اپنی نظموں میں انسان دوستی، امن پسندی اور آزادی فکر و عمل پر خاص زورو دیا ہے۔ ان کی نظموں میرے کو رات نیند نہیں آتی، گو رینکا کی یا ترا، انکبورگ باخمین واواء،"اودھل آلھا گا وت ہیں " وغیرہ میں مذکورہ بالا اقدار کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے فکر و فلسفہ پر تبصرہ کرتے ہوئے۔ نسیمہ رحمان لکھتی ہیں ۔
افتخار جالب کے کلام میں ایک مثبت پہلو انسان دوستی کا بھی ہے۔ انہوں نے صنعت معاشرے کی بے رحم مادیت پر ستی کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ وہ عصر حاضر کے تہذیب و تمدن کی پیدا کردہ بے چینی ، دھوکے بازی، خود غرضی اور احساس بیگانگی پر بے حد نالاں نظر آتے ہیں ۔
انسان دوست افتخار جالب نے اپنی نظموں میں انسان کی حقیقت اور کائنات میں اسکی حیثیت کو بھی بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ان کے خیال میں عظمت انسانی اور شرف آدمیت کے خیالات باطل ہیں ۔ یہ بے حقیقت اور بے معنی ہیں اصل میں انسان ایک بے مایہ سا ذرہ ہے ۔ وہ کائنات کی بیکراں وسعتوں پر قادر و حاکم ہونے کی بجائے نہایت فرو مایہ سی چیز نظر آتا ہے۔ افتخار جالب کی نظم" ہر گھڑی دائرے بنتے ہیں " کے اشعار دیکھیے جس میں انسان کے دکھ اور کرب کی بہترین عکاسی کی گئی ہے

ہر گھڑی دائرے بنتے ہیں
گنجلک، سایہ اشجار کی مانند اداس
میں ہوں محصور، زمیں گردشِ افلاک میں ہے
کوئی مقدر کا ستارہ بھی نہیں
کوئی زمیں ڈھونڈے
زمیں زیرِ قدم روز گزر کرتی ہے تنہا و خزاں ماندہ
مرا دل کہ عضونت سے سزا یا فتہ پوچڑ کی دکان ہے، نہ
جہاں اور جہت

(ماخذ، ص:۵۱)

افتخار جالب کے خیال میں جدید تصورات نے انسان کی منزل کا تعین نہیں کیا۔ اگرچہ انسان نے روایتی ڈگر تو چھوڑ دی ہے۔ لیکن نیا راستہ اس کے لیے ہموار نہیں ہے۔ انسان آگے سفر کرتا چاہتا ہے مگر اس سے سمت کا تعین مشکل ہے۔ نظم "تنہائی کا چہرہ" کے اشعار اسی المیے کے عکاس ہیں ۔

--میری کوئی راہ نہیں ہے
ساری راہیں میری ہیں ۔ میں سرگشتہ ہوں ۔خوابوں کے
محمل میں
ہفت سماوات
اور زمیں لے کر چلتا ہوں ۔ لیکن دیکھ نہیں سکتا ہوں
میرا تو گھر بار نہیں ہے

(مآخذ،ص:۵۵)

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ افتخار جالب کی انسان دوستی آزادی، امن اور خود اعتمادی کا پیغام عام کرتی ہے اور تنہائی، بے بسی اور وحشت و تشدد کے خلاف آواز بلند کرتی ہے جو صنعتی معاشرے کی دین ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغااور انسان دوستی (۱۹۲۲۔۲۰۱۰)

ڈاکٹر وزیر آغا اپنے زمانے کے ممتاز دانش ور، مفکر، شاعر، نقاد، انشائیہ نگار، مضمون نگار اور سب سے بڑھ کر اپنے معاصرین میں ایک اہم نظم نگار کی حیثیت رکھتے ہیں ۔بقول ڈاکٹر وزیر آغاگر مجھے شعر کی سعادت نصیب نہ ہوتی تو میں کسی بھی صنفِ ادب میں کچھ نہ کر سکتا یہی بات شاعری کو ان کے باقی ادبی کاموں پر فوقیت دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بڑی شائستہ ، دلنواز اور انسان دوست شخصیت کے مالک بھی ہیں اور ان کی یہی انسان دوستی انہیں ایک عمدہ انسان بناتی ہے۔ جہاں تک وزیر آغا کی نظم نگاری کا تعلق ہے تو وزیر آغا کی نظموں کے اب تک تیرہ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں ۔ ان مجموعوں میں انسان دوستی کے عناصر تلاش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ وزیر آغا کے دور کے حالات کا جائزہ لیا جائے۔

بیسویں صدی تحریکات، انقلابات اور حادثات کی صدی قرار دی جائے تو بے جانہ ہو گا۔ برصغیر اور بیرون برصغیر تاریخ کے یہ مناظر کھلم کھلا دیکھے گئے۔ پہلی جنگ عظیم(۱۹۱۴)انقلاب روس(۱۹۱۷)سانحہ جلیا نوالہ باغ (۱۹۲۱)عالمی معاشی بحران(۱۹۲۹) دوسری جنگِ عظیم(۱۹۳۹)قیام پاکستان(۱۹۴۷)اور پاکستان میں مارشل لا کے نفاذ(۱۹۵۸)کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں ترقی پسندتحریک (۱۹۳۶)اور رو مانوی تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کی تحریک بھی بیسویں صدی کے نصف اول کی یاد گاریں ہیں ۔ وزیر آغا اور ان کے معاصرین نے اکثر تحر یکات اور انقلابات کو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کیا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر کے واقعات خصوصاًً لسانی تشکیلات کی تحریک، جدیدیت اور ما بعد جدید یت کی تحریکیں بھی انہی انقلابات کا حصہ ہیں ۔ انہوں نے ایک ملک کو دو حصوں میں کٹتے ۱۹۷۱بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وزیر آغا اور ان کے معاصرین کی اکثریت نے تو انقلاب ایران ۱۹۸۰کے علاوہ ضیا الحق کا مارشل لا ، سماجی تبدیلیاں اور گلو بیک صورتحال بھی بنظرغائر ملاحظہ کی۔

تقدیر کے نامنصفانہ طریق کار، معاشرتی استحصال اور معاشی عدم توازن نے وزیر آغا کو چکر ا کر رکھ دیا۔ حساس طبع کے مالک اور انسان دوست وزیر آغا نے انتہائی ثابت قدمی سے شاعری کی دنیا میں قدم رکھا۔ اور انسان دوستی کے پیغام کو عام کرنے کی کوشش کی تا کہ دنیا

سے کینہ، نفرت اور کدورت کو ختم کر کے محبت اور پیار کے گیت گائے جائیں ۔
وزیر آغا کے شعری مجموعہ "دن کا زرد پہاڑ " میں گرد و پیش کا منظر نامہ، روحانی رشتوں کی شکستگی، سائنسی ترقی کے اثرات اور انسانی دکھوں سے غیر مشروط و ابستگی کا خوب صورت اظہار ملتا ہے۔ وزیر آغا کا ایک اور شعری مجموعہ "گھاس میں تتلیاں " ہے۔ اس شعری مجموعہ میں زندگی کے تسلسل کی حقیقتوں کا ادراک، زندگی کی ناپائیداری، حیات و کائنات کے گہرے رشتوں کا ادراک، عظمت انسان اور اعلیٰ اقدار کو بے تکلف پیرایہئ اظہار میں سامنے لایا گیا ہے۔ رشید نثار وزیر آغا کی انسان دوستی پر جو ان کے شعری مجموعہ" گھاس میں تتلیاں " سے عیاں ہے ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔ " گھاس میں تتلیاں " وزیر آغا کی امن دوستی کی مرئی علامت ہے اور اس منفرد طرز احساس کا نشان بھی، جس کا گہرا رابطہ زمینی رشتوں کے ساتھ ہے۔
وزیر آغا کی نظمیں اپنے معاصرین ترقی پسندوں سے منفرد نظر آتی ہیں ۔ کیونکہ ترقی پسند صرف ایک نظریے کی ترویج و ترسیل میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیتے ہیں ان کے ہاں مقصدیت فن پر غالب دکھائی دیتی ہے۔ جبکہ وزیر آغا اپنی دھرتی سے انسلاک کرتے ہیں ۔ ان کی علامات اسی دھرتی سے ماخوذ ہیں ۔ ان کی نظموں کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے ماحول،ثقافت، دھرتی اور دھرتی پر بسنے والوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور یہی ایک انسان دوست شاعر کی خوبی ہے۔
بقول ڈاکٹر عبدالکریم خالد!

> وزیر آغا کے یہاں دھرتی اور زمین کا حوالہ خاص اہمیت کا حامل ہے ۔ انہوں نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ شہر کے ہنگاموں سے دور گاؤں میں گزارا ہے۔ جہاں انہوں نے مٹی کے لمس کو بڑے قریب سے محسوس کیا ہے اور فطرت کی ایک تہذیبی اور ثقافتی اہمیت ہے جس میں ارض و طن کا حوالہ بھی ہے۔ جو ہماری جذباتی و ابستگی کا مظہر ہے۔ اس سے آگے زمین کی کوکھ سے تہذیب اور کلچر جنم لیتے ہیں ۔ چنانچہ وہ زمین کو طبقاتی اور معاشی تناظر میں دیکھنے کی بجائے خالص تحقیقی حوالے سے دیکھتے ہیں اور کلچر کو دھرتی کا اٹوٹ انگ قرار دیتے ہیں کہ اسکی جڑیں دھرتی میں دور تک اتری ہوئی ہیں ۔

وزیر آغا کی نظموں میں ارضی حوالہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ جو اس بات کا اظہار ہے کہ انہیں اپنی جنم بھومی سے بہت پیار ہے ۔وہ اس کے نظاروں ، کوہساروں ، مرغ زاروں اور بیابانوں میں منہک دکھائی دیتے ہیں ۔ ان کی نظموں میں دھرتی سے وابستگی دراصل دھرتی پر بسنے والوں کے ساتھ وابستگی ہے۔ اور یہی ان کی انسان دوستی کی بہترین مثال ہے۔ اس انسان دوستی کا اظہار انہوں نے اپنی نظم "کار سے اترو "میں کچھ اس انداز سے کیا ہے۔ اشعار دیکھیے۔

تم کیوں ربڑ کے بوٹ کی نوک سے
ٹھوکر مار کے ان خوشیوں کو
بڑی بڑی خوشیوں کے پیچھے
دوڑ رہے ہو
کار سے اترو
رُک کر دیکھو
(چٹکی بھر روشنی،کاغذی
پیرہن، ص:۱۸)
دوسری طرف نظم" آنسو بھری مسکان" کے اشعار بھی
ملاحظہ ہوں ۔
نہ جانے کس جگہ ہم آ گئے ہیں
جہاں خوشیاں
زدِجاروب کھاتی پھر رہی ہیں
بس اک آنسو بھری مسکان ہے
جس کے سہارے جی رہے ہیں
(دیکھ دھنک پھیل گئی ،کا غذی
پیرہن، ص:۸۱)
وزیر آغا کی ذات پیار و محبت اور خلوص کی پیکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ دھرتی پر صنعتی ترقی کے منفی استعمال ، دیہاتوں اور جنگلوں کو ختم کر کے حرص و ہوس کے ساتھ مادیت پرستی کا فروغ، روحانی اور اخلاقی قدروں کی پامالی، نفسانفسی کے عالم میں نفرتوں اور عصبیتوں کی ترویج دیکھتے ہیں تو ان کو شدید دکھ ہوتا ہے۔ وہ اس بات کو شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ دھرتی سے منسلک انسان بے حسی کا شکار ہو چکا ہے۔ اس کے سینے میں دل کی بجائے روبوٹ ہے جو احساسات و جذبات سے عاری ہے۔ اور ہر طرف نفرت اور ہوس کی دنیا آباد ہے۔ وزیر آغا کی نظم" اک کتھا انوکھی" کے اشعار دیکھیے جس میں وہ خواب غفلت میں سونے والوں سے مخاطب ہیں ۔ جن کی غفلت کے باعث دھرتی محبتوں کے بجائے نفرتوں کی آ ماجگاہ بن گئی ہے۔
سونے والے
جب دھرتی پر آوازوں کا شور اٹھا تھا
اور فولاد کا راج ہوا تھا
انساں سارے
لوہے کے روبوٹ بنے تھے
بے چہرہ، بے نام ہوئے تھے
(اک کتھا انو
کھی،ص:۴۴۸)
کہا جاتا ہے کہ کوئی بھی فنکار اپنے معاشرے یا ثقافت سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنے سماج میں بسنے والے لوگوں کا رہن سہن ، ریتیں ، رسمیں قوانین، حلال و حرام میں امتیازات، نظریات، تصورات،

اقدار، تجربات اور آداب و اطوار کا ناظر بھی ہوتا ہے اور ناقد بھی۔ یہی خوبی وزیر آغا کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "تماشا "قابل توجہ ہے۔ جس میں حقہ ایک ثقافتی حقیقت اور اجتماعیت کی علامت ہے۔ حقے کی "نے" سے برآمد ہونے والی "بڑ بڑ "کو انہوں نے جملہ قبائلی، نسلی، خاندانی اور اجتماعی تعصبات ختم کر کے انسانی اخوت اور عالمی برادری کے احساس کو پروان چڑھانے کا بلاوا قرار دیا ہے۔ اور یہی ایک انسان دوست شاعر کی پہچان ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شہروں کی حالت زار پر سوچنے کی دعوت بھی دی ہے۔ جہاں صنعتی عہدکے کارخانوں نے انسانی اقدار کا خاتمہ کر دیا ہے بلکہ آدمی، آدمی سے جدا ہو گیا ہے بلکہ خود اپنے آپ سے بھی بچھڑ گیا ہے۔

پھر اک حقہ
صدیوں پرانا باسی حقہ
میلا سا اک پھٹا ہوا اخبار اٹھائے
دھوں اگلتا
بُڑبُڑ کرتا
دھیرے دھیرے تھڑے پر آیا

(گھاس میں تتلیاں ، ص:۶۳۳)

بقول ڈاکٹر رشید امجد!

بنیادی بات یہ ہے کہ وزیر آغا کے یہاں فلسفیانہ عمل کے باوجود معاشرتی حقیقتوں سے رشتہ منقطع نہیں ہوتا۔ ان کے افکار و نظریات میں سماجی اور ثقافتی عمل ایک زندہ شے ہے۔ وہ انسانی عظمت کی تکمیل کو محض فکری یا خیالی سطح پر محسوس کرنے کی بجائے انسان کو ایک متحرک سماجی قوت تسلیم کرتے ہیں ۔ اس لیے ان کی نظموں میں فکر اور خیال کی بلند پروازی کے باوجود زمین کی نفی نہیں ہوتی۔

وزیر آغا کی نظموں میں لہلہاتے کھیت، خوبصورت درخت، سبزہ و گل، پرشور ندیاں ، بہتے دریا، پہاڑ اور سمندر مختلف انداز میں جلوہ گر نظر آتے ہیں ۔ انسانیت نواز و زیر آغا کی یہ خاص خوبی ہے کہ وہ لہلہاتی کھیتیوں اور گھنی ٹھنڈی چھاوں میں ڈوبی ہوئی بستیوں اور ان میں رہنے والے مکینوں اور چھوٹی چھوٹی اشیا کے گہرے مشاہد ے سے دل کی گہرائیوں تک پہنچ جاتے ہیں ۔ ملاحظہ ہوں وزیر آغا کی نظم "اجڑ تا شہر" کے چند اشعار۔

کبھی چہچہاتے ہوئے ننھے بچوں کی ٹولی
پرانی سی اک بس کے پنجرے سے نکلے
گلی کے کھلے منہ میں چپکے سے اترے
ادھڑتی ہوئی اک عمارت کے اندر پہنچ کر معاً ٹوٹ جائے
کبھی چوک کی ایک صدیوں پرانی نم آلود کھڑکی کی

چوکھٹ پرٹھوڑی ٹکائے
کوئی زرد چہرہ-- پھٹی سرخ آنکھوں کے زندان میں
بے قراری سے پھرتی ہوئی پتلیوں کا تماشا دکھائے
(شام اور سائے، ص
:۲۰۳،۲۰۴)

وزیر آغا کے ہاں ارض اور ارضی مظاہر سے دل بستگی اور انسان دوستی ان کی فکر کو حب الوطنی کے جذبے سے سر شار کرتی ہے اور یہ حب الوطنی صرف کسی خاص ارض کے سر حدی دائرے بالخصوص سماجی طبقوں یا رشتوں ناطوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں بسنے والے لوگوں کے غموں اور خوشیوں کا احساس بھی ہے اور یہی چیز انہیں انسان دوست شاعر بناتی ہے۔ وطن کے باسیوں سے محبت، پیار اور انسان دوستی کا یہ انداز در اصل اس طبقاتی سماج سے بے زاری کا اظہار ہے جس میں یہاں کے بسنے والوں کی اکثریت مبتلا ہے۔اس طرح وزیر آغا جو ترقی پسند نقطہ نظر کو نہیں مانتے کسی حد تک ترقی پسندانہ سوچ کے قریب آ جاتے ہیں ۔ نظم "چیل" میں علامتی پیرائے سے کام لیتے ہوئے عام سماج سے منقطع طبقے کو عوامی دوریوں کے ناخوشگوار نتائج سے خبر دار کرتے ہوئے مشورہ دیتے ہیں کہ

کمرے کی اکلوتی آنکھ سے باہر جھانکو
دیکھو بستی جاگ اٹھی ہے
شیشم کی چوٹی پر بیٹھی
چیل مڑی ہوئی چونچ سے اپنی
الجھے پنکھ سنوار رہی ہے
چیختے طوطوں کی اک ڈار کہ یک دم سہم گئی ہے
جامن کے اک جھنڈ پر گر کر ختم ہوئی ہے
تم بھی جاگو
تم کن میٹھے سندر، سپنوں میں غلطاں ہو
آنسو کی باریک ردا سے جھانک کے دیکھو
بستی پنکھ سنوار رہی ہے
(شام اور
سائے،ص:۲۹۹،۳۰۰)

یہ درست ہے کہ دھرتی سے محبت، دھرتی پر بسنے والے کی اکثریت کے دکھ سکھ سے عبارت ہوتی ہے۔ وزیر آغا کی نظم "ماں " دھرتی اور دھرتی پر بسنے والوں سے محبت، انسان دوستی، رغبت اورانسلاک کا بہترین ثبوت ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ مصرعے۔

وہ برگد کا اک پیڑ تھی
جس کی مانوس گہری خنک چھاؤں میں
ہم نے عمریں بتائیں
وہ مخمل کا اک نرم چھتنار تھی

جس کے پتوں میں چھپ کر
مہکتی ہوئی دودھیا شاخ کو تھام کر
ہم نے میٹھی سی راحت کا انعام پایا
وہ پتوں کے پنکھے سے
شاخوں کی لوری سے ہم کو سلاتی رہی
مسکراتی رہی

(دن کا زرد پہاڑ، ص:٣٦٦)

وزیر آغا کے ہاں "انسان " اور"کائنات" دو بڑے موضوعات ہیں ۔ ان کی نظم"اندھی کالی رات کا دھبہ" کے اشعار توجہ طلب ہیں ۔ جس میں چاند پر انسان کے قدم رکھنے اور اسکی حقیقت آشکار ہو جانے کے بعد کی صورتحال کی تصویر کشی خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔

جاو پھر سے کھاٹ پہ لیٹو
ٹکٹکی باندھ کے اُس کو دیکھو
کتنا بے بس ، کتنا بھیانک ، کتنا تنہا
ڈولتا پہیہ، کھوٹا سکہ، اندھی کالی رات کا دھبہ
تم نے اس دھبے کو اب تک پیشانی کی شوبھا سمجھا
اور اب خالی برتن بن کر چیخ رہے ہو

(دن کا زرد پہاڑ ، ص :٤٠١)

جبکہ دوسری طرف نظم "یلغار" کے اشعار دیکھیے جس میں انسان دوست وزیر آغا نے خوفناک ہتھیاروں کی جنگ کے نتیجے میں بربادیوں کی دل دوز تصویر یں پیش کی ہیں ۔ دراصل ان سائنسی ایجادات کے ذریعے انسان نے اپنی تباہی کا سامان خود پیدا کیا ہے۔ وزیر آغا اس تباہ کن صورتحال کا نقشہ کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں ۔

اندھیرے کی ڈائن نے شہروں
چھکتے مہکتے ہوئے خوبصورت گھروں
اور گھروں میں دمکتے ہوئے
دودھیا قمقموں ہی کو نگلا نہیں ہے
وہ سینے کے معبد میں گھس کر
ہزاروں برس سے مقفل پڑی میری پوُنجی
مری روح کا سوز
دل کی تپش
اور قرنوں سے چھینے ہوئے
روشنی کے خزینے کو بھی کھا گئی ہے

(دن کا زرد پہاڑ ، ص :٣٥٣۔٣٥٤)

وزیر آغا انسانی ہمدردی، امن وآزادی جیسی اعلیٰ انسانی قدروں کے علمبردارہیں ۔ ان کی امن، محبت اور آزادی کے احساسات کی حامل

نظموں میں "شب خون کے بعد"، "جنگ کی ایک رات "سیز فائر" ، "اندھا کنواں " اور "اندھی رات کا دھبہ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ وہ انسان ، انسانیت اور انسانی قدروں کے کھونے پر اداس اور ملول ہیں اور یہی ان کی انسان دوستی ہے۔ نظم "شب خور کے بعد" کے اشعار دیکھیے۔

کھلی شاہراہوں پہ جلتے ہوئے قہقہوں کی قطاریں
منور دکانوں کی الماریوں میں
منقش لبادوں میں لپٹی ہوئی مردہ گڑیاں
مگر دور تک کوئی انساں کہاں ہے؟
عجب بے بسی ہے
کھلی شاہراہوں پہ بھیگے ہوئے راستوں پر
فقط مردہ پھولوں کا لشکر رواں ہے
(دن کا زرد پہاڑ، ص:
۳۳۲،۳۳۳)

وزیر آغا کی نظموں میں انسانیت سے محبت کا درسِ اخلاق موجود ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسان انسان کے دکھ درد اور کرب کو محسوس کرے۔ وہ ذاتی حرص وہوس کا بندہ بن کر نہ رہ جائے بلکہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی سر بلندی کے لیے کوشاں رہے۔ وہ معاشرے میں موجود عدم مساوات، استحصال، سماجی اورناانصافی ،متعصبانہ رویوں اور بے مہر یوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور معاشرے میں امن و آشتی، پیار و محبت اور انسان دوستی کے پھول کھلانے کے خواہشمند نظر آتے ہیں کیونکہ یہی اصل انسانیت ہے کہ نفرت کو ختم کر کے محبت کی شمع فروز اں کی جائے۔ اور یہی ایک انسان دوست شاعر کا حسن اخلاق بھی ہے اور حسن بیاں بھی۔ ان کی نظمیں چپ بیٹھے کیوں اپنا آپ گنواتے ہو، سانپ اور سیڑھی، پہلی رنجش کے بعد' دعا، بات اور عجب وہ شخص تھا ،میں زندگی میں اخلاقیات اور انسانیت سے محبت کی اہمیت و افادیت کو خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اشعار دیکھیے۔

عجب وہ شخص تھا
زہرہ، زمیں ، مریخ سب
سورج کو کعبہ جان کر قربان ہوتے ہیں
مگر وہ شخص تو
اپنے ہی مرکز پر
نجانے کب سے گرداں تھا
سنا ہے کوئی سورج
اُس کے اپنے تن کے اندر جل اٹھا تھا
وہ جس کے گرد
شب بھر گھومتا تھا

(اک کتھا انوکھی، ص
:۴۲۲)
انسانیت نواز وزیر آغا معاشرے میں پیار و محبت اور انسان دوستی کے لیے حرکت و عمل کا پیغام عام کرتے ہیں ۔ کیونکہ یہی حرکت و عمل در اصل سکون اور زندگی کی علامت ہے۔ جبکہ جمود، ٹھہراو یا رکاو موت کے مترادف ہے۔ نظم "ترسیل" کے اشعار دیکھیئے جس میں وہ خموشی کو تجسیمی لبادہ اوڑھاتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ میرا راستہ مت روکو مجھے مقفل بستیوں کے باسیوں کو نیند سے بیدار کرنا ہے اور انہیں حرکت و عمل کا پیغام دینا ہے۔

خموشی راستہ مت روک میرا
کہ میں برکھا کی بھیگی چاپ بننا چاہتا ہوں
وہ بھیگی چاپ جو دستک میں ڈھل کر
مقفل بستیوں کو نیند سے بیدار کرتی ہے

(چہک اٹھی لفظوں کی چھا
گل، حصہ نظم)

وزیر آغا حساس طبیعت اور دھڑکتے دل کے ساتھ کس طرح دوسروں میں دخیل ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو تنہا، سماج سے کٹا ہوا اور بے عرض نہیں بنایا بلکہ سماجی خوشیوں اور سماجی غموں میں برابر کا شریک ہے۔ وہ اپنے غم کو سماج کا غم اور سماجی پریشانیوں کو اپنی پریشانیاں سمجھتا ہے۔ اور یہی ایک انسان دوست شاعر کی عظمت ہے۔ نظم "نشر گاہ" کے اشعار دیکھیئے۔

فقط اپنے ہونے کا اعلان میں نے کیا
اور بے تاب پھولوں سے ، ساون کے جھولوں سے
چڑیوں کی لوری سے
ہر زندہ ہستی کے سانسوں کی ڈوری سے
آواز آئی
مجھے اپنے ہونے کا حق الیقیں ہے

(نرد بان،ص:۴۴۸)

بقول ڈاکٹر رشید امجد! وزیر آغا کی نظمیں انسان ، کائنات اور وقت کی تثلیت سے عبارت ہیں ۔ وہ انسانی دکھوں کا مطالعہ وسیع تر معنویت کے پس منظر میں وقت کی رفتار کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں ۔ وزیر آغا کی نظموں میں دھرتی اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ تہذیبی اقدار کے روبہ زوال ہونے کی جھلک بھی ملتی ہے اور پھر دور جدید کے کرب سے اکتاہٹ کا شکار انسان تہذیبی اقدار و روایات اور فطرت کی طرف رجوع کرتا نظر آتا ہے۔

بقول شمس الرحمان فاروقی! " غزل، نظم اور پھر طویل نظم ان سب اصناف میں وزیر آغا نے اعلیٰ کامیابی کی روشن مثالیں قائم کی ہیں ۔ ان کے کلام میں اُن کا تفکر، اُن کی شائستگی، اُن کی انسان دوستی نغمہ نور

میں ڈھل کر نمایاں ہوتی ہے"۔ وزیر آغا نے نظم نگاری کی روایت کو بر قرار رکھتے ہوئے طویل نظمیں بھی لکھی ہیں ۔ ان نظموں میں سیاسی مسائل، قومی زندگی، ڈرا مائی کردار، نفسیاتی بصیرتیں ، تہذیبی اور تاریخی مناظرات اور سب سے بڑھ کر انسان دوستی کے رحجانات کو بہت خوبصورت پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں وزیر آغا کی نظم "آدھی صدی کے بعد" اہمیت کی حامل ہے۔ جس میں انہوں نے "ندی" کو اپنی ہی طاقت سے نبرد آزما دکھا یا ہے۔دراصل ایک سطح پر پہنچ کرندی میں وہ طاقت و توانائی نظر آتی ہے جو اقبال نے اپنی نظم "ساقی نامہ" میں خودی کی ذیل میں عرض کی ہے۔

رکے جب توسِل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

نظم کے اس حصے کا تجزیہ کرتے ہوئے رشید نثار نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

یہ حصہ شعور، وجدان، تجربے، احساس اور تعقل کا حصہ ہے۔ اس حصے میں اخبار اشاعت، جنوں اور اپنی ذات میں مرتکز جوان، ایک شاعرانہ شائبے کی صور ت میں موجود ہے۔ اسے اظہار کی صورت دینے میں وزیر آغا نے پڑی چابک دستی سے کام لیا ہے۔ اس اظہار میں سماعی ضرورتیں بھی ہیں اور بصری لوازمات بھی جن میں آشنائی، زندگی سے گریز اور وہ عہد سامنے آتا ہے جس میں انسان ایک دوسرے کا گلا کاٹ کر اپنی حیوانیت کے پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ شاید یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ ہے جس میں ہر طرف خوف و ہراس اور تعفن موجود ہے۔

رشید نثار کی اس بات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ یہ دوسری جنگ عظیم کے احساسات ہیں جو شاعر نے اپنی دلی کیفیت، انسانی ہمدردی اور انسان دوستی کے جذبے کے ساتھ بیان کیے ہیں ۔ وزیر آغا کی نظم "الاو" کا کینوس وسیع ہے۔ اسکی تہ میں گہراتا ریخی شعور موجود ہے۔ اس کا مرکزی نقطہ انسان اور ارض ہے۔" الاو" ایک تہذیبی علامت ہے۔ حرارت کے ساتھ ساتھ تال میل اکٹھ اور داستاں گو کی رس بھری کہانی اس دورکے امتیازات ہیں ۔ یہ نظم اجتماعیت اور تہذیبی شکست وریخت کا حال سناتی ہے۔ انسان دوست و زیر آغا دوبارہ اسی اجتماعیت کی بحالی چاہتے ہیں ۔ جنہیں موجودہ دور کا انسان نفسانفسی کے عالم میں فراموش کر چکا ہے۔ ان کے خیال میں انہی رشتوں کی بحالی میں موجود ہ دور کے انسان کی بقا کا رازمضمر ہے ۔ اس لیے دوبارہ "الاو "کیطرف رجوع کرتے ہیں ۔

الاو کی میٹھی تمازت میں بیٹھا ہوا داستاں گو
جو تم تھے
تمہاری صدا تھی، تمہاری صدا
اس صدا پر کسی اور کی حکمرانی نہیں تھی

تمہاری صدا
سارے عالم کی واحد صدا تھی
کہاں تم نے کھو دی وہ اپنی صدا؟
بولتے کیوں نہیں ہو ؟
(گھاس میں تتلیاں ،
ص:٦٤٣)

ڈاکٹر رشید امجد اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان نے اپنے دکھوں کا سامان خود اپنے لیے پیدا کیا ہے۔

ان کی نظمیں زمین پر انسانی المیوں کا کھوج لگانے کے عمل سے عبارت ہیں اور چھوٹے چھوٹے دکھوں کے ساتھ عظیم انسانی المیوں کی داستان سناتی ہیں ۔ یوں وہ اپنے قاری کو اسکی چھوٹی سی دنیا سے بلند کر کے وسیع لا محدود کائنات کے اندرون لے جاتی ہیں ۔ جہاں خواب اپنی مجرد صورتوں میں ایک مکمل اور عظیم اکائی میں ڈھل جاتے ہیں ۔

وزیر آغا کی نظم" اک کتھا انوکھی" بھی قابل توجہ ہے۔ نظم کے دو کردار اہم ہیں ۔ ایک دیوتا کا کر دار جو کائنات میں امن و آشتی کی بانسری بجا کر پر سکون جگہ پر ایک غار میں لمبی نیند سو جاتا ہے۔ مگر جلد ہی یہ امن تباہ ہو جاتاہے۔ سب لوگ اسے بیدار کرنے کی کوشش کر تے ہیں ۔ لیکن وہ داخلی اطمینان میں مست ہو کر آنکھیں نہیں کھو لتا اور جب آنکھ کھلتی ہے تو وہ اپنے پیچھے انسانوں پر ٹوٹنے والے مصائب کا سن کر تڑپ اٹھتا ہے اورحزن و ملال میں یہ کہتا ہے۔

میں جب سویا
ہرشے جاگ رہی تھی
پھولوں میں رس
ندیوں میں چاندی بہتی تھی
دریاوں کے پا ٹ کشادہ
پیڑوں پر پھل پھول لگے تھے
گائے کابھن، گری لبالب
نار کی گود ہری تھی
راجا خوش تھا، پر جا خوش تھی
دھرتی جیسے کنول کی صورت کھلی ہوئی تھی
(اک کتھا انوکھی،
ص:٤٤٢)

جبکہ نظم کا دوسرا کر دار یہ باور کر واتا ہے کہ جب وہ سویا تو ست جگ تھا اور اب کل جگ ہے۔ صنعتی ترقی نے بے راہ روی اور اخلاقی انحطاط کو فروغ دیا ہے۔ شر کی قوتیں بیدار ہو گئی ہیں ۔ سماجی اخلاق کا مفہوم بدل کر رہ گیا ہے۔ اسی مشینی کلچر نے طبقاتی تقسیم کو

فروغ دیا۔ انسان دوست وزیر آغا اسی مشینی دور کو" کل جگ" سے تعبیر کرتے ہیں ۔

یہ کل جگ ہے
کل جگ۔ جو سرطان کی صورت
پھیل چکا ہے
دھواں اگلتے، آہیں بھرتے
بوڑھی بانجھ ملوں کے پنجر
کھمبوں کی صورت
دھرتی کے اندر سے جیسے اُگ آئے ہیں
جن کے زہر کو ہم
فصلوں پر
اور بچوں پر
روز جھڑکتے ہیں
بس کی پڑیاں
گیس کے گولے
ڈالر ، ایڈز، پلاسٹک ، پھوڑے
ان میں بانٹ رہے ہیں

(اک کتھا انوکھی، ص:
٤٤٢،٤٤٣)

دراصل نظم کے دونوں کردار سویا ہوا انسان اور اسے جگانے والا دونوں ایک ہی وجود ہیں اور ظاہر وباطن کی علامت ہیں ۔ ہمارے بیشتر دکھوں کا سبب یہی ہے کہ ہم نے اپنے اندر کے شخص کو مار ڈالا ہے یا سلا رکھا ہے۔ انسان دوست وزیر آغا نے اس نظم کے ذریعے ہمیں اپنے اندر کو بیدار کرنے کی تحریک دی ہے۔ کیونکہ اسکی بیداری ہی میں ہمارے مسائل کا حل مضمر ہے۔ا ور اسی طرح ایک انسان دوست معاشرے کی تشکیل ممکن ہے۔ وزیر آغا کی نظموں کے اخلاقی اور فکری پہلو پر بحث کرتے ہوئے امین راحت چغتائی کہتے ہیں ۔ "وزیر آغا کی متعدد علامتی نظمیں سماجی منصب بھی رکھتی ہیں جو معاشرے کو معروضی انداز فکر دیتی ہیں ۔ بنظرغائر دیکھیں تو اُن کی نظموں میں سماجی ذمے داری اور انسان دوستی کی اقدار بہت نمایاں نظر آئیں گی"۔

زاہد ڈاراور انسان دوستی (۱۹۳٦)

زاہد ڈار کی نظمیں ایک بے سود زندگی کو کسی عورت کے وصال سے بامعنی بنانے کی خواہش کا اعلامیہ ہیں ۔ لیکن یہ وصال امکان میں نہیں ہے۔ سوا ایک ازلی تنہائی شاعرکا مقدر ہے۔ اس تنہائی کے باعث اس کے نزدیک زندگی ایک لا یعنی عمل بن چکی ہے۔ ان کی نظم" بیمار لڑکا" میں بیمار لڑکا دراصل جدید ذہن کی نا آسودگی کی علامت ہے جو اپنے ماحول سے سخت خائف دکھائی دیتا ہے ۔ اس کے لیے ماں کی نفرت نا قابل برداشت ہے اور وہ اس نفرت سے دور بھا گنا چاہتا ہے۔ دراصل جس ماحول میں نیا انسان تخلیق ہو اہے اسکی جھولی میں

سوائے نفرتوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اسی کرب کو زاہدؔ اس انداز میں بیان کرتے ہیں ۔

رحم مادر سے نکلنا مرا بے سود ہوا
آج بھی قید ہوں میں
حکم مادر کو میں تبدیل کروں
بے نیازی سے بھروں
پاپ کے کانٹے چن کر
روح ناپاک کروں
گیت شہوت کے ، ہوس کے سن کر
ذہن بیباک کروں
ایسے جیون کی ہے حسرت اب تک

(تنہائی ، ص :۲۲۹)

زاہد ڈار کی نظم "بیمار لڑکا" کے حوالے سے ان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے منیر احمد شیخ لکھتے ہیں ۔

زاہد ڈاروہ "بیمار لڑکا" ہے جسے وقت ،زمانے اور اسکی بندشوں میں جکڑے جانے کا شدید احساس ہے۔ رحم مادر سے نکلنا مرا بے سود ہو۔ آج بھی قید ہوں ۔ میں ۔ یہ دو مصرعے میرے نزدیک زاہد ڈار کی شاعری کے words Key ہیں ۔ان دو مصرعوں کو ہضم کیے بغیر زاہد کے مزاج کو سمجھنا اور اس کے خالص حسیاتی تجربوں کو اپنے ادراک کا جزو بنانا ناممکن ہے۔ یہ بیمار لڑ کے کی شاعری ہے جو صحت اور زندگی پر ایمان رکھتاہے۔ وہ سوچنا اور سمجھنا چاہتا ہے۔ لیکن جس دور میں وہ پیدا ہو اہے اسے سوچنے کے لیے کچھ نہیں ملتا۔

دراصل زاہد ڈار جس عہد میں جی رہے تھے وہ ایسے ہی تخلیقی بانجھ پن کا شکار ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں مسائل و معاملات کی نوعیت عصری صورتحال سے جنم لیتی ہے۔ ان نظموں میں معاشرے اور مجموعی انسانی صورتحال کی عکاسی بہت عمدہ پیرائے میں کی گئی ہے۔ جس کے مطابق جدید عہد کا انسان مادیت پرستی کے کرب کا شکار ہے۔ زمین و آسمان کی لامحدود وسعت اس کے لیے بے معنی ہے۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ زندگی جبر مسلسل کا نام ہے۔ جس کا راز پانا انسان کے بس سے باہر ہے۔ سو وہ چاروں طرف کھڑی مادے کی دیواروں سے سر پھوڑ تا رہتا ہے۔ یہی بے بسی اور لاچاری اسکی زندگی کا حصہ بن چکی ہے۔ جس سے فرار ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ نظم "تنہائی"کے اشعار اس بے بسی اور لاچاری کے عکاس ہیں ۔

یہ زمیں ، یہ آسماں ، یہ کائنات
ایک لامحدود وسعت، ایک بے معنی وجود
آدمی اس ابتری کی روح ہے

آدمی اس مادے کا ذہن ہے
ابتری لا انتہا
مادہ لا انتہا
آدمی محدود ہے
آدمی کا ذہن بھی محدود ہے
روح بھی محدود ہے
یہ زمیں یہ آسماں ، یہ کائنات
جبر کا اک سلسلہ

(تنہائی،
ص:٢٦٣،٢٦٤)

زاہد ڈار کے ہاں کرب کا یہ احساس شدید صورت اختیار کر جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ محض اسکا ذاتی مسئلہ نہیں بلکہ اس کے عہد کا ہر انسان اسی احساسِ کرب کا شکار ہے۔

بقول انیس ناگی!

شاعر کے نزدیک نئے انسان کا تصورتنہائی اور اس سے پیدا شدہ صعوبتوں سے متشکل ہوا ہے۔ نئے آدمی کا کرب زندہ رہنے کی مجبوری سے پیدا ہوتا ہے۔ شاعر کو عہد حاضر میں کوئی ایسا نظریہ، نظام اور شخصیت نہیں ملتی جو انسان کی آسودگی اور روح کا وعدہ کرتی ہو۔ چنانچہ روشنی ا ور امن کی تلاش اس تصادم سے نجات کی خواہش ہے جو شاعر کے اضطراب کا محرک ہے۔

زاہد ڈار ایک ایسے ماحول میں زندہ ہے ۔ جس میں ظلم و ستم اور میکانکی جبریت نے انسانی اقدار کو پامال کر دیا ہے۔ فرد کا فرد سے رابطہ منقطع ہو چکا ہے۔ یہ دوری اور احساسِ تنہائی انسان کی مجبوری اور بے بضاعتی کا واضح ثبوت ہے۔ اس نئے ماحول میں ڈر اور خوف کا عنصر بھی واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ جس میں اس دور کا ہر شخص مبتلا دکھائی دیتا ہے ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "چوہانامہ "قابلِ توجہ ہے ۔ جس میں انہوں نے جدید انسان کے احساس کم مائیگی، خوف، ڈر اور ماحول سے بیزاری کوانسان دوست شاعر کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔

میں ہمیشہ کی طرح کیچڑ میں لت پت آج بھی اس شہر
کی بدبو بھری گلیوں میں پاگل بلیوں کی کھوج میں بھوکا
پھرا کرتا ہوں لیکن بلیاں جانے نہ جانے کس
مکاں میں کس کی رانوں میں چھپی بیٹھی پڑی سوتی ہیں
اب تو راستے خاموش ہیں
سوچتا ہوں کیوں نہ میں اس شخص یا اس چیز یا
احساس یعنی خوف کو جو میرے سر پر آسماں کی
شکل میں چھایا ہو اہے، اپنی نفرت کانشانہ، کوربیتی کا بہانہ

کر کے ٹھہراوں گراوں توڑدوں
کیوں نہ میں ، ہاں کیوں نہ میں ہٹلر۔۔ مگر یہ قہقوں
کی لہر سی کیسی؟ ۔۔ کہیں دو بلیاں
اف کس طرح جاؤں
جاؤں چھپوں میں کیا کروں

(تنہائی،
ص:۲۴۱،۲۴۲)

زاہد ڈار کی نظموں میں واحد متکلم کاکردار نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ جس کی ذات میں لا تعداد محرومیاں ، مجبوریاں اور لاچاریاں یکجا ہو گئی ہیں ۔ اور ان سب کا علاج وہ عورت کے اس قرب میں چاہتا ہے۔ جس سے وہ محروم ہو چکا ہے۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جو نئے انسان کی پہچان ہے۔ واحد متکلم کا یہ کردار ایک طرف خود نگری ہے لیکن دوسری جانب جب یہی عورت اسے دھتکا رتی ہے تو اسے اپنی ذلت و پستی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اور اس کی تنہائی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ دراصل تنہائی کا یہ کرب اس کے لیے اذیت ناک ہے جس میں نیا انسان مبتلا ہے۔نظم "عورت اور میں "کے اشعار دیکھیے۔

میرے خیال میں وہ عورت
دنیا کی لذیز ترین عورت ہے
میں اس کے اندر غرق ہو جاوں گا
وہ مجھے دور دور سے اپنا آپ دکھاتی ہے
میرے اندر بھوک اور پیاس کو بیدار کرتی ہے
وہ مجھ سے ناراض ہو جاتی ہے
اور میں ایک دھتکارے ہوئے کتے کی طرح
اپنی تنہائی میں واپس آ جاتا ہوں

(تنہائی، ص:۴۵،۴۴)

زاہد ڈار کی اس نفسیاتی کیفیت کے بارے میں غالب احمد کا خیال ہے۔

اسکی شعری نفسیات دوسروں سے بالگل الگ ہے۔ وہ فرد اور شاعری کی حیثیت سے ایک طویل تجربے سے گزر رہا ہے جو شاہد صرف اسی کا مقدر ہے۔ وہ ایک عورت کے ساتھ نثری شاعری کر رہا ہے اس نے ساری کائنات سے اپنا رشتہ محض اپنی ذاتی محبت کے حوالے سے قائم کر رکھا ہے۔ اسکا نفسی نقطہ عرفان صرف اسکی ذاتی محبت ہے۔ اس کے تمام شعوری،غیر شعوری، عقلی اور حسی تجربات اس وجدان کے حوالے سے ہیں ۔

انسان دوست زاہد ڈار کے ہاں یہ احساس بہت گہرا ہے کہ انسان انسان سے لا تعلق ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹنا اور دوسروں کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھنا بے معنی ہے۔ انسان ہر چیز سے لا تعلق ہو

کر صرف اور صرف اپنی ذات کا اسیر دکھائی دیتا ہے۔ اسے دوسروں کے ساتھ کوئی ہمدری نہیں ۔ جسکا انہیں شدید دکھ ہے۔

کوئی ہنستا ہے تو ہنستا رہے
کوئی روتا ہے تو روتا رہے
کون کس کے لیے زندہ ہے؟
کون کس کے لیے مرتا ہے؟
میں کچھ بھی نہیں جاننا چاہتا
میں بے خبر ہی رہنا چاہتا ہوں
جو کچھ موجود ہے وہ میرے لیے نہیں
جو کچھ ہو رہا ہے اُس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں
کسی کو میرا نام بھی یاد نہیں
مجھے کسی سے محبت کیوں ہو

(محبت اور مایوسی کی نظمیں ،ص:۸۲)

زاہد ڈار کے نزدیک انسان اپنے بارے میں خوش فہمیوں کا شکا رہے۔ اس نے اپنے اردگرد سنہرے سپنوں کا محل تعمیر کر رکھا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کے سارے خواب بے حقیقت ہیں ۔ دوسروں لفظوں میں وہ احمقوں کی جنت میں رہنے والا ہے۔ ان کی نظم "عورت اور میں "اس حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے اور اسے اصل حقیقت سے باخبر کرتی ہے۔

انسانی سوچ غلط فہمیوں اور خود فریبیوں کا مجموعہ ہے
انسانی زندگی تکلیفوں اور پریشانیوں سے کبھی آزاد نہیں
ہوتی
اس دنیا میں
ساری محبتوں اور نفرتوں
محفل آرائیوں اور محاذ آرائیوں کے باوجود
ایک انسان کا دوسرے انسان سے کوئی حقیقی رشتہ نہیں
ہر انسان دراصل اکیلا ہے

(ایضاً،ص:٦٦)

زاہد ڈار کے ہاں مروجہ اقدار کے خلاف احتجاج کا رنگ بھی دکھائی دیتاہے۔ وہ ماضی پرستی کو جہالت سے تعبیر کرتے ہیں اور مستقبل پر یقین رکھتے ہوئے کہتے ہیں ۔ نظم" سنو "کے اشعار دیکھیے۔

سنو ، ماضی دھواں تھا، اڑ گیا، واپس نہ آ ئے گا
گزشتہ عظمتوں کی راکھ پر آنسو نہ بہاو
سنو گزرا ہوا کل ڈوبتا سورج تھا ، آندھی تھا
ہوائیں اور بھی آئیں گی، آئندہ
نئے سورج بھی ابھریں گے

(درد کا شہر، ص:٤٧)

زاہد ڈار کے ہاں امن، محبت ، انسانی آسودگی اور سب سے بڑھ کر انسان دوستی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے نزدیک آج کا انسان منفی قدروں کے باعث اپنی عظمت کو گنواکر تخریبی کارروائیوں کا شکار ہو چکا ہے۔ لہٰذا وہ انسان کی وحشی جبلتوں اور جنگ وجدل پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

قتل و غارت ، تباہی میں جنگ میں
جو کشش ہے
اسکا کوئی اپائے نہیں

(درد کا شہر، ص: ۸۵۸)

ڈاکٹر انیس ناگی زاہد ڈار کی انسان دوستی کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔

زاہد ڈار کی یہ جذباتی سادگی ہے کہ وہ آج کے متصادم اور متحارب دور میں انسان دوستی اور انسانی محبت کے اشلوک گاتا ہے کہ اس سے سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں ۔ لیکن کیا کیا جائے کہ عہد حاضر میں خوشامد، منافقت، ابن الوقتی اورتسخیر کی منفی قوتوں نے ا فراد کو اس طرح اپنے شکنجے میں لیا ہے کہ "انسانوں کے سوا" ان کے جذبات کا اظہار بھی ممکن نہیں ۔

زاہد ڈار کے ہاں کوئی ایسا نظر یہ، نظام یا شخصیت دکھائی نہیں دیتی جو انسان کی آسودگی کی ضامن ہو۔ ان کے ہاں امن کی خواہش ہی اس تصادم سے نجات کا ذریعہ ہے۔ اس لیے تمام تر تحفظات کے باوجود ان کے ہاں یہ خواہش دکھائی دیتی ہےنظم "زبان کا شبد" کے اشعار دیکھیے۔

اس جیون میں لڑنے بھرنے سے جب فرصت ملتی ہے تو
من میں ایک چبھن کا احساس جنم لیتا ہے
ایسی بات کریں جو سارے جگ کو بھائے
ایسی چیز بنائیں جس سے آشا شکتی پائے
ایسا کام کریں کہ دنیا سے نفرت مٹ جائے
لیکن انسانوں کی سیوا کا یہ جذبہ اکثر یوں ہوتا ہے
سوچنے والا من کے اندر ہی دب کر رہ جاتا ہے

(درد کا شہر، ص:۵۵)

زاہدڈار نے نئے شہروں کے مسائل کو اپنی نظموں کا موضوع بنایاہے۔ ان مسائل نے ڈر، خوف، تنہائی لالچ، بھوک اور نفرت جیسے مختلف النوع احساسات کو جنم دیا ہےجس کی وجہ سے معاشرے میں انسانی دوستی کی فضا کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ہر طرف نفسا نفسی اور نفرتوں کا راج ہے اور انسان اس تنہائی کے باعث اس محبت اور انسان دوستی سے محروم ہے جو ایک پُر امن معاشرے کے لیے ضروری ہے۔

گویاان نئے شہروں میں کہیں انسان دکھائی نہیں دیتے جو اپنی انسانیت کے جوہر دکھائے۔

اس بستی کی سب گلیوں میں چلنے کی آزادی ہے
اس بستی کے ناموں میں "نیکی" اور "بدی "کے نام نہیں
سیدھے سیدھے نام ہیں جسے لالچ، غصہ، بھوک، محبت، نفرت
سب گلیوں میں چلنے کی آزادی ہے
شہر نہیں ہیں چاروں جانب شور ہے شور ہی شور ہے کیا ہے؟
گہرے شہروں میں رہنے سے عظمت کا احساس مٹا
لمبے حملوں پر جانے کا، قدرت سے ٹکرانے کا ارمان مٹا
اب آرام ہے شہروں میں ، انسان مٹا

(درد کا شہر، ص:٤١)

زاہد ڈار اپنی نظموں میں مروجہ نظام کہنہ کی فرسودہ اقدار، جاگیردارانہ نظام اور مشینی عہد کی سفاکی کے خلاف بھی آواز بلند کرتے نظر آتے ہیں ۔ ان کے خیال میں آزادی انسان کا بنیادی حق ہے جس کے لیے اسے ہر دم مصروف عمل رہنا چاہیے۔ گویا انسان کی کوشش ہی میں تبدیلی کا راز مضمر ہے۔

اے نوجوان لڑکو
اور لڑکیو بتاو
پرچھائیوں کے بس میں
کب تک رہیں گے ہم تم؟
کب تک رہیں گے ظالم
بوڑھے ہمارے حاکم ؟
بولو! اٹھو! بغاوت
پھیلاو اس زمیں پر
بن جاو اس زمیں پر
تم اپنے آپ مالک
تم اپنے آپ رہبر
تم اپنے آپ محافظ
اے نوجوان بہنو
اور بھائیو! بتاو
کب تک ملا کریں گے
یہ جسم اور روحیں
کب تک کریں گی ماتم
پرچھائیاں اٹھا دو
تاریکیاں مٹا دو

(محبت اور مایوسی کی
نظمیں ، ص :١٠٨،١٠٩)

زاہد ڈار جیسا انسان دوست شاعر ایک ایسا نظام زیست تلاش کرنے پر زور دیتا ہے جس میں انسان دوستی اور انسانی برداری کا تصور کا

رفرما ہو۔ اس کے خیال میں انسان دوستی اور محبت انسان کے ذہنی انتشار میں وحدت پیدا کر سکتے ہیں ۔ چنانچہ وہ تہذیبی گھر واپسی کا تصور پیش کرتا ہے۔ نظم "واپسی" کے اشعار دیکھیے۔

میں نے سب کو چھوڑ دیا ۔ میں لوٹ آیا
خاک سے ناطہ جوڑ لیا، میں گھر آیا
روٹی، پانی دودھ اور مکھن
میرا جیون
نانک دیو اور بلھے شاہ
سیدھی راہ
مجھ کو مٹی پیاری ہے
پیار ہر نرناری ہے
دن بھر محنت کرتا ہوں اور راتوں کو سوتا ہوں
میں ملاپ میں خوش رہتا ہوں تنہائی میں روتا ہوں
(تنہائی، ص:۲۱۸)

حقیقت میں زاہد ڈار انسان دوستی، محبت، اخوت، امن اور سادگی جیسی اخلاقی اقدار کو پروان چڑھاتے ہیں اوریوں تنہائی، ڈر، خوف، کرب اور مایوسی کا علاج انسان دوستی میں تلاش کرتے ہیں ۔زاہد ڈار کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے غالب احمد نے بجا طور پر کہا ہے۔ "اس کی یہ شاعری ایک ایسی تحریک کا آغاز ہے جس سے جدید ادب اپنی تنہائی بے آسودگی، لاتعلقی، لاحاصلی اور ایہام زدگی سے نجات حاصل کر سکتا ہے "۔

ساقی فاروقی اور انسان دوستی(۱۹۳۶)

ساقی فاروقی کا شمار ان نظم نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے صنعتی و مشینی تہذیب کی لائی ہوئی تمدن اور اس کے اثرات کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا ہے۔ اس لیے ان کی نظموں میں عالمی صارفی معاشرے میں سانس لینے والے فرد کی لایعنیت کا تجربہ ایک نئے انداز میں سامنے آ تا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم" نوحہ" قابلِ ذکر ہے جس میں انہوں نے مادی معاشرے میں سانس لیتے فرد کی ذات میں ابھرنے والے خلاوں کی بہترین عکاسی کی ہے۔ جنہیں مالی اورجنسی آسودگی بھی پر نہیں کر سکتی۔

یہ میری آنکھوں میں کیسا صحرا ابھر رہا ہے
میں بال روموں میں بجھ رہا ہوں
شراب خانوں میں جل رہا ہوں
جو میرے اندر دھڑک رہا تھا وہ مر رہا ہے

ساقی فاروقی کو قیام مغرب کے دوران صنعتی اور مشینی نظام کا بغور مشاہدہ کرنے کا موقع ملا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس تہذیب کی اجارہ داری نے انسان کو انسانیت کی سطح سے نیچے گرا دیا ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ آسائشوں ، سہولتوں اور لذتوں کے حصول میں غرق

دکھائی دیتا ہے۔ ایسی ہی ایک نظم "پارٹی " ملاحظہ ہو جس میں موجود فرد تمام ترہنگاموں اور رونقوں کے باوجود ایک ایسی قابل رحم حالت سے دوچار نظر آتا ہے کہ زندگی کی تمام رنگینیاں اسکی داخلی تنہائی کے سامنے ہیچ ہو جاتی ہیں ۔

رَم اور جن کی خالی بوتلو
اخباروں میں چھپے ہوئے بے مصرف لفظوا
اسٹرپٹیز کلب کے پھٹے پرانے نکٹو
کوٹ کے کالر کے افسردہ تنہا پھولو
ٹیپ ریکارڈ میں سہمے سہگل کے نغمو
دوستیوں اور دشمنیوں کے زندہ لمحو
کانپتے ہونٹوں پر کمھلائے، مونیکا کے آخری بوسو
ناچو، گاؤ، شور مچاو
اور مرے سینے پر تھک کر سو جاؤ

محمد سلیم الرحمن! ساقی فاروقی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔ "اسکی تازہ شاعری میں تیز ابی سا اثر ہے۔ لہجے کی خلیق سفا کی جو شاعرانہ سطح پر نہایت پر کاری سے کہیں تو اپنی اور پرائی خوش فہمیوں اور اتر اہٹوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے اور کہیں پھیکے زہر خند کے لبادے میں بشریٰ کمزوریوں کی پیٹھ تھپکتی ہے"۔ ساقی فاروقی موجوہ عہد کی مروجہ سچائیوں کو ہدف تنقید بناتے ہوئے اس کے کھو کھلے پن پر طنز کے تیر چلاتے نظر آتے ہیں ۔ اسی طرح اپنی خود وضع کردہ تمثالوں سے زندگی کی بد ہیئتی اور اخلاقی کم مائیگی کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

سب سچے ہیں
نگر نگر سب سچے ہیں
ان سچوں میں
اب بھی ایک جگہ خالی ہے
اک جھوٹے کی
جسکی شیطانی آنکھوں میں
صرف تمسخر ہو اور نفرت کے شعلے ہوں
جو سقراطوں اور مسیحاوں کے منہ پر
تھوک سکے---
تھوک سکے اور اک موٹی سی گالی دے

(زندہ پانی سچا،ص
:۱۵)

ساقی فاروقی کی کرداری نظمیں بھی اہمیت کی حامل ہیں ۔ ان نظموں میں انہوں نے جنگلی جانوروں اور اشخاص کے ذریعے ہماری معاصر صورتحال پرطنزیہ انداز میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں خالی بورے میں زخمی بلا، ایک خرگوش کی سر گزشت، سر امداد علی کا مینڈک وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ۔ رفیق

سندیلوی اس قبیل کی نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں !" دلچسپ بات یہ ہے کہ ساقی فاروقی نے انسانی باطن کی نارسائی، محروحی اور کمینگی کا انطباق جانوروں کی جبلت وسرشت اور ان کی معلوم و معروف سر گرمیوں پر کیا تو اپنے سیاق کی نسبت سے علامتیں اور تمثالیں ازخود و ضع ہوتی گئیں "۔ نظم "خالی بورے میں زخمی بلا"کے اشعار دیکھئے جس میں انسان کے ارتقائی سفر کی مشکلات اور پریشانیوں کا بیان عمدہ پیرائے میں کیا گیا ہے۔

تھوڑی دیر یہ پگڈنڈی
ٹوٹ کے اک گندے تالاب میں گر جائے گی
میں اپنے تابوت کی تنہائی سے لپٹ کر
سو جاوں گا
پانی پانی ہو جاوں گا
اور تمہیں آگے جانا ہے۔
اک گہری نیند میں چلتے جانا ہے
اور تمہیں اس نظر نہ آنے والے بورے
اپنے خالی بورے کی پہچان نہیں
جان محمد خان
سفر آسان نہیں

(زندہ پانی سچا، ص: ۱۳۲)

ساقی فاروقی تیسری دنیا کے غریب ملکوں کی نفسیات اور ذہنیت کو بھی جانوروں کے حوالے سے دیکھتے ہیں ۔ ان کے خیال میں غریب اور پسماندہ ممالک عالمی طاقتوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں اور اپنی انا اور خود داری کوبھینٹ چڑھا کر کتوں کی طرح ان کے پیچھے دم ہلاتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ اس بے حسی کی تصویر ان کی نظم" ایک ویران رات "میں دیکھی جا سکتی ہے۔

تلاش رزق میں کچھ کوچہ گرد کتے ہیں
فقیر ملکوں کے مانند دم ہلاتے ہوئے
زمین سونگھتے ہیں آگے بڑھتے جاتے ہیں
پلٹ کے دیکھتے ہیں گرسنہ نگاہوں سے
اب اور کتنے پرے ہیں سگانِ ہمسایہ
پھر اپنی فتح سے مسرور ہو کر سوچتے ہیں
ناپا سکیں گے انہیں ان کے سست گام حریف

(زندہ پانی سچا ،ص:۵۸۔۵۹)

ساقی فاروقی نے انسان کے ہاتھوں انسان کے قتل کی داستاں کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ابتدا سے انسان اپنے مفادات اور ہوس کی خاطر دوسروں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارتا آ رہا ہے۔ موت کا یہ کھیل صدیوں سے یوں ہی جاری وساری ہے جسے کوئی

نظام یا انسانی طاقت نہ تو روک سکی ہے اور نہ ہی اس میں کوئی تبدیلی لاسکی ہے۔ معاشی مفادات کے حصول کا سلسلہ کسی جوئے خون کے تندرو ریلے کی مانند ملکوں ، شہروں ، بستیوں اور ان میں آباد انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لیتا آ یا ہے۔ طاقتور طبقے مجبور ونا چار انسانوں کے خون کے ذریعے اسکی روانی میں اضافہ کرتے رہے اور اس ندی کا بہاو جاری رہا۔ نظم "جوئے خوں " کے اشعار دیکھیئے۔

میرے معاون لہو مجھ میں لا لا کے بھرتے رہے
یونہی جنگی جہازوں سے چپ چاپ دشمن اترتے رہے
اور ہیروں کے انبار بھی مرے سر سے گزرتے رہے
کوئی دیکھے مجھے
بہہ رہی ہوں یونہی
سال ہا سال سے

(زندہ پانی سچا،
ص:۵۰)

ساقی فاروقی انسانوں کے دکھ درد کو محسوس کرنے والے انسان دوست شاعر ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اجنبی سرز مینوں پر تلاشِ رزق کے عذاب سے دو چار انسانوں کے دکھ کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے خیال میں غریب ممالک کے وہ افراد جو دور کے ڈھول سوہنے سمجھ کر ترقی یافتہ ممالک کا رخ کرتے ہیں وہاں مختلف دکھوں اور پریشانیوں کا شکار نظر آتے ہیں ۔ ساقی فاروقی نے اپنی متعدد نظموں "سحرزدہ شہر" اور" موت کی خوشبو" میں جلا وطنی کا دکھ سہتے انسانوں کے احساسات نظم کیے ہیں ۔

میں گرفتار ہوں
میرے دونوں طرف
اونچے اونچے مکاں سر جھکائے ہوئے
یوں ہیں جیسے فراعین کے مقبرے
جو خداوں کی مانند مختار ہوں
یا قرب وجد کے سارے دفینے لیے
صرف ماضی کے نشے میں سرشار ہوں
ایک آواز میرے تعاقب میں ہے
میرے پیچھے چلی آتی ہے پے درپے
گھوم کر دیکھ لے، گھوم کر دیکھ لے
گھوم کر دیکھ لے، گھوم کر دیکھ لے
نامراد! اسی طرف اک نظر دیکھ لے

(زندہ پانی سچا،
ص:٦١)

ساقی فاروقی نے اپنی بیشتر نظموں میں انسانی زندگی میں پائی جانے والی منافقتوں اور منفی اقدار کو منظر عام پر لا

کر ایک صالح معاشرے کے قیام کی شدید خواہش کا اظہار
کیا ہے اور یہی ان کی سب سے بڑی انسان دوستی ہے۔
بقول جمال پانی پتی!
اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک سچا اور کھرا شاعر
ہے۔ سر سے لیکر پاتک جدید۔ اپنی رگ رگ اور پور پور
میں جدید حسیت سے لبریز۔ وہ اپنی سوچ اور طرز احساس
ہی کے اعتبار سے جدید نہیں بلکہ اپنے طرز اظہار اور
جمالیات وجدان کے اعتبار سے بھی جدید حسیت کا ایک اہم
اور نمائندہ شاعر ہے ۔

آفتاب اقبال شمیم اور انسان دوستی (۱۹۳٦)

آفتاب اقبال شمیم کا شمار ان نظم نگاروں میں ہوتا ہے۔ جنکی نظمیں داخلی اور خارجی ہر دو سطح پر جمالیاتی قدروں سے مالا مال دکھائی دیتی ہیں ۔آفتاب اقبال نئی نظم کے وہ نمائندہ ہیں جن کے ہاں فرد کاتشخص اسکی آزادی سے مشروط ہے۔ انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو انسان صدیوں سے استبدادی قوتوں کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے ا ور اس جبر اور ظلم کے خلاف اسکی جنگ آج بھی ختم نہیں ہوئی۔ انسان آج تک وہ آزادی حاصل نہیں کر سکا جو اسکا بنیادی اور پیدائش حق ہے۔ آفتابؔ زید کے کردار کی صورت میں اس عام آدمی سے بات چیت کرتا ہے جو معاشی آزادی کی جدوجہد میں زندگی کی مشکلات اور مصائب سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اس گفتگو کے ذریعے شاعر نے کئی نسلوں پر محیط انسانی المیوں کی کرب ناک تصویر کشی عمدہ پیرائے میں کی ہے۔

اتنی نسلیں ، اتنی صدیاں
راہِ سفر میں فرد پر جتنی گرد پڑی
جمع کریں تو شاید اس سے
ہر بے گھر ، نادار کی خاطر
ایک مکاں ، اک کھیت بنایا جا سکتا ہے
(نادر یافتہ (کلیات)زید سے
مکالمہ،ص :۳۲۰)

انسان دوست آفتا بؔ اقبال نے جبر کی عالمی قوتوں کے خلاف بھی آواز بلند کی ہے۔ ان کے خیال میں یہ عالمی طاقتیں اپنے مفاد کی خاطر لاکھوں انسانوں کی زندگیوں سے کھیلتی ہیں اور انہیں جنگ کی نذر کر دیتی ہیں ۔ اور یوں انہیں بھوک وا افلاس کے مسائل سے دو چار کرتی ہیں تا کہ محتاجی کا طوق سدا ان کے گلے کا ہار بنا رہے اور یہ عوام اسی طرح معاشی مجبوریوں اور معاشی استحصال کا شکار رہیں ۔ آفتاب شمیم نجیب محفوظ کے ایک کردار زیطہ کے ذریعے عالمی طاقتوں کے غریب اقوام کو اپاہج بنا نے کی سوچ پر طنز کرتے ہیں ۔ زیطہ وہ جراح ہے جو معذور افراد کے ٹوٹے اعضا جوڑنے کا کام کرتا ہے۔

چنانچہ شاعر اسکی تو جہ ا ن افراد کی طرف دلاتا ہے جنہیں معاشی استحصال نے معذور بنا رکھا ہے۔

ہنر مند زیطہ !
کروں ، لامکانوں ، زمانوں کا آقا
مجھے جس نے مٹی سے بہر تماشا اٹھا یا
مجھے میرے مثبت کو منفی سے ، سیدھے سے الٹے
کو پیوست کر کے بنایا
کہ میں اپنے ہاتھوں خجل، اپنی ضد، اپنی حد، اپنی
مجبوریاں
کے پلستر میں مفلوج بانہوں کو باندھے ہوئے روز کے اس
اندھیرے
اجالے میں اُس سے
زمانے کے ہاتھوں میں پہلے سے گروی شده عمر کی بھیگ
مانگوں

(نادر یا فتہ (کلیات) ،گم سمندر،ص
(٤٥٥:

آفتاب شمیم فطری طور پر ترقی پسندی کیطرف مائل تھے۔ لیکن اُن کے ہاں نظموں میں ہمیں ایک توازن دکھائی دیتا ہے۔ جو ترقی پسندی اور حلقہ اراب ذوق کی روایت سے برابر استفاد ے پر دال ہے۔ ان کے دوسرے مجموعے "زید سے مکالمہ " میں جو طویل نظمیں ہیں وہ موجودہ زمانے کی برہنہ سچائیوں کا ادراک ایک نئی احساساتی سطح سے کراتی ہیں ۔ ان کی ایک نظم" زید آ" کے اشعار دیکھیئے جس میں انہوں نے مختلف حسیات کے ذریعے ایک ایسا منظر نامہ ترتیب دیا ہے کہ جدید اور مابعد جدید میں سانس لیتا ہر حساس فرد اپنے وجود کی لایعنیت کو پوری شدت اور کرب سے محسوس کرتا نظر آتا ہے۔

رات کے کھیت سے پھوٹتی رت کی خوشبو اڑی
جسم میں آہٹیں سی ہوئیں
نوجواں فصل کو کاٹنے کے لیے
دست آئندہ کو کاٹنے کے لیے
دست آئندہ آگے بڑھا
خون میں ڈوب کر گولیاں گنگنانے لگیں
روشنی سے سلگتے ہوئے چوک میں جراتیں
سر لٹانے لگیں
زید آ، ہم بھی شامل ہوں بیساکھ کے جشن میں
ورنہ اس جہل کی اوٹ چھپ کے بیٹھے ہوئے
کیسے بچ پائیں گے
سچ کی دوپہر
یلغار کرتی ہوئی ڈھونڈے گی ہمیں
ہم کہ آنکھوں کو اپنے ہی سائے سے ڈھانپے ہوئے

اور اپنے ہی پیچھے کھڑے
خود کو خود سے چھپانے کی کوشش میں مصروف ہیں
(نادر یافتہ، کلیات)

آفتا ب شمیم معاشرے میں امن کے خواہاں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے استحصال، جنگ، نا انصافی اور جہالت کی بھر پور مذمت کرتے ہوئے امن کا پیغام عام کیا ہے۔ وہ خود آ گاہی کے چراغ کے ذریعے خیر کی روشنی پوری دنیا میں عام کرنے میں مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں ۔

جھوٹ کی کندتھوں کے چھلکے
سارے جسموں سے اتر جائیں گے
اور گوتم کوئی
ساتھ لائے گا خودآگاہیوں کا آئینہ
سب کی پیشانیاں پاکیزہ زمانوں کی بشارت سے
دمک اٹھیں گی
(نادریافتہ، کلیات)

ان کے نزدیک خود آگاہی اور سچائی وہ موثر ہتھیار ہیں ۔ جن کے ذریعے استبداد اور استحصال کے ہاتھوں پارہ پارہ انسانیت کو یکجا کیا جا سکتا ہے ۔ اس لیے وہ اپنی اردگرد پھیلی جبریت اور وحشت کو اس دکھ اور کرب کے ساتھ بیان کرتے ہیں ۔ ملاحظہ ہو۔

میں نے آرے کی مشینوں میں پھنسی بوٹیاں
دیکھی ہیں کٹے جسموں کی
میں نے دیکھا ہے لہو تھوکتے مزدوروں کو
زرد قوت کا خدا
روندتا جاتا ہے
جس طرح پاوں رگڑنے سے بجھا دے کوئی
فرش پر کوئلے کی تحریریں
زید! تو کہتا ہے میں زندہ ہوں
میرے ہونے کی ضرورت کیا ہے
خود کو موسم کے حوالے کردوں
میں کہ مظلوم ہوں ، ظالم کے گلے کیسے لگوں ؟
(وہ اور میں (مشمولہ)زید سے
مکالمہ، ص:۱۱،۱۲)

آفتاب اقبال کی نظم میں ماضی کے سچ پر طنز اور حال کے دکھ اور کرب پر غصے اور پشمانی کا اظہار ان کی نظم "جھوٹا سچ" میں اس انداز سے کیا گیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

کتابوں میں لکھی سچائیاں
گزرے زمانے کا فنِ تعمیر لگتی ہیں
یہی لگتا ہے یہ سچائیاں
اس بھیڑ، اس شورِ سگاں ، ان گاہکوں کی بولیوں

کے درمیان بازار کے فٹ پاتھ پر حیراں کھڑے
جو اس نادان کو چالاک بھی ہونے نہیں دیتی
(نادر یافتہ کلیات)

آفتابؔ اقبال کی نظم اپنی روایات کی شکست، توڑ پھوڑ اور مدغم ہوتی تہذیب کی تصویر کشی بھی عمدہ پیرائے میں کرتی ہے۔ "میرا سچ اور" مگرمیرا سوال ہے" اس زوال پذیر تہذیب وتمدن کی عکاسی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

میں کہیں کا کہیں ، بعد کے بعد میں ، پیش کے پیش میں
مستقیم اور بھٹکا ہوا، ڈھونڈتا ہی رہا
اپنے ہونے کی غایت کے اسرار کو
اور جب شہر پنڈی میں یا شہر جہلم میں لوٹا
تو اپنے کوائف کی ساری خبر
اپنی پہچان ، اپنا پتہ کھو چکا تھا
آدم کا رشتہ ہے جو ابنِ آدم سے
دائم ہمیشہ سدا رہنے والا
(نادر یافتہ ، کلیات)

آفتابؔ شمیم کی نظموں میں ان سیاہ راتوں کی روداد بھی ملتی ہے جس میں تیسری دنیا کا ہر فرد مبتلا ہے۔ وہ آمرانہ نظام اقتدار کے مظالم کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہیں تا کہ ان احتجاجی رویوں اور اور باغیانہ اقدام کے ذریعے انکی بیخ کنی کی جا سکے اور ہر طرف امن کا راج ہو۔ بقول سعادت سعید! " سامراج، دام راج، لام راج ہر سوراجوں کے عذابوں کی کہانیاں ۔ آفتابؔ شمیم کی نظموں میں کچھ اس طور رقم ہوئی ہیں کہ پڑھنے والے کاجی چاہتاہے کہ وہ عام راج کی برکتوں سے بھی مستفید ہو"۔ عام راج دراصل عوام اور عام انسانوں کا حق خود ارادیت ہے جو وہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہیں اور جس کے لیے آفتابؔ شمیم خدا سے یوں دعا گو ہوتے ہیں ۔

خداوند
مجھے طائر،شجر، پربت بنا دے
یا مجھے ڈھا دے
کہ دوبارہ جنم لو ں اپنی
بے مشروط آزادی کی خواہش سے
(فرد اثراد،ص:۱۲)

آفتاب شمیم بے مشروط آزادی کے لیے تغیر اور انقلاب کے متلاشی ہیں ۔ ان کے خیال میں موجودہ عہد کی پسماندگی، ذلت، آمرانہ غلبے اور نظام استحصال کے خاتمے کے لیے عملی اقدامات کی اشد ضرورت ہے۔تب ہی ایک پر امن معاشرے کا قیام عمل میں لایا جا سکتا ہے۔

دل والو!
کچھ چھینٹے شوقِ تغیر کے ہم پر ڈالو
دھڑپتھر کے متحرک ہوں

ہم وارث تختِ تمنا کے
سانسوں کی حبس حویلی میں ، جینا اپنا معمولی کریں
(گم سمندر،ص:٦١)

آفتابؔ اقبال کی نظمیں آزادی کی پیا مبر ہیں ۔ جن میں محبت ، امن ا ور استحصال سے پاک معاشرے کا خمیر اٹھتا ہے۔ وہ نفرتوں اور منافقوں کو ختم کرکے ہر طرف انسان دوستی کا پیغام عام کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔ وہ دراصل اس منافقت، تعصب اور نفرت کو برداشت نہیں کرتے جس سے معاشرے کا سکون تہہ و بالا ہو۔ کیونکہ یہی چھوٹی چھوٹی نفرتیں بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہوتی ہیں ۔ ڈاکٹر رشید امجد کہتے ہیں ۔ "آفتابؔ اقبال شمیم کی نظمیں نفرتوں اور منافقتوں کے اس دور کا نوحہ ہیں "۔

انیس ناگی اور انسان دوستی(۱۹٤۰۔۲۰۱۰)

انیس ناگی اردو شاعری میں جد ت کے علمبردار اور نئی شاعری کی تحریک کے روح رواں ہیں ۔ وہ ایک انقلابی اور باغیانہ انداز کے مالک شاعر ہیں ۔ا نہوں نے جدت کے علمبردار اور نامور علامت پسند شاعروں ایلیٹ، راں باؤ، ملارے، باد بلییر اور اذرپاونڈ وغیرہ سے استفادہ کیا اور یوں جدید شاعری میں ایک ایسی تحریک کی بنیاد ڈالی جسکو نئی شاعری کی تحریک سے تعبیر کیا جاتاہے اور جس نے جدید اردو شاعر کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیاسمیع آ ہو جا انیس نا گی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔ "انیس ناگی نئی اردو شاعری کی تحریک کا بنیادی نظریہ ساز نقاد اور شاعر ہے۔ اس کی غیر معمولی متخیلہ، اس کی نظموں کی کرافٹ اور جذباتی درد مندی نے نئے ارد و شاعری میں ایک نئے افق کو ظاہر کیا ہے"۔

انیس ناگی کے شعری مجموعے بشارت کی رات ، غیر ممنوعہ نظمیں ، نوحے، زرد آسمان اور روشنیاں ، بے خوابی کی نظمیں نئے شاعروں اور نئے ادیبوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام کرتے ہیں ۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی انیس ناگی کے شعری مجموعے "بے خوابی کی نظمیں " کے بارے مین ان خیالات کا اظہارکرتے ہیں ۔

"بے خوابی کی نظمیں " انیس ناگی کا نیا مجموعہ کلام ہے جس میں ان کی تازہ کہی ہوئی نظمیں شامل ہیں ۔ ان نظموں میں اس دور کے انسان کی تنہائی، اس کی بے بسی ، کس مپر سی اور بے زبانی کی کہانیاں ہیں ۔ ان میں اس انسان کے لہو لہان جذبات و احساسات کی زندہ اور چلتی پھرتی تصویریں ہیں ۔ اس میں اس دور کے انسان کے وجود کے ایسے مرقعے ہیں جس کو ناساز گار حالات نے گھائل کر رکھا ہے۔ نوآبادیاتی نظام کی ستم رانیوں نے جس کی آرزوں ، خواہشوں ، تمناوں کے رنگ محلوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے۔ جس کے مقدرمیں تنہائی ہے۔ جس کی قسمت میں تاریکی ہے۔ وہ اس تنہائی کے عالم میں حدِنظر تک

پھیلی ہوئی تاریکیوں میں بھٹک رہا ہے۔ راستے کی تلاش
اور منزل سے ہمکنار ہونے کی تمنا، اس میں شبہ نہیں کہ
اسکا بنیادی مطمع نظر ہے۔

انیس ناگی نا امیدی اور مایوسی کے اندھیریے میں بھٹک رہے ہیں اور ایسی صورتحال میں زندگی کا بوجھ سہنا مشکل امرد کھائی دیتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے انیس ناگی کی شاعری کا مطالعہ کریں تو ان کی بہت سی نظموں کے عنوانات رات اور تاریکی سے متعلق دکھائی دیتے ہیں ۔ مثلاََ استعارہ رات اور ماہی گیر، ٹوکیوں میں آدھی رات، رات کالی کلوٹ جشن ، بیابانی کادن ، دھوئیں کا شہر وغیرہ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جدید دور کا انسان جس ماحول میں زندہ ہے اس میں تاریکی، بیابانی اور دھوئیں کے علاوہ کچھ نہیں ۔ روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی جو اس تاریکی کو دور کرنے کا سبب بنے۔ چاروں طرف اضطراب اور گٹھن کی اجارہ داری دکھائی دیتی ہے اور جدید دور کا انسان اس اضطراب میں جکڑا ہوئی دکھائی دیتا ہے اورفرار کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ نظم"ٹوکیو میں آدھی رات "کے اشعار دیکھییے۔

ٹوکیوں کی رات روشنی کی رات تھی
جدھر نگاہ کی
عمارتوں گلی گلی میں ، رنگدار روشنی کا رقص تھا
ہر ایک راہ گیر ، ریستوراں میں بیٹھے لوگ
اطمینان قلب و جاں کا جام ہاتھ میں لیے
خلیج ٹوکیو میں جلتی آگ
اور مندروں میں گھنٹیوں کے گیت کی صدا میں
میں گم

(ایک اور آسماں ، ص
:۲٦۱)

انیس ناگی کے خیال میں زندگی کی لایعنیت مادہ پرستی کے عہد کی دین ہے۔ جس کے باعث انسان بنجر مشینی ماحول میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے ۔ جس کے لیے ماضی کا حسن بھی باقی نہیں ۔ سوزندگی کا سامنا ہر روز یوں کرتاہے جیسے یہی ایک دن زندگی کا حاصل ہے۔ ویرانی اور بانجھ پن جسکا لا زمہ ہے ۔ نظم "بیابانی کا دن "کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔

آج کا دن
بیابانی کا دن
سیال
چاروں سمت بہتا پھیلتا
بد قسمی کو بانٹتا ہے
یہ بیابانی کا دن
جس کا کوئی ماضی نہیں
جس کا کوئی کل بھی نہیں

جس کی زمیں بنجر فضل بوجھل
کہین امید کا دامن نہیں
اس بے ثمر آب و ہوا
ایسی بیابانی میں
ساری عمر ہم نے کاٹی ہے

انیس ناگی عصری صورتحال پر طنز اور لا تعلقی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں "مجھے کسی سے محبت کیوں ہو" در اصل لاتعلقی کا یہ احساس ان کی نظموں میں حزن، احتجاج اور تصادم کی کیفیات کو جنم دیتا ہے۔ انیس ناگی کے نزدیک انسان کو مستقبل اور خوشحالی زندگی کے جو جواب دکھائے گئے وہ سب جھوٹے تھے اسے روشن راستہ دکھانے کے بجائے تاریک گڑھوں میں دھکیل دیاگیا ہے۔ آج فرد کسی خوابِ سبز کے سہارے جینے کے بجائے خوف ناکی، تنہائی اور کرب کا شکار ہے۔

تاریخ کا رستہ لمبا اور دھندلا ہے
اور میرے پاوں لہو میں بھیگ گئے
ذہن ابھی تک کا ذب اور عیار مورخ کی مانند فقط سنی سنائی
باتوں پر جیتاہے
کہ میرے لہو میں نسلوں کا پیوند لگا ہے
میں شاخ سے ٹوٹا پتا
کدھر کو جاوں اور کہاں سے معنی پاوں
میں اپنے شجرے کی کھوج میں تنہا
سارے کرّوں اور جنموں کے گرد مسافر بن کر بھٹک رہا
ہوں

(زرد آسمان، ص:
۱٤۰)

انیس ناگی کی نظمیں عصری بے یقینی کی بہترین عکاس ہیں ۔ آج کا انسان فقط بے یقینی کے کرب میں مبتلا ہے۔ کیونکہ ماضی کے سب خواب اس کے لیے ایک دھوکا اور سراب ثابت ہوئے۔ا س کے دکھ ماضی ، حال اور مستقبل میں بھی وہی صورت لیے ہوئے ہیں اور ان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی او رنہ ہی مستقبل قریب میں ان کے دور ہونے کی کوئی امید ہے۔ یہی نا امیدی اس کا یقین ہے اور یہی یاسیت اسکا ایمان ہے۔

میں جانتا ہوں یہ ساعتیں اب زوال کی ہیں
میں جانتا ہوں کہ زرگری کے بخار سے
اب دماغ سب کا بکھر گیا ہے
میں جانتا ہوں فراغِ آدم کہیں نہیں ہے
نظامِ کہنہ، حیاتِ تازہ، نظام تازہ ، حیاتِ کہنہ
نظامِ زر کے وہ سلسلے ہیں جو زندگی کو
نجاتِ آدم کو شاخ زریں بنا کے آنکھوں کو لوٹتے ہیں

فراغِ آدم کہیں نہیں ہے
کہیں بھی کوئی
نجاتِ ہستی کا گرم روزن کھلا نہیں ہے
(زرد آسمان
،ص:۱۱٦)

انیس ناگی کی نظموں کے بارے میں شاہین مفتی کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے۔
ناگی کی بہت سی نظموں کی فضاٹی۔ ایس ۔ ایلیٹ کی نظم Waste Land جیسی ہے۔ منظر اور اداس آنکھوں کی قسمت میں کوئی ایسی دستک نہیں جو بہار کی نوید ثابت ہو۔ ناگی کے دروازے پر خوف آن کر رکھا ہوا ہے۔ مہمان کی صورت بغیر کسی دعوت نامے کے۔۔ اور سردیوں کی شام کا کہراشاعر کی ریڑھ کی ہڈی سے لپیٹ گیا ہے۔ خوف کی حالت میں شاعر کا وجود اس کے لیے نا قص علامت بن گیا ہے۔

انیس ناگی کی نظم "ایک نئی وبا" پھیلتی ہوئی مادی اقدار پر بھرپور طنز ہے۔ نظم کے دو مرکزی کر دار دو طبقوں کے نمائندہ ہیں ۔ ایک سر مایہ دار طبقہ جسکی ہوس کبھی ختم ہونے میں نہیں آتی اور دوسرا غریب طبقہ جسکی غربت زندگی کی بنیادی ضروریات کو بھی ترستی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کردار عالمی سطح پر بڑی طاقتوں اور تیسری دنیا کے غریب ممالک کی علامت بھی ہیں ۔ دنیا میں اشتہا کا ایک الاو روشن ہے ۔ جسکا سبب مادہ پرست طبقہ کی پیداواری و سائل پر قبضہ کی ہوس ہے۔ مادہ پرست طبقے کے نزدیک اشتہا زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اور اس کے خلاف آواز بلند کرنے والے عقل سے عاری ہیں ۔

آپ تو جانتے ہیں
آپ سے کیا چھپاوں
کہ جب ابتلا ابتری ہو تو پھر اشتہا سے بدن کے خلامیں
زمانے کا سارا خلا ڈوبتا ہے
یہ میرا خلا ہے
کہ میں رات دن کے ٹریکٹر سے بیجی ہوئی ساری فصلوں کو
لقمہ بنانے کی خواہش میں دانتوں کے خنجر بہت تیز کر کے
بنی نوع انساں کو فاقہ کشی کا جہنم دکھانے پر مجبور ہوں
(ایک اور آسماں ، ص
:۱۲٤۔۱۲۵)

انیس ناگی کی ایک اور نظم" روشنیاں " کے اشعار دیکھیے جس میں وہ تیسری دنیا کی کھوئی ہوئی شناخت کی کہانی کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں ۔

کہ تیسری دنیا بھوک ، پیاس اور ناداری
کا خطہ، شمال سے اترتی سفید نسل کی برتری کے کمالات
سے
مرعوب، ان کے علوم کو فروغ
دیتا ہوا اپنے نشاناتِ شناخت سے محروم رہے گا
اوہ، ان کی تاریخ محکومی میں ہے ، وہ ایک دوسرے سے
متصادم

(ایک اور آسماں ، ص
:۲۸۹)

انیس ناگی جانتے ہیں کہ انسانوں کا سب سے بڑا مسئلہ روٹی ہے۔ اسی کے لیے کاروبار زندگی چلایا جاتا ہے۔ دفتروں میں احمقوں حاکموں کی باتیں سنی جاتی ہیں ۔ لہٰذا اس منافق اور متضاد نظریات سے سجی ہوئی زندگی میں لوگوں کے اندریہ خواہش شدید کروٹ لیتی ہے کہ وہ اس منافقت بھری دنیا کو چھوڑ چھاڑ کر ایسی بستی میں نکل جائیں جہاں یہ معمولات نہ ہوں اور ایک پرُ سکون زندگی ان کی منتظر ہو ۔ لیکن یہ ایک خوابِ خیال ہی کی صورت ہے کیونکہ شاعر کو اپنے چاروں طرف بدنصیبی ہی دکھائی دیتی ہے۔

زندگی کے معمولات سے اکتا یا ہوا شاعر لوگوں کو دعوت دیتاہے

اگر بد نصیبی کہیں دیکھنی ہے
مرے گھر میں آئو
یہاں ایک اجڑی ہوئی سلطنت کا سماں ہے

در اصل انیس ناگی کی نظموں میں تیسری دنیا کی غلامی، مفلوک الحالی ، اور محکومی کا المیہ نوحہ کی شکل میں احتجاج کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ جیلانی کامران نے ان نظموں کو تیسری دنیا کے بحران کا احتجاج قرار دیتے ہوئے کہا ہے۔

انیس ناگی کی یہ نظمیں تیسری دنیا کے بحران کا شدید احتجاج ہیں ۔ ہمیں جسکی گونج میں تیسری دنیا کی غیر تکمیل یا فتہ قومیت کی ابتلا سنائی دیتی ہے۔ انیس ناگی نے اس احتجاج کو ایک بدلا ہوا منظر دیا ہے اور قومیت اور تاریخ کو زخمی اناؤں سے منسوب کرتے ہوئے اس درد کو ظاہر کیا ہے جو تیسری دنیا کے اہل دل کی ذاتی کہانی بن چکا ہے۔ انیس ناگی کی نظموں میں نوآزاد ملکوں کی درد ناک صورت جھلملاتی ہے اور ان ملکوں کا ایسا انسان دکھائی دیتاہے جس اکا احساس ذات اور احساسِ تفخر دونوں مجروح ہو چکے ہیں ۔ ایسا کیوں ہے ؟ اس کا جواب تو معاشرتی علوم اور تیسری دنیا کے پالیسی ساز ادارے دے سکتے ہیں ۔ انیس ناگی نے تو اس کرب کو لفظوں کی شاعری دی ہے جو کرب تیسری دنیا کی پہچان بن چکا ہے۔

انسان دوست انیس ناگی انسان سے زندگی کا حق چھننے والے نظام کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور صنعتی تمدن کی منفی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہو تے ہیں ۔ ان کے نزدیک ایسا معاشرہ جو زر پرستی کا شکار ہو کر اپنی اعلیٰ اقدار سے محروم ہو چکا ہے وہ اس معاشرے میں تبدیلی کے خواہاں ہیں ۔

ہماری زندگی تو ایک بوجھ کی طرح
شقاوتوں میں کٹ گئی
کسی کو ہم شجاعتوں کا درس بھی نہ دے سکے
نہ اپنی سرزمیں کو عظمتوں کا راز دے سکے
ہماری نسل لوٹ اور کھسوٹ میں رہی
مقاومت کے حوصلے سے تہی رہی

انیس ناگی کو نہ صرف بین الاقوامی اور عالم گیر مسائل کا گہرا شعور ہے بلکہ وہ مقامی اور نچلی سطح پر بھی استحصال، تذلیلِ انسانیت اور حقوقِ انسانی کی پامالی کا شدید ادراک رکھتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی باریک بین نگاہ سے کوئی تاریک گوشہ چھپا ہوا نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں ۔

ایسے خطوں میں
جن کے روز و شب میں ابتری ہے
جہاں آدمی بے وقعت ہے
جہاں تھانوں میں عورتوں کو
برہنہ زدو کوب کرنے کا دستور ہے
کیا کروں ؟
کس طرح میں رہوں گا؟
کہ میرے تعاقب میں قسمت لگی ہے

انیس ناگی ہمارے منفی رویوں کے ناقد ہیں اور ان کی انسان دوستی معاشرے میں موجود منافق، ابن الوقت اور خوشامد پرست لوگوں کو خوب پہچانتی ہے۔ اور ان کی شاطرانہ چالوں کو یوں بے نقاب کرتی ہے۔

کچھ فاصلے پر لوگ ہیں
نامہرباں ، ناآشنا
جو اقتدار سلطنت کی کھوج میں
مظلوم بن کر ظالموں سے سخت ہیں
اور مال وزد کی لوٹ میں مشاق ہیں
جب وقت آتا ہے
خوشامد کی ریاضت میں بہت مصروف رہتے ہیں

عبدالرشیدانیس ناگی کی نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

شہر کو ایک تناظر کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے۔ اس کے منافقانہ رویوں ، طبقاتی تقسیم، نیکی اور بدی کی دوغلی اقدار سطحی مذہبی ستر پوشی کے پیچھے گہری خودغرضی کی چال شہر کی تاجر انہ آب و ہوا

میں جنس و مال کا نیلام، محرومیاں ، ہزیمتیں ، پیسہ اور صنعت کے مقاصد کے درمیان جنگ، اسی آب و ہوا میں انیس ناگی کی نظمیں اپنا تارو پود قبول کرتی ہیں ۔

مجموعی طور پر انیس ناگی کی نظمیں ، تذلیلِ انسانیت اور حقوقِ انسانی کی پامالی کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے اپنی انسان دوستی کا ثبوت پیش کرتی ہیں ۔ بقول اصغر ندیم سید!"انیس ناگی ان نظموں میں ایک انسان دوست، آزادی پسند اور زندہ اقدار کو چاہنے والوں کی حیثیت کو سامنے لاتا ہے"۔

تبسم کا شمیری اور انسان دوستی (۱۹۴۰)

تبسم کا شمیری کا پہلا شعری مجموعہ "تمثال" کے نام سے ستر کی دہائی میں منظر عام پر آیا۔ جیسے ہم ساٹھ کی دہائی میں منظر عام پر آنے والی نئی شاعری کی تحریک سے موسوم کرتے ہیں ۔ڈاکٹر تبسم کا شمیری کی انسان دوستی میں انسانوں ، شہروں اور فطرت سے محبت کا غالب رنگ دکھائی دیتاہے۔ بقول الطاف احمد قریشی!" تبسم کا شمیری نے علامتوں کو آگے بڑھا یا ہے۔ اسے اپنے اردگرد کے لوگوں اور اپنے شہروں قصبوں سے بے حد محبت ہے"۔ تبسم کاشمیری کے ہاں شہر کے بچوں ، بوڑھوں اور جوانوں سے محبت کا ایک منفرد انداز نظر آتا ہے۔ وہ شہر کے باسیوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے ہوئے اس میں برابر کے شریک دکھائی دیتے ہیں ۔ مذکورہ اشعار شاعر کی محبت کے بھر پور عکاس ہیں ۔ ملاحظہ کیجیے۔

مجھے ان خون میں جلتے ہوئے شہروں سے الفت ہے
میں ان کے نرم بالوں ، زرد گالوں سے ہمیشہ پیار کرتا ہوں
میں ان کے سوکھتے پامال جسموں پر وفا کے ہونٹ رکھتا ہوں
مجھے بچوں سے ، بوڑھوں سے، جوانوں سے محبت ہے
میں ان کے گرم تازہ آنسوں سے پیار کرتا ہوں
مجھے اس شہر کی کہنہ ہواوں سے محبت ہے

(تمثال، ص :۱۸،۱۷)

تبسم کا شمیری کی ایک نظم "میں وہیل کے پیٹ میں تھا" قابل توجہ ہے۔ جس میں مرکزی کردار ایک دفتری اہلکار ہے جو ایک دوسرے دفتری اہلکار ساتھی کو اپنا غم سنا تا ہے اور روز مرہ زندگی میں آنے والی تکالیف کا ذکر دکھ اور کرب کے ساتھ کرتاہے۔ تبسم کا شمیری نے اس غم ، دکھ اور کرب کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔

میں وہیل کے پیٹ میں تھا
مرے خون میں ریت تھی اور سرکھولتی نفرتوں کا قلعہ
مرے ہاتھ پاوں اور دھڑ کے ٹکڑے ہوئے تھے
ریستوراں کی کڑوی پیالی میں میں تھا
اور تیزاب سی گرم چائے میں جلتی ہوئی خشک مخلوق
نچڑے ہوئے زنگ آلود چہرے
اف مجھے درد سر ہے

(پرندے، پھول، تالاب، ص
۳۵:)

تبسم کا شمیری نے شہری معاشرت کی اجنبیت کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ ہر شخص مصروفیت کے باعث ایک دوسرے سے اجنبیت کا رویہ روا رکھتا ہے۔ ایک دوسرے سے میل جول، پیار و محبت اور یگانگت کا رنگ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ہر طرف خود غرضی اور نفسانفسی کا دور دورہ ہے۔ تبسم کا شمیری کا کردار "لمحے لمحے کا اجنبی "بہت پرُ اثر انداز میں سامنے آتا ہے۔ ایک شخص جو ایک ہی راہ سے روز کئی بار گزرتا ہے۔ اہل شہر اسے نہیں پہچانتے۔ دراصل شہر میں مصروفیت کی آلودگی اور گردو غبار اس قدر ہے کہ یہ شخص ہر لمحہ اپنے چہرے کے خدوخال پر ایک نئی تہہ دیکھتا ہے۔

وہ کالی سڑکوں پر گھومتا تھا
سیہ دھوئیں کو وہ پھانکتا تھا
وہ کانپتا تھا، وہ سوچتا تھا
"کہ میرا چہرہ بدل گیا ہے"
کبھی وہ ہاتھوں کو گھورتا تھا
کبھی وہ کپڑوں کو پھاڑتا تھا
کبھی وہ بالوں کو نوچتا تھا

تبسم کاشمیری کی نظموں میں ان کی اپنی ذات مرکزی حوالہ بن کر سامنے آئی ہے۔ وہ انسانی عوامل کی کائنات میں ہر حقیقت کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھتے ہیں ۔ ذات کی آگاہی کے نتیجے میں شعوری سطح پر اپنے ماحول کی عکاسی ان نظموں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ تبسم کا شمیری کی ذات ان کے لیے ایسی حقیقت ہے جس کے واسطے وہ مظاہر کا مشاہدہ کر رہے ہیں ۔ جس کے نتیجے میں یہ راز کھلتا ہے کہ ان کا عہد اپنی بے چہر گی کے باعث اپنے نہ ہونے کے کرب میں مبتلا ہے۔ اسی کرب سے ہونے کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے۔ نظم "فقط ہونے نہ ہونے سے" کے اشعار دیکھیے۔

ہوا آنکھوں کو چبھتی ہے تو یہ محسوس ہوتاہے
فقط میں ہوں
مرے ہونے کے اس احساس کی لرزش بدن میں سرسراتی ہے
بدن کی سرسراہٹ میں
ہزاروں خوشبوئیں یلغار کرتی ہیں
اگر جو سرد موسم ہو کبھی میں کپکپاتا ہوں
کبھی میں راستے میں سوچتا ہوں
تو مجھے احساس ہوتا ہے
کہ میں ہرگز نہیں ہوں

(پرندے، پھول،تالاب، ص :۴۱
۴۲،)

تبسم کا شمیری معاشرے میں پھیلی ہوئی منافقت اور نا انصافی کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کر تے ہیں ۔ یہ وہ معاشرتی برائیاں ہیں جن سے معاشرے کا امن و سکون تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی متعدد نظموں میں ان برائیوں کا پردہ چاک کرتا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے کی نظموں میں مسٹر جی ایس شاہ اور اسکی قبر ،شیخ کے پیٹ کا کتا ، محبوب خان ایک حقیقیت پسند آفیسر وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔نظم "مسٹر جی ایس شاہ اور اسکی قبر"کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔شاعر اس منافقانہ معاشرے کا حصہ ہونے پر خود کو ایک مجرم گر دانتا ہے اور احساس جرم کا شکار دکھائی دیتا ہے۔

وہ سو جاتا ہے ہر روز
اپنی قبر کے عذاب میں
بد باطنی کی چادر کی تموّ جات کے اوپر
منا فقت، ضمیر فروشی، خوشامد، لوٹ کھسوٹ
اور سازشوں کا بے انت کمبل اوڑ ھ کر
(پرندے ،پھول، تالاب، ص:۵۰۷)

ایک اور نظم ندامت ہی ندامت" کے اشعار دیکھیے۔ جس میں احساس ندامت کی کیفیت بڑی شدت سے ملتی ہے ۔

رات کے معدے میں کاری زہر ہے جلتا ہے جس سے تن بدن میرا
میں کب سے چیختا ہوں درد سے چلاتا پھرتا ہوں
تشدد ، خوف ، دہشت ، بربریت
شہوت جاگتی ہے گھورتی ہے سرخ آنکھ سے
وہ چہرے نوچتی کھاتی ہے اپنے تند جبڑوں سے
یہ کیسا زہر ہے جو پھیلتا جاتا ہے معدے میں
یہ کاری زہر ہے جو رات کے معدے سے ٹپکا ہے
تشدد ، خوف ، دہشت ، بربریت رات کے کالے ستم گرسیاہ ماتھے پر
ندامت ہی ندامت ہے
(پرندے، پھول، تالاب، ص: ۳۹،۴۰)

ڈاکٹر انیس ناگی تبسم کا شمیری کی نظموں کے اس پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

اس احساس جرم کے جملہ محرکات اسی معاشرے کی عاصبانہ فعلیت میں مضمر ہیں ۔ جس میں ہا بیل و قابیل کی رسم کا اعادہ ہر روز محبت، چاپلوسی، نفرت اور حسد کے لبادے میں کیا جاتاہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر انسان کی شناخت کا قرینہ محو ہو گیا ہے اور شناخت کی کم گشتگی، بے ہیئت زندگی معاشرے کی منفی قوتوں کی بالا دستی، عقیدے کی ما بعد الطبعیات سے انکار ، انسان میں نراش کی وجودی صورتحال کو جنم دیتے ہیں اور اپنے نتیجے کے طور پر تنہائی، عدم تحفظ اور جنسی محرومی کا تحفہ شاعر کے سپرد کرتے ہیں ۔ وہ ایسی

زندگی کو حوصلہ مندی سے بسر کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اسکی مجبوری ہے کہ وہ اس سے باہر نکلنے کا حوصلہ نہیں رکھتا ۔

انسان دوست تبسم کا شمیری معاشرے میں امن وآشتی کے خواہاں نظر آتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جنگ، ظلم اور جھوٹ جیسی معاشرتی برائیوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں ۔ وہ معاشرے میں ہر طرف محبتوں اور خوشیوں کا راج دیکھنا چاہتے ہیں ۔ بادلوں کی موت، فاختاوں کے قتل اور زمین کی سسکیوں پر ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسانوں اور ان کی بستیوں کے لیے امن کے طلب گار نظر آتے ہیں ۔ یہ اشعار اس جذبے کی بھر پور عکاسی کرتے ہیں ۔ ملاحظہ ہوں ۔

میں ایک دوسست ستارے
بستیوں کے لیے روشنی
انسانوں کے لیے امن
اور زمین کے لیے خوشبو مانگتا ہوں
(بازگشتوں کے پُل پر ،ص:۴۰)

تبسم کاشمیری معاشرے کے برے حالات کے باوجود آس اور امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ وہ اپنی نظم "دروازے کھلے رکھو"میں یہی پیغا م عام کرتے نظر آتے ہیں ۔ وہ سب کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ مظلوموں اور تہی دستوں کے لیے ہمیشہ اپنا دروازہ کھلا رکھو اور دھرتی پر امن کی صبح کو بھی کھلے دل سے خوش آمدید کہودراصل تبسم کاشمیری کے خیال میں مظلوموں اور تہی دستوں کی مدد کرنا ہی انسانیت ہے اور یہی انسانیت حقیقی معنوں میں انسان دوستی ہے۔

دروازے کھلے رکھو
مظلوم اوراق کو پناہ دینے کے لیے
دھرتی پر امن کی ایک نئی صبح کے لیے
آسمانوں پر سلامتی کے ایک نئے سورج کے لیے
(کاسنی بارش میں دھوپ، ص
:۷۰)

تبسم کا شمیری مایوسی اور اندھیروں میں ڈوبے ہوئے شاعر نہیں ہیں ۔بلکہ وہ اندھریوں میں بھی روشنی کی کرن تلاش کرلیتے ہیں ۔ یوں یاسیت کے بجائے ان کے ہاں رجائیت کا پہلو اپنی بھر پور تو انائیوں کے ساتھ دکھائی دیتا ہے اور یہی ایک انسان دوست شاعری کی خوبی ہے۔

نیا موسم بشارت ہے
کنول پانی میں کھلتے ہیں
بہار آئے گی راہوں میں
شگوفے سرخ ہو جائیں گے
منظر خوب دمکے گا

(تمثال، ص:۴۳)

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتاہے کہ تبسم کا شمیری کی انسان دوستی، امن، آزادی ، انسانی ہمدردی جیسی اعلی ٰ اقدار سے مالا مال ہے۔

کشور ناہیداور انسان دوستی (۱۹٤۰)

کشور ناہید فروری ۱۹٤۰کو یو۔ پی میں پیدا ہوئیں ۔ کشور کی شاعری کا بغو ر مطالعہ کرنے والے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ان کے ڈکشن پر ایک طرف فارسی شعری روایت کا سایہ ہے تو دوسری طرف فیضؔ، راشدؔ او ر مختار صدیقی کی ترکیب سازی اور لفظی انسلاک کے عمل یا برتاو کا اثر بھی نظر آتا ہے۔ مگر اب عالمی شاعری کے مطالعے، بین الاقوامی سماجی، تہذیبی مدوجزر اور اپنی ذات کے تلاطم خانے سے گزر کر کشور ناہید کی شعری لفظیات اپنی پہچان علیحٰدہ سے قائم کر چکی ہیں ۔

کشورؔ کے اکثر نقاد انہیں ایک باغی اور سرکش شاعرہ قرار دیتے ہیں جو مظلوم عورت کی جنگ لڑ رہی ہے۔ بیشک عورت اس کے یہاں استحصال زدگی کی ایک علامت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ لیکن اسکی بغاوت درحقیقت پورے استبدادی معاشرے کے خلاف ہے۔ ابتدا میں اسکی بغاوت اپنے عورت پن سے تھی۔ جسکا اظہار اس نے نہایت غم و غصے اور نفرت کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن بعد میں اسکی جنگ ذات کی چار دیواری سے نکل کر پورے نظام کے خلاف ایک بڑی لڑائی میں تبدیل ہو گئی۔ ان کی نظموں میں دور حاضر کا جبر و استبداد، ماضی کی روایات کے لب و لہجے میں انتہائی دلچسپ اور موثر انداز میں ملتا ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد کشور ناہید کی سماج کے خلاف بغاوت پر ان الفاظ میں اظہارِخیال کرتے ہیں ۔

> کشور ناہید اپنی نوعیت کی واحد خاتون شاعر، ادیب اور دانشور ہیں ۔ وہ ایک ایسی دانشور ہیں جس نے اپنے عورت ہونے کے بجائے اپنے انسانی اور فرد ہونے کو تسلیم کرایا ہے۔ وہ عورت کو کسی خانے میں رکھ کر پرکھنے کی درپے ہیں نہ دکھانے کی۔ وہ صنفی مساوات کی علمبر دار ہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے ملک میں ایسا ماحول اور فضا پیدا کی ہے جس میں ادب کے زنانہ اور مردانہ ڈبوں کی تفریق ختم ہو گئی اور ادب تمام انسانوں کا ورثہ بن گیا ۔

انسان کو معاشرے میں اپنا مقام اور مرتبہ بنانے کے لیے اپنے اردگرد ہونے والی تبدیلیوں اور حالات کا بخوبی علم ہونا چاہیے۔ گویا اس میں سماجی شعور اور سماجی آ گاہی کا ہونا ضروری ہے۔ ترقی پسند شاعروں نے انسانوں کو سماج میں باوقار مقام حاصل کرنے کا شعور اور پیغام دیا ہے۔ کشور ناہید کی شاعری میں سماجی شعور اور سماجی آگاہی کا موضوع بکثرت دکھائی دیتاہے۔ ۱۹٦۷میں نہر سویز پر احتجاج ہو کہ ایوب خان کے خلاف تحریک ہو،PNA کا راستہ روکنے کی بات ہو، ضیاالحق کی انتقامی سیاست ہو، مارشل لاوں کا سامنا ہو، وکلا کی

تحریک ہو ہم انسان دوست کشور کے شعری شعور اور عملی جدوجہد کو ایک ساتھ پائیں گے۔ نظم "ابھی موسم نہیں بدلا" کے اشعار دیکھیے۔

نئے موسم کو حرفِ شوق کا عنوان نہیں کرتے
وہ موسم
جس میں تازہ کونپلیں ڈر کے نکلتی تھیں
ہر گھر اور ہر دہلیز پر پہرا خزاں کا تھا
دعا کے بادباں پہ نام بھی لکھنا گماں کا تھا
وہ موسم
جس میں عفریت، ہزیمت راج کرتا تھا
وہ کیا آسیب تھا جو اپنی گلیوں سے گزرتا تھا
نصیبہ ان پرندوں کا
کہ جو پردیس میں تھے اور یہ منظر نہیں
پلٹ آئے ہیں صحنوں میں تو زخم در نہیں دیکھا

(کلیات کشورنا ہید ،خیالی شخص سے مقابلہ ،ص :۱۳۷)

ڈاکٹر سعادت سعید کشور ناہید کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔"کشور ناہید کے لیے دوسروں کے رحم وکرم پر جینا، خود اذیتی اور انفعالیت کے غیر انسانی رویوں کادامن تھا منا پسندیدہ نہیں "۔

نسان دوست کشور ناہید غلامی اور استحصال کے خلاف پر عزم دکھائی دیتی ہیں ۔ وہ عورت جو اپنی تمام تر صلاحیتوں ، قوتوں اور عملی کا موں کے باوجود مرد کی محکومی کا شکار ہے اور یوں لگتا ہے کہ یہ محکومی اور غلامی اس کی قسمت میں لکھی جا چکی ہے۔کشور ناہید عورت پر ہونےو الے ظلم و ستم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرتی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ در حقیقت وہ معاشرے میں موجود ہر فرد کی طرح عورت کی آزادی کی بھی خواہاں ہیں ۔ جو اسکا بنیادی حق ہے۔ اپنی نظم"خواب میں خواب کا ڈر" میں عورت پر ہونے والے ظلم و ستم کے خلاف انسانی ہمدردی اور انسان دوستی کے ساتھ آواز بلند کرتے ہوئے کہتی ہیں ۔

کس نے کہا تھا ان سے ملو
بات بھی کرو
اینٹوں کا رنگ سرخ ہے
دیوار بھی ہے سخت
دیوار پر جڑی ہوئی شیشے کی ٹکڑیاں
نازک ہتھیلیوں کو کریں گی لہولہان

(کلیات کشور ناہید ،بے نام مسافت، ص :۲۵۳)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ لیکن عورت آزاد ہوتے ہوئے بھی معاشرتی قیود کا شکار ہے۔ وہ ساری زندگی کسی نہ کسی کی دست نگر رہتی ہے۔ کبھی والدین کی، کبھی خاوند کی اور کبھی بیٹوں کی

۔ کشور ناہید اسی غلامی کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے اپنی نظم" روایت نہ ٹوٹے"میں کہتی ہیں ۔

ہم روایات کی کہنہ صدیوں کے پربت تلے
وہ گھنے سبز جنگل ہیں جو
بے پنہ شاخ در شاخ تابندگی
تازگی کے تموج سے سنولا کے
خود ہی جھلس جائیں
ایسے جلیں ایسے جلیں
کہ فقط دورر تک کوئلہ کوئلہ ہی دکھائی دے
اور تازگی کی نمو
خاک سے بھی گواہی نہ دے
وہ مقدر کے اچھے
کہ جن کو جلاپے کی مدت گزرنے پہ
ان کوئلوں کی جگہ ، ہیرے موتی ملے
وہ مقدر کے اچھے
کہ جن کی دعائیں ، زمیں کی تہوں میں دبیں
تو کہیں سونا چاندی بنیں
وہ مقدر کے اچھے

(بے نام مسافت، ص :۲۱۴۔۲۱۵)

ہمارا معاشرہ بے روز گاری ، بد حالی اور پسماندگی کا شکار ہے۔ جسکی بنیادی وجہ یہاں کا جاگیر دارانہ نظام ہے۔ جس کے باعث امیر اور غریب کا فرق بڑھتاچلا جا رہا ہے۔ امیر امیر سے امیر تر ہو تا چلا جا رہا ہے اور غریب، مزدور اور کسان غربت کی چکی میں پستا چلا جا رہا ہے۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم نے طبقاتی امتیازات کو اور ہوا دی ہے۔ ناقص منصوبہ بندی کے باعث اپنے چاروں طرف پسماندہ، دکھی اور لا چار لوگ دکھائی دیتے ہیں ۔ کشور ناہید کی تمام ہمدردیاں ان محروم اور مظلوم طبقے کے ساتھ نظر آتی ہیں ۔ جو زندگی کی بنیادی ضروریات کے لیے ترستے دکھائی دیتے ہیں ۔ وہ ان کے دکھ درد میں برابر کی شریک ہوتی ہیں ۔ نظم"خوف" کے اشعار دیکھیئے جس میں محروم اور مظلوم طبقے کی تصویر یں بڑے موثر انداز میں ایک انسان دوست شاعرہ کی حیثیت سے ہمیں دکھائی ہیں ۔

سونے سونے سے در و بام
فضائیں بوجھل
سہما سہما ہے اندھیروں کا وجود
ایک بے نام خموشی ہر سو
جیسے ہر سانس گھٹی جاتی ہے
سرسراتے ہوئے پتوں کی صدا
جیسے بڑھتی ہوئی دبے پاوں خزاں
ڈوبنے لگتا ہے دل

دیکھ کے ماحول کا کرب
رات تاریک ہے
سنسان ہے
جانے کیا ہو
(کلیاتِ کشور ناہید)

بقول شہرت بخاری!
کشور ناہیدبہت باخبر عورت ہے۔ اسے اس زمانے کے ادیبوں اور شاعروں کا انسائیکلوپیڈیا سمجھنا چاہیے۔ وہ سنی العقیدہ ہے لیکن رقیق القلب۔ وہ عالی ظرف ہے۔ چھچھورپن اس میں نہیں ۔ ہمدرد ہے انسان دوست ہے۔ بے تعصب ہے۔ ہر کسی کی دستگیری کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کسی کا دل نہیں توڑتی۔

یہ بھی ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ انسان معاشرتی حیوان ہے۔ معاشرے میں اکیلے زندگی بسرکرنا اس کے لیے ممکن نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی پیدائش سے لیکر موت تک دوسروں کی مدد کا طالب ہے۔ کشور ناہید جیسی انسان دوست شاعرہ انسان کی انفرادیت کی بجائے اجتماعیت اور اجتماعی شعور کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں ۔ وہ ایک انسان بلکہ ایک فرد پر ہونے والے ظلم کو پوری انسانیت پر ظلم کے مترادف قرار دیتی ہیں ۔ نظم "زوال استحصال" کے اشعار دیکھیئے جو ان کی انسان دوستی کے عکاس ہیں ۔

یہ ہاتھ جن میں رگیں ابھر کے
خزاں کی آمد کی نامہ بر ہیں
رگیں کبھی یوں تپش زدہ تھیں
کہ جیسے سیال آگ
بے آب مچھلیوں کی طرح ہو بے کل
یہ ہاتھ اٹھے نہیں دعا کو
یہ ہاتھ دست طلب کی صورت
کہیں سبک سر نہیں ہوئے ہیں
یہ ہاتھ اپنی آرزوں کے قاتل و ناخدا رہے ہیں
یہ ہاتھ کہ جن کی انگلیوں میں
مشقتوں کے عذاب نے
ہر گرہ کو چپٹا بنا دیا ہے
ہر ایک ناخن شکستہ ساحل کی شکل میں
بدنمائی کا آئینہ بنا ہے
یہ میرے اچھے دنوں کی تصویر ابتدا ہے
(کلیات کشور ناہید،بے نام مسافت، ص:۲۱۷-۲۱۸)

کشور ناہید کی شاعری میں زندگی کے سارے رنگ روپ سمیٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ جہاں وہ کچلے ہوئے اور ظلم و استحصال کے

ستائے ہوئے انسانوں کو ہمت اور حوصلہ دیتی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ وہاں ہمیں ان کے ہاں انقلاب کی آواز بھی سنائی دیتی ہے اور انقلاب برپا کرنے کے لیے دعوت عمل بھی ملتی ہے۔ وہ مایوس انسانوں کے مستقبل کو سنوارنے کے لیے آگے بڑھنے اور حالات کا مقابلہ کرنے اور حالت کو بدلنے کی دعوت بھی دیتی ہیں ۔ ان کے ہاں امید کی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ نظم" تلخیوں کا ثمر "کے اشعار دیکھیے۔

کاغذ پر بنی ہوئی مسکراہٹ
ہونٹوں پر چپکانے سے
زندگی میں غروب آفتاب کا منظر نہیں بدلے گا
روز صبح چڑیوں کا گانا
مجھے بولنے پر اکساتا ہے
میرے اندر کا سانپ میرے نطق کو ڈس لیتا ہے

(سیاہ حاشیوں میں گلابی رنگ، ص :۹۱۶)

کشور کے ہاں روز مرہ زندگی کے پیدا کردہ مسائل اور بطور فرد ان سے عہدہ بر آ ہونے کی مسلسل کو شش کا بیان بھی ملتا ہے۔ڈاکٹر مبارک علی! "کشور کے ہاں مایوسی نہیں امید ہے۔ وہ تاریخ کی تبدیلی کے عمل سے بخوبی واقف ہے"۔

بکری ذبح ہونے کا انتظار کرتی ہے
اور میں صبح ہونے کا
کہ میں روز دفتر کے میز پر ذبح ہوتی ہوں
جھوٹ بولنے کے لیے
یہی میری قسمت ہے

(کلیات کشور ناہید)

کشور ناہید کی شاعری وجودی انسان دوستی پر قائم ہے۔ وہ عو رت اور مرد دنوں کو برابر حقوق دینے اور ان کی آزادانہ حیثیت پر زور دیتی ہیں اور عورت کی ازلی محرومی پر صدائے احتجاج بلند کرتی ہیں ۔ اسی طرح ان کے ہاں زندگی کے مسخ شدہ نقوش دکھائی دیتے ہیں جو دراصل انسانوں کی منافقت اور ریا کاری کا نتیجہ ہیں ۔ اس لیے ڈاکٹرصمدانی بجا کہتے ہیں ۔"کشور ناہید کی شاعری میں منافقت اور ریا کاری کے خلاف ردِ عمل دکھائی دیتا ہے"۔

عبدالرشیداور انسان دوستی (۱۹٤۵)

۱۹۷۰کی دہائی میں جن نظم گو شعرا نے نظم کی دنیا میں اپنا نام کمایا ان میں عبدالرشید د کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے تین شعری مجموعے انی کنت من الظالمین ۱۹۷۳، اپنے لیے اور دوستوں کے لیے نظمیں (۱۹۷٤ء)، اورپٹھا ہوا بادبان،۱۹۷۷ ان کی شاعرانہ عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہیں ۔

ڈاکٹر انیس ناگی ان کے پہلے مجموعے ان کنت من الظالمین پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں !

موضوعاتی اعتبار سے انی کنت من الظالمین میں ملی جلی
نظمیں ہیں ۔ ان میں لڑکپن کے تجربات کالج کے زمانے کے
عشق، اپنی ذات کی ماہیت کی تلاش اور ایک بے ثمر عہد
سے اپنے آپ کو equateکرنے کی جدوجہد کا عمل دکھائی
دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان موضوعات میں وہ جدت یا تازگی
نہ ہو جس کا تقاضا ایک نئے شاعر سے کیا جا سکتا ہے۔
لیکن عبدالرشید نے ان موضوعات کا ادراک ایک نئی
حساسیت سے کیا ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر اسکی
نظمیں کثیر المعانی ہونے کا قرینہ رکھتی ہیں ------ چنانچہ وہ
اپنے پہلے شعری مجموعہ میں تنہائی ،محبت، اجتماعی جبر
اور تلاشِ ذات کے مروجہ موضوعات کا اداک ایک نئی
لسانی تشکیل کے کے ذریعے کرتاہے۔
انسان دوست عبدالرشید کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت
بخوبی عیاں ہو جاتی ہے کہ انہوں نے تلاش ذات تنہائی ، جنسی گھٹن کا
احساس اور اجتماعی جبر کے شکار ماحول کی عکاسی عمدہ پیرائے میں
کی ہے۔ نظم "لکھ خفیہ برداروں کی حاجت" کے اشعار اسکی بھر پورر
عکاسی کرتے ہیں ۔

لکھ خفیہ برداروں کی حاجت
ذات کے اس منقسم شطرنج پر پیچاں
ہیولیٰ یا زمیں پر آتے جاتے پاوں کے تلووں سے چمٹے
خاک اندر خاک، بے لذت گماں کا روگ
ہر کونے میں ان دیکھی نگاہوں سے لپکتا سہم
اور اس سے ورا وہ خود مسلط زائچے
جو جسم پر تقدیر کا پیوند ہیں

انسان دوست عبدالرشید کی شاعری انسانی جبر و کرب کی کہانی
بڑے دکھ درد کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ ان کے نزدیک دکھی انسانیت کی
بے بسی اور لاچار ی کے پیچھے سرکش اور ظالم خود ساختہ زمینی
خداوں کا ہاتھ ہے۔جنہوں نے اپنے ظلم و استبداد کے ذریعے ان کی
زندگی کا دائرہ تنگ کر دیاہے اور یہ مجبور و لاچار لوگ زندگی کو جبرِ
مسلسل کی طرح کاٹنے پر مجبور ہیں ۔ بقول ڈاکٹر فخر الحق نوری !"یہ
دکھ درد انسان کا اپنا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ فرعونیت کے حامل خود
ساختہ خداوں کا ہے۔ عبدالرشید نے فرعونیت کی مذمت کی ہے۔ انہوں
نے عام لوگوں کا خون چوسنے کی مذمت کی ہے"۔ عبدالرشید نے اپنی
متعدد نظموں میں جبر و کرب اور ظلم و ستم کو موضوع بناتے ہوئے
اسکی بھر پوری مذمت کی ہے۔ ان کی نظم "بغداد "کے اشعار دیکھیے۔

ستم انسانیت کی جڑ پر کاری وار ہے
تسخیر کی عادت جو از و عقل کو باہم کیے
خفیہ عزائم کو دلائل میں پروتی ہے
بہیمانہ چلے آتے ہیں وہ جو اس زمیں کے ناخدا ہیں

عقد بہ روئے شریعت اور رضا مندی کے ساتھ
جو زمانے میں تماشا بن گیا ہے
پیمبر وقت ہے اور حرص گو اولادِ آدم ہے
مگر شیطان کے نطقے کی جڑ سے ہے
صحائف میں ہے جسکا ذکر وہ دجال
بد ارواح کے لشکرکے ساتھ
وہ نخلستان جس کا نام ہے بغداد
اس پہ ٹڈی دل کی صورت چھا گیا ہے
(افتخار جالب کے لیے نوحہ اور دوسری نظمیں
،ص : ۱۹،۲۰)

بقول عمران ازفر! "نظم "بغداد"،"فکری سطح پر انسان کی مسلسل بر بادی اور زوال پر نوحہ ہے"۔ جہاں تک عبدالرشید کی نظموں میں انسان دوستی کے رحجانات کا تعلق ہے تو وہ معاصرصورتحال میں بر پا ہونے والی ہوسِ اقتدار کی جنگوں کے خلاف خصوصاً بغداد کے تناظر میں ابھرنے والی صورتحال میں زیادہ کھل کر سامنے آتے ہیں ۔ "بغداد میں بمباری کا ایک منظر " میں اسرائیل اور مغرب کی دیگر توسیع پسند او ر ہوس پرست قوموں کی بہیمیت اور انسانیت سوز جنون کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے کہتے ہیں ۔

یہ صورت اسرافیل ہے یا نارِ اسرافیل
یادست و بازوئے اسرائیل
کہ جس کے طوق کا تحفہ
اپنی گرتی راکھ پہ پہنوں
سالِ نو اور جشنِ خونِ انساں
پریدہ پیڑوں کی وادی میں
طیارے کا غیض
مغرب کی ہتھیلی سے پھوٹا
گندے خوں کا حیض
(نیند۔ موت اور بارش کے لیے نظمیں ،
ص : ۲۱٤)

عالمی استعمار کی سازشوں کے نتیجے میں انسانی وجود کی پامالی پر دکھ ا ور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر ضیاالحسن کہتے ہیں ۔

موجودہ عہد میں امریکی یلغار اور اس سے بننے والا نیا عالمی معاشرہ اور اس معاشرے میں انسانی وجود کی نئی استحصالی صورتحال ان کے پیش نظر رہی ہے۔ یہ ایک پورے عہد کا سفر نامہ ہے۔ کسی ایک ملک یا خطے کا سفر نامہ نہیں ۔ پھر یہ محض سفر نامہ نہیں بلکہ اس میں غصہ، نفرت جقارت، بے بسی سبھی کچھ ہے۔ ان احساسات نے اس منظر نامے کو زندہ کر دیا ہے۔ یہ قاری کے باطن میں بولتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جس میں ہم سب شریک ہیں ۔ جس کا

باعث ہم سب ہیں اور جس کے نتائج ہم سب پر اثر انداز ہوئے ہیں -
عبدالرشید کی متعدد نظموں میں اس غصہ، نفرت اور حقارت کے احساسات وجذبات ملتے ہیں -
نظم "صدی کا یہ آخر" کے اشعار دیکھیے جو نفرت بھرے جذبات کی عکاسی بھر پور انداز سے کرتے ہیں -

کوئی شہر مفتوحہ جو غاصبوں کے ستم
ان کی غارت گری
ان کی مردار آہن کلائی کے نیچے دبا ہو
سسکتا ہوا ----کوئی قتل ہو، شہر کا ہو یا ہو فرد کا
آبرو ریزی وہ اجتماعی ہو یا انفرادی
جرائم میں ہم معنی ہے
شہر کا قتل ہو یا روایت کا روحانی قتل

انسان دوست عبدالرشید کی انسان دوستی صرف غاصبوں اور قاتلوں کے خلاف غم و غصہ اور نفرت و حقارت تک محدود نہیں بلکہ وہ ظلم کا شکار ہونے والے عوام کے لئے پیار و محبت اور انسانی ہمدردی کے جذبات بھی رکھتے ہیں -

خلقت ہمیشہ سے چوپایوں کی مثل سادہ ، طفیلی
گزرتے ہوئے دن کے صدموں سے مضروب، نالاں
جو ایک ساتھ چلتے ہیں ، مٹی اڑاتے ہیں
باہم جگالی کرتے ہیں
جو بستر پہ مدہوش و خوابیدہ اس شوروشر سے
جو خواہش کی سرگوشیوں کو دبانے سے پیدا ہوا
جس سے مفرور ہونے کی کوشش میں
خارش سے سارا بدن چھیل ڈالا
سزا یافتہ مجرموں کی طرح جن کی نعلوں میں زنجیر ہو
جو اشارے سے چلتے ہوں رکتے ہوں
اور اذن ہو تو زباں کھولتے ہیں
زباں جو دہاں میں فقط گوشت ہے

زندگی کے ان تمام تلخ حقائق کے باوجود عبدالرشید کے ہاں امید ، آس، یقین اور رجائیت کی دولت موجود ہے۔ وہ ناگوار حالات کے خوشگوار حالات میں تبدیل ہونے کے فلسفے پر یقین رکھتے ہیں اور یہی یقین انکی انسان دوستی کو ظاہر کرتا ہے۔

پھر بھی دن آئیں گے
دن، جو سکھ کے سبک رومال لیے ہوں ، دکھ کو ڈھانپیں

سرمد صہبائی اور انسان دوستی

سرمد صہبائی کا شمار جدید نظم کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے ہاں تفکر اور حیات و کائنات کے بارے میں آگہی جیسے عناصر ملتے ہی۔ انہوں نے اپنی شاعری میں صنعتی معاشرے کے مسائل کو

موضوع بنایا ہے۔ جس کے ذریعے غصہ، تشدد اور انسانی بے وقعی جیسے مسائل معاشرے میں پیدا ہوتے ہیں اور معاشرتی امن و سکون تہ و بالاہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ صنعتی معاشرے نے صوفی ازم، روحانی اقدار اور باطن کی تلاش جیسے موضوعات کو بھی جنم دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ۔

یہ کیسی تدبیر یں ہیں جو سیفٹی پن کے کھلنے سے کھل جاتی ہیں
ساری صداقتیں ، سارے رشتے
اک پل کی ان دیکھی کاٹ سے کٹ جاتے ہیں
میلے اندر کی بد شکلی دیکھتے دیکھتے اپنا تمسخر بن جاتی ہے
کیسے چھپائیں اس بد شکلی کی یہ ہونی
نہ ہونے کا ننگا قصہ کسے سنائیں
کیسے بے شرمی سے ہم ڈھانپیں ہونٹوں میں رڑکتی گالی
تالو سے لپٹے اس گدلے ذائقے کا رس کہاں اتاریں ؟
(ان کہی باتوں کی تھکن، ص :۱۷)

سرمد صہبائی اندر کی بد صورتی اور لمحہ بہ لمحہ ٹوٹتی قدوں کا حل در اصل روحانی ا ور اخلاقی قدروں میں ڈھونڈتے نظر آتے ہیں ۔ وہ خود کہتے ہیں ۔ " خلقت جب مکرو ر یا کے جبر میں در بند ہوئی تو صوفیوں نے معرفت کا دروازہ کھولا۔ اہل دریا کا لہجہ ترک کیا اور اس خطے میں بہنے والے دریاوں کی مٹی میں گوندھے ہوئے کوزئہ سخن کے لب کلمہ ہُو سے واکیے"۔

سرمد صہبائی کے ہاں تصوف کا گہرا رنگ موجود ہے ۔ اس سلسلے میں ان کی کافیاں ، لوک رس اور واقعاتی نظمیں اہمیت کی حامل ہیں ۔ اس کے علاوہ انہوں نے دیہاتی پس منظر کی عکاسی عمدہ پیرائے میں کی ہے جس کے ذریعے معاصر سنگین حقائق کو علامتی انداز میں منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ "قصہ گاموں کمہار کی گھوڑی کا" ، قصہ دو موہنے سانپ کا اورقصہ با بے بوڑھ والے کی بیٹی کا جیسی نظمیں ان سنگین حقائق کی بھر پور عکاسی کرتی ہیں ۔ ان کا سیاسی و سماجی شعور اور اس حوالے سے مرتب ہونے والی انسان دوستی ملاحظہ ہو۔

یا مو لا یا مرشد!
پھٹی ہوئی تقدیریں اوڑھے
بھوک میں لتھڑے بچے
تیرے نام پر پیسہ مانگیں
یا مولا یا مرشد

(نیلی کے سررنگ، ص:۱۸)

سرمد صہبائی کی نظموں کا مطالعہ کیاجائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی نظموں میں پنجابی صوفی شعرا خصوصاً شاہ حسین، بلھے شاہ اورصوفی شعرا کی فکری رو موجود ہے جوا ن کی روحانی

اور اخلاقی جہت کو نمایاں کرتی ہے۔ اور ان کو ایک انسان دوست شاعر کے روپ میں سامنے لاتی ہے۔

معاصر شعرا اور انسان دوستی ۱۹۸۰سے تاحال(جدیدیت کی توسیع)

معاصر جدید اردو نظم موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے اپنی ایک الگ پہچان اور شناخت کی حامل ہے۔ اس عرصے میں منظر عام پر آنے والے نظم نگار وں کو اپنے پیش رو نظم نگاروں سے مختلف حالات سے دو چار ہونا پڑا۔ ستر کی دہائی کے اختتام تک سیاسی آوزشیں اور نظریاتی و ابستگیاں بہت شدید تھیں ۔ جسکی بنیادی وجہ دنیا کا دو بلاکوں میں منقسم ہونا تھا۔ اس تقسیم کی وجہ سے دنیا جس سرد جنگ کا شکار تھی وہ بالآخر اسی کی دہائی کے اختتام تک اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ افغانستان کی جنگ میں روس کی شکست کو مارکسی فلسفے کی شکست تصور کر لیا گیا۔ یوں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ادیب بھی اپنی نظریاتی وابستگی سے یا تو منحرف ہو گئے یا اپنی ہی ذات کے خول میں سمٹ کر رہ گئے۔ ترقی پسند تحریک پہلے ہی اپنی طبعی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ یوں نظریاتی آویزش اد ب سے اگر یکسر ختم نہیں بھی ہوئی تو اسکی شدت باقی نہیں رہی۔ دنیا کے یک قطبی ہو جانے کی بنا پر سامراجی قوتوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ ایک طرف عراق اور افغانستان کو براہ راست اندوہناک جنگ میں جھونک دیا گیا تو دوسری طرف دنیا بھری میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعے صارف"کلچر کو فروغ دیا گیا ۔

Information technology کے فروغ نے ایک نئی دنیا کو جنم دیا۔ جسکی اخلاقیات کمرشل بنیادوں پر استوار ہوئی ہے۔ اب انسان کی حیثیت انسان سے زیادہ تجارتی شےCommodityکی ہوگئی ہے۔ اس عہد کے نظم نگاروں نے جب تخلیق کو وسیلہ اظہار بنایا توملکی سطح پر بھی حالات کچھ ایسے خوشگوار نہ تھے۔ تیس چالیس برس کے عرصے میں ملک تیسرے مارشل لاء کا شکار تھا۔ حکومتی جبر ہر شعبے میں نمایاں تھا۔ آزادی رائے پر قدغن تھی ا ور اخبارات سنسر کی زد میں تھے۔ مارشل لا ء ختم ہونے کے بعد بھی صورت ِحال میں معمولی تبدیلی ہی آسکی۔

عالمی سطح پر بھی اس عہد میں کوئی ایسی بڑی فکر پیدا نہیں ہوئی جسکے اثرات ادب پر پڑے ہوں ۔ کسی حد تک مابعد جدیدیت کے نام پر اس عہد کے جملہ مسائل کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن تا حال یہ بھی کوئی فلسفیانہ اساس نہیں بنا سکی۔ اس لیے اس عہد میں لکھی گئی نظموں کو جدیدیت کی توسیع قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس کے زیر اثر نظم نگاروں نے اپنے عہد کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کو عالمی تناظر میں دیکھنے، سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش کی اور اپنی انسان دوستی کا ثبوت فراہم کیا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس عہد میں نظم نگار کے شعور نے ایک نئی کروٹ لی ہے ۔ سواس نے اپنے تخیل کو آزاد چھوڑ کر عصری آگہی کے ساتھ جدید مشینی ا ور برقیاتی عہد کے انسان کو موضوع بنایا۔ معاصر نظم کا بنیادی موضوع انسانی روح کا داخلی بحران ہے جو انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس عہد کی دین ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں بھی نظم نگاروں نے پھیلتے ہوئے صنعتی معاشرے کے باعث فرد کی تنہائی اور اقدار کی شکست و ریخت کو موضوع بنایا تھا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس دور کا فرد ایسی تنہائی کاشکا رنہیں تھا جیسا کہ آج کے عہد میں ہے۔ حقیقتاً پچھلے بیس سالوں میں کمپیوٹر، فیکس ،سیلولر ٹیکنالوجی اور میڈیا کی بڑھتی ہوئی طاقتوں نے مردکو یوں اپنا اسیر کر لیا ہے کہ اس کے اجتماعی تصورات اور عقائد، اقدار اور اخلاقیات یکسر تبدیل ہو کر ختم ہو گئی ہیں ۔معاشرے سے انسان دوستی کی اقدار ناپید ہوگئی ہیں ۔ فرد گرد و پیش سے مایوس ہوکر اپنی ہی ذات کی طرف دیکھنے لگا ہے۔ لیکن یہاں بھی محرومی اور داخلی کرب و انتشار کے سوا اسے کچھ نہیں ملتا۔ اس پرمستزاد یہ کہ سرمایہ دارانہ استحصالی نظام کے نت نئے ہتھکنڈے اور جبریت سیاسی عدم استحکام اور لا قانویت و غیرہ اس کے لیے سوہان روح بن گئے ہیں ۔ یہ ایسا منظر نامہ ہے جو اس عہد کے انسان کو شدت کے ساتھ بے چارگی اور بے بسی کا احساس دلا رہا ہے۔ ایسے میں اس کے پاس کوئی اخلاقی و روحانی سہارا بھی نہیں ہے۔ اس عہد میں بین الاقوامی سطح پر بھی زندگی انتشار، خوف اور بے بسی کا شکار ہے۔ دنیا کے یک قطبی ہونے کی بنا پر معلوم نہیں پڑتا کہ کون کس کا دشمن اور کس کا دوست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان پہلے سے زیادہ نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو رہا ہے۔ اس لیے یورپی نظم نگاروں کی طرح اردو نظم نگار بھی دروں بینی کی طرف مائل ہوئے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انسانیت نوار شعرا اپنے عہد کے المیے کو یوں بیان کرتے ہیں جیسے یہ ان کے ذاتی دکھ ہوں ۔

آیئے ان معاصر شعرا کے ہاں انسان دوستی کا رنگ ان کی نظموں میں دیکھتے ہیں ۔

معاصر اردو نظم میں رفیق سندیلوی کا نام اہمیت کاحامل ہے ۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "غار میں بیٹھا شخص" کا مجموعی مزاج اپنے عنوان کی طرح سماجی، ثقافتی اور عصری تناظر میں لمحہ حال کو ماضی کی تہذیبی روایت سے آمیز کر رہا ہے۔

شاہد شیدائی رفیق سندیلوی کی نظم نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

> رفیق سندیلوی کی نظم احساس خیال اور امیج کے مرکب سے جنم لیتی ہے۔ وہ تخلیق کاری کے دوران میں اچھوتے موضوعات چنتا اور ماحول کے مطابق لفظیات کا استعمال کرتاہے۔ اُس نے بہت جلد نظم کی کیمیا دریافت کر لی ہے۔ چھوٹے چھوٹے مصرعے، امیجز کی صورت ، سُبک رفتاری

سے خیال کو آگے بڑھاتے ہیں ۔ اور موضوع اورمتن آپس میں یوں مربوط ہو جاتے ہیں کہ کہ فالتو مواد بھولے سے بھی نظم کے کسی ٹکڑے میں شامل نہیں ہوتا۔ نامانوس فضاا ور اجنبی ماحول سے روشناس کرانا اس کی نظم کا وصف خاص ہے۔ موضوع اور مواد کے ااعتبارسے اس کی نظم نادر یافت منطقوں کا ایک ایسا جہانِ بے نشاں ہے جس میں پہلے کبھی شاید ہی اس کا کوئی ہم عصر (نظم نگار شاعر) اترا ہو۔

رفیق سندیلوی کی نظم "کہیں تم ابد تو نہیں ہو" اس داخلی شکست و ریخت کی عکاس ہے جس کا شکار جدید دور کا ہر حساس انسان ہے۔ یہ نظم نہ صرف مادی معاشرے میں وجود کی لایعنیت کا اعلامیہ ہے بلکہ اپنے اصل کی تلاش کی آرزو بھی ہے۔

کہو کون ہو تم
دھند آلود کہنہ پہاڑوں میں
اندر ہی اندر کو جاتا ہوا راستہ تو نہیں ہو
وہی رنگ ہو
جس سے رنگ اور آمیز ہوتا نہیں
بے نمو جھیل جس میں پرندہ کوئی
اپنے پر تک بھگوتا نہیں
کون ہوتم بتاؤ، بتاؤ
کہیں ملبۂ وقت پر
نیستی کے اندھیرے میں بیٹھے ہوئے
روز اول سے اجڑے ہوئے
بے سہارا مکیں تو نہیں ہو
کہیں تم فلک سے پرے
یا ورائے زمیں تو نہیں ہو

(غار میں بیٹھا شخص، ص: ۲۵، ۲۶)

رفیقؔ سندیلوی کے خیال میں انسان اپنے ظاہری خدوخال میں حسن وجمال کا پیکر ہے۔ لیکن اس کی ذات میں خیر کا پہلو ہے یا شرکا پہلو زیادہ ۔ وہ نیکیوں کی تصویر ہے یا برائیوں کا مجسم۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش میں انسان دولت رفیقؔ سندیلوی نے بھر پور کردار ادا کیا ہے۔ ان کی نظم "میں نہیں جانتا" کے اشعار دیکھئے جس میں انہوں نے ان سوالات اور الجھاو کو اس انداز میں بیان کیا ہے۔

میں نہیں جانتا
اس ناف میں کیچڑ ہے کہ کستوری ہے
یہ مرے فہم کی مجبوری ہے
حسن میں ایسی کشش ہے

کہ طنابیں دل کی
لمحہ در لمحہ کھینچی جاتی ہیں
چوکڑی بھرتا ہوا رنگ
ہدف پر ہے
خدنگِ وحشت
چشم مخمور میں صدیوں سے
کماں بستہ ہے
میں نہیں جانتا
یہ ریت کا دریا ہے
کہ پھولوں سے بھرا رستہ ہے
(غار میں بیٹھا شخص، ص:
۱۱۱،۱۱۲)

انسان دوست رفیق سندیلوی اپنے عصری ماحول کی آلودگی پر فریاد کناں ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "مگرمچھ نے مجھے نکلا ہوا ہے" قابلِ توجہ ہے۔ جس میں شاعر اپنی ماں سے مخاطب ہو کر عصری ماحول کی آلودگی کا شکوہ کرتا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ انسان ماں کے بطن سے اس دنیا میں تو آجاتا ہے لیکن یہ دنیا رویوں کی آلودگی سے بھری ہوئی ہے۔ جہاں قدم قدم پر مشکلات اور مصائب انسان کا پیچھے کرتے ہیں ۔ شاعر اپنے دوسرے جنم کے انتظار میں ہے جب وہ کسی کشادہ اور تازہ فضا میں زندگی کی شروعات کرے گا۔

پانی کا گہرا شور ہے
اندر بھی ، باہر بھی
برہنہ جسم سے چمٹے ہوئے ہیں
کائی کے ریزے
مجھے پھر سے جنم دینے کی خاطر
زچگی کے اِک کلاوبے نے
اگلنے کے کسی وعدے نے
صدیوں سے
مجھے جکڑا ہوا ہے
ماں
مگر مچھ نے مجھے نگلا ہوا ہے!
(غار میں بیٹھا شخص، ص:
٦٥)

رفیقؔ سندیلوی گمبیھر معاشی مسائل کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بناتے ہیں ۔ وہ عام لوگوں کے دکھوں اور مسائل کو خوب سمجھتے ہیں ۔ ان کے خیال میں ایک غریب انسان نسل در نسل قیدِ معاش کا شکار ہے۔ وقت سائیکل کے پہیے کی مانند اپنا سفر تیزی سے طے کرتا جاتا ہے اور انسان کی مخدوش حالت میں کوئی بہتری دکھائی نہیں دیتی۔ وہ مجبوری

ولا چاری کی تصویر دکھائی دیتا ہے۔نظم"قبر جیسی کھاٹ میں " انسان کی مخدوش حالت کی غماز ہے۔
اشعار دیکھیے۔

پیٹ پاپی پیٹ نے روٹی طلب کی
دال، پتلا شوربا
جس میں سر اسر ذائقہ مفقود تھا
بس تیز دندانوں کی چرخی گھومتی تھی
سینکڑوں گونگے پرندے
ایک حد میں پھڑ پھڑاتے تھے
ازل سے ہست کا یہ کارخانہ چل رہا تھا
شفٹ پہلی ختم ہونے کو تھی
آگے دوسری تیار تھی
پہیم گراری چل رہی تھی
دائرہ اک سائیکل
میں سائیکل پر ڈولتا
محصور تنگ وتار گلیوں
اور رستوں کے بھنور سے بچ بچا کے
تین بائی پانچ فٹ کی
قبر جیسی کھاٹ میں پہنچا
جہاں اک خواب میرا منتظرتھا!

(غار میں بیٹھا شخص، ص: ۴۲)

بقول ڈاکٹر وزیر آغا !"فی الوقت اردو نظم کے میدان میں رفیق سندیلوی ایک بھر پور اور بے حد توانا آواز کی حیثیت رکھتا ہے" رفیق سندیلوی کی نظم "توتتلی تھی" میں انسان کے اس درخشندہ ماضی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جب وہ فطرت کا دلدادہ تھا اور اس کے رویوں اور باتوں میں پھلولوں جیسی نرمی اور نزاکت پائی جاتی تھی۔ انسان کا کام تتلی کی مانند ہر طرف خوشیاں اور رنگ بکھیرنا تھا۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی رویوں میں بھی تبدیلی آگئی ہے اور انسان تتلی کی بجائے سانپ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ جس کا کام دوسروں کو ڈسنا اور تکلیف پہنچانا ہے۔

تو تتلی تھی
چھوٹی سی ایک بھنبھیری تھی
ترے فرغل میں ہر رنگ تھا
تیرے سنگ تھا
موسم
پھول ترے متوالے تھے
ترے گرد سنہری ہالے تھے!
تنکے کی طرح

کس آندھی نے
تجھے رکھا اپنے ہاتھ پہ
ماری پھونک
اکھاڑے پتوں کے خیام
پروں کے پیراہن میں
کس نے لگادی آگ
بتا کب بیضہء خواب کو ٹھونگ لگی
(غار میں بیٹھا شخص، ص: ۱۱۷، ۱۱۸)

رفیقؔ سندیلوی کی نظموں کے بیشتر کردار یاسیت اور قنوطیت کا شکار دکھائی دیتے ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں امید اور رجائیت کا پہلو بھی موجود ہے۔ ان کی نظم "پانی کا سرمایہ" امید اور یقین کی بھرپور عکاس ہے۔ جس کا مرکزی کردار صبح اٹھنے پر نلکے کا پانی اترا دیکھ کر مایوس نہیں ہوتا بلکہ کوشش کرکے کہیں سے پانی لا کر نلکے میں ڈالتا ہے اور ہتھنی چلاتا ہے تو پانی اوپر آجاتا ہے۔

لرزتی موج
انوکھا لمس
کوئی دوسری تعبیر
منظر اور ہی دنیا کا
باطن کو جگاتا ہے
نیا پانی
کہیں سے مل ہی جاتا ہے
نیا پانی کہیں سے لاکے
نلکے میں انڈیلا
تو وہ پانی نیچے جاکے
مسکراکے
تہ کے پانی سے ملا
اور اس کو اوپر کھینچ لایا
زندگی میں
ختم ہو سکتا نہیں
پانی کا سرمایہ
(غار میں بیٹھا شخص، ص: ۱۸۶،۱۸۷)

بقول ستیہ پال آنند!
رفیق سندیلوی کی نظمیں بہت تازہ دم ہیں ۔ شاعر کو نظم کے آخر تک اپنے جذبوں کو جیسے ہتھیلی پر کانچ کی گڑیا کی طرح رکھ کر سنبھالنے کا ہنر آتا ہے۔ اسے زبان کی تخلیقی رو پر قد غن لگانے کا ہنر بھی آتا ہے۔ جو بہت سے شاعروں کا کمزور پہلو ہے۔ یہ سب نظمیں ایک بے حد گہرے

اورپہنچے ہوئے شاعر کی نظمیں ہیں ۔ یہ من وتُو ، خیرو شر، شریر اور آتما میں تگ ودو کی ایسی نظمیں ہیں جن میں Inner Selfکی سطح پر تجربات کا شعری اظہار کیا گیا ہے------ یہ شاعر ذہنی طور پر سادھووں ، سنتوں اور پیروں فقیروں کی سنگت میں بیٹھنے کا اہل ہے۔
انسان دوست جاوید انور عالمی آقاؤں کے خلاف آواز بغاوت بلند کرتے ہیں ۔ ترقی یافتہ ممالک کے یہ حکمراں خود کو زمانے کا آقا بنائے بیٹھے ہیں ۔ جاوید انور کی نظم "فلسیطنی جلاوطن کا گیت" میں زمینی خداؤں کے جبرو استبداد کی بھیانک تصویر کشی عمدہ پیرائے میں کی گئی ہے۔

خدا اگر ہے تو آکے دیکھے
زمیں خداؤں سے بھر گئی ہے
زمیں خداؤں میں بٹ رہی ہے
ہماری آنکھوں پر اپنے حصے کے پھول تکنا بھی جرم ہے
ان گھروں میں رکھی صراحیاں ہم کو رو رہی ہیں
کہ جن کے دروازے ہم پر کھلتے ہیں تو دھماکے
چھتوں کو فرشِ اداس ترکے سپرد کرتے ہیں
آنسوؤں کا ہجوم ہے اور ہم
کہ رونا بھلا چکے ہیں

(شہر میں شام، ص: ۹۸)

انسان دوست جاوید انور اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ عالمی آقاؤں کی سازش کا جال کس طرح غریب ممالک میں تیزی سے سرایت کر چکا ہے۔ جس کے باعث غریب کی زندگی مزید دکھوں اور غموں میں کھِر چکی ہے۔ اس بے بسی اور لاچاری کی تصویر ان کی نظم "ریچھ یوں ناچتا ہے" کے کردارو ں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

مجھ کو معلوم ہے
تار پر چلنے والی حسینہ کی یہ مسکراہٹ فقط
اس کے ہونٹوں پر کیوں
آنکھ میں کیوں نہیں
اور تماشائی کیوں
اس قدر زور سے
تالیاں پیٹتے ہیں کہ چولہوں پہ رکھی ہوئی
بیویاں
صرف بستر کی چادر بدلتی ہیں کپڑے بدلتی نہیں

(اشکوں میں دھنک ، ص: ۳٦)

انسان دوست جاوید انور نے اپنی نظموں کے ذریعے انسان کی سماجی حیثیت کو بھی واضح کرنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ نچلے طبقے کے افراد جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں ۔ لیکن اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کی جرات نہیں کرسکتے۔ ان کی سوچ اور فکر کو پابندِ سلاسل کردیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں "بھونک" اور "بولتا کیوں نہیں " میں معصوم بچے کا کردار دراصل نچلے طبقے پر چپ کی حکمرانی کو ظاہر کرتا ہے۔ شاعر معصوم بچے سے بار بار سوال کرتا ہے کہ وہ لب کیوں نہیں کھولتا اور آخر چپ کیوں ہے۔

دیکھتا کیوں نہیں آج بازار میں جشنِ افلاس ہے
شہر کی بھوک چوری ہوئی
اور خبروں نے اخبار گم کردیا
لوگ روتے رہے
لوگ ہنستے رہے
تیرے بستر پہ اشکوں کی چمپا کھلی
اور تو چپ رہا
تیرے ماتھے پہ مسکان کا عطر چھڑ کا گیا
اور تو چپ رہا!
میری ہنڈیا جلی
میرا چولہا بجھا
میری جھولی سے حرفِ دعا گر گیا
میرے بچے تو لب کھولتا کیوں نہیں
بولتا کیوں نہیں

(شہر میں شام،ص:
۱۳)

جاوید انور کی نظمیں میں معاشرتی شناخت کے گم ہونے کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ نوجوان جو رزق کی تلاش میں اپنے وطن کی مٹی کو چھوڑ کردیارِ غیر میں پناہ ڈھونڈتے ہیں ۔ کس طرح اپنی پہچان اور شناخت کو گم کر بیٹھتے ہیں اور اجنبی لوگوں کی سر زمین پر اجنبیت کے کرب اور دکھ کو محسوس کرتے ہیں ۔

سات سمندر پیچھے گھر اور ڈھلتا دن
بے منزل رستوں کا سفر اور ڈھلتا دن
کھیت میں بے رزقی کے خواب اور تعبیریں
اپنے خون سے بوجھل پر اور ڈھلتا دن
سڑکوں پر اک گونگا شور اور تنہا میں
سر کے بوجھ سے جھکی کمر اور ڈھلتا دن
پھٹتی خالی جیبیں اور مردہ آنکھیں
بھوک شکنجے میں یہ نگر اور ڈھلتا دن

پھٹنے کو ہے دل وہ نا آسودگیاں
گھر جانے کی خواہش ڈر اور ڈھلتا دن
(شہر میں شام، ص:
۱۱۶۔۱۱۷)

جاویدانور ظلم کےخلاف آواز بلند کرتے ہیں او ر معاشرے میں عدل کے خواہاں ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں "کربلا سے امام باڑے تک " اور "اشکوں کی دھنک" قابلِ توجہ ہیں ۔ ان کے ہاں یہ احساس نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے کہ بڑی بڑی نامور ہستیوں نے عدل و انصاف کا جو پیغام عام کیا اس پیغام کی جھلک ہماری عملی زندگیوں میں کہیں دکھائی نہیں دیتی ۔ ہر طرف ظلم وبر بریت کا راج دکھائی دیتا ہے۔ ایسی صورتحال میں یہ سوال بہت اہم ہے کہ ظلم کا تسلسل کیسے روکا جائے ؟ انسان کو ان تاریکی کے اندھیروں سے کیسے باہر لایا جائے۔ انسان ظالم کے بنجوں سے کس طرح چھٹکارا حاصل کرے۔؟جاوید انور کی نظم "اشکوں کی دھنک" اپنے اندر مذکورہ سوالات کو سمیٹے ہوئے ہے۔

اس برف کی تہوں میں
ان سورجوں کا گریہ
سیلاب کب بنے گا
یہ ریت کب ڈھلے گا
ان خشک ٹہنیوں میں
مہ تاب کب بنے گا
صدیوں کا بوجھ اٹھائے
صدیوں سے منتظر ہیں
قرطاسِ احمریں پر
دھبے سے روشنی کے
لاریب یہ رسالت
لاریب یہ صحیفے
لیکن ترے اجالے
دیمک ہی چاٹتی تھی
دیمک ہی چاٹتی ہے
(اشکوں میں دھنک، ص:
۹۷،۹۸)

جاوید انور اپنی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔
مجھے یہ آہنگ اور یہ ڈرامہ جو میری شاعری ہے اسی زندگی کے ڈسٹ بن سے ملے جو میں گزار رہا ہوں ۔ ان گلیوں ، سڑکوں ، ہسپتالوں ، سکولوں کتابوں ، اخباروں اور بظاہر انتہائی معمولی چیزوں سے میری نظموں نے مجھے پکارا اور میں نے انہیں کاغذ پر رکھ دیا۔ کسی بڑے

بناؤ سنگھار کے بغیر کہ لفظ میرے لیے کھلونے نہیں اور
میں زندگی بھرے ان لفظوں کو لکڑی، لوہا یا پتھر سمجھ کر
آری اور ہتھوڑا نہیں چلا سکا، نظم نہیں بنا سکا۔

افضال احمد سید کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں انسان روستی کی جھلک نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ انسان جس میں اللہ تعالیٰ نے تخلیقی جوہر چھپا رکھا ہے۔ اس کرہ ارض پر اسکی تخلیقی صلاحیتوں پر جگہ جگہ پابندیاں عائد کر کے اسکو ناکارہ اور بیکار بنانے کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔ نظم" مٹی کی کان" میں نسل در نسل انسانوں کے بننے اور بگڑنے کا عمل دکھانے کے لیے مٹی کی کان کی تمثال تراشی گئی ہے۔ اس نظم میں مختلف کر دار مختلف انسانی رویوں کے عکاس ہیں ۔ کان میں کام کرنے والوں مزدوروں پر ظالم و جابر قوتوں کا ظلم و ستم ان کی سفا کی کا منہ بولتا ثبو ت ہے۔ ان مزدوروں پر کان میں آنے سے پہلے پانی پینے پرپابندی عائد ہے۔ گویا ان مزدوروں پر زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا گیا ہے اور وہ مجبوری و لاچاری کی مجسم تصویر بنے بیٹھے ہیں ۔

اگر نگرانوں کو معلوم ہو جائے
کہ ہم نے مٹی کی کان میں آنے سے پہلے پانی پی لیا تھا
تو ہمیں شکنجے میں الٹا لٹکا کر
سارا پانی نچوڑ لیا جاتا ہے
اور پانی کے جتنے قطرے بر آمد ہوئے ہیں
اتنے دنوں کی مزدوری کاٹ لی جاتی ہے

(مٹی کی کان، ص :٢٧)

کان میں کام کرنے والا مزدور دراصل اس انسان کی تشکیل کا متمنی دکھائی دیتا ہے جو کان میں کام کرنے کی محنت و مشقت سے آزاد ہو۔جسے زمانے کا کوئی دکھ نہ ہو۔ گویا اس کی آنکھوں میں ایک پورے انسان کے خواب دکھائی دیتے ہیں ۔ جنہیں وہ حقیقت کا روپ دینا چاہتا ہے۔

ایک دن میں اپنی مرضی کا ایک پورا آدمی بناوں گا
مجھے اس پورے آدمی کی فکر ہے
جو ایک دن بن جائے گا
اور مٹی کی کان میں مزدوری نہیں کرے گا

(مٹی کی کان، ص:٦٩)

افضال احمد سید کو اس بات کا افسوس ہے کہ کاروباری اقدار انسانی وجود کی سلامتی و بقا کے لیے اسے رزق تو فراہم کر دیتی ہیں لیکن اسے تہذیبی ابدیت سے ہمکنار کرنے سے قاصر رہتی ہیں جو صرف تخلیقی قدروں کا طرہ امتیاز ہے۔ کاروباری اقدار کو اختیار کر کے انسان نسل درنسل مٹی کی اس کا ن میں مزدوری کرنے پر مجبور ہے اور اسی مجبوری و لا چاری کے ہاتھوں اپنے نگرانوں کا ہر جبرا اور ظلم برداشت کر رہا ہے۔

سورج کا سایہ میری چھتری سے چھوٹاہو گیا
میں نے چھتری بیچ دی
اور ایک روٹی خرید لی
کسی بھی تجارت میں آخری سودا ہوتا ہے
ایک رات
یا کئی راتوں کے بعد
جب وہ روٹی ختم ہو گئی
میں نے نوکری کر لی
نوکری مٹی کی کان میں ملی
(مٹی کی کان، ص:۳۳)

افضال احمد سید کی ایک نظم "جتنی دیر میں روٹی پکے گی " کے اشعا دیکھیے جس میں مادی سر گرمیوں پر تخلیقی رحجانات کی اہمیت و فوقیت ظاہر ہوتی ہے۔

جتنی دیر میں ایک روٹی پکے گی
میں تمہارے لیے ایک گیت لکھ چکا ہوں گا
جتنی دیر میں ایک مشکیزہ بھر ے گا
تم اسے یاد کر کے گا چکی ہو گی
(مٹی کی کان، ص:۱۲٦)

افضال احمد سید اپنی نظموں میں اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں کہ ایک انسان تخلیق کارکی حیثیت سے اپنی ساری زندگی بادشاہوں کی مرضی ومنشا کے مطابق کام کرتا ہے اور بعض اوقات ایسے کام بھی کرتا ہے جو اس کے ضمیر پر بوجھ ہوتے ہیں لیکن مجبوری کے ہاتھوں اسے یہ سب کام کرنے پڑتے ہیں ۔ کبھی ایک مزدور کی حیثیت سے ، کبھی ایک کسان کی حیثیت سے، کبھی ایک استاد کی حیثیت سے۔ نظم "پا گل کتے کا نوحہ" میں انسانی ضمیر پر اسی بوجھ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اشعار دیکھیئے۔

ایک مزدور کی حیثیت سے
میں نے زہر کی ایک بوری
اسٹیشن سے گودام تک اٹھائی
میری پیٹھ ہمیشہ کے لیے نیلی ہو گئی
ایک شریف آدمی کی حیثیت سے
میں نے اپنی پیٹھ کو سفید رنگو الیا
ایک کسان کی حیثیت سے
میں نے ایک ایکٹر زمین جوتی
میری پیٹھ ہمیشہ کے لیے ٹیڑھی ہو گئی
(مٹی کی کان، ص
:۱۰۰)

افضال احمد سید اپنے اردگرد ہونےو الے ظلم و ستم اور اقدار کی پا مالی کو دیکھ کر انسانی وجود کو فراموش کر دینے کی تجویز پیش کر تے

ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم" ہمیں بھول جانا چاہیے" کے اشعار اس خیال کے بھر پور عکاس ہیں ۔

ہمیں بھول جانا چاہیے
اُسی ملبے سے
جس کا نام دل ہے
کسی کو زندہ نکالا جا سکتاہے
ہمیں کچھ لفظوں کو بھول جانا چاہیے
مثلاََ
بنی نوعِ انسان

(مٹی کی کان،ص:۲۱۰)

نصیر احمد ناصر کا شمار ان معاصر نظم نگاروں میں ہوتا ہے جن کا تخلیقی سفر تا حال جاری و ساری ہے۔ ان کے تین آزاد نظموں کے مجموعے "پانی میں گم خواب "، "عرابچی سو گیا ہے" اور" ملبے سے ملی چیزیں " منظر عام پر آچکے ہیں ۔ انسان دوست نصیر احمد ناصر اپنے اردگرد بپا آشوب سے پوری طرح آ گاہ دکھائی دیتے ہیں ۔ نظم "دھند کے پار "کے اشعار دیکھیے جس میں سارا شہر فائرنگ، دھماکوں ، سائرن اور شعلوں کی زد میں دکھائی دیتاہے۔ انسان دوست نصیر احمد ناصر اس کرب کی عمدہ تصویر کشی کر تے ہیں ۔

شہر بھر میں
فائرنگ، زخمی، دھماکے ، سائرن
شعلے
دھوئیں کے آبنوسی دائرے
جلتے تناظر
آگ میں لپٹی کتابیں
لائبریری کی عمارت
میوزیم
تصویر کی آنکھوں میں آنسو
سلسلہ در سلسلہ سہمی ہوئی
اطراف میں
اعضاء بریدہ زندگی
سر گشتگی افکار کی ، غارت گری الفاظ کی
تازہ لہو تاریخ کے اوراق پر

(پانی میں گم خواب ، ص:۱۲۴،۱۲۵)

نصیر احمد ناصر کی نثری نظموں کا مجموعہ "تیسرے قدم کا خمیاز" اس لحاظ سے قابل توجہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوتِ متخیلہ سے کام لیتے ہوئے اپنے اردگرد بکھرے آشوب کو تمثالوں کے ذریعے ایک نئے شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ اس سلسلے میں نظم "کتابوں میں

زندگی تلا ش کرنا بے سود ہے "کے اشعار معاشرتی آشوب کے غماز ہیں -

کتابوں کے صفحات میں
تہذیبیں عروج و زوال سے ہمکنار ہوتی رہتی ہیں
اور متن سے باہر حاشیوں میں
ایک نیا ورلڈ آرڈر جنم لیتا ہے
اور کسی بحث اور اندراج کے بغیر
اقوام عالم ایک نئے یک نقاطی ایجنڈے پر متفق ہو جاتی ہیں
جس کے تحت
بلٹ پروف جیکٹس
اور اندھیرے میں دیکھنے والے گاگلز پہنے ہوئے میرنیز
دہشت گردوں کا پیچھا کرتے ہیں
خواب گاہوں ، اسکولوں
مسجدوں ، لائبریریوں اور عجائب خانوں میں گھس جاتے ہیں
اور جب ہزاروں لاکھوں روحیں جسموں سمیت پامال ہو جاتی ہیں
تو امن افواج
قیمتی انسانی جانوں کو بچانے کے لیے
مفت غذائیں پیکٹس ، پانی اور دودھ کی بوتلیں
اور اپنی طبع کی ہوئی کتابیں تقسیم کرتی ہیں
تا کہ کیمپوں میں خوراک اور تعلیم کی قلت نہ ہو
اور قاتل ملکوں کی معیشت اور ثقافت قائم رہے
(تیسرے قدم کا خمیازہ، ص:۵۹)

سعیدا ابراہیم نصیر احمد ناصر کی نظم نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں -

کم و بیش چار دہائیوں پر محیط نصیر احمد ناصر کی ادبی زندگی کسی بھی قسم کی منفی ادبی سماجیات، ستائشی تقریبات اور رونمائیوں سے بے نیاز حقیقی معنوں میں تخلیقی سچائی کی آئینہ دار ہے۔ نصیر احمد ناصر کی نظموں میں نہ صرف روح عصر رواں ہے بلکہ ان میں کئی صدیاں سانس لیتی ہیں -

انسان دوست روش ندیم کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں سماج کے خلاف حزن، ملال اور احتجاج کا رنگ نظر آتا ہے۔ ایٹمی بستی میں فطرت کا اصل چہرہ مسخ ہو چکا ہے۔ شاعر اگر فطرت سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش بھی کرے تو اسے یہ احساس دا من گیر ہے کہ فطرت کے حقیقی چہرے کی بازیافت کیسے کی جائے جو یقیناً اب ممکن نہیں رہی۔ ایسے میں شاعر ان عوامل کی طرف متوجہ نظر آتا ہے جن کی بنا

پر فطرت کا حسن باقی نہیں رہا۔ سو وہ پرندوں سے معذرت خواہ نظر آتا ہے۔

کہ جب سے شہر کے لوگوں نے
اپنے سائبانوں کے لیے خود چھتریاں ایجاد کرلی ہیں
وہ کہتے ہیں
ہمیں پیڑوں کی چھاوں
یا تمہارے گھونسلوں سے کیا؟
ہمیں تو جون کے سورج بھی اب کچھ کہہ نہیں سکتے
ہم اک کمزور سی شے سے
ذراسی آکسیجن مانگنا ذلت سمجھتے ہیں
سنو یارو
ابھی کل تک
یہی انسان ہرے پیڑوں کی شاخوں پر
اچھلتا کودتا جیون بتاتا تھا
مگر جب اس نے اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہونے کا فن سکیھا
تو اپنے ہاتھ میں کلہاڑیاں لے لیں
سنا ہے
اب وہ اپنے مبدوں کو کاٹ کر بندوق کے دستے بناتا ہے
پرندو! درگزر کرنا
تم اہل دل ہو
پیڑوں سے ابھی تک پیار کی رسمیں نبھاتے ہو
(ٹشو پیپرپہ لکھی نظمیں ،
ص:۱۴،۱۵)

روش ندیم کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ گھمبیر معاشی مسائل کے باعث انسانی زندگی کرب و ابتلا کاشکار ہے۔تلاش معاش کے چکر اور تنہائی کے احساس نے انسانی شناخت کا مسئلہ پیداکر دیا ہے۔ ان کی نظم "آکاس بیل" انسان کی پہچان کی گم شدگی کا نوحہ بیان کرتی نظر آتی ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

میں اکثر سوچتا رہتا۔۔۔!
یہ دنیا کیسی دنیا ہے
جہاں لوگوں کو دفتر کے جھمیلوں سے فراغت ہی نہیں ملتی
سویرے چائے میں اخبار کے کالم بھگو کر ناشتہ کرنا
پھر اس کے بعد دن بھر فائلوں پر بیٹھ کر
دریائے فردا کے نئے گمنام ساحل ڈھونڈتے رہنا
اور آخر ڈوبتے سورج کی کرنوں پر گئے دن کی
خباثت تھوک کر گھر لوٹنا اور سوچنا۔۔ ہم کون ہیں ؟
(ٹشو پیپرپہ لکھی نظمیں ،
ص:۲۱)

نظم"نقطہ انجماد سے گرا وقت "کے اشعار دیکھیے جس میں انسان دوست روش ندیم نے وقت کا تصور ایک منفر د انداز میں پیش کیا ہے۔

مرے اس شہر میں اب بھی
وہی صبحیں وہی شامیں
وہی اخبار کی سرخی
جو صدیوں سے پرانی ہے
مناروں سے تلاوت گونجتی ہے
ہاتھ اٹھتے ہیں
پیمبر چیختے ہیں وعظ کرتے ہیں
مگر لوگوں کے چہروں سے ذرا بھی شب نہیں چھٹی
مسیحا آج بھی سولی پر لٹکا ہے
--- اتر آئے تو دن نکلے
یہاں پر سب دعائیں سرخ فتیوں میں مقید ہیں
پرانی چادروں کی سلوٹوں میں نظم روتی ہے
(ٹشو پیپر پہ لکھی نظمیں
،ص:۵۱،۵۲)

بقول ڈاکٹر نوازش علی!

روش ندیم اپنی نظموں میں فلسفیانہ مسائل پر غور وفکر کرتا دکھائی دیتا ہے ۔اس نے ایسے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں جو بڑے ادیبوں کے ہاں نظر آتے ہیں ۔ ان میں وقت کا اچھوتا تصور پیش کیا گیا ہے یہاں نہ صرف وقت کے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش یاوقت کے اثرات کا ذکر ہے بلکہ جدید زندگی کے تصنع سے گھبرا کر فطرت کی طرف رجوع اور ماضی و حال کا تقابل بھی ہے۔

روش ندیم اپنی نظم "دکھ دبے پاوں آسکتا ہے" میں ظالم و مظلوم کے رویوں کی بہترین تصویر کشی کرتے ہیں ۔اسی طرح نظم "شہر مسلسل کھانس رہا ہے" میں معاشرے کے اجتماعی دکھوں کی تصویر ایک فرد کی صورت میں پیش کی گئی ہے۔ شہر کو ایک بے رحم ڈائن نے فریزر میں رکھا ہوا ہے یہاں فریزر پورے سماج کے نظام کے منجمد ہونے کی علامت ہے اور ڈائن معاشرے کے وہ ساحرو ستم گار ہیں جو کسی طرف سے نئی سوچ کی حدت کو شہر میں داخل نہیں ہونے دیتے۔

ذیشان ساحل کا شمار جدید اردو نظم نگاروں میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنی سادگی، پر کاری اور خیال کی خوبصورتی سے نظم کو ایک نیا لہجہ عطا کیا ہے۔ انسان دوست ذیشان ساحل کی نظموں کے مجموعوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی نظمیں عصری آشوب کی بہترین عکاس ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم" دوست" قابلِ ذکر ہے۔ جس میں انہوں نے محض کراچی شہر کی منظر کشی نہیں کی بلکہ ہماری پوری عصری صورت ِحال کی بہترین غماز ہے۔ ذیشان ساحل

نے اس انتشاری کیفیت کو موضوع بحث بنایاہے جسکی ذمہ داری اس کے اپنے ہی مکینوں پر ہے اور ہر جدید شہر کا یہی المیہ ہے۔

میں بہت اکیلا ہوں
تم مجھ سے دوستی کر لو
شہر آتا ہے
اور اپنے ہاتھ ہماری طرف پھیلا دیتا ہے
ہم اس کے ہاتھوں کو دیکھتے ہیں
اور ڈر جاتے ہیں
شہر کے ہاتھ کہنیوں تک
جلے ہوئے ہیں

(کراچی اور دوسری نظمیں ،
ص:٣٤)

ذیشان ساحل معاشرے میں پھیلے ہوئے خوف اور ڈر کو بھی عمدہ پیرائے میں بیان کرتے ہیں ۔ اپنی نظم"کار" میں وہ گھٹن زدہ اور استحصال کے شکار معاشرے میں بچوں کے چہروں سے ہنسی اور مسکراہٹ کا غائب ہو جانا جس دکھ اور درد کے ساتھ بیان کرتے ہیں یہ درحقیقت خوف کی ان شدید تر کیفیات کی عکاسی کر رہا ہے جواب ہمارے عصر کی شناخت بن گئی ہیں ۔

انسانیت کے ہمدرد ذیشان ساحل کی نظر ان پسماندہ علاقوں اور گاؤں کے خستہ حال لوگوں کی طرف بھی اٹھتی ہے جو ظلم و ستم کی چکی میں پستے ہوئے اپنی زندگی کے دن پورے کرنے پر مجبور ہیں ۔ وہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں ۔ جس نے امیر اور غریب طبقات کو جنم دیا ہے اور یوں دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ گئی ہے اور امیر لوگ تمام غریب لوگوں کی زندگیوں کے مالک بن بیٹھے ہیں ۔

ایک گھر کے لوگ
دوسرے گھر کے لوگوں کو
دیکھ رہے تھے
دریا میں رہنے والی مچھلیاں
کہیں غائب ہو گئیں تھیں
کنویں کے مینڈک
ہر طرف ٹرا رہے تھے
رات کی خاموشی
جھینگروں کے شور سے بھری تھی
تتلی کے پروں کا غم
سیاہ پتھر کے فرش میں
جذب ہو چکا تھا
رسی پر پھیلی چادریں
ہوائیں اڑا رہی تھیں

انہیں رسی سے اتار کر گھر تک لانے والی عورتیں
خود کو نہ بچا سکیں
اور بچے اپنی ہنسی کو
(کراچی اور دوسری نظمیں
،ص:٤٦)

نظم "تمہارا گاوں " کے اشعار دیکھیے جس میں گاوں کے لوگ بے بسی اور لاچاری کی مجسم تصویر بنے بیٹھے ہیں ۔ ان کی آنکھیں آنسووں سے نم ہیں ۔ گاؤں کے بچے کوڑے کے ڈھیر پراپنا بچپن تلاش کرتے ہیں ۔ لیکن مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ہر طرف بھوک اور افلاس اپنا ڈیرہ جمائے ہوئے ہے۔ انسان دوست ذیشان ساحل اس مجبوری ولاچاری کو یوں الفاظ کے قالب میں ڈھالتے ہیں ۔

میں اپنے شہر میں رہتا ہوں
اور تمہارے گاوں کو نہیں جانتا
گاؤں کے لوگوں کو بھی نہیں
گاوں میں رہنے والوں کی آنکھوں میں
کتنے آنسو بھرے ہیں
یا ان کے دلوں میں
کتنا دھواں جما ہوا ہے
مجھے کچھ نہیں پتا
گاوں کی عورتیں
ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے
کوئلے جمع کرتی ہیں یا لکڑیاں
گاوں کے بچے
کوڑے کے ڈھیر میں
ٹوٹے ہوئے کھلونے تلاش کرتے ہیں
یا بسکٹ کے ڈبے؟
مجھے ان سوالوں سے کوئی دلچسپی نہیں
(نیم تاریک محبت،
ص:٢٢،٢١)

ذیشان ساحل سامر اجی قوتوں کی مکاری و عیاری کا پردہ بھی چاک کرتے ہیں ۔ ان سامراجی قوتوں نے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی خاطر کس طرح چھوٹی چھوٹی اقوام کو تباہی و بر بادی کے دہانے پرلا کھڑا کیا ہے۔ نظم" سینٹ اسامہ"کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں ۔

یہ بھی یاد نہیں کہ بچے آخری بار
کب اسکول گئے
قدم قدم پہ کانٹے اور بارودی سرنگیں بچھیں ہوئی ہیں
جن کو ناکارہ کرنے کے سارے منتر
ہاتھوں میں بندوق اٹھا کے
سینٹ اسامہ بھول گئے

(ای میل اور دوسری نظمیں
،ص:۱۰٦)

انسان دوست ذیشان ساحل معاشرے میں پھیلے ہوئے انتشار، ڈر، خوف اور سامراجی قوتوں کی پھیلائی ہوئی درندگی دیکھ کر امن و سکون کے طلب گار نظر آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے یوں دعا کرتے ہیں کہ اس دھرتی کو امن کا گہوراہ بنادے۔ جہاں محبتوں کے پھول کھلیں ۔ انسان دوستی اور پیار ومحبت کی فضا عام ہو اور ہر ایک انسان کی جھولی دکھوں سے خالی ہو۔ اشعار دیکھیے۔

اے خدا لم یزل
ہر نظر میں خواب رکھ
کیا زمین کیا فلک
حدِ آب و تاب رکھ
انتشارِ حسن میں
حسن انتخاب رکھ
خاروخس سمیٹ لے
ہر طرف گلاب رکھ
دل کے طاقچے نہ دیکھ
جو ہے بے حساب رکھ
اپنی بار گاہ میں
سب کو بار یاب رکھ

(نیم تاریک محبت،ص:۸۱)

محمد خالد اختر ذیشان ساحل کی نظم نگاری پرر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

ذیشان کی شاعری کا لہجہ دھیما اور درد مندانہ ہے۔ الفاظ سادہ اور آسان ہوتے ہیں اور بیان میں کوئی ایسا پیچ یا ابہامِ نہیں ہوتا جسکی تعبیر کی حاجت پیش آئے۔ حقیقتاً اسکی شاعری میں فن کاری اور کاریگری کا دخل نہیں ۔ وہ صحیح معنوں میں ایک قدرتی شاعر ہے۔ شعر لکھنا اس کے لیے اتنا ہی فطرت کے مطابق ہے جتنا تِیتری کے لیے اس کے پنکھوں تلے کے نقش و نگاراسکی شاعری پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے ایک بلبل شاخ گل پر بیٹھا تا نیں اڑتاجا رہا ہو۔۔۔ میں سمجھتاہوں کہ ذیشان کی شان کی شاعری کرناکوئی آسان بات نہیں ۔ اسے غالباً اس سادگی، اس خوبصورتی، اس سحر کوحاصل کرنے کے لیے خون پسینے میں سے گزرنا پڑتا ہوگا۔ سچے آرٹ کی تخلیق کرب واندوہ کے بغیر نہیں ہوتی۔

وحید احمد کی نظموں کے دو مجموعے شفافیاں اور "ہم آگ چراتے ہیں " ان کی نظم نگاری کے عمدہ شاہکار ہیں ۔ وہ نظم نگاری کی دنیا میں ایک منفرد مقام و مرتبہ رکھتے ہیں ۔ ان کی نظموں کے

مجموعوں کے مطالعے کے بعد بہت سی ایسی نظمیں ملتی ہیں جن میں انہوں نے اپنے اردگرد بکھرے آشوب کو نظموں کے قالب میں ڈھال کر عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے اور یہ ان کا ہی وصف خاص ہے۔ نظم "مرمت کون کرتا ہے"کے اشعار دیکھے۔ جس میں بہت سے ایسے سوالات کو زیر بحث لایا گیا ہے جو قاری پر فکر و فن کے نئے دروازے کھولتا جا تا ہے۔

شعوری، لا شعوری اور سب تحت الشعوری
خام سوچیں
اب نئی بھٹی میں گلتی اور ڈھلتی ہیں
بھلا میں آپ کو کیا کیا بتاوں
جوہری ہتھیار
سرد و گرم جنگیں
چاند سے آگے جو سیارے ہیں
اُن پر زندگی کو ڈھونڈتی ٹیل سکوپیں
سبزیوں کے بعد
انسانوں کے خلیوں کو بدلتی
تجربہ گاہیوں کے اندر پرورش کرتی کلوننگ
موسموں کے ساتھ سکوں کے بدلتے رنگ
بنکاری
مرکب سود، جسکی بھیڑ میں انسان مفرد ہوکے رہ جائے
مرمت کون کرتا ہے

(ہم آگ چراتے ہیں ،ص:۵۰)

آگے نظم میں چل کر سقراط عظیم جنگوں کے تناظر میں پیداشدہ مسائل کے سلسلے میں کہتا ہے۔

کوئی آدھی بصارت سے زمانہ دیکھتا ہے
مسکرانے اور رونے کے لیے
ہونٹوں کے کونے تک نہیں ہلتے
کہیں اک پوٹلی سونے کے بدلے سلطنت گروی
کہیں جب ناف کٹتی ہے
تو بچے کے گلے میں قرض کی زنجیر پڑتی ہے

(ہم آگ چراتے ہیں ،ص:۵۲)

سقراط اور پروفیسر کے درمیان مکالمے کا اختتام سقراط کے ان لفظوں پر ہوتاہے جس کے بعد پروفیسر بھی سپاہی کی طرح کانپ اٹھتاہے اور ریت میں دھنس جاتا ہے۔

پروفیسر!
کسی بھی ملک کے دانشوروں کی سوچ میں
اک بار جب غربت اتر آئے
تو صدیاں چاہیں
اس ملک کے ماتھے پر چپکی مفلسی کی رات دھونے کو

(ہم آگ چراتے ہیں ،
ص:۵۳)

دراصل وحید احمد کی یہ نظم مظلوم باشندوں کے مصائب کا نوحہ ہے۔ پروفیسر کا کردار فکری افلاس کا نمائندہ ہے۔ اس نظم میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ظلم ہر دور میں موجود رہا ہے صرف اس کے انداز اور طریقے مختلف رنگ اختیار کرتے رہے ہیں ۔ وحید احمد اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ سامراجی طاقتوں نے کس طرح اپنی سفا کی کا جال چاروں طرف پھیلا رکھا ہے۔ وہ ساہ لوح لوگوں کے خون سے ہولی کھیل رہی ہیں ۔ اور مغلوب قو میں اس ظلم و جبر کو برداشت کرنے پر مجبور ہیں ۔ نظم "مویشی" کے اشعار دیکھیے جس میں مغلوب قومیں کے پاس سوائے خون کے آنسو رونے کے کوئی چارہ نہیں ۔

وہ میرے گھر کے سب سے قیمتی کمرے میں بن پوچھے
چلا آیا
کتب خانے کے اجلے کارپٹ پر
سیاہ کیچڑ سے بھرے بوٹوں کو رگڑا
ریک پر رکھی کتابوں کی قطاروں پر
غلاظت سے بھری نظروں سے تھوکا
اور میری سرخ آنکھوں میں سلگتے قہقہے کی ریت بھری

(ہم آگ چراتے ہیں
،ص:۹۳)

نظم "افسر شاہی" کے اشعار دیکھیئے جس میں سرکاری دفاتر میں موجود اس کلچر کو تنقید کا نشانہ بنا یا گیا ہے جہاں معمولی حیثیت کے لوگوں اور زیردستوں کا استحصال ایک معمولی سی بات سمجھی جاتی ہے۔

بڑے صاحب نے اک جھٹکے سے
فائل کا بدن کھولا
اور اپنی ایک انگلی
جس کی انگوٹھی پر کالے سانپ کا منکا جڑا تھا
میرے نیلے دستخط کے پھن کے اوپر گاڑ دی
پھر اپنے منہ میں تیل بھر کے
ہاتھ میں مشعل اٹھا لی
اور اک بھرپور شعلہ بار جھونکے سے
مرا چہرہ مسل ڈالا

(ہم آگ چراتے ہیں ،
ص:۴۰)

وحید احمد کی نظم"کھلونے"کے اشعار قابل توجہ ہیں جس میں وہ تیسری دنیا کے تمام لوگوں کے نام یہ پیغام عام کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ بچپن کے وہ کھلونے جن سے ہم کھیلتے تھے اب وہ ہمارے حالات سے کھیلتے نظر آتے ہیں ۔ معاشرے میں ہر طرف حیوانیت اور درندگی کا

راج دکھائی دیتا ہے۔ انسانیت کی اعلیٰ قدریں دم توڑ چکی ہیں ۔ اب انسانی خون پانی سے ارزاں دکھائی دیتا ہے۔ کوئی کسی سے ہمدردی اور پیار و محبت بانٹتا دکھائی نہیں دیتا بلکہ انسانیت اور انسان دوستی کی جگہ حیوانیت نے لے لی ہے۔ انسانیت کے اس طرح معدوم ہو جانے پر دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں ۔ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

عجب حادثہ ہے
کہ بچپن میں ہم جن کھلونوں سے کھیلتے تھے
اب وہ کھلونے
ہماری ہی حالات سے کھیلتے ہیں
وہ نازک مجسمے
وہ رنگین گڑیائیں
طیارے، پستول
فوجی، سپاہی
کبھی جو ہمارے اشاروں کے محتاج تھے
آفریں تجھ پہ معیارِ گردش
کہ اب وہ کھلونے
ہمیں چابیاں بھر رہے ہیں
ہمارے مویشی ہمارے ہی باغات کو چر رہے ہیں
کھلونوں کے اس کھیل میں
ہم تو یوں کھو گئے ہیں
کہ ہر کام کی ہم سے امید رکھ لو
اگر کوئی تقوے کی چابی گھمادے
تو ڈاڑھی بڑھا لیں
اگر کوئی تھوڑی سی قیمت لگا کر
کسی شخص کا گھر بتا دے
تو اگلے ہی پل اسکی گردن اڑا دیں

(شفافیاں
،ص:۸۰،۷۹،۷۸)

انسان دوست اختر عثمان اس سوال کے جواب کی تلاش میں سر گرداں نظر آتے ہیں کہ دنیا سے ظلم و تخریب کے بادل چھٹتے کیوں نہیں ہیں ؟ نظم " شش جہت"کے اشعار قابل توجہ ہیں جس میں شاعر اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ حرف کی طاقت رکھنے والے اپنی پوری طاقت و توانائی کے باوجود انسان کی سوچ بدلنے میں ناکام رہے اور انسان ظلم کی جس چکی میں بس رہا تھا وہ ظلم آج بھی اسکا مقدر ہے اور وہ اس سے نجات حاصل کر نے سے قاصر ہے۔

سلسلہ خیال میں حرف بہ حرف
ڈھل گئی قلب و نظر کی روشنی
پھر بھی رخِ حیات پر تیرہ و تار جبر کا عکس
وہی ہے جو کہ تھا

تاب و تواِن حرف گر، زاویہ ہائے خامہ پر
سوچ نہیں بدل سکے
جبر وہی ہے جو کہ تھا
صبحِ نمِ ملال سے قریہ، اندمال تک اور ہیں
کتنی منزلیں
حر ف و ہنر کے راہرو کچھ تو کہیں کہ تیرگی
پل کو سہی تمام ہو
ظلمت شب کو آج تک کس لیے کھا نہیں سکی
صبح کی کاروان سرا، دھوپ نہیں اگا سکی
(ستارہ ساز، ص
:۲٦۸)

اختر عثمان اپنی نظم"نئی صدی سے" میں اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ صدیوں کا آغاز ہوتا ہے اور پھر اختتام ہوکریہ صدیاں نئی صدیوں کی شکل اختیار کرتی ہیں ۔ لیکن انسان کی حالت زار میں کوئی تبدیل ظاہر نہیں ہوتی۔ شاعر کو اس صبح درخشندہ کا انتظار ہے جب امن و محبت کا راج ہو گا اور نفرت و دشمنی کا خاتمہ ہو گا۔ شاعر نظم میں ایسے عیسیٰ نفس فرد کا متمنی دکھائی دیتا ہے جو لفظوں کو معنی کاروپ دے کر انسان کی پوری دنیا میں امن و آشتی اور انسانی دوستی کے خواب کوحقیقت کا رنگ دے دے۔

تجھے موت ہے ، اے حسینہ!
مجھے اور ہوا کو ہمیشہ اس حال میں تیری رہ دیکھنی ہے
تو آئے گی، آکر گزر جائے گی اور میری پیروی میں کئی
اور بھی آئیں گے
اے صدی !
اے مسیحا کی بیٹی! ذرا اپنے بابا سے کہنا کہ میں کم نفس
ہوں
زیادہ نہیں بھاگ سکتا
وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں بے محبت
زمانے میں پیدا ہوا ہوں
مرے کاسہ، ذہن میں لفظ ہی لفظ ہیں
(کوئی مفہوم کی بھیک دے)
کاسہ، خواب میں الجھے الجھے ہوئے چند منظر ہیں
قلب و نظر میں کوئی دیدہ دانش کا سکہ نہیں
میرے خوابوں کی تعبیر تشنگی ہے
سوالوں کے پھول ادھ کھلے ہیں
حروف اپنے امکانِ معنی سے دور آج بھی دشت لا میں پڑے
ہیں
انہیں کون زندہ کرے

(ستارہ ساز
،ص:۱۰۹۔۱۱۰)
سعید الدین نثری نظم میں ایک منفرد آواز و انداز کے حامل شاعر ہیں ۔ انہوں نے کار پوریٹ معاشرے میں پروان چڑھتی مادی اقدار کو اپنی نظموں میں عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔
نظم" کتنے بے اختیار ہو تم" کے اشعار اس رجحان کے بھر پور عکاس ہیں
کتنے با اختیار ہو تم
یہ کہتا ہے تمہارا چہرہ
تمہارا ڈھب
تمہارا فیصلہ
کتنے با حیثیت ہو تم
یہ کہتا ہے تمہارا جوتا
تمہارے کپڑے
تمہاری قورو ہیل
پر میلی ہیں تمہاری آنکھیں
جو گھورتی ہیں
میرے ننگے پیروں کو
میرے ننگے کپڑوں کو
میرے ننگے دن اور مٹی کو
(رات،ص:۲٦)
سعید الدین کی نظمیں اس کارپوریٹ کلچر کو ہدف تنقید بنانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتیں۔جنہوں نے انسان کی وجود یاتی شناخت کو مسخ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں تمہارے درمیان سے، دیمک، تابوت، گالی، دستانے اور پرسنل فائل قابلِ ذکر ہیں ۔ نظم" پرسنل فائل" کے اشعار دیکھیے۔
میری پرسنل فائل کلوز کر دی گئی
اور یوں
میرے بدن کا ایک حصہ
الگ کر دیا گیا
اب میں نئے ادارے میں ملازم ہوں
یہاں میرا بقیہ بدن
رفتہ رفتہ
ایک نئی فائل میں محفوظ کیا جا رہا ہے
جلد یا بدیر
انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا
اور میری پرسنل فائل کی ڈھنڈیا پڑے گی
مجھے یک جا کرنے کے لیے
مجھے دریافت کرنے کے لیے

مجھے دریافت کرنے کے لیے
اور مجھے گم شدہ کرنے کے لیے
(رات، ص
:۵٦)

سعید الدین کی نظموں میں بھی افضال اور ذیشان کی طرح ایسے ٹکڑے باآسانی تلاش کیے جا سکتے ہیں ۔ جن میں روشنیوں کے شہر کی بدامنی ، بے چینی،اضطراب اور انتشار کا منظر نظم نگارکے داخلی کرب کو عیاں کرتا نظر آتا ہے۔ طاقتور قوتوں نے اپنے مفادات کے پیش نظر شہر کے ناتواں طبقے پر اپنا تسلط قائم کر رکھا ہے جس کے باعث خوف کی لہر پورے شہر میں سرایت کر چکی ہے۔ناتواں طبقے پر تسلط کا یہ انداز صدیوں پرانا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی دکھائی نہیں دیتی۔ درحقیقت اس بے بسی اورمجبوری نے انسان کو اندر سے کھوکھلا کردیا ہے اور ڈر اور خوف اس کے اندر سرایت کر گیا ہے۔

یہ خون ہے
سرخ اور دوڑتا ہوا
شریانوں میں یہ
دل کی طرف دوڑتا ہے شہر میں
شاہراہوں سے ہوتا ہوا
قلب شہر تک جاتا ہے
خون سے کھڑکیوں کے شیشے
رنگین کیے جا سکتے ہیں
اس کی چھچاہٹ سے
ڈرائنگ روم میں
وال پیپر چپکائے جا سکتے ہیں
(رات،
ص:٦١)

سعید الدین کی نظموں میں صنعتی اور میکانکی زندگی کی یکسانیت اور بے رنگی کا بیان بھی ایک منفرد انداز میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کے نزدیک معاصر عہد کا ہر انسان اس یکسانیت اور بے رنگی کا شکار ہے۔ آج کے انسان کی بے بسی اور لاچارگی ہزراوں سال پہلے زمین پر اترنے والے انسان کی مانند ہی دکھائی دیتی ہے۔ گویا نسان ایک داخلی کرب میں مبتلا ہے اور ہر لمحہ ایک نئی وجودی صورتحال سے دو چار رہتا ہے۔نظم "شب و زور "کے اشعار دیکھیے۔

گھروں سے نکلتا دھواں
اور آوازوں کی دہشت سے مجروح خواب
ہمیں کہتے ہیں
ہمیں جانے دو۔۔۔ ہمیں جانے دو
ہم انہیں نہیں تھام پائے
ہم انہیں نہیں روک سکتے

اور اپنے آپ کو
کسی دھواں اڑاتی بس
یا چیختی ویگن میں ٹانگ دیتے ہیں
اور ہمارے آٹھ گھنٹے دس گھنٹے
ان ہزاروں گھنٹوں میں جمع ہو جاتے ہیں
جو ہمیں چاٹ گئے
ہمارے ہاتھوں میں
پرانی فائلوں کی بُو بس جاتی ہے
اور ہماری وکیبلری
صرف یس سر ، یس سر رہ جاتی ہے
(رات ،ص:۸۷)

مارکسی نظریے میں تاریخی شعور کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس تاریخی شعور کی بنیاد مادی حیثیت پر قائم ہے۔ مارکس کے نزدیک جب بھی کسی معاشرے یا سماج میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا ہوئی یا تبدیلی لانے کا احساس پیدا ہوا تو اس احساس کے پیچھے لازمی طور پر انسان کی مادی اور اقتصادی ضروریات کا ہاتھ گیا۔ جدید اردو نظم میں مارکسی فکر کو ترقی پسند تحریک کے زیر اثر فروع ملا ۔ لیکن ترقی پسند تحریک کے ختم ہونے کے بعدبھی مارکسی افکار جدید اردو نظم کا حصہ بنتے رہے۔ پچھلے پچیس سالوں میں روس کے انہدام کے سبب یہ تصور کیا جانے لگا کہ مارکسی فلسفہ ناکام ہو گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ معاشی واقتصادی بنیاد پر قائم طبقاتی معاشرے میں مارکسی فکر کی کشش ختم نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ عملی طور پر کیمونزم کے ختم ہونے کے باوجود معاشرے کے پسماندہ طبقوں کی خوشحالی کی خواہش آج بھی نظم کے موضوعات کا حصہ ہے۔ لیکن یہ رجحان خالص ترقی پسند نظم کے مقابلے میں ایک مختلف اسلوب میں ہمارے سامنے آ رہا ہے۔ اب اس کا انداز براہ راست نعرہ بازی کا نہیں رہا بلکہ اسے جدید انسان کے ایک اہم مسئلے کی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ اب نظم نگار کسی ایسی تحریک کا حصہ نہیں جو معا شرے سے طبقا تی کشمکش کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ بلکہ انفرادی سطح پر وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان معاشی خوشحالی کے ذریعے مادی ترقی میں اپنا کردار اداکرے۔ سلمان صدیق اپنی نظم "گھاس کا ٹتی" رہو میں اسی خواہش کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں ۔

تو گھاس کاٹتی ہو تم!
تمہارا لان اس قدر وسیع ہے
کہ اس کے آدھے حصے پر
یقین ہے کہ چار سو غریب خاندان چھت کے نیچے عمر کاٹ سکتے ہیں
وہ عمر جو تمہیں بھی کاٹنی ہے
مجھ کو بھی گزارنی ہے

تھرکتے گدگداتے جسم والی زندگی
یقین کر
کہ چار سو غریب خاندان زندگی کی اس جہت کو کھوجتے ہوئے
چھتوں کے منتظر ہیں
چاہتے ہیں ان کا خون بھی
تھر کتے گدگداتے جسم والی زندگی سے زندگی کشید کر سکے

(دھیان میں گم،
ص:۲۶،۲۷)

سلمان صدیق اپنے معاشرے کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔
میں نے ایک ایسے ہی بیمار معاشرے میں جنم لیا ہے جو مختلف اور برعکس تہذیبوں کے نامکمل اختلاط کا نتیجہ بھی ہے اور صدیوں کے بھوکوں کی بھوک کا ثمر بھی۔ بہر حال مجھے اس بھوک اور نا مکمل اختلاط کے خلاف لڑنا ہے اور لڑتے رہنا ہے۔ کیونکہ جس میدان جنگ میں میں اترا ہوں وہ بذاتِ خود ساکن نہیں ۔

شدید ہوتی ہو ئی طبقاتی کشمکش اور سخت ہو تے ہوئے سرما یہ دار انہ شکنجوں کے خلا ف بلند آہنگ ابتدائی ترقی پسند شاعروں کے تتبع میں آج بھی موجود ہے۔ البتہ موجود ہ عہد کے نظم نگاروں نے شاعری کو نعرہ بنانے سے گریز کا رویہ اختیار کیا ہے ۔البتہ ان کے ہاں پسماندہ طبقات کی ہمت بڑھانے کا رویہ ایک اضافی خصوصیت ہے۔ ضیا الحسن کی نظم "آدھی روٹی اور پُوری گالیاں " کے اشعار دیکھیئے۔

عبدالکریم!
تم یوں ہی بیل کی طرح محنت کرتے رہے
تو تمہارے بچوں کو بھی یہی میراث ملے گی
آدھی روٹی اور پوری گالیاں
تمہیں اس چکرویو سے نکلنا ہے
اپنے بچوں اور ان کے بچوں کی خاطر

وجودی فکر کے زیر اثر اس عہد کی نظم میں زندگی کی بے معنویت ،بنجرپن اور انفعالیت ایک سماجی حقیقت بن کر سامنے آئی ہے۔ نظم نگار اس بے معنویت کے خارجی اسباب سے آگاہ ہے۔ لیکن حالات کا جبرا ایسا ہے کہ وہ "نہیں " کہنے کی آزادی کا مظاہرہ کرنے کے قابل بھی نہیں ۔ جبکہ وجودی فکر میں اسی مقام سے احساس ذمہ داری پیدا ہوتاہے۔ لیکن اس عہد کا نظم نگار ابھی اس مقام تک شاید نہیں پہنچ پایا۔ پھر وجودی فکر کے ایک اور پہلو کو نظر میں رکھے ہوئے ہے جس کے مطا بق یاسیت اور بے معونیت اور بے بسی کا مسلسل اظہار بالآخر ایک معنویت اور خود اعتمادی پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ آج کا نظم نگار

ان حالات و واقعات کی یا س آمیز تکرار کے ذریعے فرد کی بے بسی کا اظہار کرنے میں مصروف ہے۔

جبر کی ایک صورت یہ ہے جس میں فرد ہونے یا نہ ہونے کے سوال سے دوچار ہے۔ وجود یوں کے نزدیک زندگی بجائے خود ایک جبر ہے کہ انسان سے اس کے انتخاب کے سلسلے میں کوئی مشورہ نہیں کیا گیا۔بلکہ ہائیڈ گر کے بیان کے مطابق انساان کو اس کائنات میں پھنکا گیا ہے اور اب اس کی یہ سزا ہے کہ وہ اسی حالت میں رہے۔ یعنی زندگی پہلے ہی ایک جبر کی صورت میں انسان کو میسر آئی ہے سوا یسی زندگی میں اگر خارجی حالات انسان کو نا انسان بنانے پر آمادہ ہوں تو اس کے لیے اپنی ذات کی معنویت کیا رہ جاتی ہے۔ اسے رہ رہ کر یہ سوال اضطراب و پریشانی میں مبتلا کرتا ہے کہ ا سکی موجودگی لا حاصلی سے کیوں عبارت ہے؟ اس انتشار ذہنی کا شکار ہو کر انسان کے لیے اس کے وجود کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتاہے کہ خارجی قوتیں اس کے وجود کو مٹانے پر تلی ہوئی ہیں بلکہ اسے خود گمان گزرتا ہے کہ وہ موجود نہیں ہے۔

میں قائل تو نہیں ہوں
لیکن---- مجھے ایسا ہی لگتا ہے
کہ جیسے میں نہیں ہوں
مجھے کچھ ایسے دکھتا ہے
میں اک چشم گمان پرور کے رستے میں
اچانک آنے والا وہ ہیولا ہوں
کہ جس کو یاد رکھنے کا تکلف ہو نہیں سکتا
میں قائل تو نہیں
لیکن---- میں جانوں
میرا ہونا
اور نہ ہونا
ایک ہی زمرے میں آتا ہے

(آب قدیم کے ساحلوں پر،
ص :۲۵۔۲۶)

انوار فطرت نے اپنے مجموعے "آب قدیم کے ساحلوں پر"کی مختلف نظموں میں جدید عہد کی بدہیئتی اور بدصورتی کو مختلف کریہہ تمثالوں کے ذریعے نظموں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ شہر نا مرد سے خطاب ، باولا بیل، ڈیپ فریزر میں رکھا شہر، آخری دن ہیں ایسی نظمیں ہیں جو اس بدہیئتی اور بدصورتی کی بھر پور عکاس ہیں ۔ اشعار دیکھیے۔

تمہارے دریا مرے پڑے ہیں
اور ان پہ غلظت کی سبز کائی
کفن کی صورت دھری ہوئی ہے
تمہاری مٹی میں

ریت کی بے شمار آنکھیں
دہک رہی ہیں
اب ان میں کوئی بھی شکل پانے کی
استطاعت نہیں رہی ہے
(آب قدیم کے ساحلوں پر ،
ص:٤٧)

انوار فطرت کی نظم نگاری کے بارے میں ڈاکٹر ضیاء الحسن کی یہ رائے انتہائی صائب معلوم ہوتی ہے کہ "انہوں نے اپنی شاعری کے لیے کوئی ماورائی یا طلسمی ماحول منتخب نہیں کیا کیوں کہ وہ اپنے عہدہ کے روبرو ہونے کی ہمت رکھتے ہیں اور ان مسائل سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں جو ہمارے اردگرد پھیلی زندگی کا خاصا ہیں "۔ تصور خدا کی عدم موجودگی ، وجودی فکر کے مطابق انسان کے لے ایک ابدی تنہائی کو جنم دیتی ہے۔ اسے اپنے وجود اور اسکی مردہ خواہشات کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ نقشے اور سارتر کے عہد کا انسان تھا جسے اپنی تنہائی کے وجود کا تو علم تھا لیکن آج کے کمپیوٹر دور میں صورتحال یہ ہو گئی ہے کہ تنہائی کا وجود بھی ختم ہو گیا ہے لیکن تنہائی کی ابدی موجودگی کا احساس دو چند ہو گیا ہے۔

شام دل گرفتہ ہے
بے وجود تنہائی
چار سمت پھیلی ہے
دھند کی ردا اوڑھے
خواب اگلے وقتوں کے
سرخ بوجھل آنکھوں میں
لہر لہرا مڈتے ہیں
بوند بوند تاویلیں
خواہشات کا ایندھن
سرد کر نہیں سکتیں
(سناٹا بولتا ہے،ص
:٣٩)

وجودی فکر میں خو ف اور تشویش کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وجودیت میں خوف کا ایک پہلو فرد کے کا ئناتی یاد نیاوی رابطے میں پوشیدہ ہے۔ فرد دوسرے افراد اور اشیا سے رابطہ رکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن انفرادی یا اجتماعی درجے کے ان روا بط کی حیثیت ہمیشہ مشکوک رہتی ہے جو فرد کے لیے دلی تشویش کا باعث بنتے ہیں ۔ یہ خوف و تشویش بڑھ جائے تو فرد اپنی تنہائی اور بے چارگی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے فنا کے احساس کے ساتھ ملا دیتا ہے اور اسے گمان گزرتا ہے کہ وہ کوئی ایسی زندگی بسر کر رہا ہے جو زمان سے باہر گرے ہوئے لمحے سے عبارت ہے۔ڈاکٹر ناہید قمر کی نظم" اے اجل دیکھ لے "کے اشعار دیکھیئے جو اس خیال کے بھر پور عکاس ہیں ۔

خیمہء ذات کی رسیوں میں پڑا گر دبادِ اذیت کابل دیکھ لے
اے اجل ! دیکھ لے
بے عقیدہ رتوں کے ستائے ہوئے
سنگ انگار کی چوٹ کھائے ہوئے
ہم وہی لوگ ہیں
جن کے دل مرکز ثقل سے ہٹ گئے
جن کے سب راستے
رائگاں کی مسافت میں گم ہو گئے
جن کو جینا پڑا
رہگز ار زماں سے کٹی عمر کا کوئی پل دیکھ لے
اے اجل! دیکھ لے
(اک سفر اداسی کا ،
ص:۱۱۵)

ڈاکٹر ناہید قمر کی نظم نگاری پر بانو قدسیہ ان خیالات کا اظہا رکرتی ہیں ۔

ناہید کی شاعری ابھی ایک بند گنبد میں بازگشت کی طرح مقید ہے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب یہی آواز اس عہد کے لیے سنگ میل کا کام دے گی اور قارئین اسکو پڑھ کر اپنے اندر کے موسموں کو پرانی روایت کے حوالے سے سمجھ سکیں گے۔

وجودیت نے فرد واحد اور اس کے گونا گوں مسائل کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ یہ مسائل صنعتی معاشرے میں فرد کی شناخت گم ہونے کی بنا پر پیدا ہوئے تھے۔ وجودیوں کے نزدیک ایسا کوئی نظام جس میں فرد کی پہچان ختم ہو جائے انسانیت کے لیے بہت بڑے خطرے کے مترادف ہے۔ ان کے نزدیک صنعتی معاشرے میں فرد کے بجائے "اشیا"کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس نظام میں فرد کو ایک کل پرزے کی طرح استعمال کیا جاتا ہے جسکی وجہ سے معاشرے میں تنہائی اور بیکانگی کا عمل دخل بڑھتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو گزشتہ پچیس برسوں میں ہمارے معاشرے میں فرد کی حیثیت خود ایک شے کی سی بن کر رہ گئی ہے جو کثیر القومی کمپنیوں اشتہاری مہموں کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اسی باعث فرد سے جڑت ختم ہو رہی ہے۔ انسان دوستی کے جذبا ت مفقود ہورہے ہیں ۔ اور بیگانگی کا احساس فروغ پا رہا ہے۔ ایسے میں فرد کو محسوس ہو تا ہے کہ جیسے زندگی ایک الزام ہے اور ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم اس الزام کی صفائی پیش کرتے رہیں ۔ اس سلسلے میں فرخ یارکی نظم "ہم تو بس "کے اشعار توجہ طلب ہیں ۔

ہم تو بس پیشی بھگتانے آئے ہیں
ہم نے کیا لینا دینا ہے
رقصِ صبا سے
تم سے

اس میلے سے
جس میلے میں
دستاویز پہ دستخطوں کی پہلی فصل بچھی تھی
اور زمانہ دو فرسنگ کی
ناہموار مسافت حیران کھڑا تھا
(مٹی کا مضمون،
ص:۸۵)

اردو نظم کے معاصر شعرا کے ہاں عہد موجود کی سماجی ساخت اور معاشرتی رویوں کے خلاف اضطراب، بے زاری اور احتجاج ان کی مختلف نظموں میں بڑی شدت کے ساتھ ظاہر ہو اہے۔ سعید احمد کے ہاں بھی ماحول سے تخلیقی گریز اور نئے فرد کی جستجو کا رویہ اپنے رنگ میں ظاہر ہو اہے۔ کہنے کو تو انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن اس نے اپنے آپ کو خود طرح طرح کی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے اور زندگی ایک قید سے دوسری قید میں منتقلی کی رو داد بن کر رہ گئی ہے۔ نظم " ذات کی کال کا ٹھڑی سے آخری نشریہ" کے اشعار اس خیال کے بھر پور عکاس ہیں ۔

سُن مرے ہمزاد سُن!
زندگی کے کھوج میں اب
ہجرتیں واجب ہیں لیکن
سرحدوں سے ماورا ہیں
یا ہوائیں یا صدائیں یا پرندے
میں تمنا کے جہازوں کا مسافر
پاسپورٹوں اور ویزوں کے ایئر پاکٹ ڈراتے ہیں
مجھے
(دن کے نیلاب کا خواب،
ص:۱۱۰)

انوار فطرت سعید احمد کی نظم نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

اس کا شعری سماج بند کمرہ اور شہر کی تنگ گلیاں کم ہی بنتا ہے اس کا محلہ وقت کی لامتناہیت میں کسی مقام پر ہے ۔تبھی وہ اپنے دکھ کو کائناتی آنکھ سے دیکھتا ہے اور اسی لحاظ سے خود کو سہلانے کو ہاتھ بھی آفاقی مانگتا ہے۔

علی محمد فرشی کی نظم معاصر اردو نظم میں امتیازی شان کی حامل ہے۔ انہوں نے اپنی طویل نظم "علینہ" میں مخصوص تانیثی اور رو مانوی تناظر کے ساتھ ساتھ ان سامراجی تدبیروں کو بھی منظر عام پر لا کر ان کی مکاری و عیاری کا پردہ چاک کیا ہے جن کا مقصد صرف تیسری دنیا کے وسائل پر اجارہ داری قائم کرنا ہے ۔ فرشی کے ہاں نئے آدمی کا کردارسا مرا جی قوتوں کے

ہاتھوں مضمحل اور شکست خوردہ دکھائی دیتا ہے۔ نظم" علینہ" کے اشعار دیکھیے۔

علینہ!
نئے آدمی کے مقدر کا نقشہ بتاتے ہوئے
مغربی ساحروں نے
تری فائلوں سے چرائے ہوئے راز کو
کس قدر ایٹمی زندگی کے تصور میں شامل کیا تھا
فقط ہیرو شیما کی مٹی کو معلوم ہے

(علینہ،ص :٤٥)

فرشی کی نظم " علینہ" کے یہ اشعار بھی قابل توجہ ہیں جن میں متکلم کا نظم کے مرکزری کردار "علینہ"سے مخاطب ہو کر اسکی مدد و معاونت چاہنا فرد کی بے بضاعتی اور بے بسی پر دال ہے۔ دراصل معاصر عہد میں ہر انسان اپنی ذات کے آشوب سے باہر نکلنے کے لیے ایسے ہی کسی وجود کی انگلی تھا مے رکھنے کا خواہش مند نظر آتا ہے جو اس کی داخلی تنہائی کے کرب کے لیے تشفی و تسلی کا باعث بنتا ہے۔ اشعار دیکھیئے۔

علینہ!
غار سے نکلیں
کوئی رستہ بنائیں
اس گھنی، گاڑھی ، سیاہی سے نکلنے کا
اندھیرے، اندھے، زہریلے دھوئیں میں
کاربن ہوتی ہوئی عمریں کہاں ہیرا بنیں گی
کسی نیکلس، انگوٹھی اور جھمکے میں
چمک اٹھنا، کہاں دل کا مقدر ہے
ہمارے کوئلہ ہوتے دلوں کا غم
ہمالہ نے کہاں رونا ہے
کس تاریخ کا چہرہ بھگونا ہے

(علینہ،ص:١٣)

انسان دوست فرشی کی نظم" علینہ" میں متکلم اپنے غم کو اکیسویں منظر نا مے میں انسانیت کے ان تمام دکھوں سے ہم آہنگ کر دیتا ہے جو معیشت کی بدولت اسے نصیب ہوئے ہیں ۔ انسان جو آج زمین پر دکھ و الم کی جیتی جاگتی تصویر بنا بیٹھا ہے اور ہر قسم کے دکھ کو بے چوں و چرا برداشت کیے جا رہا ہے اُس نے ایک وقت خدا سے کلام کیا اور اس کے کلام کی تکریم کی۔

یہ وہی آدمی تھا علینہ!
ترے سرخ ہونٹوں کے آفاق پر
جس نے پہلے تکلم کی تکریم کی
جس نے لاَ تعلمون کی تجسیم کی
میں اس آدمی کی طریقت پر چلتا رہا ہوں

چلوں گا
جہاں تک ترا آسماں ساتھ چلتا رہے گا
ترے دائمی آئینے میں
مرے غم کا چہرہ بدلتا رہے گا
(علینہ،
ص:۷۷)

اس کے علاوہ عہد موجود کی سما جی ساخت اور معاشرتی رویوں کے خلاف اضطراب، بے زاری اور احتجاج کا رنگ قاسم یعقوب ، زاہد امر وز، ارشد معراج، عمیر و اصف ،علی اکبر ناطق وغیرہ کی نظموں میں شدت کے ساتھ دکھائی دیتا ہے اور نئے فرد کی جستجو کا رویہ اپنے اپنے رنگ میں نظم ہو اہے۔یہ سب شعرا اس کوشش میں معروف عمل ہیں کہ فر د کی تنہا ئی کو ختم کر کے ہر طرف امن وآشتی، پیا رومحبت اور انسا ن دوستی کے پھو ل کھلا ئے جا ئیں کیونکہ آپس میں مل بیٹھنے اور ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹنے ہی سے موجودہ دور کے فرد کی تنہائی کو کم کیا جاسکتا ہے اور یونہی ایک انسان دوست معا شر ہ تشکیل پا سکے گا ۔ جہاں امن کا راج ہو اور ہر طرف پیار و محبت اور انسان دوستی کے مدھر گیت کانوں کو سنائی دیں ۔

Cd

باب پنجم

مجموعی جائزہ

fe

مجموعی جائزہ

انسان دوستی کو انگریزی میں Humanismکہا جاتا ہے ۔ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جو انسانی تاریخ کے ہر دور میں کسی نہ کسی طور موجود رہا ہے ۔ لیکن باقاعدہ طور پر ادب و فن میں اس اصطلاح کو یورپی احیائے علوم کی تحریک کے آغاز کے ساتھ استعمال کیا گیا ۔ یہ نظریہ ایک تحریک کی صورت میں بھی اسی عہد میں ابھر کر سامنے آیا۔ تاہم بعد میں اس اصطلاح کو مذہبی اور سیاسی تعلیمات اور تحریکوں میں بھی استعمال کیا گیا ۔

ہیومینزم ، لاطینی زبان کے لفظ (Humanitas) سے ماخوذ ہے۔جس کا لفظی مطلب " انسان دوستی" انسانیت ہے ۔ یہ نظریہ عظمت انسانی اور اعلیٰ اقدار کا متقاضی ہے اور چونکہ یہ انسان اور انسانیت کی فلاح و بہبود اور اس کی بہتری کا دعویدار ہے اس لیے آج بھی زندہ و جاوید ہے ۔

ہیو منز م دراصل امن کا حامی ہے ایسا امن جس میں انسانیت پروان چڑھ رہی ہو اور اسے اندرونی اور بیرونی طور پر کسی فتنہ و فساد کا کوئی خطرہ نہ ہو ۔ لوگوں کے حقوق محفوظ ہوں ۔ معاشرے میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ کمزور اور زیردست افراد توانا اور مضبوط ہوں ۔ ظالم اور مفسدوں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں ۔ قوم کے افراد میں ہم آہنگی بدرجہء اتم موجود ہو۔ اسی صورت میں انسانیت کی بقاء اور ترقی ممکن ہے ۔ جن معاشروں میں بد امنی کا راج ہوتا ہے وہ جلد انتشار کا شکار ہو کر صفحہء ہستی سے مٹ جاتے ہیں ۔

چودھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اٹلی میں " انسان دوستی " کو نئے سرے سے عروج حاصل ہوا اور اس تحریک کا نام "انسان پرستی " بھی اسی زمانے میں پڑا۔ انسان پرستی کے فلسفے کا اولین سراغ پانچویں صدی قبل مسیح میں یونانی مفکر پروتا غورس کے اس قول سے ملتا ہے ۔

انسان کائنات کی تمام اشیاء کا پیمانہ ہے اس بات کا پیمانہ کہ جو اشیاء ہیں وہ اس لیے ہیں کہ وہ ہیں اور جو اشیاء نہیں ہیں وہ اس لیے نہیں ہیں کہ وہ نہیں ہیں ۔

انسان پرستی کے فلسفے کے تحت انسان کو کائنات کا مرکز و محور سمجھا جاتا ہے یہ فلسفہ مکمل طور پر انسانی زندگی کا مطالعہ اور اس کی ترقی کی کوشش کرتا ہے اس تحریک نے ایک طرف تو مروجہ دقیانوسی توہمات سے اپنا دامن چھڑایا اور دوسری طرف علمی اور روحانی فیض حاصل کرنے کے لیے قدیم یونانی اور رومی ادبیات سے اپنا رشتہ قائم کیا ۔ انسان پرستی کا نصب العین یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت میں

موجود چھپی صلاحیتوں کو سامنے لائے اور انسان کی موجودہ زندگی کو اعلیٰ بنانے کی کوشش کرے ۔ حیات ، بعد الموت ، مافوق الفطرت اور توحید کے مسائل سے انسان پرستی کا کوئی تعلق نہیں ۔

ہیومنز م انفرادی آزادی کا بھی قائل ہے اور اس کے تسلیم کیے جانے پر بھی زور دیتا ہے ۔ آزادی کی قدر افزائی در حقیقت انسان دوستوں کا اہم موضوع رہا ہے۔ ان کو ایسی آزادی سے دلچسپی ہے جس کو انسان فطرت اور معاشرے میں بروئے کار لا سکے۔ کیونکہ آزادی انسان کا بنیادی حق ہے جسے وہ اپنی دنیا تعمیر کرنے ، اسے بدلنے اور ترقی دینے کے لیے استعمال کر سکتا ہے ۔ ہیو منز م کا یہ فلسفہ پوری دنیا ئے انسانیت کو آزادی و مساوات کے حقوق عطا کرتے ہوئے انہیں اخوت و بھائی چارے کی ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں انسانوں کی اپنی طرف سے رنگ و نسل اور زبان و علاقائیت وغیرہ کی بنیاد پر تیار کی گئی دیواریں زمین بوس ہو جاتی ہیں اور انسان اور انسان کے درمیان ان غیر فطری امتیازات کی بناء پر تفریق و انتشار اور فساد فی الارض کی تما م کوششوں پر پانی پھر جاتا ہے ۔

انسان دوستی درحقیقت ایک عقیدہ ہے ۔ ایک ثقافتی تحریک ہے یا ایک تعلیمی پروگرام ہے جو صرف انسان سے مخصوص ہے۔ یہ انسان کو دائرہ انسانیت میں رکھتے ہوئے مثالی انسان بناتی ہے۔ انسان کی صلاحیتوں اور کامرانیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے عظیم بناتی ہے۔ انسان دوستی کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کو عظیم بنانے والی چیز خود اس کی ذات میں پوشیدہ ہے ۔وہ کسی اور ذات کی عطا کردہ نہیں ہے ۔

انسان کائنات کی افضل ترین مخلوق ہے ۔ اسے کائنات کا مرکز و محور گردانا جاتا ہے ۔ تمام مذاہب عالم میں انسان کو بنیادی اور مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ دنیا میں جتنی بھی تہذیبیں پروان چڑھیں سب انسانی عظمت کی قائل دکھائی دیتی ہیں ۔ تمام مذاہب عالم ، مفکرین اور دانشوروں کے ہاں انسانی عظمت ، انسانی احترام ، مساوات ، اخوت اور انسانی محبت پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ گویا اس کائنات کی تمام رونق انسان ہی کے دم سے قائم و دائم ہے ۔ انسان کے بغیر یہ کائنات بے معنی و بے وقعت ہے۔ انسان اس کائنات کی ابتداء بھی ہے اور انتہا بھی ۔ ۱۴۵۳میں ترکوں نے جب قسطنطنیہ پر قبضہ کیا تو یونانی علماء جو قسطنطنیہ میں مقیم تھے اپنی کتابوں کے ذخیرے سمیت وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور اٹلی میں پناہ لی ۔یہ لوگ اٹلی کے مختلف شہروں فلورنس (Florence) بولانا (Bologna) ، پا ڑ وا (Padua) وینس (venice) اور روم (Rome) وغیرہ میں مقیم ہوئے تو یہ مقامات علم و ادب کا مرکز بن گئے ۔ یہ علماء لوگوں کو یونانی اور لاطینی زبانوں کی

تعلیم دے کر اپنا گزر بسر کرنے لگے ۔ یہی علماء یورپ میں جو جہالت کی نیند سویا پڑا تھا اس علمی بیداری کا باعث بنے جسے یورپی نشاۃ ثانیہ یا تحریک احیائے علوم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ مورخین کے نزدیک تاریخ ِیورپ کا دورِ جدید بھی اسی تاریخ سے شروع ہوتا ہے ۔

یورپ پر نظر ڈالی جائے تو قرونِ وسطیٰ میں یہ عیسائی مذہب کا پیر و تھا ۔ پوپ تمام ممالک پر اپنی حاکمیت قائم کیے ہوئے تھا اور ہر جگہ اس کا حکم چلتا اور کوئی بھی اس کی مرضی و منشاء کے بغیر کچھ نہ کر سکتا تھا۔ چودھویں صدی تک اس مذہب کی حالت نا گفتہ بہ تھی ۔ راہبوں اور پادریوں میں بدکاری اور عیش پرستی عام تھی۔ دوسری طرف پوپ نے حاکمیت کے معافی نامے بیچنے شروع کر دیے تھے ۔ یونانی اور لاطینی زبان کے عالم اس گھٹن زدہ ماحول سے تنگ آچکے تھے۔ وہ مذہب کے تنگ دائرے سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لینا چاہتے تھے اور نئی آزادی کے لیے سرگرداں تھے ۔ یونانی اور لاطینی زبان کے شاہکاروں کے مطالعے نے ان میں وسعت نظری کو فروغ دیا اور ایک نیا نظریہ حیات عطا کیا ۔ مذہب کے حوالے سے لوگوں میں بدگمانی پیدا ہوئی اور وہ مذہب کو کلیسائی عہدیداروں کے ظلم و ستم اور رعب و دبدبے کا نتیجہ سمجھنے لگے یا ان کے نزدیک مذہب فرسودہ مسائل کی پابندی کا نام تھا ۔ اس کے برعکس یونانی اور لاطینی نظریہ حیات تنگ نظری کا شکار نہ تھا ، بلکہ وہ باہمی ہمدردی اور رواداری کا درس دیتا تھا ۔

اٹلی نشاۃ ثانیہ کا مرکز بنا۔ پیٹرارک اٹلی کا سب سے پہلا انسان دوست شاعر اور ادیب تھا ۔ پیٹرارک اپنے دوستوں اور آنے والی نسل کے نام طویل خط لکھنا پسند کرتا تھا ۔یہ چونکہ کلیسا کے جبرو استبداد ، رسوم پرستی، توہم پرستی اور روایت پرستی کے خلاف تھا۔ گرجوں اور خانقاہوں میں فسق و فجور کا دور دورہ تھا۔ اس لیے پیٹرارک نے کلیسا پر سخت تنقید کی کلیسا کی گندم نما جو فروشی کا خوب تمسخر اڑایا۔ اس نے اپنے عہد کے لوگوں کی سوچ میں تبدیلی لانے کی بھر پور کوشش کی ۔

پیٹرارک اٹلی کی ریاست فلورنس کا رہائشی تھا۔ لیکن اس کی زندگی کا بیشتر حصہ فلورنس سے باہر گزرا ۔ فلورنس میں موجود علمی و ادبی حلقے نے اس کے کام کو آگے بڑھایا ۔ فلورنس میں انجیل مقدس کی تفسیر اس کے اصل متن کے مطابق کی اور یہیں سے انسان دوستوں نے اپنی تحریک کی بنیاد رکھی ۔

آزازانہ تنقید، معروضی غور و فکر اور حصول علم کے آزادانہ ر ویے کا آغاز ہوا۔ تجرباتی علوم ،طبیعی علوم ایجادات وتحقیقات اور

سائنسی ترقی کے لئے راہ ہموار ہوئی۔ روایتی علوم کی بجائے کیمیا اور فلکیات میں دلچسپی لی گئی۔ سنگتراشی اور فن تعمیر بھی نئے افکار و نظریات اور نئی علمی فضاوں سے متاثر ہوئے۔اس عہد کے مشہور فنکار کلیسا کی ترجمانی کرنے کے بجائے زندگی کی ترجمانی کرنے لگے۔ مذہبی عقیدت مندی کی جگہ تہذیب نے اور مذہبی پابندی کی جگہ کلچر نے لے لی۔ کلچر ہی کا لفظ عام ہوا۔ ادبیات یعنی Humanities سے واقفیت کلچر کا معیار ہوئی اور نئے انسان کو Humanist کہا گیا۔

یہ انسان دوست ہی تھے جنہوں نے قرون وسطی middleageاور احیاء العلوم Renaissance کی اصطلاحات متعارف کرائیں ۔انہوں نے قدیم کےلئے کلاسیکل کا لفظ استعمال کیا۔اور اسی کلاسیکل کی تجدید کےلئے احیاالعلوم کا لفظ استعمال کیا۔قدیم اشیا چونکہ ماضی کا حصہ تھیں اس لئے قدیم سکوں کو تاریخ کی گراں قیمت دستاویزات کے طور پر جمع کیا گیا ۔عوامی کتب خانوں کے قیام پر زور دیا گیا۔ ان انسان دوستوں نے اپنے سفر کے دوران کتب ڈھونڈ ڈھونڈ کر خریدیں ۔ ناقابل خرید مسودوں کی نقول اپنے ہاتھ سے تیار کیں اور نقول تیار کرنے والوں کو تنخواہ پر اپنے ساتھ گھر میں رکھا۔قدیم ادب پاروں کے تراجم بھی کئے گئے ۔انسان دوستوں کی یہ کاوش انسان دوستی کے فروغ میں ممدومعاون ثابت ہوئی۔

انسان دوستی کی تحریک اب اٹلی سے نکل کر سارے یورپ میں پھیل چکی تھی۔ فرانس میں اسکی سب سے زیادہ صحت مند صورت کی مثال ملتی ہے۔ مونتین ایسا ادیب تھا جس کی تربیت یونانی ادب اور فلسفے کے مطابق ہوئی تھی۔ اس نے یونانیوں سے انسانی فطرت کی طرف ایک نیا رجحان سیکھا ۔اس کے بعد انسان دوستی کی انتہائی فکر اہل جرمنی کے مارٹن لوتھر کی صورت میں سامنے آئی۔یہ پروٹسٹنٹ فرقے کا بانی تھا۔اس نے پوپ کو خدا کا نمائندہ ماننے سے انکار کیا اور پوپ کے معافی ناموں کو شاہراہ عام پر جلوا دیا ۔اب انسان دوستی کی اگلی منزل انگلستان قرار پائی اور وہاں جا کر اپنے قدم جمانے کی بھر پور کوشش کی۔ معلمین اور فلسفیوں کا ایک گروہ وجود میں آیا۔ جنہوں نے انگلستان میں انسان دوستی کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس میں اہم نام ٹامس مور کا ہے۔ اس نے لاطینی زبان میں اپنی مشہور کتاب یوٹو پیا UTOPIA لکھی ۔یہ کتاب افلاطون کے فلسفے پر مبنی ہے اور اس کی تبلیغ کرتی ہے۔

ٹامس مور کی یوٹوپیا کتاب "انسان دوستی "Humanismکے سلسلے میں دائمی اہمیت رکھتی ہے۔اور اسکی ہستی انگریزی ہیومنیٹیز میں مثالی ہے۔چونکہ اس عہد میں یونانی اور لاطینی زبانوں کو کلاسیک کا

درجہ حاصل تھا ۔لہذا بہت سے ادیبوں اور شعرانے اسکے سیکھنے پر توجہ دی۔ آخرکار کلاسیکی ادب کا مطالعہ لوگوں کی زندگی میں ایک واضح تبدیلی لے کر آیا ۔سوچ کے زاویوں نے ایک نیا رخ اختیار کیا ۔پاپائی نظام کی مذہبی اجارہ داری نے دم توڑ دیا۔صدیوں سے قائم جابرانہ نظام کا خاتمہ ہوا۔لوگوں میں تنقیدی شعور کا آغاز ہوا اور آزادیء فکر کو ایک درست سمت ملی جسکا ایک طویل مدت سے انتظار تھا۔

جب عیسائیت کو روم کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا تو رومی حکومت کو مقدس سمجھا جانے لگا۔مغرب میں رومی پوپ اور مشرق میں قسطنطینہ کا پوپ بہت اہم تھے۔ پوپ کی لامحدود طاقت کا دور جسکی ابتدا ۸۰۰ء سے ہوئی اور سترہویں صدی تک یورپ کے تمام بادشاہوں کے تخت و تاج عملاً پوپ کے ہاتھ میں تھے وہ اپنی مرضی و منشا کے مطابق جیسے چاہتا اقتدار کی کرسی پر بیٹھاتا اور جسے چاہتا تخت و تاج سے محروم کر دیتا۔ پوپ کے ایک ہاتھ میں یورپ کے بادشاہوں کے تاج تھے تو دوسرے ہاتھ میں عوام کے دل و دماغ کی باگ ڈور۔ عوام میں سے کسی کے سر میں سر کشی کا سودا سماتا تو اسے الحادوبے دینی کی سزا کے لئے عدالت تفتیش (Inquisition) قائم کی گئی۔ جسکی شاخیں پورے یورپ میں تھیں ۔

پندرھویں صدی کے پوپ کے بارے میں یہ رائے عام تھی کہ اسکا کوئی فیصلہ غلط نہیں ہوتا ۔اس لئے اس کے حکم کے آگے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔سولہویں صدی میں پوپ نے گناہ گاروں میں معافی نامے فروخت کرنا شروع کر دیئے ۔گویا گناہ گاروں کو معاف کرنے کا اختیار اسکے پاس تھا۔معافی ناموں کو فروخت کرنے کےلئے گلی گلی میں ایجنٹ مقرر تھے۔جو مختلف قسم کی صدائیں لگا کر ان کو فروخت کرتے۔

جب ظلم ،تعدی ،فسادات اور بدکاریوں نے اپنی انتہا کو چھو لیا تو اس قسم کے مظالم اور عیش پسندی نے عوام کے دلوں میں نفرت کے بیج بونے شروع کردیے۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بارھویں صدی میں مصلحین کلیسا اور مسیحی مذہب کی اصلاح کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان مصلحین میں پیڑوالڈد، جان وائی کلف ، مارٹن لوتھر ، رچ زونگلی اور جان کالون وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔

ان مصلحین نے فکر کے دھاروں کو ایک نئی سمت عطا کی۔ سوچ کے زاویے میں واضح تبدیلی آئی اور لوگوں میں اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا ۔ جس سے کلیسا پر بے لاگ تنقید کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا ۔ پیٹر والڈ و فرانس کا ایک امیر آدمی جسے اصلاح مذہب کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل تھا ۔ ا س نے

بارھویں صدی کے اواخر میں کلیسا کے خلاف اعلان برات میں پہل کی ۔ اس نے اپنی تعلیمات میں پوپ کے اقتدار سے انکار کیا ۔

جان و کلف کو پوپ کے خلاف آوازِ بغاوت بلند کرنے کے نتیجے میں پوپ کے غیض و غضب کا شکار ہونا پڑا۔ پوپ کی نفرت اس حد تک بڑھ گئی کہ جان و کلف کے مرنے کے تیرہ سال بعد اس کی لاش کو قبر سے نکال کر جلا دیا گیا ۔

مارٹن لوتھر ایسا انسان تھا جس نے کلیسا کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور پا پا ئیت کے تارو پور بکھیر کر رکھ دیے۔ مارٹن لوتھر نے پوپ کے ہر ظلم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ۔ لوتھر کی وفات کے بعدبھی یہ انقلابی تحریک جاری وساری رہی اور پاپائی نظام کے خلاف غم و غصے کی لہر کم نہ ہوئی۔جان کیلون نے لوتھر کے نظریات اور تعلیمات کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا ۔زونلی گل کیلون کا ہمصر تھا۔اس نے بھی اصلاح مذہب کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا ۔یہ اپنے پیشر و لوتھر سے بھی زیادہ متشدد تھا۔ اس نے کلیسا نظام کو جمہوری بنیادوں پر استوار کیا اور اصلاح یافتہ کلیسا Reformed Church کے وجود کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

فرانس میں ایسے عظیم انسان اور روشن خیال فلاسفر اور مفکر پیداہوئے جنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے عوام کے اندر احساس بیداری کو جنم دیا اور انہیں زندگی کی راہیں دکھائیں ۔اس جدوجہد میں مانٹسکو (۱۶۸۵۔۱۷۵۵) والٹیئر (۱۶۹۴۔۱۷۷۸) اور روسو (۱۷۱۲۔۱۷۷۸) جیسے لوگ شامل تھے۔والٹیئر فرانسیسی خرد افروزی کی تحریک کی ایک ممتاز شخصیت تھا۔ والٹیئر جیسے عظیم مفکر اور محقق نے اپنی نظموں ،مضامین ،ناولوں اور ڈراموں کے ذریعے پاپائیت کے خلاف جنگ لڑی اور برائیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ۔ نظریاتی طور پر وہ جمہوریت کو ترجیح دیتا تھا۔ اسے لڑائی سے سخت نفرت ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ دوسرے ملک برباد ہوجائیں اور اس کا وطن پھلے پھولے ۔

روسو کا استدلال یہی تھا کہ فرانس میں اس نے تن تنہا روشن خیال کی ، مادیت اور الحاد کا مقابلہ کیا۔ معاہدہء عمرانی میں روسو نے حکومت کے ظلم و استبداد کو بے نقاب کیا اور اس بات پر زور دیا کہ عوام بادشاہوں اور امراء کی غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہوجائیں ۔ وہ سوسائٹی کے مصنوعی بندھنوں کو توڑنے پر زور دیتا ہے۔ رو سو نے اس کتا ب میں جمہو ریت کی بھر پو ر حما یت کی اور حق خدا داد با دشا ہی سے انکا ر کیا

سیکولر ازم کے نظریے کا آغاز ڈھائی سو سال پہلے یورپ سے ہوا

۔پندرہویں صدی میں اسکی پیدائش ہوئی اور اٹھارہیویں صدی کے آغاز میں اس نے پورے یورپ میں مضبوطی سے قدم جما لیے۔

انسانی معاشرت ایک نامیاتی مظہر ہے۔تاریخی طور پر معاشرے کو منظم و مستحکم بنانے کےلئے مختلف ریاستی نظام اپنائے جاتے رہے ہیں ۔کبھی کوئی خاندان حق حکمرانی کا حق دار ٹھہرتا ۔ کبھی کسی مخصوص نسل یا زبان سے تعلق رکھنے والوں کو حق حکمرا نی ودیعت کیا جاتا تھا اور کہیں کسی خاص عقیدے یا مسلک کے پیشوا یا امام منصب حکمرانی کے اہل قرار دیئے جاتے تھے ۔ان مختلف نظاموں میں ریاست کے قیام کا مقصد بھی تبدیل ہوتا رہتا تھا۔کبھی ریاست کا مقصد شخصی اقتدار کا فروغ قرارپاتا ،کبھی کسی خاص نسل یا قبیلے کی منفعت کےلئے کشور کشائی اور کبھی اسے کسی خاص عقیدے کی ترویج واشاعت کے لئے بطور آلہء کار استعمال کیا جاتا ۔

مدتوں کے تجربات کے بعد انسان اس نتیجے پر پہنچا کہ ریاستی بندوبست کی یہ تمام صورتیں معاشرے میں امن و امان، عدل و انصاف اور ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہیں ۔ لہٰذا لوگوں کو تمام معاشرتی سہولیات بہم پہنچانے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ریاست میں حکمران اور رعایا کا فرق ختم کر کے تمام شہریوں کو ریاست کا مساوی رکن تسلیم کیا جائے اور ریاست کا کام صرف اور صرف انسانوں کی دنیاوی زندگی کو خوشحال اورپرُ مسرت بنایا ہو ۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو سیکولر ازم میں ریاست کا بنیادی مقصد ہماری دنیاوی یا زمینی زندگی کو بہتر اور خوشحال بنانے ہی میں مضمر ہے۔ سیکولرریاست اپنے شہریوں کو روٹی کپڑا اور مکان جیسی بنیادی ضروریات زندگی فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لوگوں کو مناسب روزگار اور مناسب تفریحات مہیا کرنا بھی ریاست کی ہی ذمہ داری ہے ۔اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگوں کے جا ن و مال ،عزت و آبرو اور شخصی آزادیوں کی بھی ذمہ داری ہے۔ لوگوں کو مختلف وبائی امراض اور بیماریوں سے بچانا اور ان کی صحت کا خیال رکھنا بھی اس کی ذمہ داری ہے ۔ سیکولر ریاست کا بھی یہ فرض ہے کہ ایسے اصول وقوانین اور پالیسیاں مرتب کرے جن پر عمل درآمد کر کے معاشرے سے جرم اور تشدد کا قلع قمع کیا جائے اور پر امن معاشرے کا قیام عمل میں لایا جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ریاست شہریوں کو حصول علم اور مختلف علوم وفنون میں ذوق پیدا کرنے کے جو مواقع فراہم کرتی ہے اس کے ذریعے جہالت کا خاتمہ کیا جائے۔ اس طرح سیکولر ازم کے اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے سیکولر ریاست انسان دوستی کے جذبے کو پروان چڑھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔

سکولر ریاست میں تمام پالیسوں اور قوانین کا مقصد شہریوں کو سماجی ومعاشی طور پرترقی کے مواقعے فراہم کرنا اور اس کے ساتھ ان کی فلاح وبہود کا خیال رکھنا ہے۔ یعنی سیکولرازم سماج مرتکز نظام ہے۔ جو ریاست کے بجائے معاشرے کو اولیت دیتا ہے۔ اس لیے کہا جاسکتاہے کہ یہایک انسان دوست نظریہ ہے۔ لہٰذا سیکولر ازم کی حقیقی ترقی اور کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں ہر جگہ اور ہر سطح پر سیکولر اقدار کو فروغ دیا جائے کیونکہ اس کے بغیر سیکولر ریاست کامیاب و کامران نہیں ہو سکتی اور انسان دوست معاشرے کا قیام عمل میں نہیں لایا جا سکتا ۔

اشتراکیت ایک ایسا نظام ہے جس کا تعلق پورے معاشرے کی فلاح بہبود سے ہے ۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ فرد کو زندگی کی بنیادی ضروریات روٹی ، کپڑا اور مکان وغیرہ کی فکر سے نجات دلائی جائے اور ہر شخص کو بلا تفریق بنیادی سہولیات بہم پہنچائی جائیں ۔ ہر شخص کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور ترقی کرنے کا موقع ملے اور معاشرے میں دولت کی منصفانہ اور مناسب تقسیم کا معقول انتظام ہو ۔ اس کا مقصد انصاف ، رواداری ، آزادی ، مساوات اور انسان دوستی کا قیام ہے۔

اٹھارھویں صدی کے آخر میں اور انیسویں صدی کے شروع میں انگلستان میں صنعتی انقلاب برپا ہوا اور ایک سو سال کے اندر زندگی کا نقشہ بدل گیا ۔ صنعتی انقلاب نے دنیا کو ایک بڑی مشین مہیا کی ۔ یہ مشینی دور یا میکانکی دور کی نقیب تھی۔ اگر اس سے تہذیب و تمدن کو فروغ ملا تو بربریت اور ہلاکت آفرینی کو بھی فروغ ملا ۔ اس نے امیروں کی تعیشات اور غریبوں کے افلاس میں ایسا فرق واضح کر دیا جو ماضی میں نہیں تھا۔ صنعتی انقلاب کا اہم ترین اثر یہ ہوا کہ پیدائش دولت کے طریقے بدل گئے۔ سرمایہ دارانہ نظام شروع ہوا۔ ملک میں جگہ جگہ کارخانے قائم ہو گئے دستکار مشینی دور کا مقابلہ نہ کرنے کے باعث مجبوراً کارخانوں میں مزدور بن گئے۔ بعض حالات میں مزدوروں کو کئی کئی روز کے فاقے کرنے پڑتے تھے دونوں وقت پر پیٹ بھر کر روٹی کھانا نصیب نہ ہوتی تھی اور سرمایہ دار مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے فائدہ اٹھا کر کم سے کم مزدوری دیتے تھے۔ محنت کشوں کی کمائی کھینچی ہوئی سرمایہ داروں کے پاس چلی جاتی۔ امیر ، امیر تر ہوجاتے اورغریب، غریب ترسرمایہ داروں اور محنت کشوں میں طبقاتی کشمکش کی فضا پیدا ہو گئی تھی جس سے بغض وحسد اور عداوت کے جذبات نشوونما پاتے گئے ۔ ہمدردی ، اخوت اور شفقت نام کو رہ گئی تھی۔

آخر کار اس سرمایہ دار طبقہ اور مزدور کی کشمکش کے دوران جرمن میں ایک ایسا یہودی پیدا ہوا جس نے اپنی تمام زندگی اس غیر منصفانہ تقسیم کے خاتمے کے لیے صرف کردی اس کا نام کارل مارکس تھا۔وہ جاگیر داری نظام کا مخالف تھا۔

کارل مارکس نے اپنا مشہور انقلابی Communist Manifisto (اشتمالی منشور) شائع کیا۔ مارکس نے اس مقالے میں سرمایہ دارانہ نظام کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا اور اس بات پر روشنی ڈالی کہ کس طرح سرمایہ دار مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں اور اپنے سرمائے میں اضافہ کیا اور وہ کس طرح امیر سے امیر تر بنتے چلے گئے۔ آخر کار اس نے دنیا بھر کے محنت کشوں کو متحد ہو کر سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کے خلاف جدوجہد کرنے کی دعوت دی اوراپنی انسان دوستی کا بہترین ثبوت پیش کیا۔

مارکس کا کہنا یہ ہے کہ معاشرے میں سرمایہ داروں کے خلاف نفرت پیدا کرنا ہی کافی نہیں بلکہ اشتراکی پسندی کے لیے ضروری ہے کہ عملی طور پر میدان میں اتریں اور انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں۔

کارل مارکس کا کہنا یہ ہے کہ یہ بات درست ہے کہ مشین اور خام مال سرمایہ دار کا ہوتا ہے مگر محنت مزدور کی ہوتی ہے۔ اس طرح دونوں ہی قدر زائد کے مساوی حقدار ہوتے ہیں ۔ مگر سرمایہ دار قدر زائد سے مزدور کو مکھن سے بال کی طرح نکال دیتا ہے۔ جبکہ مزدور کی محنت اور مالک کی مشین سے جو چیز تیار ہوتی ہے۔ وہ جب فروخت ہوتی ہے تو محنت کش کی اجرت اور کارخانے پر لگائی جانے والی رقم کے مقابلہ میں کہیں زیادہ قیمت حاصل کرتی ہے۔ لہٰذا اس چیز کی قیمت فروخت اور محنت کشوں کو اداکی جانے والی اجرت میں جو نمایاں فرق ہے وہی"قدر زائد"ہے اور اس پر مزدور کا حق ہے۔ مگر اسے اس حق سے محروم کر دیا جاتا ہے اور مالک اسے غصب کر لیتا ہے۔ مارکس انہی بنیادوں پر سرمایہ دار کے خلاف صف آرا ہو کر مزدوروں کو محاذ آرائی کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ محنت کش اور مزدور طبقہ خود اپنے حق کے لیے آواز بلند کرے۔ سرمایہ دار کو اپنی محنت اور طاقت کا احساس دلائے اور اسے یہ باور کروائے کہ مالک اور مزدور میں کوئی فرق نہیں ۔

کارل مارکس دنیا میں عادلانہ نظام معاشرہ قائم کرنے کے لیے جدوجہد کررہا تھا۔ وہ معاشی مساوات کی بنیاد پر عالمی حکومت قائم کرنے کے لیے تگ و دو کررہا تھا۔ اس پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ مسلح جدوجہد اور انقلابی کشمکش ، زور اور طاقت کے بغیر ہمہ گیر

جبرو استحصال کو ختم نہیں کیا جاسکتا ۔ اس طرح وہ ایک انسان دوست معاشرے کا خواہش مند تھا جہاں انسان دوستی کے جذبے کو فروغ مل سکے۔یہ ایسا انسان تھا جو دوسروں کوخوش کرکے سب سے زیادہ خوش ہوتا تھا۔ تمام عمر سوشلزم کی خدمت کرتا رہا یہ وہ عظیم انسان تھا جس نے کاشت کاروں کی سر فرازی کی جدوجہد میں بڑی سے بڑی قربانی سے کبھی دریغ نہ کیا۔

مذہبی نظریہ انسا نی عظمت کا قائل ہے اور اس کے تسلیم کیے جانے پر زور دیتا ہے۔ عظمت انسان کے لیے اسلام کا انداز بڑا عقلی اور منطقی ہے۔ مقام انسان کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے تین اہم سوالات اٹھا کر ان کا جواب دیا ہے۔ ان جوابات میں انسان کا مقام بھی متعین ہو گیا اور اسکی عظمت بھی ثابت ہو گئی۔ انسان کا مقام بھی فلسفہ اور مذہب کے ان تین مشترک مسائل کے حل پر منحصر ہے۔

۱۔ کائنات کیا ہے؟
۲۔ کائنات کا بنانے والا کون ہے؟
۳۔ انسان کیا ہے اور اسکا اصل مقام و مرتبہ کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ساری کائنات کو مسخر تو ضرور کر دیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کائنات کی ساری نعمتیں بغیر محنت و مشقت کے ہاتھ آجائیں گی بلکہ قرآن کے مطابق اسکی خاطر انسان کو تحقیق و جستجو کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جوں جوں انسان تحقیق و جستجو کے میدان میں آگے بڑھتا جائے گا۔ اس کائنات کی نت نئی نعمتیں اس کے سامنے آتی جائیں گی۔

اسلام نے تسخیر کائنات کا جو تصور عطا کیا ہے وہ مغرب کے مادہ پرستانہ تصور سے بہت مختلف ہے۔ مغرب کی تنگ نظری مادے کے اس پار کچھ دیکھنے اور سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ لہٰذا اسکو اپنی تحقیق و جستجو کے نتیجے میں جو نئی چیز دریافت ہوتی ہے وہ اسے محض عقل و فکر اور اپنی محنت و کاوش کا ثمرہ سمجھتی ہے۔

لیکن اسلام کی نظر اس محنت و جستجو اور ان تجربات و انکشافات پر جا کر نہیں رکتی بلکہ وہ ان سب کے پیچھے اس خالق و مالک کی قدرت کا ملہ کا نظارہ کراتا ہے۔ جس نے ایک طرف پوری کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے اور دوسری طرف انسان کو وہ عقل و فکر اور وہ طاقت و توانائی عطا کی ہے جس کے ذریعے اس نے کائنات کی عظیم طاقتوں کو رام کر لیا ہے۔

قرآن مجید انسانی عظمت کو بہت خوبصورت انداز میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ۔

۲۔ قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور طور سنین کی اور اس امن والے شہر کی۔ ہم نے بنایا انسان کو خوب سے خوب اندازے پر۔
۳۔ اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا اور نفیس نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی۔
٤۔ مو سیؑ نے فرمایا: بہت جلد اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دیں گے اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا مالک بنادیں گے پھر تمہارا طرز عمل دیکھیں گے۔
٥۔ اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں صاحب اختیار بنایا اور ایک کا دوسرے پر رتبہ بڑھایا تاکہ (ظاہرا) تم کو آزمائے ان چیزوں میں جو کہ تم کو دی ہیں ۔

اسلامی معاشرے میں نہ تو امارت کسی کے لیے وجہ تکریم ہیں اور نہ غربت وجہ ذلت نہ کوئی نسل کے لحاظ سے مسند صدارت پر بیٹھنے کا زیادہ مستحق ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور وجہ سے محرومِ عظمت، دنیا کا ہر انسان محض انسان ہونے کے ناطے احترام کا مستحق ہے۔

اردو شاعری میں انسان دوستی کی تاریخ و روایت کا جائزہ لیں تو سب سے پہلے بر صغیر پاک و ہند میں صوفیائے کرام اور فارسی شعراء کی مذہبی ، اخلاقی اور اور صوفیانہ شاعری پر نظر جاتی ہے۔ اس شاعری میں گو ابتدائی اردو زبان کے خدو خال بنتے دکھائی دیتے ہیں ۔ لیکن مو ضوعاتی اعتبار سے اس میں انسان دوستی کے مختلف نمونے ملتے ہیں ۔

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلام سلامتی کا علمبردار ہے۔ وہ امن ، اخوت ، محبت اور مساوات کی تعلیم دیتا ہے ۔ بھائی کو بھائی سے ملا تا ہے اور دلوں کو نفرت سے دور کرتا ہے ۔ صوفیاء کرام بھی یہی پیغام لیکر ہندوستان آئے ۔ ان کے اخلاق کی کشش اور انسان دوستی کے جذبے نے انسانوں کا دل موہ لیا ۔ ان کے گفتار و کردار میں خلوص تھا ، پیار تھا ، شیرینی تھی ، نہ کسی کو تکلیف پہنچائی نہ کسی کا دل دکھایا ، سب کے مونس و غمخوار تھے ۔ ان کی تگ و دو ملکوں کو اجاڑنے کے لیے نہیں بلکہ انسانوں کو سنوارنے کے لیے ہوتی تھی ۔یہ تخریب کے نہیں بلکہ تعمیر کے علمبردار تھے ۔یہ پتھر صفت انسانوں میں پارس کی خوبیاں پیدا کرنے کا جوہر رکھتے تھے ۔ انہوں نے نفس کو عبادت کی مشق کرانا اور اسے احکام الہی کی طرف پھیرنے کا کام کیا ۔حقوق اللہ اور حقوق العبادپر عمل کرنا ، اکل

حلال ، اللہ کی عبادت اس طرح کرنا گویا اسے دیکھ رہے ہوں ۔ تمام اچھے اخلاق کو اختیار کیا اور برے اخلاق کو ترک کیا۔

ان کے نزدیک مخلوقِ خدا کی خدمت اور دوسروں کو دینا بہترین عمل تھا۔ انہوں نے وطنیت، قومیت، رنگت اور لسانیت کے تنگ دائروں سے نکل کر آفاقیت آشنا ہونے کا درس دیا۔ سفاکی، ظلم وتشدد اور حیوانیت کی جگہ جوہر انسانیت کو اجاگر کرنے کی تعلیم دی ۔پورے برصغیر پاک وہند میں انسان دوستی، مروت اور اجتماعیت کی مستقل روایت کو پیدا کیا اور نہ صرف اس علاقے میں بسنے والے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان تہذیبی وثقافتی اشتراکات کو پیدا کیا بلکہ مذہبی سطح پر بھی رواداری، عمل اور برداشت جیسے رویوں کو فروغ دیا۔

فارسی شاعری میں انسان دوستی ، محبت ، رواداری ، وسیع المشربی ، آزادی خیال اور اتحادِ مذاہب کا درس ملتا ہے ۔ فارسی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کا مزاج روحانی ہے ۔ یہ دلوں میں خدا کی ہستی کا یقین پیدا کرتا ہے ۔دنیا خدا کی طرف یوں کشش پر مجبورہے جس طرح عاشق محبوب کی طرف کھینچا ہوا چلا جاتا ہے۔ ان شعراء کے ہاں وحدت الوجود کا تصور دکھائی دیتا ہے۔ جس کے تحت خدا کی ذات ہی اول ہے وہی آخر وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ۔ اس کی وحدت کا تصور دوئی اور غیرت کے سائے سے پاک ہے۔ گویا کائنات کو خدا کا پر تو سمجھنا بلکہ یوں کہیے کہ اس کے سوا ہر دوسری شے کی نفی ہو جاتی ہے جب عقیدہ یہ ہو تو انسان انسان میں فرق بے معنی ہوجاتا ہے ۔اس وحدت سے انسانی وحدت اور اس مساوات سے انسانی مساوات اور محبت کل کی نہریں نکلتی ہیں ۔ ساری فارسی اور اردو شاعری میں محبت کل کا نمایاں عکس نظر آتا ہے ۔ خدا ایک محبوب ہے جس کے عشق میں تمام ذراتِ عالم سرگرداں ہیں ۔ عشق کے معاملے میں یہ مجاز سے حقیقت کی طرف پیش رفت کے قائل ہیں ۔ چنانچہ اس روئے ارض پر موجود تمام مخلوقات ان کے لیے عشق کی اولین منزل بن جاتی ہیں اور یہیں سے انسان دوستی کے چشمے پھوٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ۔

فارسی کے کلاسیکی شعراء متعصبانہ ، وطن پرستی ، جارحانہ نسل پرستی اور قوم پرستی اور مذہبی تنگ نظری کے تصور کے خلاف ہیں ۔ ان شعراء نے رنگ ونسل کے امتیازات کو مٹاتے ہوئے تمام بنی نوع انسان کو محبت ، رواداری اور انسان دوستی کا درس دیا اور اس کی خاطر ہر قسم کی تکالیف اور پریشانیوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور تمام دنیا میں امن و آشتی اور پیار و محبت کا راگ الاپا۔فارسی شعراء میں غم کا عنصر غالب دکھائی دیتا ہے۔ خیاؔم کے نزدیک غموں کو پاس نہ

آنے دیا جائے اور شراب و شاہد کی دلفریبیوں سے تلخئ روزگار کو مٹا دیا جائے ایک ایسا تصور تھا جو اردو شاعری میں آزادی اور انسان دوستی کی شکل میں ظاہر ہوا ۔

اسی طرح دقیقیؔ جیسے نامور شاعر نے بھی آزاد خیالی، رواداری اور انسان دوستی اور رندی کے مضامین بہت عمدگی سے باندھے ہیں ۔ عمر خیام نزدیک بھی سب سے بڑی نیکی یہی ہے کہ انسان دوسروں کو تکلیف نہ پہنچائے اور اس کے ظاہر و باطن میں تضاد نہ ہو ۔ فارسی کے صوفی شاعروں کے علاوہ ان شاعروں نے بھی جور سماَ ّ صوفی نہیں اخلاق کا ایک نظام تجویز کیا ۔ چنانچہ سنائی ، عطار اور رومی وغیرہ کے علاوہ نظامی ، ابن یمین ، سعدی اور حافظ انوری، خاقانی اور خسرو اور بہت بعد میں صائب وغیرہ نے اخلاق اور انسان دوستی کی ایک خاص نہج سے ہمیں آشنا کیا دنیا میں کون ہے جوکشتۂ غم نہیں کون ہے جو تغیرات و انقلابات کے صدمے نہیں اٹھاتا۔ لیکن ان کا بہادری سے مقابلہ کرنا ہی حافظہؔ کا بنیادی نکتہ ہے۔ان کے ہاں زندگی کا خلاصہ سوزِعشق ہے۔وہ دل جس میں نورِ اخلاص ومحبت نہیں وہ تیرہ و تاریک ہے۔ان کے نزدیک زندگی نیکی،نکوئی اور خیر کا نام ہے ۔اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ کسی سے بُرائی نہ کی جائے کسی کا بُرا نہ سوچا جائے ۔اس رویے کے لئے صفائے قلب کی ضرورت ہے یعنی دل کا نفاق ،انتقام ،حسد اور مکر سے پاک ہونا لازمی ہے۔ اور یہی انسان دوستی کی خصوصیات ہیں ۔ حافظؔ نے ایسی ہی انسانیت نوازی پر زور دیا ہے۔

رومی ؒکے کلام میں عظمت انسانی کے مطالب بھی ہیں اور انسان کامل کی تلاش اور اس کے نقوش اور اس کی تعریف و توصیف بھی موجود ہے۔ وہ انسان کو عالم اکبر اور مظہر آیات حق کہتے ہیں ۔

فردوسیؔ کی شاہنامہ میں موجود نصیحتیں اور حکیمانہ اقوال انفرادی اور اجتماعی طور پر لوگوں کو نیکی ، شجاعت ، بزرگی، بلند ہمتی ، خدا پرستی ، حکمرانی ،عدل گستری اور مردم پروری کی تعلیم دیتے ہیں اور انسان دوستی کے پیغام کو عام کرتے ہیں ۔اس کے نزدیک انسان تمام مخلوفات میں افضل واعلیٰ ہے اور تمام مخلوقات اس کی مطیع اور فرما نبردار ہیں ۔ خسرّو نے ان ہی سے سلوک ، طریقت ، ریاضت اور درویشی کی تعلیم حاصل کی ۔ خسرّو کے ہاں تقویٰ اور اخلاقی مضامین بکثرت دکھائی دیتے ہیں ۔امیر خسرو نے اپنی تصنیف " آئینہ سکندری " میں اپنی انسان دوستی کو بیان کیا ہے ۔ اپنی مثنوی " مطلع الانوار " میں انسانی عظمت کی وضاحت کی ہے۔سعدیؔ کی حکایتوں میں اتحاد و یگانگت ، پیار و محبت اور انسان دوستی کی تعلیم ملتی ہے۔ سعدؔی کے نزدیک اللہ کے نیک بندے وہ ہوتے ہیں جو لوگوں کے غم کو اپنا غم

سمجھتے ہیں اور جب کسی کو غم میں مبتلا دیکھتے ہیں تو خود بھی غمگین ہو جاتے ہیں ۔
آٹھویں صدی ہجری میں دکن میں علم و ادب کی ابتداء ہوئی ۔ اس زمانے کی تصانیف میں زیادہ تر مذہبی کتابیں شامل ہیں ۔ اس دور میں ہمیں تین قسم کے موضوعات دکھائی دیتے ہیں ۔اول کسی دلچسپ ، عجیب اور معروف حصے کو نظم کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے اور قاری کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ اسے نصیحت حاصل ہو۔ دوم کسی مشہور مذہبی یا تاریخی واقعے کو داستانی دلچسپی کے ساتھ نظم کر دیا جاتا ہے۔ سوم : تصوف اور اخلاق پر مشتمل موضوعات ہیں ۔

حضرت گیسودراز نے دکن میں چشتی سلسلہ کے اس مسلک کو فروغ دیا جو انسان اور انسان کی محبت پر یقین کامل رکھتا تھا۔ یوں انسان دوستی، محبت اور روشن خیالی کے ذریعے دکن میں گیسودراز اور ان کے مسلک کو مقبولیت خاص حاصل ہوئی۔انہوں نے تعزیر کی جگہ محبت و عنایت کو فروغ دیا اور ظلم کی جگہ لطف وکرم کو عام کیا۔

حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کی صوفیانہ تحریروں میں "شہادت الحقیقت" "خوشنامہ" ،خوش نغز" اور "مغزمرغوب" شامل ہیں ۔ان چاروں کتابوں میں تصوف کے مسائل کا بھر پور بیان ملتا ہے ۔اس کے علاوہ انہوں نے دوہے بھی لکھے۔ ان دوہوں نے عام آدمی کی اخلاقی تربیت اور اصلاح کا بھرپور فریضہ سر انجام دیا۔معاشرتی دکھ درد، پیارو محبت، اخلاقِ انسانیت، نیکی و شرافت اور انسان دوستی ان دوہوں کے مقبول موضوعات تھے۔

دکن میں بہمنی سلطنت کے زوال پر یہاں پانچ آزاد اور خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں ان میں سے د و مشہور ریاستیں جن میں بیجا پور کی عادل شاہی ریاست اور گولکنڈہ کی قطب شاہی ریاست شامل ہے۔ ان دونوں ریاستوں نے اردو زبان و ادب کی ترقی و فروغ اور انسان دوستی میں اہم کردار ادا کیا ۔

عادل بادشاہوں کا دور حکومت (۱٤۹۰۔۱٦۸۵) تقریباً دو سو برس کے عرصے پر محیط ہے۔ اس طویل عرصے میں عادل شاہیوں کی علم و ادب سے دلچسپی اور سرپرستی کی بدولت بے شمار شعراء اور مصنفین پیدا ہوئے ۔ جن میں شاہ برہان الدین جانم ، صنعتی، ملک خشنود ، کمال خان رستمی ، حسن شوقی ، شاہ امین الدین اعلیٰ ، نصرتی اور سید میراں خان کا نام قابل ذکر ہے ۔ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے انسان دوستی کا پیغام عام کیا۔
گولکنڈہ کے قطب شاہی حکمرانوں (۱۵۱۸۔۱٦۸٦) نے بیجا پور کے عادل شاہی حکمرانوں کی طرح اپنی ذاتی کاوشوں سے اردو زبان وادب

کو بہت فروغ دیا ۔ قطب شاہی حکمرانوں کی شعروسخن سے دلچسپی اور اہل علم وفضل کی قدردانی اور شعراء وعلماء کی سرپرستی کی بناء پر ان کے دور حکمرانی میں بڑے بڑے علماء نے اردو زبان کو خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور شاعری کو فروغ حاصل ہوا ۔ اس دور کے اہم شعراء میں محمدقلی قطب شاہ ، وجہی ، ملاغواصی، ابن نشاطی اور بلاقی وغیرہ نمایاں ہیں ۔ محمد قلی قطب شاہی سلطنت کا پانچواں فرمانروا اور پرگو شاعر تھا ۔اس نے اپنی شاعری کو صرف ادب کے مخصوص موضوعات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس نے زندگی کی ہر چھوٹی بڑی اہم اورغیر اہم بات کو شاعری کا موضوع بنایا ۔ ان کی شاعری میں مذہب ، درباری زندگی ، محلات کی رنگ رلیاں ، مناظر فطرت، ہندو مسلم رسومات، تقریبات، کھیل کود، تجارت پیشہ لوگوں کی زندگی غرض ہر موضوع شامل ہے جو ان کی انسان دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہے ۔

آغاز ہی میں دکن اور شمالی ہند میں مذہبی شاعری اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی اخلاقی اور مذہبی نظمیں لکھی گئیں ۔ اس کے علاوہ مثنوی یا مرثیہ ، رزم نامہ اور غزل میں بھی اخلاقی اور انسانی دوستی کے موضوعات بکھیرے پڑے ہیں ۔ ہند میں طنز و ہجو کی روایت کا پہلا بھر پور شاعر جعفر زٹلیؔ ہے ۔وہ اپنے دور کا بھرپورتر جمان ہے۔

شمال میں اردو شاعری کا آغاز ایہام گوئی کی تحریک سے ہوا ۔ ولی کی شاعری کو ملک بھر میں جو قبول عام حاصل ہوا یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس کا تتبع بڑے پیمانے پر ہوا ۔ چنانچہ ولی کے تلامذہ میں شیخ نثار ، عمر ، رضی اور اشرف اور ان کے معنوی تلامذہ سراجؔ، داؤدؔاور عزلت وغیرہ نے ایہام کو اپنا شعار بنایا اور دلی میں خان آبرو کے شاگردوں میں سے شاہ مبارک آبروؔ ، مضمون اور یک رنگ اور اس کے علاوہ ناجیؔ اور حاتمؔ نے فارسی شعرائے متاثرین کی روایت اور دیوان دلی کی آمد سے ایہام گوئی کی بنیاد رکھی۔

ایہام گوشعراء کے ہاں جہاں ترتیب لفظی اور صنعت گری کے نمونے کثیر تعداد میں ملتے ہیں ۔ وہاں ان شعراء کے کلام میں پندو نصائح ، تجربات دنیا ، اخلاقی درس اور انسان دوستی کے موضوعات بھی دکھائی دیتے ہیں ۔ آبروؔ کے ہاں اخلاقی درس کی جو صورت دکھائی دیتی ہے ۔ وہ ان کی انسان دوستی کی غمازہے۔شاکر ناجیؔ کے ہاں پندونصائح ،انسان دوستی اور تجربات دنیا کی جھلک یوں دکھائی دیتی ہے ۔

کر لو کرم اے مہرباں پھر ہم کہاں اور تم کہاں

نہیں دیکھ سکتا آسماں پھر ہم کہاں اور تم کہاں
(دیوان شاکر ناجی ،ص:۲۸۰)

ایہام گوئی کے خلاف جلد ہی رد عمل شروع ہوگیا اور حاتمؔ نے اپنے دیوان سے ایہام کے اشعار نکال کر اپنا شعری مجموعہ " دیوان زادہ " کے نام سے ترتیب دیا ۔آئیے اس دیوان میں انسان دوستی کے نمونے دیکھتے ہیں۔

حاتمؔ نے اپنے عہد کی سیاسی افراتفری ، معاشی بدحالی ، معاشرتی بے راہ روی ، اخلاقی پستی اور انسانی قدروں کی بیخ کنی کا جس مہارت سے بیان کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماحول کے نشیب و فراز سے کتنے باخبر تھے ۔ وہ اپنے عہد کے خاموش تماشائی یا محض ترجمان نہیں تھے بلکہ نقاد بھی تھے ۔ وہ اختلاط پذیر نظام کی خامیاں اور نقائص کو منظرعام پر لاکر ایک انسان دوست شاعر کی حیثیت سے اس کی بہتری کے خواہاں تھے ۔ ان کے کلام میں ہمیں ہندوستان کے شہروں اور نگروں کے لٹنے اور ویران ہونے خصوصاً دار السلطنت دلی کی تباہی کا نقشہ صاف دکھائی دیتا ہے ۔ جہاں وہ گلستان باغ ، چمن اور آشیاں کا ذکر کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کنایتہ اپنے ملک و وطن اور گھر بار کا ذکر کر رہے ہیں ۔ اسی طرح ظالموں ، قاتلوں ، لٹیروں اور غارت گروں کو کبھی باغبان ، کبھی گل چین اور صیاد کے ناموں سے پکارتے ہیں اور چمن کے باسیوں کو غنچہ ، گل ، پھول اور بلبل سے تشبیہ دیتے ہیں اور اسی طرح دور امن و خوشحالی کو بہار سے اور دورِ انتشار و اضطراب کو خزاں سے ۔

اب کے چمن میں گل کا نے نام و نشان ہے
فریاد بلبلان ہے یا شہرئہ خزاں ہے
تو رنگ گل کے اوپر مت بھول کہ اے بلبل
پلک کے مارتے فصل بہار گزرے ہے
درودیوار چمن آج ہے خوں سے لبریز
دست گل چیں سے مبادا کوئی دل ٹوٹا ہے
(دیوان زادہ)

میر وسودا کے دور کو ایہام گوئی کے رد عمل کی تحریک کی توسیع قرار دیا جا سکتا ہے ۔اس عہد کو اردو شاعری کے دور ِزریں سے بھی موسوم کیا جاتا ہے ۔اس دور کی شاعری کا جائزہ لیں تو اس میں متصوفانہ، اخلاقی اور انسان دوستی کے مضامین بکثرت دکھائی دیتے ہیں ۔

سودؔا ایک بہت بڑے انسان دوست شاعر ہیں ۔ ان کی انسان دوستی ، مروت ، محبت ، ہمدردی اور دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کی صفت کے نمونے ان کے کلام میں جابجا دکھائی دیتے ہیں ۔ سودا ؔسمجھتے ہیں کہ جب تک انسان کی زندگی ہے اسے اپنی یہ زندگی مخلوق خدا کی خدمت میں صرف کردینی چاہیے۔کیونکہ انسان کے اعمال ہی اسکی اخروی زندگی میں کام آتے ہیں ۔اس لئے جہاں تک ہو سکے نیکی کے کام کرنے چاہیں اور انسانی فلاح و بہبود ہی کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔انسانیت نواز سودا ؔکے مطابق تمام انسان آدمؑ کی اولاد ہیں ۔کسی میں کوئی تفریق اور فرق روا نہیں رکھنا چاہیے ۔

افسوس کریوں میں نہیں یہ دستور
مفلس پہ کرم کر کے نہ ہوویں مغرور
جھکتا ہے اگر شاخ ثمر دار کا ہاتھ
پھل دے کے وہیں آب کو کھینچے ہے دور
(کلیات سودا جلد چہارم ،ص:۲٤۱)

سوداؔکے خیال میں اس جہاں رنگ وبو کا سب سے لازاوال رشتہ پیارو محبت کا رشتہ ہے ۔ یہ رشتہ رنگ و نسل اور تہذیب وعقیدے کی تفریق سے با لا تر ہے ۔ محبت کے اس رشتے میں بندھے ہوئے لوگ خدمت خلق کو اولیت دیتے ہیں ۔ رواداری اور وسیع المشربی جیسی صفات ان کی ذات کا حصہ ہوتی ہیں ۔ ایک رباعی کے اشعار دیکھیے ۔

زیر فلک جتنی کہ یہ موجودات
ہر ایک کی اک طرح کٹے ہے اوقات
اے شیخ کیا خوب یہ ہم نے تحقیق
شیخی و کرامات ہے بن آئے کی بات

(کلیاتِ سودا جلد چہارم
،ص :۲۳۸)

ا میرؔ کی طبیعت میں درد مندی ، کسک ، سوزوگذار اور انسان دوستی کے جو جذبات دکھائی دیتے ہیں وہ ان کے والد علی متقی کی سیرت کا پر تو ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ میرؔ کو انسان دوست شاعر بنانے میں ان کے عہد کے سیاسی وسماجی حالات نے بھی اہم کردار ادا کیا ۔میرؔ چونکہ وحدت الوجودی عقیدے سے متاثر تھے لہٰذا وہ اسی ذات کو تمام کائنات کے حسن اور خوبصورتی کا مرکز و منبع قرار دیتے ہیں ۔

میرؔ کو کائنات میں حسنِ مطلق کی جھلک سب سے زیادہ اشرف المخلوقات یعنی انسان میں دکھائی دیتی ہے ۔ چنانچہ میرؔ کی شاعری کا مرکز و محور انسان ہے ۔ وہ انسان جسے دنیاکے اکثر مفکرین نے اس کائنات کی کمتر اور حقیر شے تصور کیا ہے ۔ میرؔ کے نزدیک نہایت قابل احترام اور جملہ مخلوقات میں شاہکار اور مشیت کے لیے باعثِ فخروناز پیکر ہے۔ گویا انسان کو یہ عزت اور احترام دینے والی ذات رب تعالیٰ ہی کی ہے ۔

یہ صنعت گری اس ہی صانع سے
آئے
کفِ خاک کو آدمی کر دکھائے
نہ آوے کسی کے جو ادراک میں
سو رکھ جائے وہ اس کفِ خاک میں
(کلیات میر جلد ششم
،ص:۸۹۔۹۰)

میرؔ کے ہاں انسانی فضیلت اور برتری کا جو تصور دکھائی دیتا ہے اس کا اصل سرچشمہ تصوف کے افکار سے ہی پھوٹتا ہے ۔ انھوں نے انسان کو مخلوق اور خدا کو ایک برتر ہستی ہی قرار دیا ہے اور خدا کے اس احسان کو مانا ہے کہ اس نے ہمیں پیدا کیا اور ساری مخلوقات پر فضیلت اور برتری کا شرف عطا کیا ہے ۔ میرؔ کی رباعی کے اشعار اس حقیقت کے غماز ہیں ۔

کیسا احسان ہے خلق عالم کرنا
پھر عالم ہستی میں مکرم کرنا
تھا کار کرم ہی اے کریم مطلق
ناچیز کفِ خاک کو آدم کرنا
(کلیاتِ میر جلد
پنجم ،ص:٤)

میرؔ کی تمام تر شاعری میں ہمیں انسان دوستی ، مذہبی رواداری اور بے تعصبی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ شاید یہ سب کچھ میرؔ کے عہد اور اس کے گھریلو ماحول کی دین ہے۔ دراصل میر تمام مذاہب اور اس کے پیروکاروں میں یکجہتی دیکھنے کے متمنی ہیں ۔ کیونکہ یکجہتی پر امن معاشرے کی ضامن ہے۔ ان تمام کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس عہد میں ہمیں تمام مذاہب کے لوگ ایک لڑی میں پروے ہوئے ایک قوم کی صورت میں نظر آتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال ہولی کی عید عام طور پر ہندو اور مسلمان دونوں ملکرمناتے تھے اور بادشاہ اور امر اس میں خاص طور پر دلچسپی لیتے تھے۔ انسان دوست میرؔنے اپنی مثنوی "دربیانِ ہولی" میں اس کا نقشہ اتارا ہے۔

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر
رنگ محبت سے عجب ہیں خرد و پیر
شیشہ شیشہ رنگ صرفِ دوستاں
صحنِ دولت خانہ رشکِ بوستاں
دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جواں
جیسے گل دستہ تھے جووں پر رواں

(کلیاتِ میر جلد ششم، ص: ۲۸۱)

میر و سوداؔ ہی کے دور میں قائم ، میروسوز ، میر اثر اور میر حسن جیسے اہم شعراء بھی تھے ۔ میر حسن نے شاعری میں میر و سودا کی پیروی کی ۔ ان کی شاعرانہ زندگی کا لافانی کارنامہ ان کی مثنوی " سحر البیان " ہے۔ سحر البیاں کے کرداروں میں بے عملی میں عمل اور جمود میں حرکت پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے ۔ جس کی عکاسی نجم النساء کا کردار ادا کرتا نظر آتا ہے ۔ اس کے علاوہ میر حسن ، شہزادہ بے نظیر کے اوصاف حمیدہ کو پیش کر کے اپنے فلسفہ انسان دوستی کی جھلک دکھاتے ہیں ۔

دیا شنکر کی مثنوی گلزارِ نسیم لکھنوی تہذیب و تمدن کی فضا اور مزاج کی بہترین عکاس ہے ۔اس کے کرداروں کی کوئی مکمل اور زندہ شخصیت مرتب نہیں ہوتی ۔ یہ مخلوق نہ ناری ہے نہ خاکی۔ تاہم ان کرداروں میں قلب انسانی کی تڑپ موجود ہے ۔ بعض سہیلیوں میں انسانیت اور انسان دوستی کے جذبات موجود ہیں ۔ اس کے علاوہ گلزار نسیم کا تہذیبی ، اخلاقی اور انسان دوستی کا پہلو بھی اس کی انفرادیت کا حامل ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ کریں :

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجئے

مثنویات کے علاوہ مراثی گوئی بھی شعری ادب کا میدان خاص ہے۔اس لہذا سے دیکھا جائے تو ارود مرثیہ اور انیس ہم معنی الفاظ ہیں ۔

میر انیسؔ کے مراثی کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں اخلاقی مضامین اور انسانیت دوست قدروں کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔شعر کا ایک ایک مصرع اصول اخلاق کا سمندر محسوس ہوتا ہے اور انسانی قدروں اور انسان دوستی کی متعدد مثالیں مرثیوں میں ملتی ہیں ۔دنیا کی بے ثباتی کا فلسفہ جو درس اخلاق اور انسان دوستی کا جزو خاص ہے اس کو عمدگی سے بیان کرتے ہیں ۔اشعار ملاحظہ کیجیے۔

تھوڑے سے بستروں کی ہے درکار ہم کو جا
جنگل ہوا تو کیا جو ترائی ہوئی تو کیا
ہے عمر بے ثبات زمانہ ہے بے وفا
آرام کا محل نہیں یہ عاریت سرا
اب وہ کہاں ہیں شہر جنہوں نے بسائے ہیں
سب اس زمین پہ خاک میں ملنے کو آئے ہیں
(انیس کے مرثیے)

نظیرؔ کی " آدمی نامہ" انسان دوستی کی معراج ہے ۔اس میں ہمدردی ،دلسوزی ،خلوص اور انسان دوستی کے جلوے کارفرما دکھائی دیتے ہیں ۔ نظیرؔ دراصل ایک زندہ دل ،بے ضرر، سادہ مزاج اور زندگی اور زندگی کے ہنگاموں سے محبت کرنے والا شخص تھا۔اس نے عوام کی اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر ایک سچے شاعر اور فنکار کی حیثیت سے زندگی کی عکاسی اور ترجمانی کے فرائض سر انجام دیئے ہیں ۔"آدمی نامہ " میں انہوں نے ایک انسان دوست شاعر کی حیثیت سے مفلس عوام کے زخموں پر مرہم لگانے کی کوشش کی ہے۔جہاں ہر شخص آدمی ہونے کی حیثیت سے ایک ہی کشتی کا سوار نظر آتا ہے ۔انسانی عظمت کے سامنے طبقات کی تقسیم بے معنی ہے۔ہر شخص جو ایک مرد و عورت سے پیدا ہوا ہے وہ "آدمی " ہے۔ نظیر نے دراصل اس نظم میں انسان کے رنگ اور رتبے کی تصویر کشی کرتے ہوئے بڑے لطیف پیرائے میں مساواتِ بشر کا خیال عام کیا ہے۔

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی
آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی
آدمی
زردار بینوا ہے سو ہے وہ بھی
آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ
بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ
بھی آدمی
(کلیات نظیر،
ص: ٦٠٤)

نظیرؔ کے عہد کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی مسئلہ تھا اور نظیرؔ کی شاعری میں یہ مسئلہ بہت نمایاں ہے ۔وہ جب اپنے عہد کی بدحالی اور انتشارکا تجزیہ کرتے ہیں اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کو تیز ی سے مٹتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان سب کی تہہ میں انہیں اقتصادی مسائل ہی نظر آتے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی نظموں میں آٹے ،دال ،روٹی مفلسی ،پیسہ وغیرہ جیسے اہم مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے۔وہ انسان دوست ہیں ۔اس لئے زندگی میں عام آدمیوں کی طرح شامل ہیں ۔وہ دنیا کی حقیقت کو سمجھتے ہیں وہ سماجی عوامل سے اچھی طرح واقف ہیں ۔

نظیرؔ کو اس دنیا اور اس دنیا کے لوگوں سے بڑی محبت ہے۔جس طرح وہ ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں شریک ہے۔ اسی طرح وہ اُن کے غموں پر آنسو بہاتا ہے۔وہ ایک سچے فنکار کی طرح بہتر معاشرے کا خواہاں ہے۔ایسا معاشرہ جس سے رنج و غم اور کلفت و یاس کا خاتمہ ہو جائے ۔اپنے زمانے کے جاگیر دارانہ نظام سے علیحدہ ہو کر اس نے عوام سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہا۔یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرے میں مساوات کے قائل تھے۔ ان کی نظر میں انسانوں کے تمام امتیازات اخلاقی اقدار ،زر و دولت ،عہدہ و خاندان اور لباس کی وجہ سے قائم کئے جاتے ہیں جو سب کے سب عارضی اور سطحی ہیں ورنہ تما م انسان امیر و غریب ،ادنیٰ و اعلیٰ ،زاہد و رند وغیرہ سب برابر ہیں ۔ ان میں انسان ہونے کی قدر مشترک ہے۔

نظیرؔ ایک بے تعصب شاعر اور بے تعصب انسان تھے ۔ وہ نفرتوں ،کدورتوں ، تعصبات اور کینہ پروریوں سے بینیاز اور بلند تر تھے۔ ان کے دماغ کے دریچے ہر جانب کھلے تھے۔ ان کے دل میں کسی کے بارے میں کوئی عنادیا میل نہیں تھا۔ ان کا حلقہ احباب وسےع تھا اور اس

حلقہ میں امیر وغریب ، عالم وجاہل پیشہ ور اور غیرپیشہ ور ، ہند و مسلمان کسی کی قید نہ تھی۔ اس وسیع النظری اور وسیع المشربی کا اثر ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔

ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا دیوالی کا
ہر اک طرف کو ہوا اجالا دیوالی کا
سبھی کے دل میں سماں بھا گیا دیوالی کا
کسی کے دل کو مزا خوش لگا دیوالی کا
عجب بہار کا ہے دن بنا دیوالی کا
(کلیاتِ نظیر ، ص:٤٢٦)

١٨٥٧ کے ہنگامے کے بعد ملک میں ایک تعطل پیدا ہو گیا تھا۔ اس تعطل کو دور کرنے اور زندگی کو ازسر نو متحرک کرنے کے لیے حکومت کے ایما پر مختلف صوبوں اور شہروں میں علمی و ادبی سوسائٹیاں قائم کی گئیں ۔ سب سے پہلے بمبئی ، بنارس ، لکھنو ، شاہ جہاں پور، بریلی اور کلکتہ میں ادبی انجمنیں قائم ہوئیں ۔ ایسی ایک انجمن لاہور میں قائم کی گئی۔ جس کا پورا نام "انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب" (٦٧)تھا۔ جو بعد میں انجمن پنجاب کے نام سے مشہور ہوئی۔

انجمن پنجاب کے زیر اہتمام ١٨٧٥میں جدید شاعری کے مشاعرے شروع ہوئے جنہوں نے جدید نظم کی بنیاد رکھی۔ انجمن کے مشاعروں نے اردو شاعری میں ذہنی، فکری اور تہذیبی انقلاب پیدا کیا۔ حب الوطنی ، انسان دوستی ، مروت، محبت، اخلاق اور معاشرے کے مختلف موضوعات کو ان مشاعروں کا موضوع بنایا گیا۔

آزادؔ کی نظموں کا مرکز و محور وہ مسلمان قوم تھی جو روبہ زوال تھی۔ وہ انہیں انصاف، تہذیب، دوستی ، محبت اور اولوالعزمی کا بھولا سبق یاد دلا کر معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں ۔ انہوں نے قوم کے سامنے عمل اور تحریک کا نظریہ پیش کرکے اہلِ قوم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

محنت جو کی جو توڑ کر ہر شوق سے منہ موڑ کر
کر دو گے دم میں فیصلہ محنت کرو محنت کرو

کھیتی ہو یا سودا گری، ہو بھیک یا
ہو چاکری
سب کا سبق یکساں سنا، محنت
کرو محنت کرو
جس دن بڑے تم ہو گئے دنیا کے
دھندوں میں پھنسے
پڑھنے کی پھر فرصت کجا، محنت
کرو محنت کرو
(کلیات نظم آزاد
،ص :۱۸٦)

انسان دوست آزادؔ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار دکھائی دیتے ہیں ۔ وطن سے محبت دراصل انسان دوستی کی ایک اعلیٰ شکل ہے۔ جس میں انسان ذات، برادری اور مذہب کی حد بندیوں سے آزاد ہوکر ہر ایک میں پیار و محبت کے پھول بانٹتا پھرتا ہے۔

حالیؔ نے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں نئی طرز شاعری کی بنیاد ڈالی اور انسان کے مسائل اور مناظر فطرت کو شاعری کا موضوع بنایا ۔

حالیؔ خود تعصب سے پاک انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی ہندو مسلم نزاع کا کوئی واقعہ سنتے تھے انہیں بہت رنج اور افسوس ہوتا تھا۔ تحریر و تقریرمیں کیا نج کی اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے کبھی کوئی کلمہ ایسا سننے میں نہیں آیا جو کسی فرقے کی دل آزاری کا باعث ہو۔ بلکہ اگر کوئی تعصب بھری بات کہتا تو برا مانتے اور نصیحت کرتے تھے۔ بے تعصبی کا وصف ان ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کو ہر طرح کے تعصب سے پاک رہنے کی تلقین کرتے ہیں ۔ حالیؔ کی یہ غیر معمولی انسان دوستی ہے کہ وہ اس روگ سے نجات حاصل کرانا چاہتے ہیں ۔ جسکی وجہ سے انسانی رشتے اپنا وجود کھو دیتے ہیں ۔ سماج بکھر جاتا ہے اور آپس کی لڑائیوں سے آبادیاں ویرانوں کا روپ دھار لیتی ہیں ۔ وہ در حقیقت وسیع النظری کا درس دیتے ہیں ۔ حالیؔ قوم کی تنزلی کا سبب جن عناصر کو قرار دیتے ہیں انکی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

مجلسیں غیبت و بہتان سے پُر
صحبتیں جھوٹ کے طوفان سے پُر
منقطع بھائی کی بھائی سے امید
اپنا بیگانہ ، لہو سب کے سفید

فقرا مکر و ریا کے پتلے
اغنیاء حرص و ہوا کے پتلے
شیخ عیا تو زاہد پُرفن
مولوی عقل کے سارے دشمن
(کلیات نظم حالی، جلد اوّل،
ص :٤٣٧)

مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کے ہاں انسان چونکہ جملہ مخلوق سے اشرف و افضل ہے۔ اس لیے حسن و خوبی میں کوئی اور مخلوق اس کے مد مقابل نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مسجود ملائک ٹھہرایا اور احسن تقدیم خلق کیا ہے اور اس با کمال فنکار نے اپنے اس فن میں ہر جمالیاتی واخلاقی خوبی کو مجتمع کر دیا ہے۔ نظم " انسان" کے اشعار انسانی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہیں اور انسان دوستی کے غماز ہیں ۔

ابرو باد و مہ خورشید میرے کام
میں ہیں
مرغ و ماہی و دد و دام میرے دام
میں ہیں
آب و آتش میری خدمت کے سر
انجام میں ہیں
کل جمادی و نباتی مرے خدام میں
ہیں
مجھ میں قدرت نے عجب فضل و
شرف رکھا ہے
میں نے فردوس کے میووں کا
مزہ چکھا ہے
(ایضا،
ص :٣٣)

اکبرؔ کی شاعری میں ان کے سچے جذبات، میلانات، خواہشات، انسان دوستی، خلوص و محبت اور ہمدردی کی ایک صاف و شفاف تصویر نظر آتی ہے۔جو شاعر کی نہ صرف ذہنی سوچ بلکہ قلبی واردات کی بھی آئینہ دار ہے۔

اکبرؔ کی شاعری میں پندو نصائح اور سنجیدگی کے حامل اشعار ان کی انسان دوستی کو تہ در تہ عیاں کرتے جاتے ہیں ۔ یہ اشعار بظاہر تو ہمیں قہقہ لگانے پر مجبور کرتے ہیں مگر جونہی ہنسی کی رو گزر جاتی ہے تو ہم اپنے باطن کی دنیا میں اصلیت کو تلاش کرتے ہیں ۔ یہی

وجہ ہے کہ ہم حقیقت حال سے جونہی آشنا ہوتے ہیں تو دل ہی دل میں ندامت محسوس کرتے ہیں ۔

اکبرؔ جس فضا میں سانس لے رہے تھے وہ نکبت و افلاس اورمحکومی کیوجہ سے مسموم ہو چکی تھی۔ اعلیٰ اقدار دم توڑ چکی تھیں ۔ ایسی صورت میں اکبرؔ ہماری اعلیٰ اقدار کے بہترین ترجمان کے طور پر سامنے آئے اور ان تمام محاسن اخلاق کو اپنانے کی تلقین کی جس سے انسان دوستی کی بہترین فضا پیدا ہو سکتی ہے۔ ان کا پیغام یہ تھا کہ برے کام کرنے سے بہتر ہے کہ کچھ نہ کیا جائے۔ ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دینی چاہیے۔

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا
افعالِ مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبرؔ نے سنا ہے اہل غیرت سے یہی
جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا
(کلیات اکبرؔ)

اکبرؔ کو ہم اردو کا ایک ممتاز انسان دوست شاعر تسلیم کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھیں گے اگر ہم ان کے کلام کے اس حصہ پر نظر ڈالیں جہاں وہ انسانی عظمت کے قائل نظر آتے ہیں اور انسان کو کائنات کا مرکز قرار دیتے ہیں ۔ وہ ابو الوقت ہیں اور وقت کو اپنے ساتھ لے کر چلنے کے قائل ہیں ۔ ان کے نزدیک سب سے بڑی قوت انسان کا ارادہ ہے اور سب سے بڑی حقیقت اسکی قوت تسخیر ہے۔ ان کے نزدیک انقلاب آتا نہیں لایا جاتا ہے۔ زمانہ انسان کو نہیں بدلتا بلکہ انسان زمانے کو بدل دیتا ہے۔ جدید نظریہ حیات جس میں فطری قوتوں کے مقابلہ میں انسان کو حقیر اور کمتر سمجھتا ہے۔

ہوس پرستوں کو کیوں یہ کد ہے ان انقلابوں کی کیا سند ہے
اگر زمانہ بدل رہا ہے بدلنے ہی کو بدل رہا ہے
عروج قومی زوال قومی خدا کی قدرت کے ہیں کرشمے
ہمیشہ رد و بدل کے اندر یہ امر پولیٹکل رہا ہے
(کلیاتِ اکبرؔ)

اکبرؔ کے ہاں مرکزی حیثیت انسان کی ہے۔ ان کے نزدیک شخصی اور اجتماعی زندگی کی سب سے بڑی قدر اسکی ابوالوقتی ہے۔

لوگ کہتے ہیں بدلتا ہے زمانہ سب
کو
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل
دیتے ہیں

(کلیاتِ اکبرؔ)

شبلیؔ کی انسان دوستی، خلوص، محبت اور درد مندی صرف ہندوستان کے مسلمانوں تک محدود نہیں تھی۔ وہ اس وقت بھی تڑپ اٹھتے تھے جب ان کے ہم وطنوں کے خون سے ہاتھ دھوئے جارہے ہوں اور اس وقت بھی جب دنیا کے کسی حصے میں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جا رہے ہوں ۔ انسان دوست شبلیؔ کی نظر بلقان پر بھی اسی طرح پڑتی ہے جیسے کانپور پر۔ چنانچہ بلقان کے تاریخی واقعات کا جو اثر شبلیؔ کے درد مند دل نے قبول کیا اسکی منہ بولتی تصویریں ان کی وہ نظمیں ہیں جو انہوں نے جنگ بلقان سے متاثر ہو کر کہیں ۔ شبلیؔ کو انگریزوں سے نفرت اور ترکوں سے محبت ہے۔ اسلامی رشتے سے ترک ان کے بھائی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ترکوں کے دکھ میں برابر کے شریک دکھائی دیتے ہیں ۔

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے
خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں گے
تمہاری کھتیاں کب تک
عروس بخت کی خاطر تمہیں
درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ پائے خاک ہونگے زر
فشاں کب تک
کہاں تک لو گے ہم سے انتقام فتح
ایوبی
دکھاو گے ہمیں جنگ صلیبی کا
سماں کب تک
(کلیاتِ ،
شبلی، ص :۹۸)

اقبالؔ جس آدم کا تصور پیش کرتے ہیں روح ارضی اس آدم کا استقبال انتہائی خوش دلی اور بے تابی کے ساتھ کررہی ہے، کائنات کی ہر چیز بادل، گھٹائیں ، گنبد افلاک، خاموش فضائیں ، کوہ، صحرا، سمندر اور یہ ہوائیں سب انسان کے تصرف میں ہیں ۔ گویا اس تمام کائنات کو آدم کے

لیے سجا دیا گیا ہے۔ وہ صاحب علم و ادراک ہے۔ وہ نطشے کا خود سر فوق ابشر نہیں ہےئ۔ اور نہ ہی روایتی تصوف کا فنا گزیدہ زاہد ہے۔ بال جبریل کی نظم " روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" کے اشعار انسانی عظمت کے عکاس ہیں ۔ جس میں اقبال نے اپنے انساں کو مرکز مکاں قرار دیا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس کا مرکز و محور انسان ہے۔

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گِل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

(کلیات اقبال ، بال جبریل،ص:٤٦١)

اقبالؔ انسان کی تمام تر صلاحیتوں اور مخفی امکانات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک لائحہ عمل پیش کرتے ہیں جس پر عمل پیرا ہو کر انسان درجہ کمال کو پہنچ سکتا ہے۔ یہ لائحہ عمل خودی میں پوشیدہ ہے۔ اقبالؔ خودی کی تشریح کرتے ہوئے خودی کے تین مراحل بیان کرتے ہیں ۔ مرحلہ اول احکام الہیٰ کی اطاعت، مرحلہ دوم خودی کا ضبط نفس اور مرحلہ سوم خودی کی نہایت الہٰی۔ اقبالؔ کے اس لائحہ عمل کے مطابق کوئی بھی انسان احکام الہیٰ کا پابند ہو کر اور ان کو اپنی زندگی میں جاری و ساری کر کے اپنے نفس کو مغلوب کرتا ہوا انسانیت کے درجہ کمال یعنی نہایت الہیٰ کے بلند رتبے پر فائز ہوتے ہوئے اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

اقبالؔ کے نزدیک جو انسان ان مراحل کو طے کر لے وہی اقبالؔ کی نظر میں انسانی عظمت کے بلند ترین مقام پر فائز ہے اور اسے اقبال کبھی بندئہ مومن کہتے ہیں اور کبھی مرد مومن۔ اسی طرح مرد بزرگ، صاحب امروز، مومن جانباز ، صاحب لولاک، مرد حق، مرد آفاقی اور مختصر یہ کہ مرد مسلما ن۔ ضرب کلیم میں اقبال اس مر دمسلمان کی یہ عظمت اور شان بیان کرتا ہے۔

ہمسائیہ جبریل امیں بندئہ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفت سورہ رحمٰن
(ضرب کلیم ،ص:۵٤۳، ۵٤٤)

اقبالؔ وہ انسان دوست شاعر ہے جس نے پوری دیانت کے ساتھ معاشی استحصال کو محسوس کیا اور بلند ادبی سطح پر استحصالی نظام اور مغربی سامراج کے خلاف آواز بلند کی جو معاشی استحصال کا سرچشمہ ہیں ۔ انہوں نے بندئہ مزدور کو بیدار ہونے کا پیغام دیا۔ اپنی نظم " خضر راہ" میں مزدور کو خضر کی زبان سے جو بیداری کا پیغام دیا وہ ان کی مزدور دوستی کا بین ثبوت ہے۔ اقبالؔ نے سرمایہ و محنت کی کش مکش میں محنت کے موقف کی بھر پور تائید کی۔ وہ سماجی انصاف کے علمبردار تھے۔ چنانچہ کمزوروں ، مظلوموں اور محروموں کی حمایت اپنا فرض تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اسلام کا پیغام اور کائنات کا پیغام دو مختلف چیزیں نہیں ہیں ۔ حضرت خضر کا یہ پیغام دراصل انسانیت کی پکار ہے۔

بندہ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دوست آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
(بانگ درا ،حصہ سوم، ص:۲۹۱)

اقبالؔ کو بلا شبہ مزدوروں ، کسانوں ، مجبوروں ، محروموں اور مظلوموں کے ساتھ ہمدردی ہے۔ اسی ہمدردی، محبت اور انسان دوستی کا نتیجہ ہے کہ وہ دنیا سے سرمایہ داروں ، زمینداروں ، جابروں ، دولت مندوں اور ظالموں کے استبدادو استحصال کا خاتمہ چاہتے ہیں اور مزدوروں کی حمایت میں ایسی آواز بلند کرتے ہیں جسکی باز گشت رہتی دنیا تک سنائی دیتی ہے۔"فرمان خدا" جیسی زور دار نظم کسی اور انسان دوست کے قلم سے نہیں نکلی۔

اٹھو ! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشئہ گندم کو جلا دو
(بال جبریل ،ص :٤٣٨)

اقبالؔ انسان دوستی کا پیغام دیتے ہوئے ملک و ملت کے تفرقے اور طبقاتی تفریق کو ختم کرنا چاہتے ہیں ۔ انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنانا چاہتے ہیں ۔اقبالؔ غلامی کو خواہ وہ کسی شکل میں ہو نوع انسان کے لیے سب سے بڑی لعنت سمجھتے ہیں اور ہر فرد کو آزاد دیکھنے کے متمنی ہیں ۔ انسان دوست اقبالؔ ان نادان انسانوں کو جو اپنی غلامی پر مطمئن ہیں آزادی کا پیغام دیتے ہوئے غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا درس دیتے ہیں ۔

اقبالؔ کی انسان دوستی اس بات کی متقاضی ہے کہ قوم و وطن کے تنگ اور محدود دائرہ سے نکال کر نسل انسانی کو اخوت کی لڑی میں پرو دیا جائے۔ اقبالؔ اس بات پر حیران تھے کہ مغرب انسان دوستی کا نعرہ بلند کرتا ہے لیکن اسکا وجود سرتاپا انسان دشمنی پر مبنی ہے۔ خاص طور پہ اس نے قوم پرستی کا جو تصور دنیا کے انسانوں کو ٹکڑوں میں بانٹنے کے لیے پیش کیا وہ انسانیت کے لیے بے انتہا خطر ناک ہے۔ قوم پرستی کا سب سے بڑا نقصان مسلم ممالک کو ہوا جو اسلام کے انسان دوستی کے تصور کے تحت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ اور قوم

پرستی نے ان کو رنگ و خون اور جغرافیائی سرحدوں کی دیواریں کھڑی کر کے الگ کر دیا ۔

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اسی سے
(بانگ دارا، حصہ سوم، ص: ۱۸۸)

خوشی محمد ناظر کو معاصرین اقبال میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہ حالیؔ کی اصلاحی شاعری کی تحریک سے نہ صرف متاثرتھے بلکہ ان سے اصلاح شعر و سخن بھی لیتے رہے۔ ان کی شاعری میں انسان دوستی کے ساتھ ساتھ نیچرل اور قومی نوعیت کے موضوعات کا رنگ غالب دکھائی دیتا ہے۔

ناظرؔ نے اپنی شاعری میں حریت فکر، آزادی اخوت اور اسلامی بھائی چارے اور معاشرتی نظام میں تبدیلی کا پیغام دیتے ہوئے دراصل انسان دوستی کا پیغام عام کیا ہے۔ نظم "سرودِ افلاک" میں جذبہ آزادی کی بیداری کو یوں بیاں کیا ہے۔

خدا کی عادت رہی سدا لا یغیر اللہ ما بقوم
مگر بدلتی رہی ہیں قومیں عمل کی پاداش اپنے پا کر
یہ بحر ملاح کے تھپیڑے ڈبوتے ہیں غافلوں کے بیڑے
ہیں پہنچے ساحل پر اہلِ ہمت طلب کے چپو چلا چلا کر
(نغمہ فردوس، ص :۱۰٦)

انسان دوست مولانا ظفر علی خان کو قدرت نے ایک درد مند دل عطا کیا تھا۔ ظفرؔ زندگی کے معاشی مسائل اور ان کے حل کیطرف بھی توجہ دیتے ہیں ۔ وہ کلیسائی نظام کی مخالفت کرتے ہیں ۔ جو محتاج کو محتاج

اور غنی کو غنی تر بنانے میں مدد گار ثابت ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کا معاشرتی نظام غریبوں کو فقط تسلی کی افیون نہیں کھلاتا بلکہ اقتصادی نظام کے اصول پیش کر کے مسلمانوں کی معاشی نا ہمواریوں اور مسائل کا حل زکوٰۃ اور تجارت کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ اسلام سرمایہ داری کے خلاف ہے اور مزدور کو اس کا حق دینا اسلام کا بنادی نقطہ نظر ہے۔

سرمایہ نے یوں جب دون کی لی محنت
نے چمک کر اس سے کہا
اس وقت تو بیشک گردش میں ہم فاقہ
کشوں کا ستارا ہے
لیکن تجھے اس کی بھی ہے خبر تو نے
نہ سنا اب تک ہو تو سن
تقدیر پلٹتی رہتی ہے تقدیر کا رنگ نیارا
ہے
جس ڈھلتی پھرتی چھاؤں کو تو اپنا ہی
اجارا سمجھا ہے
آج اس پہ اگر قبضہ ہے ترا کل دعویٰ
اس پہ ہمارا ہے
اسلام نے جب یہ بحث سنی سرمایہ کو
ڈانٹا اور کہا
الٹے گا وہ اک دن ٹاٹ ترا مزدور خدا کا
پیارا ہے
(کلیاتِ ظفر
،نگارستان،ص:۱٤۹)

نیرنگؔ کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو ان کی نظموں میں اصلاحی و اخلاقی رنگ نمایاں ہے۔ وہ انسان دوستی اور ہمدردی کی تعلیم دیتے ہیں ۔ وہ عام اشیا اور موضوعات کے ذریعے فلسفیانہ نکات کو کامیاب مہارت سے بیان کرنے کا فن جانتے ہیں ۔ جو ان ہی کا طرئہ امتیاز ہے۔اپنی انسان دوستی کا پیغام عام کرتے ہوئے سب کو ہنسی خوشی زندگی گزارنے ، زندگی میں خوشیاں بانٹنے اور دوسروں کو دکھ یا تکلیف نہ دینے کی تلقین کرتے ہیں ۔

چار سو پھیلے جہاں میں ہو ترے
اخلاق کی
دیکھ کر تجھ کو دلوں سے دور ہو
غم کا اثر

کاٹ دے ہنس کھیل کر اس مختصر ہستی کو تُو
دے خوشی سب کے دلوں کو اور نہ مت پہنچا ضرر
کل کو چھا جائے نہ ان پر موت کی پژمردگی
التفات دوستاں کی آج ناداں قدر کر
ہے مری پژمردگی تاویل رویائے حیات
میری ایک اک پنکھڑی تفسیر آئین ممات
(کلام نیرنگ، ص:۸۲)

چکبستؔ نے بیسویں صدی میں وطن پرستی کے نغمے الاپے اور قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا پیغام عام کیا تو اس کے ساتھ ساتھ بنی نوع انسان سے محبت، ہمدردی اور انسان دوستی کا بھی درس دیا۔ وہ انسانوں پر ظلم و ستم کے سخت مخالف ہیں ان کی نظم " درد دل" کے اشعار قومی درد اور ہمدردی کے بہترین عکاس ہیں ۔

قوم کے درد سے ہوں سوزِ وفا کی تصویر
مری رگ رگ سے ہے پیدا تب غم کی تاثیر
ہے مگر آج نظر میں وہ بہارِ دل گیر
کر دیا دل کو فرشتوں نے طرب کے تسخیر
یہ نسیم سحری آج خبر لائی ہے
سال گزرا میرے گلشن میں بہار آئی ہے
(صبح وطن، ص:۳۳)

مجموعی طور پر چکبستؔ کا مسلک انسان دوستی اور حب الوطنی ہے۔ وہ دنیا میں موجود ہر انسان کے درمیان محبت، ہمدردی اور بھائی چارے کے داعی ہیں ۔ وہ کسی قسم کی تفریق و امتیاز کے قائل نہیں ۔ نفرت و وحشت کے سخت مخالف ہیں ۔

انسان دوست محرومؔ دنیا میں امن و سکون اور محبت کے متلاشی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر رنجشیں ، فریب و ریا کاری اور ظلم و نا انصافی دیکھتے تھے تو ان کو بہت دکھ اور افسوس ہوتا۔ وہ دنیا سے اور انسانی زندگی سے غلامی ، افلاس، ناانصافی ، عداوت اور ظلم کا خاتمہ چاہتے تھے۔ ان کا پیغام محبت، امن و سلامتی، ہمدردی اور انسان دوستی کا پیغام تھا۔ ہندوستانیوں کے ہر غم اور دکھ کو انہوں نے دل سے محسوس کیا ہے۔ انکی پریشان حالی پر اظہار غم کیا ۔

گورنمنٹ سے فریاد اب ہماری ہے
کہ اے وطن کی ممد اے نگاہدار
وطن
یہ خواہ مخواہ کی ہم سے کدورتیں
کیسی
اڑائے دیتے ہیں اغیار کیوں غبارِ
وطن
سمجھ کے بیکس و تنہا نہ دیں
عذاب انہیں
شریک حال غریبان ہیں سوگوار
وطن

(کاروان وطن،
ص :۴۰)

رو ما نیت اور حقیقت نگا ری کی تحر یکیو ں نے ایک طویل عرصے تک الگ الگ سمتوں میں اپنا سفر جاری رکھا ۔ اور جب تر قی پسند تحر یک کا آغا ز ہو ا تو یہ دو نو ں دھا رے آپس میں مل گئے۔درا صل یہ زما نہ سما جی اور سیا سی تحر یکیوں کے لیے اس لیے بھی سا زگا ر تھا کہ عوام اب اپنی جا نب دیکھنے پر ما ئل ہو چکے تھے اور غلا می کا جو ااتارنے پر آماد ہ تھے ۔

پر یم چند جیسے افسانہ نگا رنے اپنی کہا نیوں کے ذریعے بھوک ، بیماری ، بیکا ری ، جہالت ، اور تو ہم پر ستی کے مسائل کو اجا گر کیا اور ایک عام فرد کی ذہنی الجھنوں ، سما جی بند شوں ، معا شر تی پیچید گیوں اور ان سے پید ا ہو نے والے غموں کو منظر عام پر لا نے کی بھر پو ر کو شش کی۔

تا ہم اختر حسین نے ترقی پسند تحریک کی تنقید ی جہت تلا ش کی اور عوامی بہبو د کو ادب کا اہم حصہ قرار دے کر زند گی اور ماحول کی تر جما نی پر ما مو رکر دیا ۔ چنا نچہ جہاں ادیب کو غریبوں اور مظلو

موں کی بے حسی زا ئل کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ وہاں یہ بھی واضح کیا گیا کہ ادب کا مو ضو ع غر یب لو گ ہیں اور انہی کی حالت بد لنے سے سماج عر وج کی راہ ریکھ سکتا ہے ۔ پس ادب کا وہ قاری جسے ادب کی تخلیق کے وقت پیش نظر رکھنا ضر وری قرار دیا گیا غریب عوام ہی تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جا ئے تو تر قی پسند تحریک کے آغا ز ہی سے اس کی عوام دوستی اور واقعیت نگاری کا سراغ ملتا ہے ۔

تر قی پسند تحر یک کی ابتد ا اگر چہ نا مسا عد حالا ت میں ہو ئی تھی ۔ تا ہم ہند و ستان میں اس تبد یلی کو قبول کر نے کے لیے فضا مو جو د تھی ۔ تر قی پسند تحر یک کی پہلی کلی ہند کا نفر نس ۱۵اپر یل ۱۹۳٦ کو لکھنو میں منعقد ہو ئی۔ جسکی صدارت منشی پر یم چند نے کی ۔ اس کا نفر نس میں سب سے اہم چیز منشی پر یم چند کا خطبہ صدارت تھا۔ جس میں انہوں نے ادب کی دائمی قد روں کو اجاگر کیا اور حسن صداقت ، آزادی اور انسان دوستی کو اعلیٰ ادب کا جز و لا ینفک قرار دیا ۔

چونکہ تر قی پسند ادب کے بنیا دی مقا صد انسا نیت اور آ ز ادی کی جد و جہد تھے اس لیے اس تحر یک کے قلم کا روں نے اپنی انسا ن دوستی کا ثبو ت پیش کر تے ہو ئے غریب عوام ، محنت کشوں ، مز دوروں اور کسانوں کے حقو ق کے لیے مسا وات کا علم بلند کیا اور سما ج میں ظلم و جبر اور استحصا ل کے خلا ف آواز بلند کی ۔

تر قی پسند نظم کے ذریعے نچلے طبقوں کو جو عز ت واحترام اور اہمیت دی گئی اس کے نتیجے میں انسان کی عظمت اورانسان دوستی کو نمایا ں کر نے میں خا صی مد دملی۔

جو ش ملیح آبادی بیسویں صدی کے ان با کمال شا عروں میں سے تھے جن کی نظیر ملنا مشکل امر ہے ۔ بیسویں صدی میں ٹیگور اور اقبالؔ کے بعد جتنی عز ت ، شہرت اور مقبولیت جو ش کو نصیب ہو ئی کسی دوسرے شا عر کے حصے میں نہیں آئی ۔ جو شؔ کی نظم گو ئی میں ایک پو رے عہد کی گونج سنا ئی دیتی ہے ۔

انسا ن دوست جو شؔ کی شا عر ی میں انسا نیت کا درد مو جود تھا ان کا دل ابتد ا ہی سے سیا سی و سما جی مسا ئل ، معاشرتی نا ہمواری اور مذ ہبی اجار ہ داری کے خلاف بھڑکتا رہا ہے ۔ اور یہی اجتما عی رو یہ ان کی شا عر ی میں بجلی کی سی کڑک کی صورت میں ظاہر ہوا ہے ۔ سما جی اصلاح کے طور پر ان کی شاعری نے ایک تا زیا نے کا کام ضرور کیا ہے۔ جوشؔ کی انسان دوستی کی بہتر ین مثال ان کی نظم "کسان" میں ملتی ہے ۔ جس میں کسی نواب یا راجہ کا قصیدہ نہیں بلکہ ایک کسان کے کردار کو بڑی خو بی کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ ان کے نز دیک یہ کسان ار تقا کا پیشوا ، تہذ یب کا پر وردگا ر، تا جدار خاک ، امیر بو ستان ، ماہر آئین قدرت اور کھیتوں کا بادشاہ ہے ۔

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا ، تہذیب کا پروردگار
وارث اسرارِ فطرت ، فاتح امید و بیم
محرم آثار باراں واقفِ طبع نسیم
صبح کا فرزند خورشید زرفشاں کا علم
محنتِ پیہم کا پیماں سخت کوشی کی قسم
(شعلہ وشبنم، ص:۱۹،۲۰)

تر قی پسند فراقؔ کو معا شرے میں سسکیاں بھرتے آدمی، درد کی ماری زند گی ، سا ئیں سا ئیں کرتی بستیاں اور تہذیب کے نام پر ز بر دستی دکھا ئی دیتی ہے تو فراقؔ کی انسان دوستی اسے دوسروں کے دکھ ددر با نٹنے پر مجبور کرتی ہے ۔ اپنی نظم "کسانوں کی پکار" میں وہ کسانوں کے ہمد ر دبن کرا ن کے درد کا درما ں کر تے نظر آتے ہیں کہ آنے والا وقت ان کا وقت ہو گا۔ جب ظلمت کے بادل چھٹ جا ئیں گے اور غریب کاحق اور انسان کی محنت کا پھل اسے مل کر رہے گا۔ کیو نکہ کسان اب پُر عز م ہے کہ وہ کسی چالا کی، دھو نس دھا نس ، دلا لوں کی پھوڑ پھا نس ، پھسلا نے ، بہکا نے، ڈروانے اور دھمکا نے میں نہیں آئے گا ۔

آئے دن کے کال کا رونا
ہر چیز اور ہر بات کا رونا
جگ جگ سے دن رات کا رونا
نہیں رہے گا نہیں رہے گا
(کلیات فراق ،ص:۲٤٦)

تر قی پسند مخد ومؔ بھی اقبا لؔ کی طرح مشر ق کے زوال و انحطاط پر مضطرب ہیں ۔ وہ مشر ق جو کبھی علم و آگہی کا مر کز تھا۔ جس سے دنیا نے جہاں با نی و جہا نگیر ی کا ہنر سیکھا ۔ جس نے مسا وات اور روا داری کا پیغا م عام کیا ۔ جو مذہبی رہنما وں کا مسکن رہا ہے ۔ وہی آج جہل ، فا قہ ، بھیک ، بیماری ،اور نجا ست کا مکاں بنا ہو ا ہے ۔ انہوں نے مشرق کو ایک نئے روپ میں پیش کیا ہے اور کہا دیکھو یہ تمہار ا مشر ق ہے جہاں درد و غم اور بھوک و افلا س اپنا ڈیرہ جمائے

ہوئے ہے ۔ وہ انسان دوستی اور انسان ہمد ردی کے ساتھ اپنی نظم " مشر ق" میں مشر ق کا حالِ زاریوں بیان کرتے ہیں ۔

جہل ، فاقہ، بھیک ، بیماری ،نجاست کا مکان
زندگانی ، تازگی ، عقل و فراست کا مسان
جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اُس مشرق کو دیکھ
دیکھ کھیلتی ہے سانس سینے میں مریض دق کو دیکھ
ایک ننگی نعش بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہءخون میں لتھری ہوئی
(سرخ سویرا ، بسا ط و رقص(حصہ)،ص:۳۸،۳۷)

عوام دوست مجازؔ سر مایہ داروں کے خلا ف آواز بلند کرتے ہیں ۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر دنیا کے مالک سرمایہ داروں کے چلا ئے بنا کو ئی کام نہیں چلتا۔ اگر ایک طر ف جنگ ملو کیت میں شا مل ہو نا اور دوسری طر ف فا قہ، جہالت ، بے روزگاری ، غلا می کی زند گی ہی دنیا کے ان حکمرانوں کا عطیہ ہیں تو اس منحو س نظام کو جسے سر ما یہ داری کہتے ہیں یکسر ختم کیوں نہ کر دیا جا ئے ۔ یہ لو گ ظلم وبر بر یت کی جیتی جا گتی مورتیں ہیں ۔ ہمارے سر مایہ دار اہل علم و فن کو سماج کی بے انتہا دولت کا اتنا حصہ تک دینے سے قا صر ہیں جس سے ان کی بسر ا وقات ہو سکے ۔ آج سا ری دنیا میں لوگوں کی زند گی دو بھر ہو رہی ہے ۔ وہ سرمایہ داروں کی ظلم وبربریت کا پردہ چاک کرتے ہیں۔

یہ وہ آندھی ہے جس کی رو میں مفلس کا نشیمن ہے
یہ وہ بجلی ہے جس کی زد میں ہر دہقاں کا خرمن ہے
یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے

یہ انسانی بلا خود خونِ انسانی کی گاہگ
ہے
وبا سے بڑھ کے مہلک موت سے
بڑھ کر بھیانک ہے
(آہنگ ،ص:
۹٤)

فیضؔ کی انسان دوستی ایسی ہے جو انہوں نے شعوری طور پر اختیارکی ہے ۔ان کی شا عر ی کے مطا لعے سے واضح ہے کہ انہوں نے وا قعی انسا نی فلاح کو اپنے فن کا تقا ضا سمجھا اور اسے ذاتی مفا دات کو با لا ئے طاق رکھ کر ایک فرض کی طرح نبھایا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی انسا نی دوستی کی پہلی نظم " مجھ سے پہلی سی محبت مر ے محبوب نہ مانگ" تخلیق کی ۔ اب انہیں محبت کے دکھوں کے علا وہ زمانے کے دکھ درد کا بھی احسا س دامن گیر تھا ۔ان کی نظر ان گنت صدیوں کے بہیما نہ طلسم ، بہتی ہو ئی پیپ اور گلے ہو ئے نا سور وں پر بھی جا پڑ تی ہے اور وہ تڑ پ اٹھتا ہے ۔ خاک میں تھڑسے ہو ئے اورخون میں نہلا ئے ہوئے جسموں کے خیال سے وہ کا نپ جاتا ہے ۔ اور تھوڑی دیر کے لئے وہ حسن کی دلکشی کو با لکل بھول جاتا ہے اور زمانے کے دکھ اور درد کو محبت پر تر جیح دینے لگتا ہے اور زمانے کی راحتوں کو وصل کی راحتوں سے زیادہ پسند کر نے لگتا ہے ۔

اَن گنت صدیوں کے تاریک بیمانہ
طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں
بُنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار
میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں
نہلائے ہوئے
(نقش فر یادی،
ص: ٥٤)

علی سردار جعفری جتنے بڑے تر قی پسند شاعر ہیں انہیں زند گی سے اتنا پیار ہے۔ ایسے شاعر اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے دوسروں کے دکھ درد کو شد ت سے محسو س کرتے ہیں اورانہیں دور کر نے کی بھر پور کوشش کرتے ہیں۔ اور یہی خو بی انہیں دوستوں کی دوست اور انسانی قدروں کی پاسبان بناتی ہے ۔ اس کے خیال میں معا شرہ طبقا ت کا شکار ہے ۔ اس میں کچھ طبقے ایسے ہیں جو ظالم سفاک

اوراستحصال کرنے والے ہیں اور کچھ طبقے ہیں جو مظلوم ہیں اور تخلیق کر نے والے ہیں ۔ چو نکہ شاعر خود خلا ق ہے اس لیے اس کا رشتہ اور تمام ہمد ردی محنت کش اور خلاق مز دوروں ، کسانوں اور عام انسانوں کے سا تھ ہے ۔ اس سلسلے میں ان کی نظم " اودھ کی خاک حسین " کے چند اشعار دیکھئے ۔ جس میں ان کی انسان دوستی کا رنگ جھلکتا ہے ۔

میرے تصور میں سا قیوں کاخرام رنگیں نہ جام و مینا کی گر د شیں ہیں ۔

نہ میکدے ہیں نہ شورشیں ہیں
میں چھوٹے چھوٹے گھروں کی چھوٹی سی زند گی میں گھرا ہوا ہوں
اندھیرے قصبوں کو یاد کر کے تڑپ رہا ہوں
وہ جن کی گلیوں میں میرے بچپن کی یا دیں اب تک بھٹک رہی ہیں
جہاں کے بچے پرانے کپڑے کی میلی گڑیوں سے کھےلتے ہیں
گاوں جو سینکڑوں برس سے بسے ہوئے ہیں
کسانوں کے جونپڑوں پہ ترکاریوں کی بیلیں چڑ ھی ہوئی ہیں
پرانے پیپل کی جڑ میں پتھر کے دیوتا بے خبر پڑے ہیں
قدیم برگد کے پیڑ اپنی جٹائیں کھولے ہو ئے کھڑے ہیں
یہ سید ھے سا دے غر یب انسان نیکیوں کے مجسم ہیں
یہ محنتوں کے خدا ، یہ تخلیق کے پیمبر
جو اپنے ہا تھوں کے کھردرے پن سے زندگی کو سنوارتے ہیں
(کلیات علی سردار جعفری ، حصہ دوم ،ص: ۹۵،۹۶)

احسانؔ کی سا ری زند گی چو نکہ محنت و مشقت میں گزری۔ اس لیے وہ مز دوروں کی زند گی اور احسا سات سے بخو بی آگا ہ تھا ۔ ان کی شا عری میں مز دوروں اور کسا نوں کے لا متنا ہی دکھوں کی داستان محض خیالی یا تصوراتی نہیں بلکہ ان کے ذاتی تجر بات اور ذاتی داستان حیات پر مشتمل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس مخصوص طبقے کی زند

گی کی تصو یر یں جس کمال مہارت سے احسان نے پیش کی ہیں ۔دوسرا کو ئی شاعر اسکی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا ۔ اس اعتبار سے وہ نظیر اکبر آبادی کے بعد اردو کے سب سے بڑے عوامی شاعر ہیں ۔ احسانؔ کسا نوں اور مزدوروں سے شد ید ہمد ردی رکھتے ہیں ۔ ان کی مفلو ک الحالی پر کڑھتے ہیں ۔

روا ں ہے اس طرح مزدور گھر کی سمت جنگل سے
کھنچا جاتا ہے جیسے شمع کے جلووں میں پراونہ
تہی آنکھوں ، تہی سینہ ، تہی کیسہ ، تہی دامن
سلگتا آتش شب رنگ سے راحت کا کاشانہ
پھٹی دستار کا ہر تار ہے عنوان مجبوری
برہنہ پاوں کا ہر نقش ہے نکبت کا افسانہ

(چراغاں ،ص:۴۲،۴۱)

ندیمؔ اپنی نظم " جبر و اختیار " میں مو ہوم ثقافت کے علمبرداروں اور خوابیدہ مشیت کے پر ستاروں کو بے عمل اور بے جان قرار دے کر ان سے اپنا ناطہ توڑ لیتا ہے ۔ اور اپنا ناطہ زند گی کی "بے رحم صداقت "اور" تا بند ہ حقیقت"سے اس لئے جوڑ لیتا ہے ۔کیو نکہ وہ حق وباطل کی آویز ش میں مو ہوم ثقا فت اور خوا بیدہ مشیت سے کسی طور سمجھوتے کے لیے تیار نہیں کیو نکہ وہ حق کا علمبر دار ہے وہ با طل کے خلا ف صف آرا ہو کر میدان عمل میں نکل آیا ہے ۔ چمن افر وزی شبنم سے اسے کو ئی سروکار نہیں بلکہ حد ت مہر سے جلنا اسکا مقدر ٹھہرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مو ہوم ثقا فت کے علمبرداروں پر طنز کے تیر برساتا ہے جو بھوک کی شدت کے عوض غریب اورلا چار عوام کے سامنے " عقیدوں کے غبارے "لا کر رکھتے ہیں اور "ملبوس کے پر حو ل شگافوں "کے بد لے انہیں فرمان حیا، دے کر نہ صرف اپنے فرائض سے غفلت بر تتے ہیں بلکہ عوامی قوتوں کو عوامی قو توں ہی کے مقا بل لا کر ظلم و استحصال کی مد ت کو بڑ ھاتے چلے جا تے ہیں ۔ انسان دوست ند یم ؔجبر کی ان علامتوں کے خلا ف آواز بلند کرتے ہیں اور مستقبل

میں انہیں جمہور کی کامیابی وکامرانی یقینی نظر آتی ہے ۔ اشعار ملا حظہ کیجئے ۔

تم کو اس وقت بھی معلوم نہیں ہے شاید
کہ زمانہ تو بہت دور نکل آیا ہے
آج سلجھائے گی جمہور کی آواز اسے
تم نے تاریخ میں جس بات کو الجھایا ہے
اب مرا ذوق کسی قید کا پابند نہیں
تم نے صدیوں مرے وجدان کو ترسایا ہے
(شعلہ گل ،ص:۲۳۳)

ندیمؔ کی شخصیت محبت ، خلوص اورانسان دوستی کے خمیر میں گند ھی ہو ئی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ انسان دوست ندیم کے نز دیک اس زمین پر انسان سے انسان کی دوری اورآپس کی نفرت صرف اسی صورت میں ختم ہو سکتی ہے کہ انسان انسان سے محبت کرے۔ پیار کی شمع روشن کر ے اورانسا ن دوستی کا پیغام پوری دنیا میں عام کرے ۔ کیو نکہ ایک انسان کے دل میں دوسرے کے لئے کد ورت اورنفرت کا جذبہ شدت اختیار کر چکا ہے ۔ اس لیے ندیم کے نز دیک انسان کا اصل سرمایہ اسکی انسانیت ہی ہے۔ جسکی کھوج اورحصول ہی حاصل حیاتِ انسان ہے۔ اس لیے وہ آزرو کرتے ہیں ۔

آج ہو جائے جو انسان کو انسان سے پیار
چار سو ایک تبسم کا ہو عالم طاری
صحن گلشن میں بدل جائے یہ دھرتی ساری
توپ ہو روئے زمین پر ، نہ فضا میں بمبار
(محیط، ص:۱۲۳)

عارفؔ ایک صحت مند معا شرے کی تشکیل و تعمیر کا داعی ہے ۔و ہ بنی نوع آدم کو آپس میں یگا نگت بڑھانے اورمحبت کا درس دیتاہے ۔ انہوں نے زند گی کے ہر دکھ درد کو بخو شی قبول کیا ہے لیکن سمجھو

تے کا راستہ نہیں اپنا یا ۔ خیر و شر کے معر کوں میں وہ زخمی ہوتے ہیں ۔ لیکن ان کے یہاں ضمیر اپنی بھر پور توانا ئی کے ساتھ زندہ رہتا ہے ۔ زخمی ہونے کے با وجود انکے ہاں اجتماعی فلاح و بہبود کی آرزو اور امنگ کسی طور ماند نہیں پڑتی۔ وہ اب بھی اخوت کی جہا نگیری اورمحبت کی فر اوانی کے خواب دیکھتے ہیں اور خواہش مند ہیں کہ ان کے خواب حقیقت کا روپ دھار لیں ۔ان کی یک مصری نظم " جوابی سلوک" ملا حظہ ہو۔

سنگ برساتے ہو مجھ پر جب تو تم پر
گل برسنے کی دعا کرتاہوں
(دھوپ کی چادر
،ص :٤٥)

جالبؔ انسانی ہمدردی کے پیکر تھے ۔ عوام کی فلاح و بہبود ہی ان کا مقصد حیات تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ١٩١٧میں آنے والے روسی انقلاب پر وہ خوشی کے ترانے گاتے ہیں کہ یہ انقلاب انسان کا بول بالا کر ے گا ۔ کٹیاوں میں اجالا ہوگااور محنت کشوں کا راج ہوگا اور ہر طرف انصاف ہی انصاف ہوگا نظم "ترانہ دوستی " کے اشعار دیکھیئے۔

نہ لٹ سکیں گی محنتیں نہ بک
سکیں گی حسرتیں
امیر اس دیار کے نہ دے سکیں
گے ذلتیں
نصیب میں یہ سنگدل نہ لکھ سکیں
گے ظلمتیں
دیکھنا ستم زدہ غم کی رات اب
ڈھلی
پاک روس دوستی زند گی زندگی
پاک روس دوستی روشنی روشنی
(کلیات حبیب جالب
،ص:٤٠٧،٤٠٦)

جدیدیت کو بطور ایک اصطلاح کے پہلی بار بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں یورپ میں استعمال کیا گیا۔ بعض شارحین جدیدیت کے اس رجحان کا آغاز پہلی جنگ عظیم یعنی ١٩١٤ء سے بتاتے ہیں اور یہ میلان بعض کے نزدیک ١٩٣٠ء یا دوسری جنگ عظیم کے ساتھ ختم ہوگیا۔ ممکنہ حد تک اس کے آغاز کو (AVANT-GARDE) یعنی فرانسیسی علامت نگار شعرا وغیرہ سے منسلک کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ شاعر وادیب تھے جو ادب میں غیر تقلیدی، اختراعی اور انقلابی تصورات رکھتے

تھے۔یورپ میں جدیدیت کا اظہار دادا ازم اور سرئیلزم کی تحریکیوں کے ذریعے ہوا۔ ناموں تلے جدیدیت پسندوں نے جدید نتائج اخذ کرنے کے لیے نئے نئے طریقوں کے استعمال پر زور دیا۔ جدیدیت کے ان مختلف پہلوؤں میں سے جو جدید نظم میں نمایاں نظر آتے ہیں فنی وہیئتی سطح پر علامت نگاری، امیجز، نظم آزاد، شعور کی رو، انسان دوستی جبکہ فکری سطح پر نفسیاتی فکر اور وجودیت اہم ترین ہیں ۔

وجودی فلسفے کی بنیاد بننے والے اسباب میں ابتری ومایوسی، تسلیم شدہ روایات کے خلاف بغاوت مادہ پرستی، عدم تحفظ کااحساس ، سماجی، سیاسی مذہبی، اخلاقی اور جمالیاتی قدروں وغیرہ کی پامالی شامل ہیں ۔ وجودیت کی بنیاد اس دعوے پر ہے کہ وجود جو ہر پر مقدم ہے۔ یہ ڈیکارٹ کے اس مفروضے "I think therefore I am" کے خلاف اس بات کا اعلان ہے کہ "I am therefore I think"یعنی میں ہوں اس لیے میں سوچتا ہوں ۔ کیونکہ سارتر کے نزدیک انسان پہلے وجود میں آتا ہے پھر اپنے جوہر کا انتخاب یا اپنے خواص کا اکتساب کرتا ہے۔ انسان کا انفرادی وجود ہی اہم ترین شے ہے۔ وجودیت کا اولین فریضہ انسانی زندگی کے اسرار کی عقدہ کشائی ہے۔ وجودی دانشور انسان کو روائیتوں اور رواجوں کی زنجیروں سے نجات دلانا چاہتا ہے۔ اور یہی اس کی انسانی دوستی ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدا اردو شعرو ادب کو فرسودہ اور کہنہ روایات سے نجات دلا کر جدید قدروں کے فروغ میں اہم سنگ میل ثابت ہوئی۔ یہ اسی جدیدیت کے اثرات تھے کہ بیسویں صدی کے چوتھے عشرے کے اختتام پر حلقہ ارباب ذوق ایک تحریک کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ جس نے سماجی جمود کے بجائے ادبی انجماد کو توڑنے کی سعی کی اور نہ صرف زندگی کے خارج کو مناسب اہمیت دی بلکہ انسان کے داخل کی پر اسرار آواز کو بھی بکوش ہوش سنا۔ اس نے اجتماع میں گم ہو جانے کے بجائے ابن آدم کو اپنی شخصیت کے عرفان کی طرف متوجہ کیا۔

حلقہ ارباب ذوق نے زندگی اور سماج کے مسائل کو براہِ راست ادب کا موضوع نہیں بنایا۔ تاہم اس تحریک نے ادب کا بنیادی سرچشمہ زندگی کو ہی قرار دیا۔ اور بہترین نظموں میں ان تخلیقات کو شامل کرکے جن سے اس عہد کی سیاسی وسماجی زندگی کا سراغ ملتا ہے یہ ظاہر کیا ہے کہ ادب میں ہر موضوع آسانی سے سما سکتا ہے۔ تصدق حسین خالدؔ اگرچہ رومانوی شاعر تھے لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری میں اپنے زمانے کے سماجی وسیاسی نظریات وحالات کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے زمانے میں سب سے بڑا مسئلہ آزادیِ ملک کا تھا۔ جس کے ساتھ عالم اسلامی کی غلامی ومحکومی کی چبھن بھی

شامل تھی۔ اس دوہری خلش کو انسان دوست شاعر خالدؔ محسوس کیے بغیر نہیں رہا۔

آج پامال ہے باطل کا طلسم
آج آزاد فضاؤں میں ہے سرگرمِ خروش
روحِ بیباک کی آتش نفسی
اک نئے دور کی صبح
چیر کر سینہ مشرق کو اُبھر آئی ہے
آؤ اس صبح کی رنگینی کو
سرخیِ خونِ شہیداں دے کر
ابدی سوز کا جوہر بخشیں
(سرودِ نو، ص:۲۳۰،۲۳۱)

جدید شاعری کے عظیم معمار ن۔ م۔ راشد اپنے فکری سفر میں جس سوال پر غور وفکر کرتے ہیں وہ حقیقتِ انسان سے متعلق ہے۔ ان کی شاعری میں انسان ایک مرکزی اور بنیادی حوالہ ہے۔ اور یہی سوچ انہیں انسان دوست شاعر بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

را شدؔ خدا سے انسان کی بے بسی کا گلہ کرتے ہیں ۔ان کے نزدیک یہ دنیا جس میں انسان رہتے ہیں بے سکوں اور لا چا ر وں کی دنیا ہے۔یہ دنیا غریبوں ، جا ہلوں ،مردوں اور بیماروں کی دنیا نظر آتی ہے۔ایسی دنیا ایک ناتوانی کی داستا ں ہے۔جس کے کردار صر ف ہم نہیں بلکہ ہما را وہ خدا بھی ہے جس کے پاس مسا ئل انسا نی کا کو ئی حل نہیں ہے۔گو یا راشدؔ تقد یرا ور تد بیر ہر دو تصو رات کی نفی کر تے ہیں ۔

ایسی غور و تجسس میں کئی راتیں گزاری ہیں
میں اکثر چیخ اٹھتا ہوں بنی آدم کی ذلت پر
جنوں سا ہو گیا ہے مجھ کو احساس بضاعت پر
ہما ری ہی نہیں افسو س ، جو چیزیں "ہماری" ہیں
کسی سے دور یہ اندوہِ پنہاں ہو نہیں سکتا

(ما ورا

،ص :۲۵)

میرؔاجی کے نزدیک دنیا کے دکھوں سے بھرے لوگ انسانیت کی معراج ہیں ۔ اس لیے انہیں وہ لوگ عزیز ہیں جو دکھوں کی دلدل میں ہمیشہ پھنسے رہتے ہیں ۔لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ دکھوں کے حامی ہیں ۔ دراصل ان کے خیال میں انسان کا مقدر دکھوں سے عبارت ہے اور خوشیاں اس کے مقابلے میں ناپائیدار ہیں ۔ یہ ناپائیدار خوشیاں دکھوں میں اضافہ کرتی ہیں ان کوکم نہیں کرتی۔

آؤ آؤ سکھ لائے ہو؟ بولو، مول بتاؤ تم
اپنے اپنے سکھ کے بدلے مجھ سے دکھ لے جاؤ تم
پل دو پل کا سکھ لائے ہو؟ پل دو پل کا دکھ بھی ہے
جیسا دکھ لینے آئے ہو جیب میں ایسا سکھ بھی ہے؟
سکھ کے بدلے دکھ تو کھرے ہیں پر یہ پرکھ تمہاری ہے
کون ہے پار پہنچنے والا کون نرا سنساری ہے
دنیا کے دکھ بیچ بیچ کر میرا جیون بتا ہے
ہار ہار کر اپنی بازی میں نے جگ کو جیتا ہے

(کلیاتِ میراجی، ص:٤٥٩،٤٦٠)

یوسف ظفر نے انسان کو رومی کے زاویہ نظر سے پرکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں انسان انسان نہیں بلکہ دام ودر دکھائی دیتے ہیں ۔ وہ ایسے انسان کی خواہش کرتے ہیں جو دکھی انسانیت کی خدمت کاجذبہ لے کر انسان دوستی کے جذبے سے سرشارہو کر شہر کی گلیوں میں گشت کرتا دکھائی دے۔ اپنی نظم "وراثت" میں انہوں نے انسان کے مختلف تخریبی رویوں اور ان کے نتائج کا تفصیل سے نقشہ کھینچا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

شب تارمیں ڈھونڈتی ہیں نگاہیں کہاں جارہے ہیں جئے جانے والے
تجسس کی آنکھوں میں مذہب کا سرمہ ہے لیکن یقین

بصارت نہیں ہے
تجسس کے ہاتھوں میں ہے فلسفے کا عصا لیکن اس کا
سہارا یقینی نہیں ہے
تجسس شبِ تیر وتار میں وقت کی ٹھوکریں کھاکے بھی نا
ر سا ہے
ہوس ، بھونکتی ہے مگر اس کا چہرہ انساں کا چہرہ
ہوس کاٹتی ہے مگر اس کا جبڑا ہے انساں کا جبڑا
بد دستور شیروں کی دھاڑ اور فیلوں کی چنگھاڑ، انساں کی
آواز سے پھوٹتی ہے
شب تار میں "پالیا" پالیا، کی صداؤں سے ارض وسما
کانپتے ہیں
مگر کیا ملا ہے؟ فقط رازِ یک ذرد کائنات
کہ جس سے فنا کا طلسم دوامی ہوا پختہ تر
شبِ تار میں آدمی کو ابھی تک وہی قطب تارہ نظر آرہا ہے
کہ جس سے سفید اور سیاہ کی ہے صورت نمایاں
کہاں ہیں وہ تہذیب ومذہب کہ جن کی حقیقت پہ ہیں علم
وادراک نازاں
کہاں ہے؟ --- کہاں ہے؟ --- وہ انساں --- وہ انساں !!!
(کلیاتِ یوسف ظفر،صدا بہ صحرا، ص: ۳۵۷)

مجید امجدؔ کے نزدیک سب انسان مٹی کے رشتے سے منسلک ہیں ۔ یہ رشتہ ان کو برابری کا درجہ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مٹی کا کوئی پیکر بھی طاقت کے اصل سرچشموں مثلاً اداروں پر قبضہ کرکے انسانی وجود کو خوشی کی روشنی دے سکتا ہے لیکن موجودہ سماجی ڈھانچے پر جن لوگوں نے پنجے گاڑے ہیں ۔ وہ عزم ستم سے انسانی وجود کو عدمِ تحفظ میں مبتلا کر رہے ہیں ۔ مجید امجدؔ نے انسان دوستی کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے یہ سوال اٹھایا ہے کہ ہم اس دن کا انتظار کررہے ہیں جب قوت پر قبضہ رکھنے والے ہاتھوں کو یہ احساس ہو کہ انسان مٹی کے رشتہ سے وابستہ ہیں ۔

اپنی بابت تو ہم تم جانتے ہیں کہ ہماری منزلت اور ہمارے منصب مٹی
کے رشتے ہیں
لیکن میں کہتا ہوں ، یہ جو سارے ادارے، یہ جو ساری تنظیمیں اور
تملیکیں ہیں
یہ سب جگہیں کتنی تکریموں والی ہیں
جو بھی قوت کے سرچشموں پر قوت حاصل کرے
اس کے بس میں ہے اور دلوں میں وہ تقدیریں بھر دے

جن میں لاکھوں انسانوں کے ضمیروں کی خوشیاں مضمر ہیں
لیکن اب ان جگہوں پر جن لوگوں کے پنچے ہیں
کیسے ان کے ارادوں کے قبضے ان کی سانسوں پہ کسے ہوئے ہیں
اور کتنے آسودہ ہیں اپنے عزم ستم پر
بندے جانے وہ دن کب آئے گا
جب یہ لوگ بھی جانیں کہ سبھی یہ ان کے منصب مٹی کے رشتے ہیں
وہ دن جس کے تقدس کے آگے ہم نے ہمیشہ اپنے آپ کو بے قوت پایا ہے
(کلیاتِ مجید امجد،
ص:٦٠٥)

قیوم نظر ایک حساس انسان ہیں ۔ وہ کسی واقعے یا سا نحے کو دیکھ کر آگے نہیں بڑھتے بلکہ اس پر غور و فکر کرتے ہیں۔ اور یہی ایک انسان دوست شاعر کی پہچان ہے کہ وہ اس واقعہ یا سانحہ کو اپنے جذبات کی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرتا ہے ۔ وہ زندگی کی خستہ حالی پر بھی پریشان ہوتے ہیں ۔ کیونکہ ان کے نزدیک زندگی ایک جبر مسلسل ہے۔ اور انسان اسکو جینے پر مجبور ہے ، نظم " عشق گریزاں " کے اشعار دیکھیے ۔

ہمکنار غم ہو کر
لطف زندگی کھو کر
آج اور کل ، برسوں
بے بسی کے بل برسوں
زہر زیست پینا ہے
آدمی کو جینا ہے
(قلب و نظر کے سلسلے
، ص: ٥٤٤)

اختر الایمان کے ہاں زندگی ایک سمجھوتے کا روپ دھار لیتی ہے جس میں ضمیر کو چھوڑ دیا جائے تو پیچھے صرف حیوانیت رہ جاتی ۔ اخترالایمان کی شاعری میں انسانیت اور حیوانیت کی یہ کشمکش مختلف روپ میں سامنے آئی ہے۔انہوں نے اپنی انسان دوستی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اپنی نظم " نقش پا" میں اپنے معاشرے کا وہ بھیانک روپ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ جس کا شکار معاشرے کا ہر غریب اور مفلس الحال انسان ہے۔

کوئی نیا افق نہیں جہاں نظر نہ آ
سکیں
یہ زرد زرد صورتیں یہ ہڈیوں
کے جوڑ سے

(گرداب ،ص
:٥٧)

دراصل انسانیت نواز مختار صدیقی کی آواز ہر اس لمحے سنائی دیتی ہے۔ جب انسان اور انسانیت پر ظلم ڈھایا جاتا ہے اور خونِ ناحق بہایا جاتا ہے اور یہی ان کی انسان دوستی ہے کہ وہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں ۔مختار صدیقی نے نظم "منزلِ شب" میں ذہن انسانی کے بدلتے ہوئے میلانات کو بھرپور طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ بدلتی ہوئی اقدار اور تخریبی رویوں کی بالادستی نے انسان کو ایک بے مایہ سی چیز بنا دیا ہے ۔ اب ایٹمی طاقت کا حصول انسان کے ارتقاء کی علامت بن گیا ہے۔ ان کے نزدیک ان مکروہات نے انسان کو درندہ صفت بنا دیا ہے وہ حیوانیت کی جیتی جاگتی مثال بن چکا ہے اور وہ ہر وقت اپنے سے چھوٹے اور کمزور درندوں کو چیرنے پھاڑنے کی فکر میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے انسانیت کے مٹ جانے کا مر ثیہ اور آدمیت کی ذلت و رسوائی کا نقشہ دلسوز پیرائے میں بیان کیا ہے ۔

اور یہ سرگوشیاں کہتی ہیں وہ باتیں گئیں
شہر و صحرا ، خونِ ناحق سے رہیں گے لالہ گوں
زندگی بے مایہ ہے ، جیتیں گئیں ، ماتیں گئیں
آج اک عالم کو پاگل کر چکی ہے بوئے خوں
سروری کرتا ہے بے مقصد تباہی کا جنوں
نسل انسانی کی جیسے حسرتِ دل ہو یہی
علم و حکمت اس طرح ہیں اس کے آگے سرنگوں
جیسے ان صدیوں کی جانکاہی کا حاصل ہو یہی
آدمی کے ارتقا کی جیسے منزل ہو یہی

(منزلِ شب
،ص:٥٣)

مختارؔ صدیقی کی فکر کا ایک اہم موضوع شرفِ انسانی ، مقصدِ تخلیقِ انسان کو جاننا اور اس دنیا میں انسان کی حالتِ زار کا تجزیہ کرنا ہے اور یہی ان کی انسان دوستی ہے۔ مختارؔ کے خیال میں انسان کوا شرف اور جلیل القدر مخلوق اس لیے کہا گیا ہے کہ انہوں نے خدا کی ذات کی گواہی دینے کی بھاری ذمہ داری اپنے ناتواں کندھوں پر اُٹھائی ہے اور یہ بار کوئی اور مخلوق ا ٹھانے کی جسارت نہ کر سکی ۔ وہ انسان کو شاہد حق سمجھتا ہے۔ اس لیے انسان اس کے ہاں بر ترو اعلی ہے۔

اب میں اس لہجے کو اس نور کی آواز کو
پہچانتا ہوں
اس نے کب مجھ سے کیا کہا تھا----- میں اب
جانتا ہوں
اس نے اک روز ازل
جو کہ مرا روز ازل تھا----- یہ کہا تھا
" تمھیں ہم زندگی دیتے ہیں "
ذرا ----یہ تو شہادت دو
کہ ہم کون ہیں ---- تم جانتے ہو
اور تم کون ہو ، تم جانتے ہو

(آثار ،ص: ۱٦۰)

انسان دوست ضیاؔ جالندھری کی نظمیں جدید شہری زندگی کے المیہ و آشوب کی داستان سناتی نظر آتی ہیں۔ اس عہد میں مشینوں کی حکومت نے انسانی زندگی کو جبر کی مانند بنا دیا ہے۔ جس سے چھٹکارے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی ۔ ہرطرف خوف ودہشت کی فضا طاری ہے۔ جس کے باعث یا تو لوگوں نے چپ سادھ لی ہے یا ایک دوسرے سے دست وگریباں نظر آتے ہیں ۔ آپس کا پیار و محبت ختم ہو چکا ہے۔ ہر طرف عجیب نفسانفی کا عالم دکھائی دیتا ہے۔انسان دوستی کے جذبات ماند پڑچکے ہیں ۔ ضیاؔ جالندھری نے اس نفسانفسی کی تصویر کشی بہت عمدہ پیرائے میں کی ہے۔ نظم "شہر آشوب " کے اشعار دیکھیئے۔

وہی صدا جو مرے خوں میں
سرسراتی تھی
وہ سایہ سایہ ہے اب ہر کسی کی
آنکھوں میں
یہ سرسراہٹیں ساپنوں کی سیٹیوں
کی طرح

سیاہیوں کے سمندر کی تہ سے
موج بہ موج
ہماری بکھری صفوں کی طرف
لپکتی ہیں
بدن ہیں برف ، رگیں رہگزار
ریگ رواں
گئی تو سہم کے چپ ہوگئے ہیں
صورت سنگ
جو بچ گئے ہیں وہ اک دوسرے
کی گردن پر
جھپٹ پڑے ہیں مثال سگان آوارہ
ہوا گزرتی ہے سنسان سسکیوں کی
طرح
(خواب سراب ، ص:
٢٦٣ ، ٢٦٤)

انسان دوست منیرؔ نیازی بے روح انسانوں کا دکھ درد رکھتے ہیں اور ساتھ ساتھ ان باہمی رویوں میں تبدیلی کی خواہش بھی رکھتے ہیں جو ان دکھوں کا موجب ہیں ۔ وہ برائی کے خلاف تبلیغ کے بجائے عمل خیر کے تسلسل پر توجہ دیتے ہیں ۔ مجموعی طور پر وہ صالح ماحول کے آرزو مند ہیں جہاں انسان دوستی کی اقدار پروان چڑھیں اور انسان دوست ماحول کی تشکیل میں مصروفِ عمل لوگوں کے لیے دعا ئیہ اندازاختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔ نظم "ایک نیا شہر دیکھنے کی آرزو" کے اشعار دیکھیے۔

ایک نگر ایسا بس جائے جس میں نفرت
کہیں نہ ہو
آپس میں دھوکا کرنے کی، ظلم کی
طاقت کہیں نہ ہو
اس کے مکیں ہوں اور طرح کے،
مسکن اور طرح کے ہوں
اس کی ہوائیں اور طرح کی گلشن اور
طرح کے ہوں
(ماہِ
منیر،ص: ٢٩)

لسانی تشکیلات ہر زبان کا حصہ ہیں ۔ زندہ زبانیں مسلسل شکست و ریخت کے عمل سے دور چار رہتی ہیں۔ اس کے برعکس جامد زبانیں

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماضی کا قصہ بن کر رہ جاتی ہیں ۔ زبان کوئی مشینی عمل نہیں کہ ادھر مشین میں الفاظ ڈالے ادھر کھٹاکھٹ زبان تشکیل پا کر باہر نکل آئے گی۔ یہ صدیوں کے عمل پر محیط ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زبان میں ترمیم و اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ بعض الفاظ اپنی قدرو قیمت کھو کر متروک ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے الفاظ لے لیتے ہیں ۔ اردو میں لسانی تشکیلات کی کہانی صدیوں پر محیط ہے۔

۱۹۶۰کی دہائی میں ایک ایسا گروہ نمودار ہوا جس نے تحقیق و تنقید کے سابق سانچوں سے عدم طمانیت کا اظہار کیا اور "نئی لسانی تشکیلات" کی طرح ڈالنے کی سعی کی۔ اس گروہ کے سر براہ افتخار جالب تھے۔

لسانی تشکیلات کے روح رواں افتخار جالب نے نہ صرف لغوی معانی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا بلکہ اس کا دائرہ وسیع کر کے شعر و ادب میں مربوط جملے کے تصور کو خیر باد کہہ دیا۔ اور ایسی تکنیک کا استعمال شروع کیا جس سے نحوی ترکیب کے اجزا درہم برہم ہو جائیں ۔

اس کا اندازہ اس کے مجموعہ کلام مآخذ کی نظموں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مآخذ چھتیں نظموں پر مشتمل شعری مجموعہ ہے ۔ اس مجموعے کے دیپاچے میں وہ شاعری کی بو طیقا کو نئے انداز سے بیان کرتے ہیں ۔

نئی شاعری کے علمبر داروں میں جیلانی کامران کا نام بھی اہمیت کا حامل جیلانی کامران نے جدید نظم کی تازہ کاری کے لیے جو حل تجویز کیا وہ زبان میں تبدیلی سے عبارت ہے۔ان کے خیال میں راشدؔ کی نسل تک کے شاعر اور ترقی پسند شاعر جو زبان اور طرزِ اظہار اختیار کرتے رہے اسکی تربیت پرانی شریعت کے اصولوں پر ہوئی تھی۔ جسکا مزاج "شعراَ لعجم" نے متعین کیا تھا۔

جیلانی کامران کے خیال میں پرانی شریعت شاعر کے تخیل کو آزاد بنانے کی بجائے پا بند بنا دیتی ہے۔ اس لیے وہ ایسی زبان استعمال کرنے پر زور دیتے ہیں ۔جسکا تعلق دبستان دہلی یا لکھنو سے نہیں بلکہ عوام سے ہے۔

ساٹھ کی دہائی کے بعد جدید نظم میں جس طرح شہروں کو صنعتی و میکانکی تہذیب کے ہاتھوں بڑی بڑی عفریتوں کا روپ دھارتے دکھایا گیا اسکے نقوش جیلانی کامران کی نظموں میں واضح دکھائی دیتے ہیں ۔

بجلی کے کھمبے سے میں نے کہا
وہ چمکتا ہوا شہر کس راستے پر
بسا ہے؟

ہوا سگرٹوں کا دھواں بن کے آئی
دکانوں کے باہر
دہکتے ہوئے دن کی دھول اورمٹی
گھٹا بن کے پھیلی تو دھول اور مٹی
کی چادر پہ
میں نے کئی ایک سائے، کئی لاو لشکر
کئی داستانیں ، کئی ملک دیکھے
(جیلانی کامران کی نظمیں (کلیات)،ص:۱۵٤)

انسان دوست افتخار جالب موجودہ عہد کی پیچیدگیوں کا شعور رکھنے والے ایک ایسے شاعر ہیں جو اپنے عصر کی پیچیدگیوں کو پیچیدہ اسلوب میں بیان کرتے ہیں جسکی وجہ سے ان کی نظمیں شدید ابہام کا شکار دکھائی دیتی ہیں ۔ چونکہ ان کا یہ پیچیدہ بیان آزاد تلازمہ کاری کی بنا پر ہے اس لیے ان نظموں کی تفہیم ایک مشکل امر ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر طویل خود کلامی میں مصروف ہے جس میں "میں " کاصیغہ بے حد اہم ہے۔ وہ اپنے تجربات و مشاہدات صیغہ" میں " میں بیان کرتا چلا جاتا ہے اور یون ان کی انسان دوستی "وجودی " صورت اختیار کر لیتی ہے۔

خود نگر ہوکے رہوں یا جہاں بینی کروں ، میری حقیقت ہے
حقیقت میں ہوں ! میں ہوں ! میں ہوں اور سیلِ حوادث مرے ابرو کے اشارے سے بڑھے
بڑھ کے تھمے، تھم کے بڑھے
میری خبر میں ہے شب قدر کا ہنگام
تمہیں کوئی خطر ہو تو کہوں ! آتی ہواوں میں ہوس کی ترغیب ہے
معلوم ہے، سب راہیں مرے عکس میں ہیں
اورہبوطِ آدم مرے عکس میں ہیں

وزیر آغا کی نظموں میں ارضی حوالہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ جو اس بات کا اظہار ہے کہ انہیں اپنی جنم بھومی سے بہت پیار ہے ۔وہ اس کے نظاروں ، کوہساروں ، مرغ زاروں اور بیابانوں میں منہک دکھائی دیتے ہیں ۔ ان کی نظموں میں دھرتی سے وابستگی دراصل دھرتی پر بسنے والوں کے ساتھ وابستگی ہے۔ اور یہی ان کی انسان دوستی کی بہترین مثال ہے۔

تم کیوں ربڑ کے بوٹ کی نوک سے
ٹھوکر مار کے ان خوشیوں کو
بڑی بڑی خوشیوں کے پیچھے
دوڑ رہے ہو
کار سے اترو
رُک کر دیکھو

(چٹکی بھر روشنی،کاغذی پیرہن،
ص:۱۸)

وزیر آغا کی نظموں میں انسانیت سے محبت کا درسِ اخلاق موجود ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسان انسان کے دکھ درد اور کرب کو محسوس کرے۔ وہ ذاتی حرص وہوس کا بندہ بن کر نہ رہ جائے بلکہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی سر بلندی کے لیے کوشاں رہے۔ وہ معاشرے میں موجود عدم مساوات، استحصال، سماجی اورناانصافی ،متعصبانہ رویوں اور بے مہر یوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور معاشرے میں امن و آشتی، پیار و محبت اور انسان دوستی کے پھول کھلانے کے خواہشمند نظر آتے ہیں کیونکہ یہی اصل انسانیت ہے کہ نفرت کو ختم کر کے محبت کی شمع فروز اں کی جائے۔ اور یہی ایک انسان دوست شاعر کا حسن اخلاق بھی ہے اور حسن بیاں بھی۔

عجب وہ شخص تھا
زہرہ، زمیں ، مریخ سب
سورج کو کعبہ جان کر قربان ہوتے ہیں
مگر وہ شخص تو
اپنے ہی مرکز پر
نجانے کب سے گرداں تھا
سنا ہے کوئی سورج
اُس کے اپنے تن کے اندر جل اٹھا تھا
وہ جس کے گرد
شب بھر گھومتا تھا

(اک کتھا انوکھی، ص :۲۲ے)

زاہد ڈار ایک ایسے ماحول میں زندہ ہے ۔ جس میں ظلم و ستم اور میکانکی جبریت نے انسانی اقدار کو پامال کر دیا ہے۔ فرد کا فرد سے رابطہ منقطع ہو چکا ہے۔ یہ دوری اور احساسِ تنہائی انسان کی مجبوری اور بے بضاعتی کا واضح ثبوت ہے۔ اس نئے ماحول میں ڈر اور خوف کا عنصر بھی واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ جس میں اس دور کا ہر شخص مبتلا دکھائی دیتا ہے ۔ جس میں انہوں نے جدید انسان کے احساس

کم مائیگی، خوف، ڈر اور ماحول سے بیزاری کوانسان دوست شاعر کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔

میں ہمیشہ کی طرح کیچڑ میں لت پت آج بھی اس شہر
کی بدبو بھری گلیوں میں پاگل بلیوں کی کھوج میں بھوکا
پھرا کرتا ہوں لیکن بلیاں جانے نہ جانے کس
مکاں میں کس کی رانوں میں چھپی بیٹھی پڑی سوتی ہیں
اب تو راستے خاموش ہیں
سوچتا ہوں کیوں نہ میں اس شخص یا اس چیز یا
احساس یعنی خوف کو جو میرے سر پر آسماں کی
شکل میں چھایا ہو اہے، اپنی نفرت کانشانہ، کوربیتی کا بہانہ کر
کے ٹھہراوں گراوں توڑدوں
کیوں نہ میں ، ہاں کیوں نہ میں ہٹلر۔۔ مگر یہ قہقوں
کی لہر سی کیسی؟ ۔۔ کہیں دو بلیاں
اف کس طرح جاؤں
جاؤں چھپوں میں کیا کروں

(تنہائی، ص:۲۴۱،۲۴۲)

ساقی فاروقی نے انسان کے ہاتھوں انسان کے قتل کی داستاں کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ابتدا سے انسان اپنے مفادات اور ہوس کی خاطر دوسروں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارتا آ رہا ہے۔ موت کا یہ کھیل صدیوں سے یوں ہی جاری وساری ہے جسے کوئی نظام یا انسانی طاقت نہ تو روک سکی ہے اور نہ ہی اس میں کوئی تبدیلی لاسکی ہے۔ معاشی مفادات کے حصول کا سلسلہ کسی جوئے خون کے تندرو ریلے کی مانند ملکوں ، شہروں ، بستیوں اور ان میں آباد انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لیتا آ یا ہے۔ طاقتور طبقے مجبوررونا چار انسانوں کے خون کے ذریعے اسکی روانی میں اضافہ کرتے رہے اور اس ندی کا بہاو جاری رہا۔ نظم "جوئے خوں " کے اشعار دیکھیئے۔

میرے معاون لہو مجھ میں لا لا کے بھرتے رہے
یونہی جنگی جہازوں سے چپ چاپ دشمن اترتے رہے
اور ہیروں کے انبار بھی مرے سر سے گزرتے رہے
کوئی دیکھے مجھے
بہہ رہی ہوں یونہی
سال ہا سال سے

(زندہ پانی سچا، ص:۵۰)

آفتابؔ شمیم کی نظموں میں ان سیاہ راتوں کی روداد بھی ملتی ہے جس میں تیسری دنیا کا ہر فر دمبتلا ہے۔ وہ آمرانہ نظام اقتدار کے مظالم

کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہیں تا کہ ان احتجاجی رویوں اور اور باغیانہ اقدام کے ذریعے انکی بیخ کنی کی جا سکے اور ہر طرف امن کا راج ہو۔

خداوند
مجھے طائر ، شجر ، پربت بنا دے
یا مجھے ڈھا دے
کہ دوبارہ جنم لوں اپنی
بے مشروط آزادی کی خواہش سے

(فرد اثراد،ص:۱۲)

انسان دوست انیس ناگی انسان سے زندگی کا حق چھننے والے نظام کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور صنعتی تمدن کی منفی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہو تے ہیں ۔ ان کے نزدیک ایسا معاشرہ جو زر پرستی کا شکار ہو کر اپنی اعلیٰ اقدار سے محروم ہو چکا ہے وہ اس معاشرے میں تبدیلی کے خواہاں ہیں ۔

ہماری زندگی تو ایک بوجھ کی طرح
شقاوتوں میں کٹ گئی
کسی کو ہم شجاعتوں کا درس بھی نہ دے سکے
نہ اپنی سرزمیں کو عظمتوں کا راز دے سکے
ہماری نسل لوٹ اور کھسوٹ میں رہی
مقاومت کے حوصلے سے تہی رہی

تبسم کاشمیری کے ہاں شہر کے بچوں ، بوڑھوں اور جوانوں سے محبت کا ایک منفرد انداز نظر آتا ہے۔ وہ شہر کے باسیوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے ہوئے اس میں برابر کے شریک دکھائی دیتے ہیں ۔

مجھے ان خون میں جلتے ہوئے شہروں سے الفت ہے
میں ان کے نرم بالوں ، زرد گالوں سے ہمیشہ پیار کرتا ہوں
میں ان کے سوکھتے پامال جسموں پر وفا کے ہونٹ رکھتا ہوں
مجھے بچوں سے ، بوڑھوں سے، جوانوں سے محبت ہے
میں ان کے گرم تازہ آنسوں سے پیار کرتا ہوں
مجھے اس شہر کی کہنہ ہواوں سے محبت ہے

(تمثال، ص :۱۴،۱۸)

یہ بھی ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ انسان معاشرتی حیوان ہے۔ معاشرے میں اکیلے زندگی بسرکرنا اس کے لیے ممکن نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی پیدائش سے لیکر موت تک دوسروں کی مدد کا طالب ہے۔ کشور ناہید جیسی انسان دوست شاعرہ انسان کی انفرادیت کی بجائے اجتماعیت اور اجتماعی شعور کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں ۔ وہ ایک انسان بلکہ ایک فرد پر ہونے والے ظلم کو پوری انسانیت پر ظلم کے مترادف قرار دیتی ہیں ۔

یہ ہاتھ جن میں رگیں ابھر کے
خزاں کی آمد کی نامہ بر ہیں
رگیں کبھی یوں تپش زدہ تھیں
کہ جیسے سیال آگ
بے آب مچھلیوں کی طرح ہو بے کل
یہ ہاتھ اٹھے نہیں دعا کو
یہ ہاتھ دست طلب کی صورت
کہیں سبک سر نہیں ہوئے ہیں
یہ ہاتھ اپنی آرزوں کے قاتل و ناخدا رہے ہیں
یہ ہاتھ کہ جن کی انگلیوں میں
مشقتوں کے عذاب نے
ہر گرہ کو چپٹا بنا دیا ہے
ہر ایک ناخن شکستہ ساحل کی شکل میں
بدنمائی کا آئینہ بنا ہے
یہ میرے اچھے دنوں کی تصویر ابتدا ہے

(کلیات کشور ناہید،بے نام مسافت، ص :۲۱۴،۲۱۸)

انسان دوست عبدالرشید کی انسان دوستی صرف غاصبوں اور قاتلوں کے خلاف غم و غصہ اور نفرت و حقارت تک محدود نہیں بلکہ وہ ظلم کا شکار ہونے والے عوام کے لئے پیار و محبت اور انسانی ہمدردی کے جذبات بھی رکھتے ہیں ۔

سرمد صہبائی کی نظموں کا مطالعہ کیاجائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی نظموں میں پنجابی صوفی شعرا خصوصاً شاہ حسین، بلھے شاہ اورصوفی شعرا کی فکری رو موجود ہے جوا ن کی روحانی اور اخلاقی جہت کو نمایاں کرتی ہے۔ اور ان کو ایک انسان دوست شاعر کے روپ میں سامنے لاتی ہے۔

معاصر جدید اردو نظم موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے اپنی ایک الگ پہچان اور شناخت کی حامل ہے۔
عالمی سطح پر بھی اس عہد میں کوئی ایسی بڑی فکر پیدا نہیں ہوئی جسکے اثرات ادب پر پڑے ہوں ۔ کسی حد تک مابعد جدیدیت کے نام پر اس عہد کے جملہ مسائل کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن تا حال یہ بھی کوئی فلسفیانہ اساس نہیں بنا سکی۔ اس لیے اس عہد میں لکھی گئی نظموں کو جدیدیت کی توسیع قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس کے زیر اثر نظم نگاروں نے اپنے عہد کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کو عالمی تناظر میں دیکھنے، سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش کی اور اپنی انسان دوستی کا ثبوت فراہم کیا۔
یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس عہد میں نظم نگار کے شعور نے ایک نئی کروٹ لی ہے ۔ سواس نے اپنے تخیل کو آزاد چھوڑ کر عصری آگہی کے ساتھ جدید مشینی ا ور برقیاتی عہد کے انسان کو موضوع بنایا۔ معاصر نظم کا بنیادی موضوع انسانی روح کا داخلی بحران ہے جو انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس عہد کی دین ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں بھی نظم نگاروں نے پھیلتے ہوئے صنعتی معاشرے کے باعث فرد کی تنہائی اور اقدار کی شکست و ریخت کو موضوع بنایا تھا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس دور کا فرد ایسی تنہائی کاشکا رنہیں تھا جیسا کہ آج کے عہد میں ہے۔ حقیقتاً پچھلے بیس سالوں میں کمپیوٹر، فیکس ،سیلولر ٹیکنالوجی اور میڈیا کی بڑھتی ہوئی طاقتوں نے مردکو یوں اپنا اسیر کر لیا ہے کہ اس کے اجتماعی تصورات اور عقائد، اقدار اور اخلاقیات یکسر تبدیل ہو کر ختم ہو گئی ہیں ۔معاشرے سے انسان دوستی کی اقدار ناپید ہوگئی ہیں ۔ فرد گرد و پیش سے مایوس ہوکر اپنی ہی ذات کی طرف دیکھنے لگا ہے۔ لیکن یہاں بھی محرومی اور داخلی کرب و انتشار کے سوا اسے کچھ نہیں ملتا۔ اس پرمستزاد یہ کہ سرمایہ دارانہ استحصالی نظام کے نت نئے ہتھکنڈے اور جبریت سیاسی عدم استحکام اور لا قانویت و غیرہ اس کے لیے سوہان روح بن گئے ہیں ۔ یہ ایسا منظر نامہ ہے جو اس عہد کے انسان کو شدت کے ساتھ بے چارگی اور بے بسی کا احساس دلا رہا ہے۔ ایسے میں اس کے پاس کوئی اخلاقی و روحانی سہارا بھی نہیں ہے۔ اس عہد میں بین الاقوامی سطح پر بھی زندگی انتشار، خوف اور بے بسی کا شکار ہے۔ دنیا کے یک قطبی ہونے کی بنا پر معلوم نہیں پڑتا کہ کون کس کا دشمن اور کس کا دوست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان پہلے سے زیادہ نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو رہا ہے۔ اس لیے یورپی نظم نگاروں کی طرح اردو نظم نگار بھی دروں بینی کی طرف مائل ہوئے

ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انسانیت نوار شعرا اپنے عہد کے المیے کو یوں بیان کرتے ہیں جیسے یہ ان کے ذاتی دکھ ہوں ۔

رفیق سندیلوی کی نظم "توتتلی تھی" میں انسان کے اس درخشندہ ماضی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جب وہ فطرت کا دلدادہ تھا اور اس کے رویوں اور باتوں میں پھلولوں جیسی نرمی اور نزاکت پائی جاتی تھی۔ انسان کا کام تتلی کی مانند ہر طرف خوشیاں اور رنگ بکھیرنا تھا۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی رویوں میں بھی تبدیلی آگئی ہے اور انسان تتلی کی بجائے سانپ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ جس کا کام دوسروں کو ڈسنا اور تکلیف پہنچانا ہے۔

تو تتلی تھی
چھوٹی سی ایک بھنبھیری تھی
ترے فرغل میں ہر رنگ تھا
تیرے سنگ تھا
موسم
پھول ترے متوالے تھے
ترے گرد سنہری ہالے تھے!
تنکے کی طرح
کس آندھی نے
تجھے رکھا اپنے ہاتھ پہ
ماری پھونک
اکھاڑے پتوں کے خیام
پروں کے پیراہن میں
کس نے لگادی آگ
بتا کب بیضہء خواب کو ٹھونگ لگی

(غار میں بیٹھا شخص، ص: ۱۱۷، ۱۱۸)

انسان دوست جاوید انور نے اپنی نظموں کے ذریعے انسان کی سماجی حیثیت کو بھی واضح کرنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ نچلے طبقے کے افراد جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں ۔ لیکن اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کی جرات نہیں کرسکتے۔ ان کی سوچ اور فکر کو پابندِ سلاسل کردیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں "بھونک" اور "بولتا کیوں نہیں " میں معصوم بچے کا کردار دراصل نچلے طبقے پر چپ کی حکمرانی کو ظاہر کرتا ہے۔ شاعر معصوم بچے سے بار بار سوال کرتا ہے کہ وہ لب کیوں نہیں کھولتا اور آخر چپ کیوں ہے۔

دیکھتا کیوں نہیں آج بازار میں جشنِ افلاس ہے
شہر کی بھوک چوری ہوئی
اور خبروں نے اخبار گم کردیا
لوگ روتے رہے
لوگ ہنستے رہے
تیرے بستر پہ اشکوں کی چمپا کھلی
اور تو چپ رہا
تیرے ماتھے پہ مسکان کا عطر چھڑ کا گیا
اور تو چپ رہا!
میری ہنڈیا جلی
میرا چولہا بجھا
میری جھولی سے حرفِ دعا گر گیا
میرے بچے تو لب کھولتا کیوں نہیں
بولتا کیوں نہیں

(شہر میں شام،ص: ۱۳)

افضال احمد سید کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں انسان دوستی کی جھلک نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ انسان جس میں اللہ تعالیٰ نے تخلیقی جوہر چھپا رکھا ہے۔ اس کرہ ارض پر اسکی تخلیقی صلاحیتوں پر جگہ جگہ پابندیاں عائد کر کے اسکو ناکارہ اور بیکار بنانے کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔ نظم" مٹی کی کان" میں نسل در نسل انسانوں کے بننے اور بگڑنے کا عمل دکھانے کے لیے مٹی کی کان کی تمثال تراشی گئی ہے۔ اس نظم میں مختلف کر دار مختلف انسانی رویوں کے عکاس ہیں ۔ کان میں کام کرنے والوں مزدوروں پر ظالم و جابر قوتوں کا ظلم و ستم ان کی سفا کی کا منہ بولتا ثبو ت ہے۔

اگر نگرانوں کو معلوم ہو جائے
کہ ہم نے مٹی کی کان میں آنے سے پہلے پانی پی لیا تھا
تو ہمیں شکنجے میں الٹا لٹکا کر
سارا پانی نچوڑ لیا جاتا ہے
اور پانی کے جتنے قطرے بر آمد ہوئے ہیں
اتنے دنوں کی مزدوری کاٹ لی جاتی ہے

(مٹی کی کان، ص :۲۷)

انسان دوست نصیر احمد ناصر اپنے اردگرد بپا آشوب سے پوری طرح آ گاہ دکھائی دیتے ہیں ۔ نظم "دھند کے پار "کے اشعار دیکھیے جس میں سارا شہر فائرنگ، دھماکوں ، سائرن اور شعلوں کی زد میں دکھائی

دیتاہے۔ انسان دوست نصیر احمد ناصر اس کرب کی عمدہ تصویر کشی کر تے ہیں -

شہر بھر میں
فائرنگ، زخمی، دھماکے ، سائرن
شعلے
دھوئیں کے آبنوسی دائرے
جلتے تناطر
آگ میں لپٹی کتابیں
لائبریری کی عمارت
میوزیم
تصویر کی آنکھوں میں آنسو
سلسلہ در سلسلہ سہمی ہوئی
اطراف میں
اعضاء بریدہ زندگی
سر گشتگی افکار کی ، غارت گری الفاظ کی
تازہ لہو تاریخ کے اوراق پر
(پانی میں گم خواب ، ص:۱۲۴،۱۲۵)

روش ندیم کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ گھمبیر معاشی مسائل کے باعث انسانی زندگی کرب و ابتلا کاشکار ہے۔تلاش معاش کے چکر اور تنہائی کے احساس نے انسانی شناخت کا مسئلہ پیداکر دیا ہے۔ ان کی نظم "آکاس بیل" انسان کی پہچان کی گم شدگی کا نوحہ بیان کرتی نظر آتی ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

میں اکثر سوچتا رہتا۔۔۔!
یہ دنیا کیسی دنیا ہے
جہاں لوگوں کو دفتر کے جھمیلوں سے فراغت ہی نہیں ملتی
سویرے چائے میں اخبار کے کالم بھگو کر ناشتہ کرنا
پھر اس کے بعد دن بھر فائلوں پر بیٹھ کر
دریائے فردا کے نئے گمنام ساحل ڈھونڈتے رہنا
اور آخر ڈوبتے سورج کی کرنوں پر گئے دن کی
خباثت تھوک کر گھر لوٹنا اور سوچنا۔۔۔ ہم کون ہیں ؟
(ٹشو پیپرپہ لکھی نظمیں ، ص:۲۱)

انسان دوست ذیشان ساحل کی نظموں کے مجموعوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی نظمیں عصری آشوب کی بہترین عکاس ہیں ۔ ذیشان ساحل نے اس انتشاری کیفیت کو موضوع بحث

بنایاہے جسکی ذمہ داری اس کے اپنے ہی مکینوں پر ہے اور ہر جدید شہر کا یہی المیہ ہے۔

میں بہت اکیلا ہوں
تم مجھ سے دوستی کر لو
شہر آتا ہے
اور اپنے ہاتھ ہماری طرف پھیلا دیتا ہے
ہم اس کے ہاتھوں کو دیکھتے ہیں
اور ڈر جاتے ہیں
شہر کے ہاتھ کہنیوں تک
جلے ہوئے ہیں

(کراچی اور دوسری نظمیں ، ص:۳٤)

تیسری دنیا کے تمام لوگوں کے نام یہ پیغام عام کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ بچپن کے وہ کھلونے جن سے ہم کھیلتے تھے اب وہ ہمارے حالات سے کھیلتے نظر آتے ہیں ۔ معاشرے میں ہر طرف حیوانیت اور درندگی کا راج دکھائی دیتا ہے۔ انسانیت کی اعلیٰ قدریں دم توڑ چکی ہیں ۔ اب انسانی خون پانی سے ارزاں دکھائی دیتا ہے۔ کوئی کسی سے ہمدردی اور پیار و محبت بانٹتا دکھائی نہیں دیتا بلکہ انسانیت اور انسان دوستی کی جگہ حیوانیت نے لے لی ہے۔

انسانیت کے اس طرح معدوم ہو جانے پر دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں ۔

عجب حادثہ ہے
کہ بچپن میں ہم جن کھلونوں سے کھیلتے تھے
اب وہ کھلونے
ہماری ہی حالات سے کھیلتے ہیں
وہ نازک مجسمے
وہ رنگین گڑیائیں
طیارے ، پستول
فوجی، سپاہی
کبھی جو ہمارے اشاروں کے محتاج تھے
آفریں تجھ پہ معیارِ گردش
کہ اب وہ کھلونے
ہمیں چابیاں بھر رہے ہیں
ہمارے مویشی ہمارے ہی باغات کو چر رہے ہیں
کھلونوں کے اس کھیل میں
ہم تو یوں کھو گئے ہیں

کہ ہر کام کی ہم سے امید رکھ لو
اگر کوئی تقوے کی چابی گھمادے
تو ڈاڑھی بڑھا لیں
اگر کوئی تھوڑی سی قیمت لگا کر
کسی شخص کا گھر بتا دے
تو اگلے ہی پل اسکی گردن اڑا دیں
(شفافیاں ،ص:۷۸،۷۹،۸۰)

اختر عثمان اپنی نظم"نئی صدی سے" میں اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ صدیوں کا آغاز ہوتا ہے اور پھر اختتام ہوکریہ صدیاں نئی صدیوں کی شکل اختیار کرتی ہیں ۔ لیکن انسان کی حالت زار میں کوئی تبدیل ظاہر نہیں ہوتی۔ شاعر کو اس صبح درخشندہ کا انتظار ہے جب امن و محبت کا راج ہو گا اور نفرت و دشمنی کا خاتمہ ہو گا۔ شاعر نظم میں ایسے عیسیٰ نفس فرد کا متمنی دکھائی دیتا ہے جو لفظوں کو معنی کاروپ دے کر انسان کی پوری دنیا میں امن و آشتی اور انسانی دوستی کے خواب کوحقیقت کا رنگ دے دے۔

تجھے موت ہے ، اے حسینہ!
مجھے اور ہوا کو ہمیشہ اس حال میں تیری رہ دیکھنی ہے
تو آئے گی، آکر گزر جائے گی اور میری پیروی میں کئی اور بھی آئیں گے
اے صدی !
اے مسیحا کی بیٹی! ذرا اپنے بابا سے کہنا کہ میں کم نفس ہوں
زیادہ نہیں بھاگ سکتا
وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں بے محبت
زمانے میں پیدا ہوا ہوں
مرے کاسہ ، ذہن میں لفظ ہی لفظ ہیں
(کوئی مفہوم کی بھیک دے)
کاسہ ، خواب میں الجھے الجھے ہوئے چند منظر ہیں
قلب و نظر میں کوئی دیدہ دانش کا سکہ نہیں
میرے خوابوں کی تعبیر تشنگی ہے
سوالوں کے پھول ادھ کھلے ہیں
حروف اپنے امکانِ معنی سے دور آج بھی دشت لا میں پڑے ہیں
انہیں کون زندہ کرے
(ستارہ ساز ،ص:۱۰۹،۱۱۰)

وجودیت نے فرد واحد اور اس کے گونا گوں مسائل کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ یہ مسائل صنعتی معاشرے میں فرد کی شناخت گم ہونے کی بنا پر پیدا ہوئے تھے۔ وجودیوں کے نزدیک ایسا کوئی نظام جس میں فرد کی پہچان ختم ہو جائے انسانیت ے لیے بہت بڑے خطرے کے مترادف ہے۔ ان کے نزدیک صنعتی معاشرے میں فرد کے بجائے "اشیا"کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس نظام میں فرد کو ایک کل پرزے کی طرح استعمال کیا جاتا ہے جسکی وجہ سے معاشرے میں تنہائی اور بیکانگی کا عمل دخل بڑھتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو گزشتہ پچیس برسوں میں ہمارے معاشرے میں فرد کی حیثیت خود ایک شے کی سی بن کر رہ گئی ہے جو کثیر القومی کمپنیوں اشتہاری مہموں کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اسی باعث فرد سے جڑت ختم ہو رہی ہے۔ انسان دوستی کے جذبا ت مفقود ہورہے ہیں اور بیگانگی کا احساس فروغ پا رہا ہے۔ ایسے میں فرد کو محسوس ہو تا ہے کہ جیسے زندگی ایک الزام ہے اور ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم اس الزام کی صفائی پیش کرتے رہیں ۔ اس سلسلے میں فرخ یارکی نظم "ہم تو بس "کے اشعار توجہ طلب ہیں ۔

ہم تو بس پیشی بھگتانے آئے ہیں
ہم نے کیا لینا دینا ہے
رقصِ صبا سے
تم سے
اس میلے سے
جس میلے میں
دستاویز پہ دستخطوں کی پہلی فصل بچھی تھی
اور زمانہ دو فرسنگ کی
ناہموار مسافت حیران کھڑا تھا

(مٹی کا مضمون،
ص:۸۵)

اس کے علاوہ عہد موجود کی سما جی ساخت اور معاشرتی رویوں کے خلاف اضطراب، بے زاری اور احتجاج کا رنگ قاسم یعقوب ، زاہد امر وز، ارشد معراج، عمیر و اصف ،علی اکبر ناطق وغیرہ کی نظموں میں شدت کے ساتھ دکھائی دیتا ہے اور نئے فرد کی جستجو کا رویہ اپنے اپنے رنگ میں نظم ہو اہےیہ سب شعرا اس کوشش میں معروف عمل ہیں کہ فر د کی تنہا ئی کو ختم کر کے ہر طرف امن وآشتی، پیا رومحبت اور انسا ن دوستی کے پھو ل کھلا ئے جا ئیں کیونکہ آپس میں مل بیٹھنے اور ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹنے ہی سے موجودہ دور کے فرد کی تنہائی کو کم کیا جاسکتا ہے اور یونہی ایک انسان دوست معا شر ہ تشکیل

پا سکے گا ۔ جہاں امن کا راج ہو اور ہر طرف پیار و محبت اور انسان دوستی کے مدھر گیت کانوں کو سنائی دیں ۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

* القرآن الکریم ،کنزل الایمان ،احمد رضا بریلوی (مترجم)، سید محمد نعیم الدین مراد آباد، (مرتب)ترجمہ القرآن ، پاک کمپنی ، لاہور

۱۔ اختر الایمان،اس آباد خرابے میں ، اردو اکادمی ، دہلی ،۱۹۹۶ئ

۲۔ اختر الایمان، زمین زمین، رخشندہ کتاب گھر، بمبئ، ۱۹۹۰ئ

۳۔ اسرار الحق مجاز، کلیات مجاز، مکتبہ اردو ادب، لاہور، س ن

٤۔ افتخار احمد صدیقی،ڈاکٹر، کلیات نظم حالی (جلد اوّل) مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اوّل جولائی ۱۹٦۸ء

۵۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، کلیات نظم حالی (جلد دوم) مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اوّل ۱۹۷۰ء

٦۔ افتخار جالب، ماخذ، مکتبہ جدید، لاہور ،۱۹٦۳ء

۷۔ افتخار بیگم صدیقی، دیوان شاکر ناجی، انجمن ترقی اردو ہند۔ نئی دہلی

۸۔ اقبال، ڈاکٹر سر محمد، کلیات اقبال (اردو) ، سروسز بک کلب پاکستان، طبع چہارم ،۱۹۹۹ء

۹۔ اکبر الٰہ آبادی،کلیات اکبر، قطعات ورباعیات(جلد اوّل، دوم) مرتبہ، احسان الحق بھیا، بزم اکبر، کراچی ۱۹۵٤ء

۱۰۔ اکبر الٰہ آبادی، کلیات اکبر (جلد دوم، سوم) ،بزم اکبر کراچی، ۱۹۵٤ء

۱۱۔ انوار فطرت، آب قدیم کے ساحلوں پر، حرف اکادمی راولپنڈی، ۲۰۰۳ء

۱۲۔ انیس ناگی، بیابانی کا دن، جمالیات لاہور ، ۱۹۹٤ء

۱۳۔ آفتاب اقبال شمیم، زید سے مکالمہ، ثبات پبلی کیشنز اسلام آباد،۱۹۸۹ء

۱٤۔ آفتاب اقبال شمیم، فرد انژاد، ثبات پبلی کیشنز اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۱۵۔ آفتاب اقبال شمیم، گم سمندر ، ثبات پبلی کیشنز اسلام آباد، ۲۰۰۰ء

۱٦۔ پنڈت دیاشنکر نسیم، مثنوی گلزار نسیم، مکتبہ عالیہ لاہور ،۱۹۷۸ء

۱۷۔ تبسم کاشمیری، تمثال، ارسلان پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۵ء

۱۸۔ تصدق حسین خالد، ڈاکٹر ،سُرودنو، سنگ میل پبلی کیشنزز ،لاہور، ۱۹۹۰ء
۱۹۔ جاوید انور، اشکوں میں دھنک، الحمد پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹٤ء
۲۰۔ جاوید انور، شہر میں شام، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ، لاہور ،۱۹۹۱ء
۲۱۔ جالبی ،ڈاکٹر جمیل ، دیوان حسن شوقی ، انجمن ترقی اردو ، کراچی، ۱۹۷۱ء
۲۲۔ جیلانی کامران، کامران کی نظمیں ، ملٹی میڈیا افیرز، لاہور ،۲۰۰۲ء
۲۳۔ چکبست لکھنوی، صبح وطن، سرتیج بہادر سپرو (مرتبہ)،انڈین پریس الہ آباد، دوسرا ایڈیشن ۱۹٤۷ء
۲٤۔ حبیب جالب، کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور ۱۹۹۳ء
۲۵۔ ذی شان ساحل، چڑیوں کا شور، آج کی کتابیں ، ۱۹۸۹ء
۲٦۔ ذی شان ساحل، نیم تاریک محبت ، آج کی کتابیں ، ۲۰۰۵ء
۲۷۔ رفیق سندیلوی ، غار میں بیٹھا شخص، کاغذی پیرہن، لاہور ،۲۰۰۷ء
۲۸۔ روش ندیم ، ٹشو پیپرپہ لکھی نظمیں ، حرف اکادمی راولپنڈی ،۲۰۰۲ء
۲۹۔ زاہد ڈار، محبت اور مایوسی کی نظمیں ، اظہار سنز لاہور، س ن
۳۰۔ زاہد علی خان، کلیات مولانا ظفر علی خان، الفیصل کتب لاہور، اپریل ۲۰۰۷ء
۳۱۔ زکریا، ڈاکٹر،خواجہ ، محمد (مرتب) ،کلیات مجید امجد، ماور اپبلشرز لاہور، طبع دوم ، ۱۹۹۱ء
۳۲۔ ساقی فاروقی، غزل ہے شرط، اکادمی بازیافت، اگست ۲۰۰٤ء
۳۳۔ سرمد صہبائی، نیلی کے سورنگ، کتب پرنٹر اینڈ پبلشرز، کراچی ،۱۹۸۲ء
۳٤۔ سعید احمد ، ڈاکٹر ، دن کے نیلاب کا خواب ، شہرزاد کراچی، مارچ ۲۰۱۱ء
۳۵۔ سلطانہ ایمان بیدار بخت، کلیات اختر الایمان، نیا آہنگ، سٹی پریس، کراچی ،۲۰۰۰ء
۳٦۔ سلمان صدیق، دھیان میں گم، قدریں پبلشرز لاہور ،۱۹۹۹ء

۳۷۔ سید خاور رضوی، ڈاکٹر، مولوی محمد اسماعیل میرٹھی، ایک مطالعہ، مکتبہ میری لائبریری،
لاہور، ۱۹۸۳ء
۳۸۔ صالحہ عابد حسین، انیس کے مرثیے، مکتبہ عالیہ ، لاہور، ۱۹۸۶ء
۳۹۔ ضیاء جالندھری، سرشام سے پس حرف تک (کلیات) ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۶ء
۴۰۔ عارف عبد المتین، امکانات، ٹیکنیکل پبلشرز اُردو بازار، لاہور ،۱۹۷۵ء
۴۱۔ عارف عبد المتین ، دھوپ کی چادر، عارف عبد المتین ، اکیڈمی ، لاہور
۴۲۔ عبد الحق، پروفیسر ، دیوانِ حاتم، اصیلا پریس دریا گنج، نئی دہلی ، جنوری ۲۰۰۸ء
۴۳۔ عبد الرشید، افتخار جالب کے لیے نوحہ اور دوسری نظمیں ، ملٹی میڈیا افیئرز لاہور ، ۲۰۰۶ء
۴۴۔ عبد الرشید ، انی کنت من الظالمین ، قوسین لاہور ،۱۹۷۳ء
۴۵۔ عبد الرشید ، خزاں اور میں ، ادریس اینڈ کو لاہور ،۱۹۸۷ء
۴۶۔ عبد الرشید ، نیند موت اور بارش کے لیے نظمیں ، طفیل آرٹ پرنٹر ز لاہور، ۱۹۹۳ء
۴۷۔ عبد الرشید، بنکاک میں اجنبی، ملٹی میڈیا افیئرز لاہور ، ۲۰۰۵ء
۴۸۔ علی احمد فاطمی، کلیات علی سردار جعفری، نئی دہلی قومی کونسل برائے فروغ اُردو، جلد اوّل ۲۰۰۴ء
۴۹۔ فرخ یار، مٹی کا مضمون، علمی گرافکس کراچی، ۲۰۰۶ء
۵۰۔ فیض احمد فیض ، نسخہ ہائے وفا، مکتبہ کارواں لاہور، س ن
۵۱۔ قاسمی، احمد ندیم، ندیم کی نظمیں ، سنگ میل ، پبلی کیشنز، لاہور ،۲۰۰۶ء
۵۲۔ قیوم نظر، قلب ونظر کے سلسلے، سنگ میل پبلشرز لاہور ،۱۹۸۷ء
۵۳۔ کالی داس گپتا رضا، کلیات چکبست ، بمبئ، ۱۹۸۱ء
۵۴۔ کلب علی خاں فائق ، کلیات میر (جلد ششم)، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اوّل جون ۱۹۸۴ء
۵۵۔ کلب علی خاں فائق، کلیات میر (جلد پنجم)، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، طبع اوّل جون ۱۹۸۲ء

۵٦۔ کشور ناہید، کلیات کشور ناہید، دست قیس میں ہے لیلیٰ، سنگ میل پبلیکشنز ،لاہور، ۲۰۰۱ء
۵۷۔ محروم، تلوک چند، کاروانِ وطن، مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمٹیڈ ، طبع اوّل ۱۹٦۰ء
۵۸۔ محروم، تلوک چند، گنج معانی، محروم میموریل لٹریری سوسائٹی ، نئی دہلی، طبع سوم ۱۹۹۵ء
۵۹۔ محمد شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر، کلیاتِ سودا (جلد چہارم) مجلسِ ترقی ادب، لاہور ، طبع اوّل، مارچ ۱۹۸۷ء
٦۰۔ محمد شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر، کلیاتِ سودا (جلد دوم) ،مجلسِ ترقی ادب، لاہور ، طبع دوم جون ۲۰۰٦ء
٦۱۔ محمد شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر، کلیاتِ سودا (جلد سوم)، مجلسِ ترقی ادب، لاہور ، طبع اوّل ، جون ۱۹۸۴ء
٦۲۔ مختار صدیقی، منزل شب، نیا ادارہ سویرہ آرٹ پریس، لاہور ، ۱۹۵۵ء
٦۳۔ مختار صدیقی، آثار، ماور اپبلشرز لاہور ،۱۹۸۸ء
٦۴۔ مختار صدیقی، سی حرفی، کراچی گولڈن بلاک ورکس، ۱۹٦۴ء
٦۵۔ مطرب نظامی طیب ، کلیات فراق گور کھپوری، شمشاد پرنٹرز، لاہور، اکتوبر ۲۰۱۴ء
٦٦۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، کلام نیرنگ، مکتبہ اسلوب، کراچی ۱۹۸۳ء،
٦۷۔ منیر نیازی، کلیات منیر، ماور اپبلشرز، لاہور ،۱۹۸٦ء
٦۸۔ میراجی، کلیات میرا جی، مرتب، جمیل جالبی، ڈاکٹر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ،۱۹۹٦ء
٦۹۔ مولانا شبلی نعمانی، کلیات شبلی، داتا پبلشرز، لاہور ،س۔ ن
۷۰۔ ن ۔م۔ راشد۔ کلیات راشد، ماورا پبلشرز لاہور، طبع دوم ۱۹۹۱ء
۷۱۔ ناہید قمر، ڈاکٹر، اک سفر اداسی کا، ویرا پبلی کیشنز اسلام آباد، ۲۰۰۲ء
۷۲۔ نصیر احمد ناصر، پانی میں گم خواب، تسطیر پبلشرز ، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء
۷۳۔ نصیر احمد ناصر، دسمبر اب مت آنا، لیو بکس ، اسلام آباد۔ ۱۹۹۳ء
۷۴۔ نصیر احمد ناصر، عرابچی سوگیا ہے، تسطیر ، پبلیشرز، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء

۷۵۔ نظیر اکبر آبادی، کلیات نظیر، مطبوعہ تیج کمار لکھنو ۱۹۰۱ء
۷۶۔ وحید احمد، شفافیاں ، ماورا پبلشرز لاہور، ۱۹۹۴ء
۷۷۔ وزیر آغاز، نردبان، کاغذی پیراہن، لاہور، س ن
۷۸۔ وزیر آغا، آدھی صدی کے بعد، کاغذی پیرہن لاہور، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، ۱۹۸۱ء
۷۹۔ وزیر آغا، چنا ہم نے پہاڑی راستہ، کاغذی پیرہن ،لاہور ۱۹۹۹ء
۸۰۔ وزیر آغا، ڈاکٹر ، چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل، مکتبہ فکرو خیال، لاہور ۱۹۹۱ء
۸۱۔ یوسف ظفر، زہر خند، مکتبہ اردو ، لاہور ،۱۹۴۴ء

کتابیات

ثانوی ماخدات

۱۔ ابو اللیث ،صدیقی، ڈاکٹر ، تجر بے اور روایت، سنگ میل ، پبلی کیشنز ، لاہور ، ۱۹۹۹ء

۲۔ احتشام حسین، انتخاب احتشام حسین،سید، کراچی اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۶۶ء

۳۔ احسان دانش جہان دانش ، المسلم پبلشرز، لاہور ، ۱۹۹۶

٤۔ اختر ہا شمی ، ڈاکٹر دس بڑے نظم نگار،رنگ ادب ، کراچی ، اگست۲۰۱۳ء

٥۔ اختر انصاری ،اکبر آبادی اکبر اس دور میں ، س ۔ن

٦۔ اختر حسین رائے پوری ،ڈاکٹر ۔ ادب اور انقلاب، ، نفیس اکیڈمی کراچی ، لاہور ،۱۹۸۹ء

۷۔ اسرار الحق مجاز،آہنگ، نیا ادارہ لاہور۔ س۔ ن

۸۔ اسلم فرخی،ڈاکٹر محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، ۱۹۶۵ء

۹۔ اشفاق حسین،فیض کے مغربی حوالے، جنگ پبلشر ز لاہور ،اکتو بر ۱۹۹۲ ء

۱۰۔ اصغر علی انجینئر ، ہندوستان میں فرقہ پرستی اور اس کا جواب، شفقت تنویر مرزا(مترجم)،مکتبہ جدید پریس، لاہور ، ۲۰۰٤ء

۱۱۔ اعجاز الحق قدوسی، تذکرہ صوفیائے بنگال، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶٥ء

۱۲۔ اعجاز حسین،ڈاکٹر مختصر تاریخ ادب اردو، اردو اکیڈمی سندہ کراچی۔ تیسرا ایڈیشن ،۱۹۷۱ء

۱۳۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر عروج اقبال، کلب روڈ، لاہور ،طبع اول جون۱۹۸۷ء

۱٤۔ افتخار جالب ،نئی شاعری ، نئی مطبوعات ،لاہور ، بار اوّل ۱۹۶۶ء

۱٥۔ اقبال خان ،انسان دوستی لبرم ازم جمہوریتقاضی جاوید، (مترجم)، اظہار سنز اردو بازار لاہور، ۱۹۹۳

۱۶۔ الطاف گوہر تحریر یں چند،العمر پر نٹر ز اسلام آبا د،بار اول ۱۹۸۸ء

۱۷۔ امام بخاری، الجامع الصحیح جلد ۲، کتاب العتق صفحہ نمبر ۵۷۱، مطبوعہ مصر، نضرۃ النور العزء الاوّل ، ص:۴۹، حدیث رقم ۲۹۸
۱۸۔ امام مسلم، الجامع الصحیح کتاب البر والصلۃ،مصر
۱۹۔ انور سدید،ڈاکٹر اردو ادب کی تحریکیں ،انجمن ترقی اردو پاکستان، چہارم ۱۹۹۹ء
۲۰۔ انور ظہیر خاں مت سہیل ہمیں جانو، فضلی سنز لمیٹڈ ، کراچی ۔ اشاعت اول۱۹۹۶ ،دوم مارچ۱۹۹۹ء
۲۱۔ انور مسعود فارسی ادب کے چند گوشے، عاقب پبلشرز آئی نائن، اسلام آباد ، ۱۹۹۳ء
۲۲۔ انیس ناگی ، ڈاکٹر، نیا شعری افق، جمالیات ، مکتبہ ادب جدیدلا ہور ، طبع دوم ۱۹۸۸ء
۲۳۔ انیس ناگی، روشنیاں ، جمالیات ، لاہور ،۱۹۸۵ ء
۲۴۔ ایڈون اے برٹ ، فلسفہ مذہب،بشیر احمد ڈار(مترجم)مجلس ترقی ادب ،لاہور
۲۵۔ ایس۔ایم۔ شاہد تقابل ادیان، ایورنیوبک پیلس لاہور ،س۔ن
۲۶۔ ایم حبیب خان غالب سے اقبال تک، ،انڈین بک ہاوس علیگڑھ ، نومبر ۱۹۷۷ء
۲۷۔ ایم شمس الدین، پروفیسر جدید تاریخ یورپ ،نذیر سنز سرکلر روڈ،لاہور اکتوبر ۱۹۷۶ء
۲۸۔ برٹرینڈرسل،فلسفہ مغرب کی تاریخ، پروفیسر محمد بشیر(مترجم) ، پورب اکادمی ، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء
۲۹۔ بریلوی ،ڈاکٹرعبادت ، اقبال احوال و افکار، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۷۷ء
۳۰۔ بریلوی ،ڈاکٹرعبادت ، روایت کی اہمیت ،انجمن ترقی اردو ، پاکستان کراچی ،۱۹۵۳ء
۳۱۔ بریلوی ،ڈاکٹرعبادت ، جہان میر، ادارہ ادب و تنقید ، لاہور
۳۲۔ بریلوی ،ڈاکٹرعبادت ، حبیب جالب فن اورشخصیت ،
۳۳۔ بریلوی ،ڈاکٹرعبادت ، شاعری کیا ہے، ادارہ ادب و تنقید ، لاہور
۳۴۔ بشیر سیفی،ڈاکٹر تنقیدی مطالعے، نذیر سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۶ء
۳۵۔ پطرس بخاری، ایران میں اجنبی ، گوشہ ادب ،لاہور،۱۹۵۵ء
۳۶۔ تاراچند، ڈاکٹر ہندوستان کلچر کا ارتقا، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء

۳۷۔ تبسم کا شمیری ، ڈاکٹر اردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنرز، لاہور،۲۰۰۹ء
۳۸۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر ،عزیز ابن الحسن، ڈاکٹر،میر تقی میر ،میر شناس منتخب مضامین ،مقتدرہ قومی زبان پاکستان، طبع اول ۲۰۱۰ء
۳۹۔ ثا قب رزمی ، فیض محبت و انقلاب کا شاعر، آئینہ ادب انار کلی ، لاہور، اشاعت ۱۹۸۶ء
۴۰۔ ثاقب رزی اقبال ایک نیا مطالعہ، آئینہ ادب انار کلی، لاہور ،۱۹۸۴ء
۴۱۔ جالبی، ڈاکٹر جمیل ،میرا جی ایک مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ،۱۹۹۰ء
۴۲۔ جالبی ،ڈاکٹر جمیل، معا صر ادب،سنگ میل پبلی کیشنر ، لاہور ، ۱۹۹۱ء
۴۳۔ جالبی، ڈاکٹرجمیل، تاریخ اردوادب، جلد سوم مجلس ترقی ادب ، لاہور طبع اول ۲۰۰۶ء
۴۴۔ جالبی ،ڈاکٹر جمیل، تاریخ ادب اردو (جلد اول) ،مجلس ترقی ادب، لاہور ،طبع دوم جنوری ۱۹۸۴ء
۴۵۔ جالبی ،ڈاکٹر جمیل، تاریخ ادب اردو (جلددوم)، مجلس ترقی ادب، ،لاہور ،طبع دوم اپریل ۱۹۸۷ء
۴۶۔ جالبی ،ڈاکٹر جمیل، محمد تقی میر،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی ۱۹۹۰ء
۴۷۔ جا ر ج ر سو ل، عظماکے معا شی نظر یا ت،ایس ایم اختر،ڈا کٹر، غلا م رسو ل مہر ،مو لا نا(مترجم)،مجلس تر قی ادب، لاہور
۴۸۔ جمیل ملک، ندیم کی شاعری،نو ید پبلشر ز راولپنڈی اشاعت اول ۱۹۷۲ء
۴۹۔ جمیل احمد انجم، پروفیسر ،اردو شاعری کا ارتقا، علی کتاب خانہ، لاہور
۵۰۔ جگن ناتھ آزاد اقبال اور اسکا عہد،قدرت پرنٹرز، لاہور، ۱۹۷۷ء
۵۱۔ جو ش ملیح آبادی ،جو ش کی شاعری،مکتبہ اردو ادب،لاہور،اشاعت س۔ن
۵۲۔ جوش ملیح آبادی یا دوں کی برات، مکتبہ شعر و ادب لاہور،مئی۱۹۷۵ء

۵۳۔ جے۔ ایس۔ میکنیزیسماجی فلسفہ کا خاکہ ،سعید احمد صدیقی (مترجم) ، ترقی اردو یونیورسٹی، دہلی ۱۹۹۰ء
۵۴۔ چوہدری نیاز احمد سنگھیڑہ، پاکستان میں قوم سازی کا عمل، آب وتاب پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۸
۵۵۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، اردو اکیڈمی لاہور تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۶ء
۵۶۔ حامد کاشمیری، پروفیسر جدید اردو نظم اور یورپی اثرات، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دلی، طبع اول مارچ ۱۹۶۸، اشاعت دوم، ۲۰۱۰ء
۵۷۔ حمید نسیم ، پانچ جدید شاعر،فضلی سنز کراچی ، طبع اوّل ، س۔ ن
۵۸۔ خالد علوی ، اقبال اور احیائے دین، المکتبہ العلمیہ لاہور، اشاعت طبع اول جون۱۹۷۱ء
۵۹۔ خالد ارمان ،انسانی تاریخ کے بڑے قتل، میاں چمبرز ٹمپل روڈ ،لاہور ،۲۰۰۲ء
۶۰۔ خلیق احمد نظامی،پروفیسرسرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے ، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی
۶۱۔ خلیل الرحمن اعظمی ، اردو میں تر قی پسند تحریک، علیگڑھ ایجو کیشنل بک ہا وس ۲۰۰۷ء
۶۲۔ خوا جہ غلا م صا دق،پرو فیسر،فلسفہ جدید کے خدو خا ل،شعبہ فلسفہ پنجا ب یو نیو رسٹی ، طبع اول ۱۹۷۸ء
۶۳۔ دلبر حسن خان ،علامہ اسلام اور مذاہب عالم،(تقابلی مطالعہ) یونائیٹڈ پبلشرز ،کراچی، اشاعت اوّل ۱۹۸۶
۶۴۔ دلشاد اجمل ، مقالہ نگار حبیب جالب ادبی خدمات،برائے ایم فل ،علامہ اقبا ل اوپن یو نیو رسٹی ، اسلام آباد
۶۵۔ ذاکر نائیک،ڈاکٹر،تفابلِ ادیان اسلام،فیضان محمد،(مترجم)،زین العابدین(ترتیب وتحقیق) بک ڈپو لاہور،س۔ن
۶۶۔ ذاکر حسین ،ڈاکٹر، طاہر تونسوی، ڈاکٹر ، اردو شاعری کا صدر دروازہ ،گو رنمنٹ کالج یو نیو رسٹی،فیصل آباد ۔س۔ن
۶۷۔ رالف بارٹن پیری،آدمی کی انسانیت، محمد بخش سلیم،مولانا (مترجم)، مقبول اکیڈمی لاہور، اشاعت دوم ۱۹۷۴ء
۶۸۔ رام بابو سکسینہ ، تاریخ ادب اردو، غضنفر اکیڈمی پاکستان اردو بازار کراچی ۱۹۹۸ء

٦٩۔ رام لعل نابھوی چکسبت، نئی دہلی ترقی اردو لاہور ،۱۹۹۳ء
۷۰۔ رانا صابر نظامی،اسلام اور سرمایہ داری میں جنگ، ،ادارہ تحریک اسلام، لاہور مارچ ۱۹۸۵ء
۷۱۔ رحمت یوسف زئی ،ڈاکٹر لفظوں کے درمیان، ،نوشین پبلی کیشنز ،حیدر آباد
۷۲۔ رشید احمد گو ریجہ ، ڈاکٹر اردو ادب،راولپنڈی اسلام آباد ، شمار جون۱۹۹٤ء
۷۳۔ رشید امجد ، ڈاکٹر ،پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار، ، ترتیب و تدوین ، ایم سلطانہ بخش ، ڈاکٹر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ، اسلام آباد
۷٤۔ رشید امجد ، ڈاکٹر ،نیا ادب ، تعمیر ملت پبلیشرز ، منڈی بہاؤالدین ،۱۹٦۹ ء
۷۵۔ رشید نثار ،ڈاکٹر وزیر آغا اور ہمارا عہد،پنڈی ، اسلام آباد، ادبی سوسائٹی ، راولپنڈی ، ۱۹۹۸ ء
۷٦۔ روز نیہال ،لغات سماجی علوم وفلسفہ، خیال امروہوی، پروفیسر، ڈاکٹر ،(مترجم)یو پبلشر یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار ، لاہور ، ۲۰۰۸ء
۷۷۔ روشن اختر کاظمی،ڈاکٹر اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقا، موڈرن پبلشنگ ہاوس نئی دہلی، ۱۹۸٤ء
۷۸۔ زاہد منیر عامر،ڈاکٹر، آئینہ کردار، شیخ زاید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۳ء
۷۹۔ زکریا ،ڈاکٹر محمد خواجہ، اکبر الٰہ آبادی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ،۲۰۰۳ء
۸۰۔ سبط حسن ، مقد مہ ، سر مقتل ، مکتبہ دانیال کراچی ، تیسری بار ستمبر ۱۹۹۰ء
۸۱۔ سبط حسن،مو سیٰ سے ما ر ج تک، نیشنل پبلشنگ ہا و س ، را ولپنڈی ، ما ر چ ۱۹۷٦ء
۸۲۔ سبط حسن،نوید فکر، مکتبہ دانیال احمد برادرس ،کراچی،۱۹۸۵
۸۳۔ سجاد باقر رضوی تہذیب و تخلیق،مکتبہ ادب جدید لاہور، اپریل ۱۹٦٦ء
۸٤۔ سجاد حارث ایم اے ، پروفیسر ،عوامی شاعر اور اس کا فن،پی۔ آئی ۔ بی سی شاہ عالمی گیٹ ، لاہور ۱۹۵۸ء
۸۵۔ سرور، آل احمد ، تنقید کیا ہے، اور دوسرے مضامین، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ،۱۹۵۲ء

۸٦۔ سلوا تو رپولیدا،انسا ن ہو نے کے نا طے ، امجد علی بھٹی(مترجم) ،فکشن ہا وس مز نگ روڈ،لا ہو ر ۲۰۰۷ء
۸۷۔ سلیم احمد ،نئی نظم اور پورا آدمی ،نفیس اکیڈمی ، کراچی ،بار دوم ۱۹۸۹ء
۸۸۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،اقبال کا نفسیاتی مطالعہ اور دوسرے مضامین،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۸ء
۸۹۔ سلیم شہزاد تنویر، نئے ادب کا معمار انیس ناگی ، مرتبہ ،سلیم شہزاد تنویر،ساغر ، حسن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء
۹۰۔ سنبل نگار،ڈاکٹر اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، دارالنوادر، میٹرو پرنٹرز لاہور ،۲۰۱۳ء
۹۱۔ سہیل احمد خان ، ڈاکٹر ،مجموعہ سہیل احمد خان ،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ ء
۹۲۔ سہیل احمد خان،ڈاکٹر، محمد، سلیم الرحمن منتخب ادبی اصلاحات، سویرا آرٹ، پریس لاہور،۲۰۰۵ء
۹۳۔ سید ابو الحسن علی ندوی،مولانا تعمیر انسانیت ، مجلس نشریات اسلامیہ، شکیل پرنٹنگ پریس، ناظم آباد کراچی
۹٤۔ سید ابو الحسن علی ندوی،مولانا نقوش اقبال، سروسز بک کلب کراچی ،۱۹۸۸ء
۹۵۔ سید اسد گیلانی، اسلامی تہذیب واقدار، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور کراچی، راولپنڈی، ۱۹۹۱ء
۹٦۔ سید عامر سہیل ،مجید امجد بیاض آرزو بکف، بیکن بکس ملتان، بار اول،۱۹۹۵ء
۹۷۔ سید عبد اللہ ، ڈاکٹر ،مباحث،مجلس ترقی ادب ، لاہورطبع اوّل،۱۹٦۵ء
۹۸۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر ولی سے اقبال تک، اکیڈمی منصور پریس لاہور، بار روم مئی ۱۹٦۳ء
۹۹۔ سید ابو الحسن علی ندوی، مولانا ،تزکیہ و احسان یا تصوف وسلوک، محمد الحسنی مرحوم ایڈیٹر الجت الاسلامی (مترجم) مجلس نشریات اسلام ناظم آباد ،کراچی، ۱۹۸۰ء
۱۰۰۔ سید عبداللہ ،ڈاکٹر،فارسی زبان و ادب مجموعہ مقالات ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء
۱۰۱۔ سید علی عبا س جلا ل پو ری، تا ر یخ کا نیا مو ڑ،آغا امیر حسن کلا سیک ،لا ہو ر،ا شا عت با را ول مئی ۱۹۸٤
۱۰۲۔ شاہد اقبال کامران،ڈاکٹر اقبال دوستی، پورب اکادمی اسلام آباد ،طبع اول۲۰۰۹ء

۱۰۳۔ شاہین مفتی ،ڈاکٹر ،جدید اردونظم میں وجودیت،سنگ میل پبلی کیشنز ،لاہور

۱۰٤۔ شاہین مفتی،ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار، اکادمی ادبیات ، اسلام آباد،پاکستان ، ۲۰۰۸ ء

۱۰۵۔ شاہین مفتی ، ڈاکٹر ،انیس ناگی، شخصیت و فن، اکادمی ادبیات ،اسلام آباد، پاکستان ، ۲۰۰۹ ء

۱۰٦۔ شگفتہ حسین ،مقالہ نگار، ماہنا مہ ادب لطیف کی ادبی خد ما ت کا تحقیقی و تنقید ی جا ئز ہ،بر ائے پی ایچ ڈی بہاء الدین زکریا یو نیو رسٹی ملتان، ۱۹۹٦ء

۱۰۷۔ شمیم حنفی ، ہمسفروں کے درمیان، انجمن ترقیِ اردو (ہند)، نئی دہلی ،۲۰۰۵ ء

۱۰۸۔ شمس الدین ،پروفیسر ، جدید تاریخ یورپ، نذر سنز، سرکلر روڈ، لاہور ،۱۹۷٦ء

۱۰۹۔ شمیمہ بیگم ،ڈاکٹر ،تر قی پسند تنقیدکا ارتقا اوراحتشام حسین، اردو اکیڈمی ، کراچی، ۱۹۸۷ ء

۱۱۰۔ شیمامجید، نعیم حسن، ادب ، فلسفہ وجودیت ،نگارشات لاہور، ۱۹۱۲ء

۱۱۱۔ صدف بخاری، مقالہ نگار، جدید شعری طرزِ احساس اور منیر نیازی کی انفرادیت، ،شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۱ء

۱۱۲۔ صدیق جاوید ،ڈاکٹراقبال، نئی تفہیم سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء

۱۱۳۔ صدیقی،مظہر الدین، اسلام اور مذاہب عالم' ادارہ ثقافت اسلامیہ ۱۹۹۷ء، لاہور

۱۱٤۔ صفدر حیا ت صفدر مطا لعہ تا ریخ،نیو بک پیلس اردو بازا ر ،لا ہو ر

۱۱۵۔ صفیہ بانو،ڈاکٹر انجمن پنجاب تاریخ و خدمات، کفایت اکیڈمی کراچی ،۱۹۷۸ء

۱۱٦۔ ضیا الحسن ، ڈاکٹر ، جدید اردو نظم و آغازو ارتقا،سانجھ پبلشرز ، لاہور ، ۲۰۱۲ ء

۱۱۷۔ صلاح الدین درویش ،ڈاکٹر ، انسان دوستی نظریہ اور تحریک، پورب اکادمی، اسلام آباد طبع اوّل جنوری ۲۰۰۷ء

۱۱۸۔ صہبا لکھنوی، مجاز ایک آہنگ زندگی شخصیت فن،مکتبہ افکار کراچی پہلا ایڈیشن اگست ۱۹۵۸دوسرا ایڈ یشن جولائی ۱۹٦۷ ء

۱۱۹۔ ضیا الرحمن احمدفہم اسلام، نشان پبلشرز اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۵ء
۱۲۰۔ طارق ہاشمی اردو نظم اور معاصر انسان، پورب اکادمی ، اسلام آباد ، اشاعت فروری ،۲۰۱۵ء
۱۲۱۔ طاہر اصغر، گفتگو حبیب جالب ، مشمولہ جالب بیتی جنگ پبلشر ز پریس لاہور، اشاعت اول اگست۱۹۹۳ء
۱۲۲۔ ظفر اقبال، ڈاکٹر لاہور کا دبستان شاعری، مقبول اکیڈمی ، لاہور
۱۲۳۔ ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر ، ڈاکٹر اخلاقیات ایرانی ادبیات میں ، مجلس تحقیق و تالیف فارسی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور،۲۰۰۳ء
۱۲٤۔ عابد نظامی، خواجہ ،ڈاکٹر، لاہور میں اسلام کے سفیر (عہد غزنوی سے قیام پاکستان تک) الفیصل کتب اردو بازار، لاہور ،مئی ۲۰۰۰ء
۱۲۵۔ عاشق حسین ،بٹالوی، ڈاکٹرہفتہ وار چٹان،۲۸جون ۱۹۷۱ء
۱۲٦۔ عبد ا لروف ملک مغر ب کے عظیم فلسفی،ادارہ ادبیا ت نو، لا ہو ر،س۔ن
۱۲۷۔ عبد الحمید صدیقی ، پروفیسر انسانیت کی تلاش، حرا پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء
۱۲۸۔ عبد الکریم خالد نئے پرانے مضا مین،اظہار سنز لاہور ، ۱۹۹۸ء
۱۲۹۔ عبد الوحید، جدید شعرا اردو (دوسرا حصہ) متوسطین ، فیروز سنز لمیٹڈ ،لاہور، ۱۹٦۹ء
۱۳۰۔ عبدا لرؤف ملک، فیض کی شاعری کانیا دور،پیپلزپبلشنگ ہاؤس ، لاہور ،جنوری۱۹۸۸ء
۱۳۱۔ عبدالحق ،مولوی ذکر میر،انجمن اردو پریس اورنگ آباد، دہلی، ۱۹۲۸ء
۱۳۲۔ عبدالقادر سروری، جدید اردو شاعری ،کتاب منزل ،لاہور ۱۹٤٦ء
۱۳۳۔ عبدالوحید، جدید شعرائے اردو، ، لاہور، فیروز سنز س۔ن
۱۳٤۔ عزیز احمد ، متاع عز یز ، عزیز احمد کے تنقید ی مضا مین کا مجمو عہ، صدیق جاوید،ڈاکٹر (مرتبہ) ، لاہور مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء
۱۳۵۔ عظیم الحق جنیدی ،اردو ادب و تاریخ،ایجوکیشنل ہاوس ، علیگڑھ چھٹا ایڈیشن ،۱۹۸٤ء

۱۳٦۔ عقیل عباس جعفری، شخصیت اور فن ،ورثہ پبلی کیشنز ،لاہور، ۲۰۱۵ء
۱۳۷۔ علی احمد فاطمی، فراق گو رکھپوری، فن اور شخصیت ، نصرت پبلشرز، لکھنؤ ، ۱۹۸٦ء
۱۳۸۔ علی سردار جعفری، تر قی پسند ادب ، مکتبہ پاکستان لاہور،س۔ن
۱۳۹۔ علی عبا س جلال پو ری روا یا ت فلسفہ،المثا ل پبلشنگ،لا ہو ر
۱٤۰۔ علی عباس جلالپوری ،روح عصر، نفیس پرنٹرز،لاہور ،۱۹۸۹ء
۱٤۱۔ عمران ازفر ،نئی اردو نظم، نئی تخلیقی جہت،پورپ اکادمی اسلام آباد ،۲۰۱۳ء
۱٤۲۔ عمران ازفر ، نئی اردو نظم نئی تخلیقی جہت ، یورپ اکادمی ، اسلام آباد ،جنوری ۲۰۱۳ء
۱٤۳۔ عبد الحق ، مولوی ، انتخاب کلام میر، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی ،۱۹۸۲ء
۱٤٤۔ عبدالحق، مولوی ،ڈاکٹر چند ہمعصر، ،اردو اکیڈمی سندھ کراچی ،اکتوبر ۱۹۷۹ء
۱٤۵۔ عبد الحق ، مولوی ، افکار حالی، انجمن ترقی اردو، پاکستان ،طبع اول ۱۹۷٦ء
۱٤٦۔ غلام حسین ذوالفقار،پروفیسر ، ڈاکٹر مولانا ظفر علی خان حیات، خدمات وآثار، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۳ء
۱٤۷۔ غلام حسین ذوالفقار،ڈاکٹر اردو شاعری کا سیاسی سماجی پس منظر، مطبع پنجاب، لاہور ،۱۹٦٦ء
۱٤۸۔ غلام حسین ذوالفقار،ڈاکٹر ،بزم اکبر، سنگ میل پبلی کیشنز ، لاہور، ۱۹۹۲ء
۱٤۹۔ فاطمہ تنویر،ڈاکٹر، اردو شاعری میں انسان دوستی، تحقیقی مقالہ برائے پی۔ ایچ ڈی۔ اودھ یونیورسٹی فیض آباد،بھارت آفسٹ گلی قاسم جان دہلی، ۱۹۹٤ء
۱۵۰۔ فرخ جمال ملیح آبادی ، جوش میرے بابا(شخص اور شاعر) یورپ اکا ومی،اسلام آباد ،فروری ۲۰۱۰ء
۱۵۱۔ فرزانہ سید نقوش ادب، ،سنگ میل پبلی کیشنز، اردو بازار ، لاہور ،۱۹۸٦ء
۱۵۲۔ فہیم شناس کاظمی، سارتر کے مضامین، بک ٹائم، کراچی،۲۰۱۲ء

۱۵۳۔ قاری شاہ محمد انور علی سہیل فرید، ڈاکٹر،جہانِ تصوف، مسعود الحسن خان روہیلہ افغان ، (تعارف و تدوین) ، ریسرچ سنٹر لاہور ، ۲۰۱۲ء
۱۵۴۔ قاسمی ، احمد ندیم، جلال و جمال، التحر یر دوم ،لاہور ، ۱۹۶۹ء
۱۵۵۔ کر شن چند ر ۔ اردو کا جد ید سرمایہ ادب ، شا ہر اہ، دہلی، اپر یل ۱۹۴۹ء
۱۵٦۔ گو پی چند نارنگ ،فراق گو رکھپوری،سنگ میل پبلی کیشنر ، لاہور، ۲۰۰۸ء
۱۵۷۔ گوپی چند نارنگ، ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۵ء
۱۵۸۔ گیان چند جین ،پروفیسر تاریخ ادب اردو ،جلد پنجم ،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، جولائی ستمبر ۱۹۹۸، شک۱۹۲۰ء
۱۵۹۔ مالک رامافکار محروم، محروم میموریل لٹریری سوسائٹی ،نئی دہلی، اشاعت پہلی ۱۹٦۷، نئی طباعت ۱۹۹۳ء
۱٦۰۔ مائیکل ہارٹ ،سو عظیم آدمی، ،محمد عاصم بٹ(مترجم)تخلیقات ٹمپل روڈ، لاہور ،۱۹۹٦ء
۱٦۱۔ متولی یوسف جلبی،مسیحیت (علمی اور تاریخی حقائق کی روشنی میں)، شمس تیریز خان لکھنوی، مولانا، (مترجم)، ادارہ اسلامیات، انار کلی لاہور، ۱۹۸٦ء
۱٦۲۔ مجنوں گورکھپوری ادب اور زندگی، مکتبہ دانیال کراچی، طبع دوم،۱۹۸۵ء
۱٦۳۔ محمد اکرم چغتائی ، نذیر حق، محمد اسلم کوسری، تشریحی لغت، اردو سائنس بورڈ اپرمال، طبع اوّل، لاہور،۲۰۰۱ء
۱٦٤۔ محمد اکرم رانا،پروفیسر،ڈاکٹر بین الاقوامی مذاہب، ایک تجزیاتی مطالعہ، پورب اکادمی،اسلام آباد ،۲۰۰۹ء
۱٦۵۔ محمد رفیق مرزا، ڈاکٹر ،قرآنی فلسفہ ء حیات، جاوداں پبلیکیشنز جنجوعہ روڈ ، راولپنڈی ،مارچ ۲۰۰۲ء
۱٦٦۔ محمد عبد السلام خان ، مولاناافکار رومی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ،۱۹۸۱ء
۱٦۷۔ محمد متین خالد عیسائیت کے تعاقب میں ،علم وعرفان پبلشرز، لاہور ،۲۰۰۳ء
۱٦۸۔ محمد منور، پروفیسر ایقان اقبال ،سول اینڈ ملٹری پریس کراچی، طبع اول ،جنوری۱۹۷۷ء

۱٦۹۔ محمود احمد برکاتی ،حکیم ،شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب، احمد برادرزپریس کاظم آباد، کراچی ،طبع اول ۲۰۰٤ء

۱۷۰۔ محمد رشید ،شیخ ، اسلا م کا معا شی نظا م اور تحر یک پا کستا ن، جمہو ری پبلیکیشز، لا ہور،۲۰۰۲ ء

۱۷۱۔ مز مل حسین نئے زاویے،التحر یر ،لاہور،بار اول جنو ری۲۰۰۰ء

۱۷۲۔ مسر ت لغا ر ی ،زند گی کیا ہے، (فلسفہ حیا ت، رو حا نی و مذ ہبی نقطہ نظر سے) پشا ور رو ڈ ، راولپنڈی ،اگست ۲۰۰۲ء

۱۷۳۔ مشتاق احمد،احتساب یا انقلاب، کلاسیک پرنٹرز لاہور، بار اوّل ستمبر ۲۰۰۵ء

۱۷٤۔ مظفر حسین ،سید، محمد طا ہر ملک ،ڈا کٹر ،اسلامی فلسفہ اخلا ق، کرا چی یو نیو رسٹی شعبہ تضیف و تا لیف و ترجمہ ،۱۹۹۱ء

۱۷۵۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر کلام نیرنگ، مکتبہ اسلوب ، کراچی ،۱۹۸۳ء

۱۷٦۔ مغنی تبسم،ڈاکٹر، شہریار ، ڈاکٹر، ن۔م ۔ راشد شخصیت وفن، ماڈرن پبلشنگ ہاوس،نئی دہلی، نومبر ۱۹۸۱ء

۱۷۷۔ ملک کریم بخش اسلام اور مذاہبِ عالم، مکتبہ دانیال اردو بازار، لاہور،س۔ن

۱۷۸۔ نثار احمد فاروقی ،ڈاکٹر ذکر میر، (متن فارسی) میر کی آپ بیتی (ذکر میر کا اردو ترجمہ)، مجلس ترقی ادب، لاہور۔ طبع اول جون ۱۹۹۲ء

۱۷۹۔ نعیم مشتاق، ڈاکٹر ،اسلام، مسیحیت اور مکالمہ ء محبت، نوریہ رضویہ پبلی کیشنز گنج بخش روڈ، لاہور، ۲۰۰۸ء

۱۸۰۔ وزیر آغا ،ڈاکٹراردو ادب میں طنز و مزاح،مکتبہ عالیہ، لاہور ،۱۹۸۷ء

۱۸۱۔ نعیم نقوی،پروفیسر،ڈاکٹر،تنقید و آگہی، غضنفر اکیڈمی اردو بازار کراچی،۱۹۹۵ء

۱۸۲۔ نوازش علی، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، گندھارا، راولپنڈی

۱۸۳۔ نواز ش علی ، ڈاکٹر، فراق گو رکھپوری شخصیت وفن، دستا ویز مطبو عات ،لاہور، مئی۱۹۹۳ء

۱۸٤۔ نیاز فتح پوری، علامہ خدا اور تصور خدا، آواز اشاعت گھر، لاہور، ۲۰۰٤ء
۱۸۵۔ نیر صمدانی ،ڈاکٹر، اعتبارات ، الوقار پبلی کیشنز، لاہور ، ۱۹۹۸ ء
۱۸٦۔ نیرصمدانی، ڈاکٹر، جواز، پولیمر پبلی کیشنز اردو بازار لاہور، جنوری ۱۹۹۰ء
۱۸۷۔ وجاہت مسعود بنیادی سیاسی تصورات، سانجھ پبلیکیشنز، مزنگ روڈ، لاہور، مارچ ۲۰۱۲ء
۱۸۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر ، نئے تنا ظر، لاہور ، آئینہ ادب ،۱۹۸۱ء
۱۸۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر ،نظم جدید کی کروٹیں ، سنگت پبلشرز، لاہور ،۲۰۰۷ء
۱۹۰۔ وزیر آغا،ڈاکٹر تنقید اور احتساب، ،جدید ناشترین چوک اردو بازار لاہور، ۱۹٦۸ء
۱۹۱۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر جدید تاریخ اردو غزل، نیشنل بک فاونڈیشن ، اسلام آباد،۱۹۸۸ء
۱۹۲۔ ول ڈیورانٹ، یورپ کی بیداری، یاسر جواد(مترجم)، تخلیقات ،لاہور ،۲۰۰٦ء
۱۹۳۔ ولیم ووڈرف، جدید دنیاکی مختصر تاریخ، راشد مراد(مترجم) ، دار الشعور مزنگ روڈ، لاہور،س-ن
۱۹٤۔ ہارون الرشید،پروفیسر اردو ادب اور اسلام، ،اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور، نومبر ۱۹٦۸ء
۱۹۵۔ ہارون الرشید،پروفیسر اردو کا جدید نثری ادب، میڈیا گرافکس، کراچی ۲۰۰۹ء
۱۹٦۔ Robert p gwinn - Encyclopcdia Britinica. Vol. 20, P-665 ,1962 Chicago U.S.A
۱۹۷۔ The world book Encyclopedia, Volum 9, 1989, U.S.A 416 .P. No
۱۹۸۔ William-D-Halsey. Collier's Encyclopedia. Macmillan EducationalCorporation. New York Volume.21, 979, .P.121
۱۹۹۔ Roskilde spahi Chamber'sEncyclopedia International Learning systems Corporation Limited. London. P.640 ,Volume 12
۲۰۰۔ P.165 .Gaard kerike, Sickness unto Death, 1835
۲۰۱۔ J. A. cudden. Dictionary of literary Terms. Penguin P.551 ,Books 1977

رسائل

١۔ اورینٹل کالج میگزین، پنجاب یونیورسٹی، لاہور مئی ١٩٩٤ء
٢۔ رسالہ اردو ، اپریل ١٩٥٢ء
٣۔ علیگڑھ میگزین، اکبر نمبر ١٩٥١
٤۔ فنون، خاص شمارہ شمارہ نمبر ٦، جلد نمبر ٦، انار کلی ، لاہور ١٩٦٨ء
٥۔ رسالہ افکار، جوش ملیح آبادی نمبر شمارہ دسمبر ، کراچی ١٩٦١ء
٦۔ ارتقا شمارہ نمبر ٤٨ مخدوم محی الدین نمبر ، کراچی جون ٢٠٠٩ء
۷۔ افکار ، فیض نمبر، مکتبہ افکار رابس روڈ کراچی ١٩٦٥ء
٨۔ سہ ماہی ، مونتاج (ندیم نمبر) ، شمارہ ١۔٢ لاہورجنوری تا اگست ٢٠٠۷ء
٩۔ مفیض، جلد سوم، شمارہ ١١۔١٢ ستمبر ، دستمبر ١٩٩٣ء
١٠۔ نیا دور، ن۔ م۔ راشد نمبر ، شمارہ ۷١۔۷٢، پاکستان کلچرل سوسائٹی، کراچی
١١۔ رسالہ اوراق، جولائی، اگست ١٩۷۷ء
١٢۔ نگار، کراچی ، شمارہ، مارچ اپریل ١٩٦٦ء
١٣۔ نگار، کراچی ، شمارہ مئی جون ١٩۷٢ء
١٤۔ نگار، کراچی ، شمارہ، مارچ اپریل ١٩٦٦ء